ماہنامہ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے ۔/25
چندہ ششماہی ۔/12
قیمت فی پرچہ ۔/2

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان
ماہنامہ
الرشاد

سالانہ چندہ
ممالک غیر سے
بارہ ڈالر امریکی
8 ۔/12

جلد ۲ بابت جنوری فروری مطابق ربیع الثانی و جمادی الاول شمارہ ۱۲-۱۳

فہرست مضامین

مجلس ادارت

نشاط پریس ٹانڈہ
(عبدالرحیم)

آزادی کے بعد سے مسلمانوں کے ساتھ صوبائی حکومتوں اور مرکزی حکومت کا جو طرز عمل رہا ہے اس کی بنا پر یہ کہنا شاید صحیح ہو کہ مسلمانوں کے ایک ایک امتیاز کو مٹا کر ان کو دوسرے درجہ کا شہری بنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی ہے۔ آزادی کے بعد اردو زبان کو دیس نکالا ملا، مسلم یونیورسٹی کی آزادی سلب کی گئی، مسلم پرسنل لا کے بیشتر حصہ کو ختم کر دیا گیا، ابتدائی تعلیم کو ہندو تہذیب کے فروغ کا ذریعہ ہی نہیں بنایا گیا بلکہ اسلامیہ مکاتب کے نام سے انگریزوں کے زمانہ سے جو الگ ایک نظام تھا اور جس کے لئے الگ سے مسلمان انسپکٹر رکھا جاتا تھا، اور ان میں مسلمان ٹیچروں ہی کا تقرر ہوتا تھا وہ سب ختم کر دیا گیا، سرکاری ملازمتوں کے بعض شعبوں میں مسلمانوں کا تناسب صفر کے برابر کر دیا گیا۔

ہماری پہلی دستور ساز پارلیمنٹ نے ڈاکٹر امبیڈکر آنجہانی کی سرکردگی میں جو دستور بنایا وہ یقیناً جمہوری اور سیکولر تھا مگر اس دستور کے نفاذ اور صوبائی حکومتوں کے متعصبانہ دائرہ اختیار نے، عملی طور پر اسے ہندی، ہندو، ہندوستان بنا کر رکھ دیا ہے۔

---

۳۵ برس سے مسلمانوں کے ساتھ یہ مذاق ہو رہا ہے کہ ان کی زبان تہذیب ادب اور دل پر دھاوا بولا جاتا ہے اور ان کی امتیازی خصوصیات کو مجروح کیا جاتا ہے اور پھر چیخ و پکار یا ملک کے حالات یا سیاسی مصلحت کے تحت چھینے ہوئے اختیارات میں سے کچھ حصہ اس طرح مسلمانوں کے سامنے پھینک دیا جاتا ہے جس طرح کسی سائل کو بھیک دی جاتی ہے

اور اسے ایک کارنامہ ثابت کرنے کے بڑے پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے، مسلم یونیورسٹی کے اختیارات ۱۹۵۲ء سے کر ۱۹۷۲ء تک برابر چھینے گئے۔ اب اس کے لئے بل لاکر اپنا کارنامہ دکھلایا جارہا ہے۔ اردو زبان گو مسلمانوں کی تنہا زبان نہیں ہے مگر اس کا رشتہ کسی نہ کسی صورت میں مسلمانوں کی علمی و تہذیبی خصوصیات سے جڑا ہوا ہے اس لئے اس کو برداشت نہیں کیا گیا اور کئی صوبائی حکومتوں نے دفتروں، کچہریوں اور اسکولوں سے اسے یکلخت ختم کرکے روٹی روزی سے اس کا رشتہ کاٹ دیا تاکہ یہ زبان خود بخود مر جائے، دوسری طرف یہ باور کرانے کے لئے کہ حکومت کو اردو سے کوئی دشمنی نہیں ہے اردو بورڈ اور اردو اکیڈمی قائم کرکے حکومت کے چند مسلمان کارندوں کی پرورش کی جارہی ہے اور تھوڑے تھوڑے دنوں کے وقفہ سے اردو کو دوسری زبان بنانے اور اس کا حق واپس کرنے کی بات سیاسی بازیگر دہراتے رہتے ہیں، یہ کتنا غلط ہے کہ فرقہ پرستوں کی وجہ سے حکومت اردو زبان کے سلسلہ میں کچھ نہیں کرپارہی ہے بلکہ خود کانگریس کی سیکولر حکومت کے اندر ایسے عناصر موجود ہیں جو ہر اس چیز کو جن کی کسی درجہ میں مسلمانوں سے نسبت ہے برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ چنانچہ یوپی حکومت نے جب کیبنٹ میں یہ مسئلہ رکھا تو اس کے کئی وزرا، باسدیو سنگھ اور لوک پتی ترپاٹھی وغیرہ نے مخالفت کی اور بعض نے اس مسئلہ پر استعفا کی دھمکی دی۔

یہی صورت حال مسلم پرسنل لا کے بارے میں ہے، سب سے پہلے شفعہ کے حق کو ختم کیا گیا یہ شفعہ کا حق ہی تھا جس کی وجہ سے غریب مسلمانوں کی جائداد فروخت ہونے سے بچ سکتی تھی دوسرا آدمی مسلمانوں کی جائداد لیتے ہوئے اس لئے ڈرتا تھا کہ اگر ہم خریدیں گے تو شفعہ کے تحت اس کا کوئی دوسرا بھائی دعویٰ کرکے واپس لے لیگا۔ اسی طرح وراثت کا دائرہ اور ہبہ اور وقف کے اختیارات محدود کر دئے گئے نکاح و طلاق کے سلسلہ میں کچھ ایسی پابندیاں لگا دی گئی ہیں جو اسلامی شریعت کے بالکل منافی ہیں۔

حکومت کے ذمہ داروں کی طرف سے گاہے بگاہے اعلان ہوتا رہتا ہے کہ مسلمانوں کے مسلم پرسنل لا میں کسی طرح کی مداخلت نہیں کی جائے گی مگر آہستہ آہستہ اس کے پورے ڈھانچے کو بے

یہی صورت ملازمتوں میں مسلمانوں کے تناسب کی ہے۔ سول سروسز کے مقابلہ کے امتحانوں کے نتائج برابر نکلتے رہتے ہیں ان کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد مسلمان قوم کے نام کی کوئی قوم اب ہندوستان میں یا تو بستی ہی نہیں ہے یا اگر بستی ہے تو تعلیمی اعتبار سے وہ بانجھ ہو گئی ہے جبکہ آزادی سے پہلے ان سروسوں میں مسلمانوں کا تناسب ہندوؤں کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا تھا۔ یہی حال پولیس، فوج اور دوسرے اور تیسرے درجے کے ملازمین کا ہے کہ آزادی سے پہلے ان محکموں میں مسلمانوں کا تناسب پچیس تیس فی صد تک ہوتا تھا اور اب دو چار فی صد بھی باقی نہیں ہے گویا سول سروسز اور ایڈمنسٹریٹیو سروسوں کے قابل تو مسلمان پیدا ہی نہیں ہوتے۔ اب ان میں پولیس، فوج، کلرک اور چپراسی کے لائق بھی افراد پیدا نہیں ہو رہے ہیں، ناانصافی کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے؟

تعلیم کا معاملہ اس وقت سب سے اہم ہے جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ آزادی سے پہلے اسلامیہ مکاتب کا ایک مستقل شعبہ قائم تھا اور اس میں اردو میڈیم سے تعلیم ہوتی تھی اور اس کا سارا خرچ حکومت برداشت کرتی تھی مگر ہماری سیکولر حکومت اس "فرقہ پرستی" کو کس طرح برداشت کر سکتی تھی چنانچہ اس نے اس کا نام تو باقی رکھا ہے مگر عملاً وہ ہندی میڈیم پرائمری اسکول ہو کر رہ گئے ہیں۔

حالات کا اندازہ کرکے مسلمانوں نے اس ناانصافی کی شکایت کرنے کے بجائے انھوں نے ابتدائی تعلیم کا نظام اپنے ہاتھ میں لینے کی جد و جہد شروع کر دی اور اپنی غربت کے باوجود انھوں نے گاؤں گاؤں اور محلے محلے اپنے پیسے سے اردو میڈیم مکتب اور مدرسے کھولے جس کے اوپر اس غریب قوم کا کروڑوں روپیہ سالانہ خرچ ہو رہا ہے۔ ان کے لئے ایسا کرنا اس لئے ضروری تھا کہ مسلمان بچے ہندی، انگریزی، حساب، تاریخ و جغرافیہ اور سماجی علوم کے ساتھ اردو زبان (یا جو ان کی مادری زبان ہو) قرآن پاک اور دینیات کی بھی تعلیم حاصل کریں تاکہ وہ مروجہ تعلیم میں بھی دوسرے بچوں سے پیچھے نہ رہیں اور اپنے مذہب سے بھی بیگانہ نہ ہونے پائیں اس لئے کہ حکومت کے نصاب تعلیم میں پرائمری اسٹیج سے لے کر یونیورسٹی تک بچے کے لئے مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے۔ اس لئے ایسا کرنا ان کے لئے ناگزیر تھا مگر ہماری

سیکولر حکومت اس کو بھی برداشت نہ کر سکی، پہلے جبری تعلیم کے ذریعہ ابتدائی تعلیم کے ان دینی مکاتب پر حملہ کرنے کی کوشش کی گئی مگر جب اس میں ناکامی ہوئی تو پھر کوٹھاری کمیشن مقرر کر کے "پڑوسی اسکول" کی اسکیم بنا کر مسلمانوں کے اس ابتدائی تعلیم کے نظام کے سر پر ایک تلوار لٹکا دی گئی ہے، گو سیاسی حالات نے اس تلوار کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی اور وہ اسکیم فی الحال "سرد خانہ" میں ڈال دی گئی ہے مگر خطرہ ہر وقت لاحق ہے کہ اس کے ذریعہ مدارس اسلامیہ کی شہ رگ کب نہ کاٹ دی جائے

ایجوکیشنل کوڈ کی دفعہ ۷۳ میں یوپی گورنمنٹ نے مسلمانوں کے احتجاج پر یہ ترمیم کر دی ہے کہ جو مکاتب گورنمنٹ سے رکگنائزڈ نہیں ہیں ان کے پڑھے ہوئے بچوں کا داخلہ ٹسٹ لے کر درجہ چھ میں کر لیا جائیگا مگر مختلف اضلاع میں محکمہ تعلیم کے ذمہ دار مکتب کے بچوں کو پریشان کرتے رہتے ہیں اور بعض جگہ چھ چھ مہینے کے بعد اسکول سے یہ کہکر بعض بچوں کو خارج کر دیا گیا ہے کہ ان کے پاس رکگنائزڈ مدرسہ کی سرٹیفکٹ نہیں ہے، حالانکہ درجہ چھ کے لئے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

تعلیم کے سلسلہ میں یہ بات بھی عرض کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ہندوستان کی بسنے والی دوسری قوموں کی تعلیم کا مسئلہ صرف ایک ہے وہ یہ کہ ان کی نسل اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم پا کر دنیا میں ترقی کرے خواہ ان میں مذہبی اور اخلاقی حس باقی رہے یا نہ رہے، مگر مسلمانوں کے سامنے ان کی نسل کا صرف تعلیم یافتہ ہو جانا کافی نہیں ہے بلکہ ان کے سامنے یہ مسئلہ بھی ہے کہ ان کی نسل اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ مسلمان بھی باقی رہے اور ان کا دین و ایمان بھی محفوظ رہے۔ اس لئے تعلیم کے سلسلہ میں حکومت کے ذمہ داروں کو مسلمانوں کے اس نازک احساس کو بڑی سنجیدگی سے سمجھ لینا چاہئے اسی احساس کی وجہ سے یہ غریب قوم کروڑوں روپیہ اپنے مدارس اور مکاتب پر سالانہ خرچ کر رہی ہے۔

اس صورت حال میں مسلمانوں کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اس ہندوستان میں ایک زندہ قوم کی طرح اگر انھیں باقی رہنا ہے تو ان کو خدا تعالیٰ پر اعتماد کر کے ہندوستان کی حکومت کی طرف سے اپنی ساری امیدوں اور سہاروں کو توڑ لینا چاہئے اور زندگی کے ہر میدان میں اپنے بل بوتے پر آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہئے اور اسی پر ان کو اپنی ساری توانائی لگا دینی چاہئے۔ ان کی یہ داخلی اور خارجی جد وجہد ہی ان کو عزت کا مقام عطا کر سکتی ہے اور ان کو دوسرے درجے کا شہری بنانے سے روک سکتی ہے۔ مگر اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہمارے اندر اتحاد ہو تنظیم ہو، ہمارے ذہن میں تعمیری

کاموں کی اہمیت میٹھے اور اسی کے ساتھ ہم ایک "اجتماعی قیادت" فراہم کرسکیں، آزادی کے بعد ایک ہی مخلص اور بے غرض قائد ڈاکٹر عبدالجلیل زیدی مرحوم پیدا ہوا تھا جس کے قلب میں درد تھا خلوص تھا، غیرت وحمیت تھی جس نے اپنے جان ومال کی ساری توانائی اس محاذ پر لگادی تھی مگر افسوس ہے کہ قوم نے اس کا ساتھ نہیں دیا اور وہ اپنی حسرتوں کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوگیا اب اس کی تلافی کا ایک ہی صورت ہے کہ ہم اس کے لئے کوئی اجتماعی قیادت فراہم کرسکیں مگر اس کیلئے ہمکو بڑے کسر وانکسار اور محنت وایثار سے کام لینا ہوگا اور اس کی خاطر اپنے بہت سے فائدوں اور جذبات کی قربانی دینی ہوگی کاش مسلمان قوم کے موجودہ رہنما اور جماعتیں اپنے شخصی اور جماعتی تحفظات سے اوپر اٹھکر اس کام کو کرڈالتیں تو امت مسلمہ ہندیہ پر ان کا بہت بڑا احسان بھی ہوتا اور یہ ایک تاریخ ساز کارنامہ بھی ہوتا۔

اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی ہمیں ذہن نشین کرلینا چاہئے کہ ہمارے دین، ہماری زبان، اور ہماری تہذیب کو نہ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کے مسلمان ممبر بچا سکتے ہیں اور نہ انفرادی طور پر مولانا ابوالکلام جیسی عظیم شخصیت کی وزارت تعلیم بچا سکتی ہے اور نہ ڈاکٹر ذاکر حسین اور فخرالدین علی احمد جیسے ممتاز حضرات کی صدارتیں بچا سکتی ہیں۔ اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ ہماری خدا اعتمادی اور خود اعتمادی ہی بچا سکتی ہے ہمارے پارلیمنٹ اور اسمبلی کے ممبر مسلمانوں کے نام پر ممبری پاتے ہیں اور کرسی پر جانے کے بعد ان کی ساری وفاداری دین وملت کے بجائے اپنی پارٹی یا اپنی ذات سے ہو جاتی ہے۔ الا ماشاءاللہ اس لئے وہ ہمیشہ ملی مفاد کے مقابلہ میں اپنی پارٹی اور اپنے ذاتی مفاد کو ترجیح دینے ہی میں اپنی خیر سمجھتے ہیں اس لئے مسلمانوں کو اس سہارے سے بھی اپنی ساری امیدوں کو منقطع کرلینا چاہئے اور نہ اپنے ملی معاملات میں ان کو کوئی اہمیت دینی چاہئے۔

امارت شرعیہ بہار ایک مدت سے مسلمانوں کے آپسی معاملات کے بارے میں شرعی فیصلے کرتی ہے اور اس کے فیصلوں کو آزادی سے پہلے سے حکومت بہار تسلیم بھی کرتی رہی ہے جس کی وجہ سے مسلمان موجودہ عدالتوں کی بہت سی جان لیوا پریشانیوں سے بچ گئے اور ان کو بڑی راحت ملی

اس وقت امارت شرعیہ کے امیر مولانا منت اللہ صاحب رحمانی اور ناظم مولانا نظام الدین صاحب ہیں، ان حضرات نے قضا کے کام کو اور زیادہ مستحکم کرنے کے ساتھ امارت کے دائرہ کار کو اور زیادہ وسیع کر دیا ہے اور مسلمانوں کی اقتصادی مدد کو بھی اپنے پروگرام میں شامل کر لیا ہے۔ اسی پروگرام کے تحت بہار شریف کے قرب و جوار کے وہ مسلمان جو پچھلے سال کے فسادات میں تباہ و برباد ہو گئے تھے ان کے لئے انھوں نے ایک الگ کالونی بسا دی ہے اور پچاسوں خاندان اس میں آباد ہو گئے ہیں۔ یہ امارت شرعیہ کا اتنا بڑا کارنامہ ہے کہ اس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ مسلمان جماعتوں کو اور اداروں کو اسی تعمیری ذہن سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ انشاء اللہ یہ تعمیری ذہن ان کی بڑی سے بڑی مصیبت کو دور کر دے گا اور ان کو وہ مقام عطا کرے گا جو دوسرے ذریعوں سے وہ اب تک نہیں حاصل کر سکے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند کے موجودہ اختلافات کے سلسلہ میں اپنی معلومات کی روشنی میں عاجز نے جو کچھ لکھا ہے اس کے بارے میں بعض ممتاز علما اور سمجھدار لوگوں کے تائیدی خطوط بھی آئے ہیں۔ اور ایک حلقہ کے بعض حضرات کو اس سے کافی تکلیف پہنچی ہے اور انھوں نے غیظ و غضب سے بھرے ہوئے خطوط لکھے ہیں جن کا میں نے بحمداللہ کوئی اثر نہیں لیا مگر ہمارے ضلع کے مشہور قصبہ مئو کے ایک نوجوان عالم مولانا نذیر احمد صاحب نے جس شریفانہ انداز سے میرے بعض فقروں کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا اس کا قلب پر اثر بھی ہوا اور ندامت بھی۔ گو میری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے مگر میں ان تکلیف دہ فقروں کے لئے ان سے اور جن لوگوں کو اس سے تکلیف پہنچی ہے معذرت خواہ ہوں۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ کسی ذاتی پرخاش یا نفسانیت کی بنا پر نہیں بلکہ دارالعلوم کی محبت اور مفاد میں لکھا ہے مگر پرخلوص کام میں بھی غلطی کا بہرحال امکان ہوتا ہے اس لئے راقم الحروف حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اس ہدایت پر عمل کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کرتا۔

المراجعة الی الحق خیر من التمادی فی الباطل — حق کی طرف پلٹ آنا غلط بات پر اڑے رہنے سے بہتر ہے۔

ایک سانحہ

رشحات لکھے جا چکے تھے کہ ۲۰ جنوری کے اخبار میں یہ افسوسناک خبر پڑھی کہ یادگار سلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب مدظلہ کی اہلیہ محترمہ کا انتقال ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کی نیک بختی کے صلہ میں انھیں جنت الفردوس میں جگہ عنایت فرمائے اور حضرت مولانا کو صبر و رضا کے درجۂ علیا پر فائز فرمائے اور صاحبزادگان اور صاحبزادیوں کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ مولانا پرتاپگڈھی ایک زمانہ میں جب ان کے قویٰ مضبوط تھے تبلیغ دین کا جذبۂ فراواں لئے ہوئے پرتاب گڈھ اور سلطان پور وغیرہ کے گاؤں گاؤں کا دورہ کرتے تھے۔ وہ جھولے میں روٹی یا چنا وغیرہ لیتے تھے وہی خود کھاتے تھے اور جو ساتھی ہمراہ ہوتے ان کو بھی کھلاتے، دعوت بہت کم قبول کرتے تھے۔ اس طرح وہ ہفتوں گھر واپس نہیں ہوتے تھے اس اثنا میں نماز روزہ اور تلاوت قرآن پاک کی پابندی کے ساتھ گھر کا سارا انتظام اور بچوں کی دیکھ بھال اہلیہ محترمہ کرتی تھیں اور ان کی واپسی پر وہ کبھی کسی ناگواری یا تکلیف کا اظہار نہیں کرتی تھیں، وہ اس حدیث کی مصداق تھیں جس میں صالح عورت کو "خیر متاع الدنیا" اور "اذا غاب عنہا زوجہا نصحت فی نفسہا ومالہ" کہا گیا ہے۔ وہ کئی برس سے بے حد کمزور ہوگئی تھیں اور کچھ دنوں سے صاحب فراش تھیں مگر اس حالت میں بھی نماز کی پابند تھیں ہر وقت تسبیح پڑھتی رہتی تھیں اور کبھی ہاتھ اٹھا کر دعا کرتیں تو لڑکیاں پوچھتیں کہ اماں کیا دعا کر رہی ہیں کہتیں کہ تمہارے ابا کے لئے دعا کر رہی ہوں کہ وہ تندرست رہیں اور دین کا زیادہ سے زیادہ کام کریں۔

مولانا فرمایا کرتے ہیں کہ اگر ان کا (اہلیہ) تعاون میرے ساتھ نہ ہوتا اور انھوں نے مجھے آزاد نہ رکھا ہوتا میں اتنا دین کا کام نہ کر پاتا۔ ان کی تجہیز و تکفین رات میں ہوئی مگر سردی اور اندھیری کے باوجود اس معمولی دیہات میں اتنا مجمع تھا کہ بہت سے لوگوں کو کندھا دینے کی نوبت نہیں آئی۔ اللہ اپنی رحمت بے پایاں اور ان کے اس پرعزیمت عمل کے صلہ میں ضرور ان کو اپنی خاص رحمتوں سے ڈھانک لے گا۔ مرحومہ ہم سب کی معنوی ماں تھیں اسلئے مولانا اور انکے صاحبزادگان اور صاحبزادیوں کے غم میں ہم برابر کے شریک ہیں اس خبر کو سنتے ہی راقم الحروف نے اساتذہ اور طلبہ کے سامنے بعد نماز عصر مرحومہ کے بارے میں کچھ باتیں عرض کیں اور قرآن خوانی کے بعد انکے لئے دعائے مغفرت کی گئی اور خود تعزیت کیلئے پھولپور حاضر ہوکر حضرت مولانا کے غم میں اور مرحومہ کی قبر پر فاتحہ پڑھ کر ایصال ثواب میں شریک ہوا۔

(۲)

قرآن مجید میں

آیتِ رجم

(مجیب اللہ ندوی)

اس تمہید کے بعد اب ہم اس ٹکڑے پر بحث کرتے ہیں جس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ قرآن کی ایک آیت تھی جو بعد میں منسوخ ہوگئی اس ٹکڑے کے کلام الٰہی نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ کسی ضعیف سے ضعیف روایت سے بھی یہ ثابت نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہو کہ قرآن میں آیت رجم نازل ہوئی تھی مگر اس کی تلاوت منسوخ ہوگئی اور اس کا حکم باقی ہے۔ حالانکہ جب بھی قرآن کا کوئی ٹکڑا نازل ہوتا تھا تو اس کا علم ہر خاص و عام کو ہو جاتا تھا، اور رجم کے سلسلہ میں کسی صریح آیت کے نزول کا علم تو اور زیادہ زبان زد خاص و عام ہونا چاہیئے تھا اس لئے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے عام مجمع میں متعدد بار رجم کی سزا دی ہے، ان سزا پانے والوں میں مسلمان ہی نہیں بلکہ یہودی بھی تھے اس لئے اس کا چرچا تو گھر گھر ہوا ہوگا، ایسی صورت میں اگر رجم کے بارے میں کوئی صریح آیت نازل ہوتی تو بہتوں کو اس کا علم ہوتا، اور وہ آیت بہت سے لوگوں کے سینوں اور سفینوں میں محفوظ ہو جاتی اور جب وہ منسوخ قرار دی جاتی تو اس کا علم بھی اسی اعتبار سے بہت سے افراد کو ہونا چاہیئے تھا، مگر اس سلسلہ میں محض چار صحابہ کے بارے میں یہ ذکر ملتا ہے کہ انھوں نے مذکورہ ٹکڑے کو آیت رجم بتایا ہے ان میں سے ہر ایک کا بیان دوسرے سے مختلف اور بعض حیثیتوں سے مضطرب اور متضاد ہے۔ حالانکہ کسی کلام کو کلام الٰہی کہنے کے لئے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کی روایت متواتر ہو، اور یہ ٹکڑا متواتر کیا مشہور بھی نہیں ہے ہم ان

چاروں روایتوں کو نقل کر کے ہر ایک پر الگ الگ بحث کریں گے۔

پہلی روایت | عن زر بن جیش قال قال ابی بن کعب وکان یقرء سورة الاحزاب قال قلت ثلاثا تلثین اٰیة قال قط قلت قط، قال لقد رأیتها وانها لتعدل البقرة ولقد قرأنا فیها الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما البتة نکالا من الله والله عزیز حکیم [1]

زر بن حبیش سے مروی ہے کہ مجھ سے حضرت ابی بن کعب نے پوچھا کہ سورہ احزاب میں کتنی آیتیں ہیں، میں نے کہا کہ ۷۳ آیتیں ہیں۔ پوچھا کہ بس اسی قدر آیتیں ہیں میں نے کہا ہاں محض ۷۳ آیتیں ہیں۔ انھوں نے کہا میں نے پوری سورہ دیکھی تھی اور قریب قریب سورہ بقرہ کے برابر تھی، اس میں جو آیتیں ہم نے پڑھی تھیں ان ہی میں ایک آیت الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما البتة نکالا من الله والله عزیز حکیم بھی تھی۔

دوسری روایت | ابو امامہ بن سہل اپنی خالہ یا پھوپھی سے روایت کیا ہے۔

قالت لقد اقرأنا رسول الله صلی الله علیه وسلم اٰیة الرجم الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما البتة بما قضینا من اللذة [2]

انھوں نے کہا کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت رجم پڑھائی تھی اور وہ یہ ہے کہ الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما البتة بما قضینا من اللذة

تیسری روایت | کثیر بن الصلت کا بیان ہے کہ حضرت عمرو بن عاص اور حضرت زید بن ثابت مصحف کی کتابت کر رہے تھے کہ آیت مذکور سامنے آئی تو زید بن ثابت نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ....

سمعت یقول الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما البتة فقال عمرو لما نزلت اتیت النبی صلی الله علیه وسلم فقلت اکتبنیها فکانه کره ذالك فقال عمرو

الشیخ والشیخة اذا زنیا فارجموهما البتة کہتے ہوئے سنا ہے۔ حضرت عمر بن عاص نے کہا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر عرض کی، یا رسول اللہ آپ

---

[1] یہ روایت مستدرک حاکم اور سنن بیہقی دونوں میں مندرج ہے، روایت کے الفاظ ہم نے مستدرک سے نقل کئے ہیں مگر اس کے ابتدائی حصہ کا مفہوم زیادہ واضح نہیں تھا اس لئے ترجمہ دونوں روایتوں کو سامنے رکھکر کیا گیا ہے۔

[2] مستدرک ج ۴ ص ۳۵۹ ۔

الا تری اذا زنی وقد احصن جلد ورجم واذا لم یحصن جلد وان الثیب اذا زنی وقد احصن رجم [1]

اسے لکھوا دیجئے، تو آپ نے اس پر ناگواری کا اظہار فرمایا، پھر ابن عاص نے حضرت زیدؓ سے کہاکہ (اس ناگواری کی وجہ اس آیت کی لفظی و معنوی خامی ہے) آپ اس پر غور کیجئے، اس میں مطلقاً بوڑھے زانیوں کو رجم کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ حالانکہ اگر کوئی غیر شادی شدہ بوڑھا زنا کرے تو اس کو سو کوڑے مارے جائیں اور اگر کوئی شادی شدہ جوان زنا کرے تو اسے رجم کیا جائے گا۔ گویا اس میں تناقض ہے۔

چوتھی روایت اس سلسلہ کی سب سے اہم روایت حضرت عمرؓ کی ہے جس کو امام مالک نے موطا، میں نقل کیا ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں:

ایاکم ان تھلکوا عن آیۃ الرجم ...... والذی نفسی بیدہ لولا ان یقول الناس زاد عمر فی کتاب اللہ لکتبتھا بیدی الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھما البتۃ [2]

میں تم کو گواہ کرتا ہوں کہ آیت رجم کے بارے میں شک کرکے ہلاکت میں نہ پڑو، خدا کی قسم اگر لوگ یہ نہ کہتے کہ عمر نے قرآن میں زیادتی کر دی تو میں اپنے ہاتھ سے اس آیت کو قرآن میں لکھ دیتا۔

حضرت عمرؓ کی یہی روایت اب بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، وغیرہ میں ملاحظہ کیجئے جس کا خلاصہ یہ ہے،

حضرت عمرؓ کا پورے زمانۂ خلافت میں یہ معمول تھا کہ حج کے موقع پر آپ اسلامی مملکت کے تمام صوبوں کے امراء کو مکہ مکرمہ طلب کرتے تھے اور ان سے ہر ہر صوبہ کے دینی، اخلاقی اور سیاسی حالات دریافت کرتے تھے، جب آپ آخری بار حج کو تشریف لے گئے تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کے ذریعہ ان کو یہ علم ہوا کہ یہاں بعض اسلامی مسائل کے بارے میں کچھ لوگوں کے دلوں میں شبہات

[1] یہ روایت بعض دوسرے طریقوں سے بھی مروی ہے، بیہقی اور بعض دوسری حدیث کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت زیدؓ سے یہ گفتگو حضرت عمرو بن عاص سے نہیں بلکہ حضرت عمرؓ سے ہوئی تھی اور ان ہی نے اس کی خامی کی طرف توجہ دلائی تھی۔

[2] اسلامی مسائل میں سب سے اہم مسئلے دو تھے۔ ایک حضرت صدیقؓ کی خلافت اور دوسرا سزائے رجم کی فرضیت۔

پیدا ہوگئے ہیں، تو انھوں نے فرمایا کہ میں ان مسائل کے بارے میں مجمع عام میں ایک تقریر کرنا چاہتا ہوں، مگر حضرت ابن عوف رضؓ نے حضرت فاروق رضؓ سے عرض کیا کہ امیرالمومنین! یہ عام مجمع ہے اس میں ہر طرح کے لوگ ہیں، بہت سے لوگ آپ کی تقریر کے مدعا کو سمجھ نہ سکیں گے اور واپس جا کر نہ جانے اس کے کیا کیا معانی پیدا کریں گے اور فتنہ اٹھائیں اس لئے میری رائے ہے کہ آپ یہ تقریر مدینہ منورہ میں کریں جہاں خواص اہل علم کا مجمع ہوگا۔ وہ مغز سخن تک پہنچیں گے اور چنانچہ حضرت عمر رضؓ اس ارادہ سے باز رہے۔ اور جب مدینہ منورہ واپس ہوئے تو پہلے ہی جمعہ میں ان مسائل پر تقریر فرمائی جس کے چند جملے بروایت بخاری یہ ہیں:

اما بعد۔ فانی قائل لکم مقالۃ قد قدرلی ان اقولہا لا ادری لعلہا بین یدی اجلی فمن عقلہا ووعاھا فلیحدث بہا حیث انتہت بہ راحلتہ ومن خشی ان لا یعقلہا فلا احل لاحد ان یکذب علیّ

میں ایک ایسی تقریر کروں گا جس کا ذکر کرنا میرے لئے انتہائی ضروری ہے، اس لئے کہ میں نہیں جانتا کہ موت ابھی آجائے تو جن لوگوں کے اندر اس تقریر کے سمجھنے اور اس کے ذہن نشین کر لینے کی صلاحیت ہو وہ اس کو جہاں تک پہنچا سکیں پہنچا دیں مگر جن لوگوں کو یہ اندیشہ ہو کہ مغز سخن تک ان کی رسائی نہ ہو سکے گی تو میں ایسے کسی شخص کو اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ میرے اوپر افترا پردازی کرے اور جھوٹی سچی بات میری طرف منسوب کرے۔

اس تمہید کے بعد آپ نے فرمایا کہ

ان اللہ بعث محمداً صلی اللہ علیہ وسلم بالحق وانزل الکتاب فکان مما انزل اللہ اٰیۃ الرجم فقرأناھا وعقلناھا ووعیناھا رجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورجمنا بعدہ فاخشی ان طال بالناس

بلاشبہہ خدا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی ہے خدا نے جو کلام آپ پر نازل فرمایا ہے۔ اس میں آیت رجم بھی ہے، ہم نے اس آیت کو پڑھا سمجھا اور اس کو محفوظ رکھا (اور اس کا ثبوت

زمان ان یقول قائل واللہ ما نجد آیۃ الرجم فی کتاب اللہ فیضلوا بترک فریضۃ انزلھا اللہ والرجم فی کتاب اللہ حق علی من زنی اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البینۃ اوکان الحبل او الاعتراف [1]

یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس رجم کی سزا دی اور آپ کے بعد ہم نے اس پر عمل کیا، میں ڈرتا ہوں کہ ممکن ہے کچھ دنوں کے بعد کہنے والے یہ نہ کہنے لگیں کہ ہم تو کتاب اللہ میں آیت رجم (صراحۃً) نہیں پاتے۔ پس اس شبہہ میں وہ ایک فریضۂ خداوندی کو ترک کرکے گمراہ ہو جائیں۔ حالانکہ سزائے رجم کا حکم کتاب اللہ میں (اشارۃً) موجود ہے۔ یہ سزا ان لوگوں کے لئے ہے جو شادی شدہ ہوں، خواہ وہ مرد ہوں یا عورت۔ مگر یہ سزا اس وقت نافذ ہوگی جب اس کا شرعی ثبوت مل جائے۔ یا زانیہ حاملہ ہو جائے یا مجرم خود اعتراف کرے۔

پہلی تینوں روایتوں میں اور حضرت عمرؓ کی جو روایت امام مالک نے نقل کی ہے اسمیں الشیخ والشیخۃ والے ٹکڑے کا ذکر ہے۔ مگر حضرت عمرؓ کی یہی روایت بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی وغیرہ نے بھی نقل کی ہے مگر ان میں سے کسی نے اس ٹکڑے کا ذکر نہیں کیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان محدثین کے نزدیک حضرت عمرؓ کی طرف اس بات کی نسبت صحیح نہیں ہے کہ انھوں نے اس ٹکڑے کو کلام الٰہی کہا ہو یا صراحۃً یہ فرمایا ہو کہ کتاب اللہ میں رجم کا ثبوت اسی منسوخ التلاوت آیت سے ثابت ہے، پھر اس میں اس بات کا بھی ذکر نہیں ہے کہ جب اس کا حکم باقی ہے تو اس کی تلاوت کیوں منسوخ قرار دی گئی، اب ان روایتوں پر الگ الگ غور کیجئے۔

پہلی روایت کے الفاظ پر غور کیجئے، اس میں ذکر ہے کہ یہ ٹکڑا سورۂ احزاب کا جزو تھا اور سورۂ احزاب میں اس وقت محض ۷۳ آیتیں ہیں، مگر اس کی ضخامت سورہ بقرہ کے

---

[1] بخاری کتاب المحاربین ج ۲ ص ۱۰۰۵ –

برابر تھی، روایت میں صراحتہً یہ ذکر تو نہیں ہے کہ یہ حصہ منسوخ ہو گیا مگر بظاہر اس کا مقصد یہی معلوم ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کا یہ مطلب بھی نکل سکتا ہے کہ یہ حصہ غائب ہو گیا ہو۔

اگر اس روایت کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ سورۂ احزاب کا جو حصہ منسوخ یا غائب ہو گیا ہے وہ قرآن میں موجودہ حصہ کی کئی گنا زیادہ تھا اس لئے کہ سورہ احزاب میں کل ۷۳ آیتیں ہیں اور سورہ بقرہ میں ۲۸۶ آیتیں، یہ ایک ایسی بات ہے جس کی تائید نہ تو کسی حدیث نبوی سے ہوتی ہے اور نہ کسی دوسرے صحابی کی روایت سے، ممکن ہے کہ سلسلۂ سند کے اعتبار سے یہ روایت صحیح ہو اس لئے کہ اس کی سند پر کو جرح و تنقید نظر سے نہیں گذری مگر بہر نوع اصول روایت کے اعتبار سے کسی طرح اس روایت کو صحیح قرار نہیں دیا جا سکتا، قرآن واضح طور پر اپنے محفوظ اور مکمل ہونے کا اعلان کرتا ہے اور اس سے اس کا غیر محفوظ ہونا ظاہر ہوتا ہے اس لئے ایک روایت کی بنا پر قرآن مجید کو کیسے ناقص قرار دیا جا سکتا ہے۔

حضرت ابی بن کعب جن سے یہ روایت منقول ہے، ان کے نیچے کے راوی زر بن حبیش ہیں ان کے بارے میں محدثین نے لکھا ہے کہ وہ علوی تھے، ممکن ہے کہ ان کی علویت سے فائدہ اٹھا کر کسی شیعی راوی نے ان کی طرف یہ روایت منسوب کر دی ہو، اور چونکہ یہ حضرت ابی بن کعبؓ کے معروف شاگرد تھے اس لئے یہ روایت کی نسبت ان کی طرف کر دی گئی ہو، یہ قیاس اسلئے بھی صحیح معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے بارے میں بعض شیعوں کا جو تصور ہے اس میں اور اس روایت میں ہم آہنگی ہے۔

پھر حضرت ابی بن کعبؓ کی اس روایت سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ رجم کو قرآنی حکم اسی منسوخ التلاوت آیت کی وجہ سے تسلیم کرتے تھے۔ مگر کنز العمال کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کو سنت نبوی سمجھتے تھے، ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں تو صحیح نہیں ہو سکتیں اس لئے لامحالہ ان میں سے کسی ایک ترجیح دینا پڑے گا۔ میرے خیال میں دوسری بات اسلئے زیادہ قرین قیاس ہے کہ اس رائے میں ان کے ساتھ بعض دوسرے جلیل القدر صحابہ بھی شریک ہیں مگر دوسری میں یہ تنہا ہیں۔

دوسری روایت ابو امامہ[1] یا ابو اسامہ نے اپنی صحابیہ خالہ یا پھوپھی سے کی ہے رجال

---

[1] مستدرک حاکم میں ان کا نام ابو امامہ درج ہے اور فتح الباری میں ابو اسامہ بن سہیل۔

اور طبقات کی کتابوں میں نہ تو ابوامامہ بن سہل کے حالات ملتے ہیں اور نہ ان کی پھوپھی اور خالہ کا ذکر ملتا ہے کہ ان کے نام و نسب اور روایت حدیث میں ان کے مرتبہ کا اندازہ کیا جا سکے اس لئے اصول روایت سے قطع نظر "جہالت رواۃ" اس روایت کے ناقابل اعتبار ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

تیسری روایت حضرت زید بن ثابتؓ سے مروی ہے۔ اس روایت کے آخری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس ٹکڑے کا ذکر آیا تو آپ نے ناگواری کا اظہار فرمایا کانہ کرہ ذلک،

ایک طرف تو کتاب و سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب بھی کلام الٰہی کا کوئی حصہ نازل ہوتا تھا تو آپ خود بھی اسے مستحضر کر لیتے تھے اور فوراً کاتبین وحی کو بلا کر اس کا املا کرا دیتے اور حاضرین کو سنا کر یا نمازوں میں پڑھ کر اس کا عام چرچا فرما دیتے تھے اس طرح وہ نازل ہوتے ہی سیکڑوں سینوں اور سفینوں میں محفوظ ہو جاتا تھا مگر اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ کلام الٰہی کا کوئی حصہ ایسا بھی تھا کہ آپ نے نہ اسے کسی کو سنایا اور نہ املا کرایا بلکہ جب آپ سے اس کے لکھوانے کی فرمائش کی گئی تو آپ نے ناگواری ظاہر کی، حالانکہ اسمیں ناگواری کی کوئی بات نہیں تھی، آپ یہ فرما سکتے تھے کہ یہ آیت منسوخ ہو چکی ہے۔

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جوں ہی اس کا نزول ہوا، حضرت ابن عاص یا حضرت عمرؓ آپ کی خدمت میں گئے (لما نزلت اتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم) اور اس کے لکھنے کی فرمائش کی، مگر آپ نے اس سے انکار فرمایا آخر کار ایسی آیت کے نزول سے فائدہ ہی کیا تھا جس کی نہ تو ایک دن تلاوت ہی ہوئی اور نہ اس پر ایک دن عمل ہوا۔

اس روایت کا وہ حصہ اور بھی قابل غور ہے جس میں اس ٹکڑے کے معنوی نقص پر روشنی ڈالی گئی ہے حضرت ابن عاصؓ یا حضرت عمرؓ نے زید بن ثابت کو مخاطب کر کے فرمایا، آپ ذرا اس مفہوم پر غور کریں اس میں مطلقاً بوڑھوں کے مرتکب زنا ہونے کی سزا رجم قرار دی گئی ہے خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا نہ ہوں۔ مگر عمل اس کے خلاف ہے، عمل تو یہ ہے کہ اگر بوڑھا شادی شدہ ہو تو اس کو رجم کیا جائے گا اور اگر اس نے شادی نہیں کی ہے اور بڑھاپے میں اس نے

اس جرم کا ارتکاب کیا تو اس کو محض سو کوڑے کی سزا دی جائے گی، اور اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ محض بوڑھے زانیوں ہی کو رجم کیا جائے گا لیکن عملاً یہ ہے کہ اگر کوئی نوجوان شادی شدہ ہو اور وہ زنا کا ارتکاب کرے تو اس کو بھی رجم کیا جائے گا۔ مقصد یہ ہے کہ یہ آیت اس لئے منسوخ قرار دی گئی کہ اس میں معنوی نقص بھی ہے اور تعامل کے خلاف بھی۔ اس بیان سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔

ایک یہ کہ جن صحابی نے اس پر یہ عقلی اعتراض کیا ہے ان کے نزدیک حکم الٰہی کے مقابلہ میں تعامل زیادہ اہمیت رکھتا ہے، اور کلام الٰہی کے منسوخ ہونے کے لئے خلاف تعامل ہونا کافی ہے۔

دوسری یہ کہ کلام الٰہی کا کوئی حصہ ایسا بھی ہے جو محض اپنے معنوی نقص کی وجہ سے منسوخ ہوا، اور یہ معنوی نقص خدا اور اس کے رسول نے نہیں، بلکہ ایک صحابی نے بتایا، غور کیجئے کہ وہ اس روایت کو تسلیم کر لینے کے بعد ہمیں دین کی کتنی بنیادی باتوں سے دست بردار ہونا اور ان پر تیشہ چلانا پڑے گا۔ (باقی)

عمر کا ہر لمحہ قیمتی ہے

علامہ شبلی نے اپنے سفرنامہ مصر و شام میں لکھا ہے کہ جس جہاز سے وہ سفر کر رہے تھے اسی میں مشہور انگریز مصنف پروفیسر آرنلڈ جن کا علی گڑھ میں ساتھ رہ چکا تھا بھی سفر کر رہے تھے۔ تو راستہ میں جہاز خطرے میں آگیا اور قریب تھا کہ وہ غرق ہو جائے جہاز کے کپتان نے یہ اعلان کر دیا کہ اب جہاز ہمارے قابو سے باہر ہے، سب لوگ اپنے بچنے کی تدبیریں کریں۔ علامہ شبلی پریشان پروفیسر آرنلڈ کے پاس آئے تو دیکھا کہ وہ اطمینان سے بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں۔ انھوں نے تعجب سے کہا کہ آپ کو معلوم نہیں کہ جہاز کے ڈوب جانے کا اعلان ہو چکا ہے انھوں نے کہا کہ ہاں معلوم ہے مگر اب عمر کے جو لمحے باقی ہیں انھیں کیوں ضائع کیا جائے جو ہونا ہے وہ تو ہو گا ہی۔ پروفیسر آرنلڈ نے ایسی بصیرت افروز بات کہی جو رہتی دنیا تک یاد رہے گی چنانچہ جہاز خطرے سے نکل گیا اور جو لوگ حیران و پریشان تھے وہ اپنی منزل تک پہونچے اور پروفیسر آرنلڈ بھی۔

غزوہ بنی النضیر کا اصل باعث

ابن اسحاق کی کتاب میں ایک قدیم سہو کتابت؟

از محترم جناب ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب، پیرس (فرانس)

سیرۃ النبی (علی صاحبہا السلام) کے اس واقعے سے بچہ بچہ واقف ہے کہ ۴ھ کے معرکۂ بدر کے کچھ دن بعد مدینہ منورہ میں مسلمانوں اور بنی النضیر کے یہودیوں میں لڑائی ہوئی۔ فتح پر رسول اکرم نے ان کو اس شرط پر معاف کر دیا کہ اپنا سارا مال و متاع حتیٰ کہ قرض کی جو رقمیں تھیں مسلمانوں سے واپس حاصل کر کے کہیں اور جا بسیں، یہ لڑائی کیوں ہوئی؟

ابن ہشام (یعنی ابن اسحاق) نے لکھا ہے کہ بدر کی شکست پر کھسیانی بلی کی طرح مشرکین مکہ نے یہ اعلان کیا کہ جو کوئی کسی مسلمان کو قتل یا گرفتار کرے تو اسے انعام دیا جائے گا۔ ایک زبردست بے اصول قبیلے[۱] نے رسول اکرم سے التجا کی کہ تبلیغ اسلام کے لئے اس کے ہاں چند مشنری بھیجے جائیں[۲] اور جب وہ اس کے ہاں پہنچے تو ان کو گھیر کر مار ڈالا یا قید کر کے اہل مکہ کے ہاتھ فروخت کر دیا[۳] اور بچا تو صرف ایک مسلمان جو قافلے کے اونٹوں کو چراگاہ لے گیا تھا اور واپسی پر بدقت جان بچا کر مدینہ روانہ ہوا[۴] (یعنی عمرو بن امیہ ضمری)، مدینے سے ایک منزل پہلے انہیں دو بدوی ملے اور معلوم ہوا کہ وہ اسی قبیلے کے افراد ہیں جس نے مسلمانوں کو دھوکے سے قتل کیا تھا، کھائی کر جب دونوں

---

[۱] بنو عامر [۲] یہ پیغام ابو البراء کلابی لے کر آیا تھا [۳] فروخت کرنے کا معاملہ عضل و قارہ نے کیا تھا جس میں انھوں نے حضرت خبیب اور زید بن الدثنہ کو قریش کے ہاتھ فروخت کیا تھا، بنو عامر کے سلسلے میں یہ واقعہ پیش نہیں آیا غالباً ڈاکٹر صاحب کو غلط فہمی ہوگئی ہے۔ [۴] بعض روایتوں میں ہے کہ انھوں نے خود ان کو چھوڑ دیا اور ان کے سر کے بال کاٹ دیئے۔

بدوی سوگئے تو حضرت عمرو بن امیہ نے چپکے سے اور انتقام لینے کے لئے ان کو قتل کر دیا جب
مدینہ پہنچکر واقعات بیان کئے تو رسول اکرم نے فرمایا کہ وہ بدوی دوست (مسلمان تھے [1]) اور پروانہ
امن لے کر گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ قتل خطا پر خوں بہا دینے کی ضرورت تھی۔ رسول اکرم بنی النضیر کے
یہودیوں کے یہاں گئے تاکہ وہ بھی خوں بہا کی ادائی میں شرکت کریں۔ بہ ظاہر تو انھوں نے قبول کیا
اور انتظار کرنے کو کہا، پھر جس گڑھی کے نیچے سائے میں رسول اکرم بیٹھے ہوئے تھے، چاہا کہ اس کے
اوپر سے چکی کے پاٹ گرا کر آپ کو قتل کر دیں رسول اکرم نے اسے بھانپ لیا اور حضرت ابوبکر
وغیرہ ہمراہیوں کے ساتھ "ابھی آتا ہوں" کہکر مدینہ واپس ہوگئے، پھر دوسرے دن سزا دہی کے
لئے بنی النضیر کا محاصرہ کیا......

ابن اسحاق کی اس روایت کو تقریباً سارے ہی متاخرین دہراتے رہے ہیں۔ مجھے بچپن ہی
سے اس سے کھٹک رہی، ایک بار ہمارے سب سے بڑے سوانح نگار نبوی (مولانا سید سلیمان ندوی)
مرحوم حیدرآباد دکن آئے تو میں نے ان سے طالب علمانہ پوچھا تھا کہ قاتل جب مسلمان تھا تو
یہودیوں پر خوں بہا کی کیوں ذمہ داری ہونی چاہئے؟ زیادہ سوچے بغیر فرمایا: "نہیں جی وہ ذمہ دار
تھے [2]" پھر اوروں سے گفتگو میں مشغول ہو گئے۔ اور بات رہ گئی۔

ان کی سیرۃ النبی کا یہ حصہ غالباً ہمارے دوسرے سرگروہ علم مولانا شبلی نعمانی مرحوم کا لکھا
ہوا ہے انھیں بھی اس میں کوئی غیر معقول بات نظر نہیں آئی۔

اس پر سالہا سال گذر گئے اور گتھی کا تشفی بخش حل نہ ملا۔ آخر ابھی حال میں سمہودی کی وفاء الوفاء
فی اخبار دار المصطفیٰ کو بار دیگر اور ذرا تفصیل سے پڑھنے کا موقع ملا تو الحمد للہ اس کا جواب مل گیا
میں نے فوراً "معارف" اعظم گڈھ کو ایک نوٹ بھیجا، شاید وہاں اسے گستاخی خیال کیا گیا۔ ابھی
حال میں مصنف عبدالرزاق بن ہمام میں بھی (جو امام بخاری کے دادا استاد کی تالیف ہے) وہی
داستان ملی جو سمہودی نے لکھی ہے (اور غالباً سمہودی کا ماخذ بھی وہی ہے)

---

[1] یہ مسلمان نہیں تھے بلکہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پروانۂ امن عطا کیا تھا، ابن ہشام میں ہے وکان مع العامرین عقد من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وجوار ج ۲ ص ۱۸۶، ان دونوں عامریوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاہدۂ امن کیا تھا۔

[2] حضرت سید صاحب نے اس کی تفصیل نہیں فرمائی مگر ان کا یہ فرمانا کہ "نہیں جی وہ ذمہ دار تھے" اس وجہ سے صحیح معلوم ہوتا ہے کہ یہود سے جو معاہدہ ہوا تھا اس کے تحت آپ ان سے مطالبہ کا حق تھا، جیسا کہ اگلے صفحات میں راقم الحروف نے اس کی کچھ تفصیل کی ہے۔

چونکہ سیرت شبلی ہمارے ملک اور ہماری زبان کی سب سے بہتر سوانح نبوی ہے۔ اس لئے اگر ذیل کی معلومات شائع ہو جائیں تو کم از کم چند لوگوں کی غلط فہمی دور ہو جائے گی۔ انشاء اللہ سمہودی کی کتاب مستند بھی ہے اور معروف بھی اس سے ناواقفیت کا سوال نہیں ہو سکتا۔ "سفرنامۂ مصر و شام و روم" کے محترم مؤلف کو عبدالرزاق کی مصنف سے واقفیت کا موقع بھی رہا ہے کہ اس کے کئی نسخے ہیں[1] اور اب ڈابھیل اور جوہانسبورگ کی مشہور رئیس میاں فیلی کی توجہ سے مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی نے اسے شائع بھی کر دیا ہے۔

بہر حال مصنف عبدالرزاق کی جلد پنجم حدیث نمبر (۹۷۳۳) میں اور سمہودی کی تاریخ مدینہ (طبع جدید) صفحہ (۲۹۸) میں غزوہ بنی نضیر کی اہم تفصیل ملتی ہے اور سمہودی نے لکھا ہے کہ وہی بیان عبد بن حمید کی تفسیر میں اور ابن مردویہ کی حدیث کی کتاب میں بھی اور عمدہ راویوں کی سند سے مذکور ہے اور یہ کہ "یہ بیان ابن اسحاق کے بیان پر قابل ترجیح ہے[2]"

بدر کی جنگ کے بعد مشرکین مکہ نے بنو النضیر کے یہودیوں کو ترغیب دلائی کہ رسول اکرم کو کسی طرح قتل کر ڈالیں۔ انھیں غیر یہودی نبی کا وجود گوارا نہ تھا اس کی روزافزوں ترقی سے جلن تھی اور یہود بنی قینقاع کی شہر بدری سے غم اور غصہ بھی تھا اور خود اپنے مستقبل کے لئے خطرہ بھی نظر آرہا تھا ممکن ہے کہ اہل مکہ نے انعام واکرام کا مالی لالچ بھی دلایا ہو۔ بہر حال انھوں نے قبول کر لیا اور رسول اکرم کو ایک پیغام بھیجا کہ وہ اسلام قبول کرنے پر مائل ہیں اور اگر آپ تیس اصحاب کے ہمراہ ان کے یہاں تشریف لائیں تو تیس یہودی علماء آپ سے بحث کریں گے اور اگر یہ علماء قائل ہو گئے تو بنو النضیر کے سارے یہودی اسلام قبول کر لیں گے۔ وقت معینہ پر یہودی عالم کپڑوں میں ہتھیار چھپائے ہوئے انتظار کرنے والے تھے پھر انھوں نے سوچا کہ تیس ایسے مسلمانوں سے جن میں سے ہر ایک اپنی جان سے رسول اللہ کی جان کو ترجیح دینے والا ہو، ملاقات خطرے سے خالی نہیں۔ اس لئے فوراً ایک نیا پیغام بھیجا کہ تیس آدمیوں سے گفتگو میں گڑبڑ ہوگی اس لئے حضور صرف تین آدمیوں کے ساتھ رونق افروز ہوں، حضور نے منظور فرما لیا۔ ان یہودیوں میں ایک مدنی عرب عورت بیاہی ہوئی تھی جب اسے معلوم ہوا کہ تین یہودی عالم اپنے جبّوں میں خنجر چھپائے

---

[1] علامہ شبلی نے خود سفرنامۂ مصر و شام میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا اشارہ اسی طرف ہے۔ [2] یہی بیان عبدالرزاق کے واسطے سے امام زہری کی مغازی میں بھی ہے، ص ۷۲۔

ہوئے رسول اللہ کی آمد کا انتظار کر رہے ہیں تو اس نے اپنے بھائی سے جو ایک انصاری مسلمان تھے خفیہ اطلاع بھجوائی۔ پیام ملتے ہی وہ دوڑے اور رسول اللہ کو اس وقت جالیا جب آپ بنو النضیر کے گاؤں میں پہنچنے ہی کو تھے، خبر سنتے ہی آپ الٹے پاؤں مدینہ چلے آئے اور دوسری صبح کو فوجی دستوں کے ساتھ جاکر بنو النضیر کا محاصرہ شروع فرمایا ......

عبد الرزاق اور عبد بن حمید جیسے پرانے محدثین کی یہ روایت معقول معلوم ہوئی اور دل کو لگتی ہے، معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ابن اسحاق کی کتاب المغازی کو نقل کرتے وقت کاتب سے سہو ہوئی اور یا تو چند سطریں یا پورا ایک ورق چھوٹ گیا اور نظر اچٹنے سے دو قصے مدغم ہوگئے یہ بہت قدیم زمانے میں پیش آیا اور بعد کو تحقیق کا کس کو خیال نہ آیا۔

ان حالات میں سمہودی کے بیان کی اکہ یہ روایت ابن اسحاق کی روایت پر قابل ترجیح ہے، یہ ناچیز بھی تائید کرتا ہے اور توقع ہے کہ دیگر فضلا و محققین اسی نتیجے پر پہنچیں گے یہ تصحیح سیرت نبویہ کی ایک اہم خدمت متصور ہو سکتی ہے۔

....

اس سلسلہ میں مرتب کی چند گذارشات

سیرت نبوی کے موضوع پر محترم جناب ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا مطالعہ غیر معمولی وسیع ہے اور انھوں نے اس موضوع پر مختلف زبانوں میں متعدد کتابیں لکھی ہیں، خاص طور پر عہد نبوی کے غزوات اور خلفائے راشدین کے زمانہ کی جنگوں اور حدود مملکت کے جو نقشے انھوں نے تیار کئے ہیں وہ اس موضوع پر ماخذ کا کام دیتے ہیں، عربی اردو، انگریزی اور فرنچ وغیرہ کی زبانوں میں سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤں پر انھوں نے بہترین سرمایہ فراہم کیا ہے، فرنچ میں انھوں نے قرآن کا ترجمہ بھی کیا ہے اس مختصر استدراک سے بھی سیرت نبوی پر ان کے مطالعہ کی گہرائی اور ذوق کا اندازہ ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس میں غزوۂ بنو النضیر کے سبب اصلی پر جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی جگہ پر صحیح ہے مگر اس سلسلہ میں راقم الحروف کا خیال ہے کہ اس کا سبب نہ تو محض دیت کا مطالبہ تھا اور نہ قریش کی سازش میں ان کا ملوث ہونا تھا بلکہ ان مذکورہ بالا اسباب کیساتھ ان کی وہ معاندانہ روش بھی تھی جس کی زد روزمرہ مسلمانوں پر پڑتی تھی ان تمام اسباب نے مل کر

ایسی صورت پیدا کر دی تھی کہ اگر ان کے خلاف یہ قدم نہ اٹھایا جاتا تو وہ اسلامی حکومت جو ابھی وجود میں آئی تھی اور جس کا مرکز مدینہ منورہ تھا وہ ہمیشہ انتشار و فساد کی آماجگاہ بنا رہتا اور مسلمانوں کو مثبت طور پر کوئی کام کرنے میں ہمیشہ رکاوٹیں پیدا ہوتی رہتیں جیسا کہ تین چار برس میں مسلمانوں کو متعدد بڑے بڑے خطرات کا سامنا کرنا پڑا اور آئندہ اس کا امکان باقی تھا چنانچہ یہود کے مدینہ منورہ سے نکل جانے کے بعد کسی کو پھر مدینہ منورہ پر حملہ کرنے کی جرأت اسی لئے نہیں ہوئی کہ اب گھر کے بھیدی موجود نہ تھے۔

ہجرت نبوی سے پہلے مدینہ منورہ اور اس کے اس کے آس پاس کی پوری آبادی پر یہودیوں کا نہ صرف اقتصادی غلبہ تھا بلکہ مذہبی اعتبار سے انصار اور دوسرے عرب قبائل بھی ان کو اپنے سے معزز و محترم سمجھتے تھے یہی وجہ تھی کہ وہاں کے ہر اجتماعی معاملہ میں ان کا عمل دخل ضروری ہو گیا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ منورہ تشریف لانے کے بعد اقتصادی اعتبار سے گو انکا غلبہ باقی تھا مگر وہاں کے اجتماعی معاملات میں ان کی وہ قائدانہ حیثیت باقی نہیں رہی جو ہجرت سے پہلے تھی پھر ان کے کئی ممتاز علما حضرت عبد اللہ بن سلام اور حضرت زید بن سعنہ وغیرہ کے اسلام لانے کے بعد ان کی مذہبی قیادت بھی کمزور پڑ گئی اس کے ساتھ قرآن پاک میں ان کی بہت سی دینی و اخلاقی خرابیوں کو کھول کھولکر بیان کیا جا رہا تھا جس سے ان کی اخلاقی پوزیشن کمزور ہو رہی تھی، گو آپ ہمیشہ ان سے مدارات کا معاملہ فرماتے تھے بلکہ حدیث میں آتا ہے کہ

وکان یحب موافقۃ اھل الکتاب فیما لا یومر فیہ بشیء (بخاری کتاب اللباس)	جس چیز کے بارے میں کوئی حکم خدا کی طرف سے نہیں آتا تھا اس میں آپ اہل کتاب کی موافقت پسند فرماتے تھے۔

پھر آپ نے مدینہ تشریف لانے کے بعد ان سے ایک معاہدۂ امن بھی کر لیا تھا جس میں ان کو ہر طرح کی آزادی اور مسلمانوں کے برابر حیثیت دی گئی تھی مگر مذکورہ بالا اسباب کی بنا پر ان کو اسلام اور مسلمانوں اور ذات نبوی سے ایک نفرت پیدا ہو گئی تھی جس کی وجہ سے آپ کے اس اخلاقی طرز عمل کا کوئی اثر ان پر نہیں پڑتا تھا اور نہ اس معاہدۂ امن کو انھوں نے ایک دن بھی دل سے قبول کیا بلکہ برابر اپنے طرز عمل سے اس کی خلاف ورزی کرتے رہے اور حسن اخلاق کے مقابلہ میں برابر بد اخلاقی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ چند واقعات ملاحظہ ہوں:۔

۱- یہود عام طور پر آپ کی مجلس میں جاتے تھے تو آپ کی خدمت میں السلام علیکم کے بجائے السام علیکم (آپ کو موت آئے) کہتے تھے، صحابہ کو اس سے سخت تکدر ہوتا تھا مگر آپ لے انگیز فرماتے تھے، اس کے علاوہ بھی مختلف طریقوں سے آپ کو اذیت پہنچاتے تھے چنانچہ قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی:

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اَذًى كَثِيْرًا — آپ اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنیں گے مگر آپ صبر سے کام لیں۔

(آل عمران)

۲- انصار کے دونوں قبیلوں اوس و خزرج میں انھوں نے کئی بار اختلاف پیدا کرنے کی کوشش کی۔

(اصابہ ابن حجر ج ۱ ص ۸۸)

۳- جہاں موقع ملتا تھا مسلمان عورتوں کی بے حرمتی کرتے تھے۔ (سنن ابوداؤد)

۴- ان کی سازش اور مختلف سازشوں کا علم ہوا تو آپ نے ان سے تجدید بیعت کے لئے کہا مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ (ابوداؤد)

۵- کعب بن اشرف یہودی جو بنو نضیر کا حلیف تھا اس نے آپ کی دشمنی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

۶- ابن ہشام میں اور دوسری کتابوں میں دیت کے مطالبہ کا ذکر ہے جیسا کہ علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی وہ روایت نقل کی ہے مگر حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس پر جو حاشیہ تحریر فرمایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف قریش نے ان کو آپ کے قتل اور مسلمانوں کے مدینہ سے نکالنے پر ابھارا تھا بلکہ گھر کے بھیدی کی حیثیت سے انھوں نے خود ان کو مسلمانوں سے جنگ پر ابھارا اور خفیہ باتوں سے بھی ان کو آگاہ کیا اور حقیقت یہ ہے کہ یہود اور منافقین کی شہ اگر قریش کو نہ ملی ہوتی تو وہ تین سو میل دور آکر مدینہ پر کئی بار حملہ کرنے کی جرأت کبھی نہیں کر سکتے تھے سید صاحب نے دیت کے مطالبہ پر جو مختصر سا حاشیہ علامہ شبلی کی عبارت پر لکھا ہے وہ یہ ہے۔

"یہ روایت ابن ہشام وغیرہ میں مذکور ہے، زرقانی نے موسیٰ بن عقبہ کی مغازی

سے جو صحیح ترین مغازی کی کتاب ہے یہ عبارت نقل کی ہے۔

وکانوقد دسوالی قریش فی قتاله	یعنی یہود نے قریش سے درپردہ سازش کی اور
صلی اللہ علیہ وسلم وحضوھم علی	ان کو آمادۂ جنگ کیا اور ان کو مخفی راز بتائے۔
القتال ودلوھم علی العورة	

مذکورہ بالا تفصیل کی روشنی میں راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہود کے قبائل سے جنگ کرکے ان کو مدینہ سے جلا وطن کرنے کا کوئی ایک ہی سبب نہیں تھا بلکہ اس کے بے شمار اسباب تھے اور عام طور پر جیسا کہ ہوتا ہے کہ دو فریق میں یا دو قوموں میں اعصابی جنگ پہلے سے جاری رہتی ہے اور کوئی ایک قوی سبب میدان جنگ میں اترنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ بنونضیر سے جو معاملہ کیا گیا وہ ایک سازش کے نتیجہ میں تھا مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بنو عامر کے دو مقتولین[1] کے دیت کا ان سے مشورہ یا مطالبہ بھی صحیح تھا اس لئے کہ معاہدہ کی رو سے آپ کو ان سے اس معاملہ میں گفتگو کرنے کا پورا حق تھا معاہدہ کی دفعات ۲۵، ۳۷، ۳۸، ۴۳، ۴۵ ملاحظہ ہوں۔

دفعہ ۲۵۔ بنی عوف کے یہودی مومنین کے ساتھ ایک سیاسی وحدت یا امت تسلیم کئے جاتے ہیں۔

〃 ۳۷۔ اور جو کوئی اس دستور والوں سے جنگ کرے تو ان میں (یہودی اور مسلمانوں) باہم امداد عمل میں آئے گی اور ان کے درمیان حسن مشورہ اور بہی خواہی ہوگی اور وفا شعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی۔

〃 ۴۵۔ اگر ان کو کسی صلح کے معاملہ میں مدعو کیا جائے تو وہ بھی صلح کریں گے اور اس میں شریک رہیں گے۔

معاہدہ کی مذکورہ بالا دفعات کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ان سے دیت میں شرکت کے لئے فرمانا حق بجانب تھا۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ آپنے بھائی چارہ کے طور پر دیت کے سلسلہ میں ان سے مشورہ کیا تھا کہ اتنی بڑی ذمہ داری کیسے ادا کیجائے اسلئے کہ نہ تو مسلمان ابھی اس پوزیشن میں تھے کہ دیت ادا کرسکیں اور نہ بیت المال میں اس کی گنجائش تھی اگر یہ رائے مان لی جائے تو پھر بات اور صاف ہو جاتی ہے۔ حضرت سید صاحب نے بھی حاشیہ میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔

---

[1] ڈاکٹر صاحب نے ان مقتولین کو مسلمان سمجھا ہے مگر ان کا مسلمان ہونا کسی روایت سے ثابت نہیں ہوتا بلکہ تمام روایتوں میں وکان مع العامریین عقد من رسول اللہ وجوار ان دونوں عامریوں کے پناہ کا ایک معاہدہ آپ نے فرمایا تھا۔ (ابن ہشام۔ البدایہ والنہایہ)

دورِ حاضر میں

اسلامی اقدار کی معنویت

(جناب غلام رسول ملک صاحب لکچرر شعبۂ انگریزی کشمیر یونیورسٹی)

۳-۶ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی میں جو سنجیدہ مضمون پڑھے گئے ان میں متوازن دینی احساسات پر یہ مضمون بھی تھا، یہ ایک ایسے جدید تعلیم یافتہ نوجوان کا مضمون ہے جو گفتار کے ساتھ کردار کا بھی حامل ہے۔ (مرتب)

موضوع بحث پر کلام کرنے سے پہلے یہ توضیح ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جب اسلامی اقدار کے تعلق سے بات کی جائے تو زمانے کی قدیم و جدید میں تقسیم بے معنی ہے، وقت کی رفتار کیساتھ ساتھ انسانی زندگی میں جو تغیرات رونما ہوتے ہیں ان کا تعلق زندگی کے اساسی اصول و اقدار سے نہیں بلکہ مظاہر سے ہوتا ہے۔ اس زاویۂ نگاہ سے جب ہم زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو اس کے دو پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک اس کا فنی اور تکنیکی پہلو ہے اور دوسرا اس کا اخلاقی پہلو عملی زندگی میں فنی اور تکنیکی پہلو ہمیشہ اخلاقی پہلو کے تابع ہوتا ہے، اور زندگی ایک نامیاتی کل (organic whole) کی طرح معاملہ کرتی ہے۔ انسانی زندگی میں جو تغیر و تبدل ہوتا ہے اس کا تعلق زندگی کے فنی اور تکنیکی پہلو کے ساتھ ہوتا ہے، اخلاقی پہلو کے بنیادی اصول غیر متبدل اور ناقابل تغیر ہیں اگرچہ اس اصولوں کے اطلاق و انطباق کی صورتیں زمانے کی تبدیلی کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں۔

انسان کے ہر عمل اور اس کی ہر سرگرمی میں یہ دونوں پہلو بین طور پر متمیز نظر آتے ہیں۔

ایک تاجر کی تجارت کا فنی پہلو یہ ہے کہ اموالِ تجارت کہاں اور کیسے خریدے جائیں اور انھیں اچھے سے اچھے منافع پر زیادہ سے زیادہ مقدار میں کیسے فروخت کیا جائے؟ بازار میں کس چیز کی مانگ ہے اور وہ کہاں سے آسانی سے دستیاب ہو سکتی ہے؟ اور اس کا اخلاقی پہلو یہ ہے کہ خرید و فروخت میں کن اصولوں پر عمل کیا جائے؟ کیا چیز جائز ہے اور کیا چیز ناجائز ہے؟ فاضل روپیہ کس طرح اور کن مدوں میں صرف کیا جائے اور تاجر پر خریدار اور سوسائٹی کی طرف سے کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں؟ اس کے اور سماج کے باہمی حقوق و فرائض میں کس طرح توازن قائم کیا جائے؟ ایک کسان کے پیشے کا فنی پہلو یہ ہے کہ پیداوار میں کس طرح اضافہ کیا جائے اور کام کو کس طرح زیادہ سے زیادہ آسان اور فائدہ بخش بنایا جائے جبکہ اس کا اخلاقی پہلو یہ ہے کہ فاضل پیداوار کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ ہمسایہ کی زمین کے ساتھ کیا کیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح ایک سائنسدان اور ایک عالم اور فلسفی کے کام کا فنی پہلو سائنسی ایجادات و اکتشافات اور علم و فکر کو آگے بڑھانے سے تعلق رکھتا ہے جبکہ اس کا اخلاقی پہلو یہ ہے کہ ان پر سوسائٹی اور نوعِ انسانی کی طرف سے کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور انھیں کس حد تک پورا کرتے ہیں؟ یہی حال انسانی زندگی کے ساتھ تعلق رکھنے والے ہر معاملے کا ہے۔

ان میں سے فنی اور تکنیکی پہلو کا تعلق انسان کی عقل و فکر کے ساتھ ہے۔ انسان کو عقل و فکر کے ہتھیاروں سے آراستہ کر کے اور ایک مالامال دنیا اس کے تصرف میں دے کر اللہ تعالیٰ نے اسے اس میدان میں آزاد چھوڑ دیا ہے۔ پھر چونکہ ان امور کا تعلق زندگی کے مابعد الطبیعی پہلو سے نہیں بلکہ طبیعی پہلو سے ہے اس لئے اس میں انسان کی راہنمائی کے لئے اس کی عقل کافی ہے اور وہ باہر کی کسی رہنمائی کا محتاج نہیں۔ اس کے برعکس انسان کے اخلاقی پہلو کا بنیادی سوال ہی یہ ہے کہ اخلاق کے پیچھے کون سی قوت نافذہ ہو؟ انسانی ضمیر اور طبیعت کو اخلاقی بندشیں قبول کرنے پر کس طرح آمادہ کیا جائے؟ فرد اور سماج کے باہمی حقوق و فرائض میں کس طرح توازن قائم کیا جائے اور جزا و سزا اور ثواب و عقاب کا کون سا تصور انسانی اعمال کی صحیح بنیاد قرار پا سکتا ہے؟ ان تمام امور کا تعلق مابعد الطبیعات سے ہے جو انسانی عقل کی دسترس سے باہر ہے۔ ان امور کے بارے میں اس وقت تک کوئی صحیح رائے قائم ہی نہیں کی جا سکتی جب تک انسان کی نظر کائنات

کی عمیق پیچیدگیوں اور تاریخ کے وسیع سفر پر محیط نہ ہو۔ پھر ان امور پر سوچنے اور ان کے بارے میں لائحہ عمل مرتب کرتے وقت انسان بہت سے ذاتی، نسلی، موروثی، قومی اور دوسرے عوامل سے متاثر ہوتا ہے جس کی وجہ سے حقیقت تک رسائی حاصل کرنے میں اسے ناکامی ہوتی ہے۔ اس راہ میں وحی الٰہی کی رہنمائی کے بغیر اس کا ایک قدم بھی صحیح رخ پر نہیں جا سکتا۔ انسان کے اسی پہلو میں اس کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے ابتدائے آفرینش آدم سے لے کر آخر نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک بہت سے انبیاء مبعوث فرمائے اور اس لئے مبعوث فرمائے کہ اس رہنمائی کے بغیر انسان ہدایت یافتہ اور جزا و سزا کا مستحق نہیں ہو سکتا اور اس رہنمائی کے بعد اس کے پاس ہدایت قبول نہ کرنے کی کھلی حجت باقی نہیں رہتی۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ ۔	یہ سارے رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر مبعوث کئے گئے تاکہ ان کی بعثت کے بعد لوگوں کے پاس
(النساء)	اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت باقی نہ رہے۔

چونکہ وحی الٰہی کا اصل مقصد زندگی کے اخلاقی پہلو میں انسان کی رہنمائی کرنا ہے اس لئے شرائع الٰہیہ نے کبھی یہ نہیں سکھایا کہ تجارت کے لئے کونسے طریقے موزوں ہیں اور صنعتی پیداوار کے لئے کونسی مشینیں زیادہ کارآمد ہیں؟ زمین کی پیداوار کس طرح بڑھائی جائے اور سیاروں و ستاروں کو کس طرح مسخر کیا جائے؟ الہامی کتابیں صنعت و حرفت اور جغرافیہ اور علم نجوم کی کتابیں نہیں بلکہ انسان کی روحانی اور اخلاقی زندگی میں اس کی رہنمائی کے وسائل ہیں۔ سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا مشہور واقعہ ہے کہ جب آپ مدینہ تشریف لائے تو دیکھا کہ انصار میں کھجور کے درختوں میں پیوند لگانے کا رواج ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر درختوں کو بغیر پیوند کے رہنے دیا جاتا تو شاید پیداوار زیادہ ہوتی۔ انصار جو ہر ادائے نبوی پر مر مٹنے کے لئے تیار ہوتے تھے فوراً تعمیل حکم کے لئے تیار ہو گئے اور پیوندکاری ترک کر دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فصل میں کمی واقع ہوئی۔ انصار نے حضور سے استفسار فرمایا تو آپ نے ارشاد فرمایا انتم اعلم بامور دنیاکم — تم اپنے دنیوی معاملات بہتر جانتے ہو۔

ظاہر ہے کہ اس امر کا تعلق فن کاشتکاری سے ہے جسے اللہ تبارک و تعالیٰ نے انسانی عقل پر چھوڑ دیا ہے اسی طرح فن جنگ کے سلسلے میں حضور نے دوسروں کے مشورے قبول فرمائے چنانچہ غزوہ احزاب

حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورے پر خندق کھودنے کا فیصلہ فرمایا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام نے انسانی زندگی کے اخلاقی پہلو روحانی پہلو کے لئے تشریع کی ہے۔ فن اور تکنیک بجائے خود مفید ہے نہ مضر اس کی افادیت اور مضرت کا انحصار استعمال کرنے والے کے اخلاقی رویہ پر ہے اور جب انسان کا اخلاقی رویہ درست ہو جائے تو فن اور تکنیک کا استعمال خود بخود صحیح ہو جاتا ہے۔

اس بحث سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام نے انسانی زندگی کے لئے جو قدریں فراہم کی ہیں وہ اضافی (Relative) نہیں بلکہ عالمگیر اور اطلاقی (Absolute) نوعیت کی ہیں۔ قدروں کا اضافی تصور غیر اسلامی اقدار کے لئے تو صحیح ہو سکتا ہے جن کی تعین وقت کے مختلف سیاسی معاشرتی اور معاشی عوامل سے ہوتی ہے اور ان عوامل کے بدلنے کے ساتھ ہی جن کی مناسبت و موزونیت (Validity) اور افادیت و قدر و قیمت ختم ہو جاتی ہے لیکن اسلامی اقدار پر اس تصور کا اطلاق بالکل غلط اور گمراہ کن ہے۔ یہ قدریں زندگی کے اس اساسی پہلو سے تعلق رکھتی ہیں جو زمان و مکان کی حدبندیوں سے بالکل بالاتر ہے اس لئے انھیں وقت اور مقام سے وابستہ کرکے اضافی قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اقبال نے حیات کے اسی اساسی پہلو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک

دلیل کم نظری قصۂ جدید و قدیم

ظاہر ہے کہ تمدن کے ابتدائی مراحل میں انسان کو جن اخلاقی مسائل کا سامنا تھا ان سے آج بھی اس کو سابقہ ہے۔ زندگی بیشک وسیع الاطراف اور پیچیدہ ہو گئی ہے مگر اخلاقی مسائل کی ماہیت بھی ذرہ برابر تغیر واقع نہیں ہوا ہے۔ انسان اگر کرہ ارضی سے اٹھ کر کسی اور سیارے پر بھی بود و باش اختیار کرے تو اس کی اجتماعی زندگی اس کے لئے وہاں بھی وہی مسائل پیدا کرے گی جو کرہ ارضی پر موجود ہیں اور وہاں بھی وہ ان کے حل کے لئے اسی طرح رہنمائی کا محتاج ہوگا جس طرح یہاں ہے۔

اس ضروری توضیح کے بعد میں اسلامی نظام اقدار کی اہم اور اساسی دفعات کا مختصر تذکرہ کروں گا ورنہ اس پر تفصیلی بحث تو اس کے لئے ایک مختصر مضمون کافی نہیں ہو سکتا۔

اسلام کی دائمی اور عالمگیر اقدار میں سب سے اہم مقام رضائے الٰہی کو حاصل ہے اور ہونا بھی چاہئے۔ یہ اسلام کے تمام اصول اور اقدار کے لئے اصل الاصول کا حکم رکھتی ہے۔ اسلام کی نگاہ میں یہ وہ قدر اور پیمانہ ہے جس سے انسان کے ہر عمل اس کی ہر حرکت اور اس کے ہر ارادے کو ناپا جانا چاہئے۔ یہ وہ محرک ہے جو ہر عمل انسانی کو حقیقی معنوں میں مفید اور بامعنی بناتا ہے۔ اس محرک کی عدم موجودگی میں انسان کا ہر عمل بے معنی اور بے فائدہ بلکہ الٹا مضرت رساں ثابت ہوتا ہے اس کے بغیر دعوت و تبلیغ، اشاعت علم دین انفاق فی سبیل اللہ ہجرت، جہاد اور شہادت جیسے بلند پایہ اعمال بھی ضائع ہو جاتے ہیں فمن کانت ھجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی ما ھاجر الیہ[1] (بخاری و مسلم عن عمر بن الخطابؓ) اور اس کے ہوتے ہوئے تھوڑے سے سرمایۂ عمل سے بھی بیڑا پار ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے صالح اور محبوب بندوں کا ذکر کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِينًا وَّيَتِيمًا وَّاَسِيرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُورًا ۔ (الدھر)	اور وہ اللہ کی محبت کے لئے مسکینوں، یتیموں اور قیدیوں کو کھلاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ ہم محض اللہ کے لئے تم کو کھلاتے ہیں اور تم سے نہ کوئی جزا چاہتے ہیں نہ شکریہ۔

یہ قدر جب خیر و شر کا معیار اور انسانی اعمال کے ناپنے کا پیمانہ بن جاتی ہے تو لازماً بے غرض بے لوث اور مخلص افراد وجود میں آتے ہیں اور پھر جب وہ مل کر ایک معاشرہ بناتے ہیں تو اس میں خلوص و بے غرضی اور محبت و ہمدردی کی حیات بخش ہوائیں چلنے لگتی ہیں اور چمن انسانی ایک ایسی بہار سے ہمکنار ہوتا ہے جہاں ہر فرد دوسرے افراد کو اپنے اوپر ترجیح دیتا ہے۔ جہاں میدان جنگ میں زخموں سے چور ایک جاں بلب زخمی دوسرے زخمی کو پیاس کو اپنی پیاس پر ترجیح دیتا ہے اور پانی پلانے والے سے کہتا ہے کہ وہ پہلے اسی کو پانی پلائے اور دوسرا زخمی ایک تیسرے زخمی کو اپنے اوپر ترجیح دیتا ہے اور یہ سلسلہ بڑھتا ہی جاتا ہے یہاں تک کہ تمام تشنہ لب بغیر پانی پئے جام شہادت نوش فرماتے ہیں، جہاں ایک صاحب خانہ خود اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو بغیر کھلائے پلائے سلا دیتا ہے اور

---

[1] جس شخص کی ہجرت خدا اور رسول کی طرف ہوگی تو اس کی ہجرت خدا اور رسول ہی کی طرف متصور ہوگی لیکن جس شخص کی ہجرت دنیا حاصل کرنے کیلئے یا کسی عورت سے شادی کرنے کی خاطر ہو تو اس کی ہجرت اپنی مقاصد کیلئے ہوگی۔

سارا کھانا مہمان کو کھلا دیتا ہے

ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ۔ | اور وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ حالانکہ وہ خود تنگ دست ہوتے ہیں۔

آج کی دنیا نے اخلاق کی اس اساسی قدر سے منہ موڑ لیا ہے اور نتیجہ یہ ہے کہ خلوص مفقود ہے، محبت عنقا ہے، ہمدردی غائب ہے چند ٹکوں کے عوض انسان کا خون بہایا جاتا ہے اور آئے دن ایسے واقعات سامنے آتے ہیں کہ باپ بیٹے سے بھائی بھائی سے دور شوہر بیوی سے حقیر مادی فوائد کے لئے دست وگریباں ہے۔

اسلامی نظام اقدار میں رضاء الٰہی کے بعد دوسرا اہم درجہ تصور آخرت کو حاصل ہے، یہ وہ پیمانہ ہے جس سے دنیوی زندگی کو پرکھا اور جانچا جانا چاہئے۔ دنیا کی زندگی کا رخ اگر آخرت کی جانب ہو تو یہ بامقصد ہے ورنہ لایعنی اور بے مقصد ہے۔ دنیوی زندگی آخرت کے مقابلے میں ہیچ ہے، دھوکے کا سامان اور لہو ولعب ہے۔

وما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع الغرور۔ | اور دنیا کی زندگی محض دھوکے کا سامان ہے۔

(آل عمران)

ما ھذہ الحیوۃ الدنیا الا لھو ولعب ولدار الاخرۃ لھی الحیوان۔ | یہ دنیا کی زندگی محض لہو ولعب ہے اور اصلی زندگی کا گھر آخرت ہے۔

(العنکبوت)

ایک نیک عمل صرف اسی صورت میں نتیجہ خیز ثابت ہو سکتا ہے جب اسے فلاح آخرت کے نقطۂ نگاہ سے انجام دیا جائے ورنہ اس کا کوئی وزن نہیں۔ دنیوی زندگی صرف اسی صورت میں قدر وقیمت کی حامل ہو سکتی ہے جب یہ مائل بہ آخرت (Akhirat Oriented) ہو ورنہ یہ گھاٹے اور خسران کا سودا ہے۔

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَلِقَاءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ (الاعراف) | اور جن لوگوں نے ہماری آیات اور آخرت کی ملاقات کو جھٹلایا ان کے اعمال ضائع ہو گئے۔

هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا اَلَّذِيْنَ | کیا ہم تمہیں ان لوگوں کے بارے میں بتائیں کہ جن کے

ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ

(الکہف)

اعمال سب سے زیادہ ٹوٹے میں ہیں یہ وہ لوگ ہیں جن کی کوششیں دنیا ہی میں رائگاں ہو گئیں اور وہ یہ سمجھتے رہے کہ بہت اچھے جا رہے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کی آیات اور اس کے ساتھ ملاقات کو جھوٹ سمجھتے ہیں۔ اس لئے ان کے اعمال ضائع ہو گئے۔

تمام انبیاء کی دعوت کا لب لباب یہی تھا کہ انسان کے اندر ترجیح آخرت بر دنیا کا جذبہ پیدا ہو۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرَاهِيْمَ وَمُوْسٰى ۔ (الاعلیٰ)

تم لوگ حیات دنیا کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت بہتر بھی ہے اور پائدار بھی۔ یہ تعلیم گذشتہ انبیاء کی کتابوں میں موجود ہے۔ ابراہیم اور موسیٰ کے صحائف میں۔

آخرت کی اسی اہمیت کے پیش نظر حضور فداہ امی وابی کی زبان پر مبارک پر اکثر یہ دعا جاری رہتی تھی کہ

اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْاٰخِرَةِ ۝

اے اللہ! زندگی تو بس آخرت کی زندگی ہے۔ اور یہی

اور یہی حقیقت آپ پیرائے بدل بدل کر اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ذہن نشین کرتے تھے۔ کبھی فرمایا کہ دنیا میں اس طرح رہو جیسے پردیسی یا مسافر رہتا ہے کن فی الدنیا کانک غریب او عابر السبیل (بخاری عن عبد اللہ بن عمرؓ) کبھی ارشاد فرمایا کہ الدنیا سجن المومن وجنۃ الکافر (مسلم عن ابی ھریرہ) یعنی دنیا مومن کے لئے قید خانہ اور کافر کے لئے جنت ہے۔ کبھی فرمایا کہ آخرت کی ابدی اور پائدار زندگی کے مقابلے میں دنیوی زندگی کی حیثیت وہی ہے جو سمندر کے مقابلے میں پانی کی اس مقدار کی ہے جو سمندر میں انگلی ڈبونے سے انگلی میں لگ جائے وَاللّٰهِ مَا الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مِثْلُ مَا يَجْعَلُ اَحَدُكُمْ اِصْبَعَهٗ فِي الْيَمِّ فَلْيَنْظُرْ بِمَ يَرْجِعُ (مسلم عن مستورد بن شداد)

راستے میں اصحاب کے ساتھ گذر رہے ہیں کہ ایک مردہ بوچے بکری کے بچے پر نظر پڑتی ہے۔ ساتھیوں سے استفسار کرتے ہیں کہ آپ میں سے کون اسے بچے کو ایک درہم میں خریدنا پسند کرے گا۔ اصحاب عرض کرتے ہیں کہ حضور ہم تو اسے کسی بھی قیمت پر لینے کے لئے تیار نہیں ہوں گے تو ارشاد ہوتا ہے کہ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی اس سے زیادہ نجس اور حقیر ہے (مسلم عن جابرؓ) دانائی اللہ

حماقت کی یہ تعریف قرار پاتی ہے کہ جو شخص نفس پر قابو پانے کرکے آخرت کے لئے عمل کرتا ہے وہ دانا ہے اور نادان وہ ہے جس کے مساعی نفس اور دنیا کے لئے محدود رہیں اور وہ جھوٹی امید پر جیتا رہے۔ اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْعَاجِزُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ (ترمذی۔ ابن ماجہ عن شداد بن اوس)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تعلیم و تربیت کے نتیجے میں پاکیزہ سیرت انسانوں کو جو مثالی جماعت قرون اولیٰ میں تیار ہوئی تھی اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا رُخ آخرت کی جانب تھا وہ ہر قدم اٹھانے سے پہلے اور ہر ارادہ کرنے سے پہلے یہ سوچتے تھے کہ آخرت میں اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا آخرت کا تصور ان کے طرز عمل اور انداز فکر پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کے تحت الشعور کا جزو بن گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی محفلوں میں دنیا سے زیادہ آخرت کا ذکر ہوتا تھا اور وہ اپنے ہر عمل کو اسی پیمانے سے ناپتے تھے۔ آخرت کے اسی تصور کا نتیجہ تھا کہ امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے آپ کو راتوں کی نیند سے محروم کر دیا تھا اور وہ رعایا کی خبرگیری کے لئے گلی گلی اور کوچے کوچے میں پھرتے تھے۔ آخرت کے اسی تصور نے ایک دودھ بیچنے والی لڑکی کے اندر ضمیر کی ایسی بیداری پیدا کی تھی کہ وہ رات کے اندھیرے میں بھی دودھ میں پانی ملانے کے لئے تیار نہیں ہوتی تھی۔ یہی تصور تھا جس نے اسلامی حکمرانوں کو اپنی مسلم اور غیر مسلم رعایا کے لئے اتنا ہی شفیق و رحیم بنایا تھا جتنا ایک باپ بچے کے لئے ہوتا ہے، اسی تصور نے ان کے لئے دنیا ہیچ اور متاع دنیا کے لئے ناجائز ذرائع کا استعمال بالکل ناقابل تصور بنا دیا تھا۔

آج دنیا انسان کا واحد منتہائے مقصود اور مطمع نظر ہے اور نتیجہ ظاہر ہے۔ دنیوی خوشحالی کے لئے بددیانتی، رشوت خوری، لوٹ کھسوٹ، ملاوٹ (حتیٰ کہ دوائیوں تک میں ملاوٹ) دھوکہ بلکہ قتل و خونریزی تک جائز ہوگئی ہے اور دنیوی برتری کے لئے ایک قوم دوسری قوم کا گلا کاٹنے کے لئے چڑھ دوڑتی ہے۔ ایک ملک دوسرے ممالک کو ہڑپ کرنا حق بجانب سمجھتا ہے اور انسانوں کا خون پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ آج بھی اگر جائز و ناجائز کے پیمانوں کو توڑ کر اسلام کا دیا ہوا معیار خیر و شر قبول کر لیا جائے تو انسانیت کی کھیتی پھر سے لہلہا اٹھے گی اس لئے کہ اسلامی نظام اقدار کی بنیاد ہی اس تصور پر ہے کہ انسان فطرتاً برا نہیں ہے۔ اسے بہترین صلاحیتوں کے ساتھ پاکیزہ

مقاصد کے لئے وجود میں لایا گیا ہے لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ٥ وہ حیوان یا درندہ نہیں ہے کہ اس کے معاشرے میں عدل قائم کرنے کے لئے اشتراکی صفت بمین جھپٹ کا ہنگامہ گرم کیا جائے۔ اس کی اخلاقی حس بیدار ہو اور صحیح خطوط پر اس کی تربیت ہو تو وہ فیاضی، عالی ظرفی سخاوت اور مقاصد اعلیٰ کے لئے قربانی کی مثالیں اب بھی قائم کر سکتا ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ ترجیح آخرت پر دنیا کی جو قدر اسلام نے ہمیں دی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلام ہمیں دنیا سے کنارہ کشی کی تعلیم دیتا ہے۔ مذاہب عالم میں اسلام کا طرۂ امتیاز ہی یہ ہے کہ اس نے دنیا کو صحیح طور پر برتنے کی تعلیم دی ہے اور رہبانیت کو کفر اور گمراہی قرار دیا ہے لیکن بہت بڑا فرق ہے دنیا برتنے میں اور اس بات میں کہ دنیا ہی انسان کو برتے۔ اسلام ہم سے یہ کہتا ہے کہ دنیا تمھارے لئے بنائی گئی ہے تم اس کو اس طرح برتو کہ اس سے تمھاری آخرت سنور جائے لیکن خبردار کہیں دنیا تم پر مسلط نہ ہو جائے اس لئے کہ تم دنیا کے لئے نہیں بنائے گئے ہو۔ دنیا کی زندگی تمھارے امکانات بروئے کار لانے کے لئے اور تمھارے روحانی ارتقا کے لئے ضروری ہے مگر اگر یہ تم پر مسلط ہو گئی تو تم پستی کے اسفل السافلین میں گر کر تباہ ہو جاؤ گے۔ قرآن کا ارشاد ہے:

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ٥ (البقرہ)	لوگو! زمین میں جو کچھ حلال اور پاک ہے اس میں سے کھاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو کہ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔
قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ٥ (الاعراف)	کہو اللہ نے بندوں کے لئے جو زینت نکالی ہے اور رزق کی پاک چیزیں انھیں کون حرام کر سکتا ہے۔

اسلامی نقطۂ نگاہ سے دنیا نہ تو دارالعذاب ہے کہ جس سے چھٹکارا پانے کی کوشش کی جائے نہ کوئی تفریح گاہ ہے کہ جہاں انسان اپنی مہلت عمل خرمستیوں میں صرف کرے۔ یہ نہ تو بیہودہ اور عبث کارخانہ ہے نہ کھیل اور لیلا بلکہ انسان کے روحانی ارتقاء کے لئے ایک ناگزیر ذریعہ (Medium) ہے بشرطیکہ آدمی اس پر قابو حاصل کرے اور اسے اپنے اوپر مسلط ہونے کی اجازت نہ دے۔

دنیا کی زندگی اور اس کی ذمہ داریاں قبول کرنے سے ہی اسلامی نظام کی اس اہم قدر کا بھی تعلق ہے کہ جسے ہم عبادت الٰہی بواسطۂ خدمت خلق کا نام دوں گا اسلامی عبادات کی اسپرٹ یہ ہے کہ یہ فرد کو نوع انسانی کی خدمت کے لئے تیار کرتی ہیں۔ ان عبادات میں کچھ تو ایسی ہیں جو فرد کے اندر روحانی پاکیزگی اور تقوے کی اسپرٹ پیدا کرتی ہیں جس کا مظاہرہ دوسرے افراد انسانی کے ساتھ اس کے تعلقات میں ہوتا ہے اور کچھ ایسی ہیں جو ان مقاصد کے ساتھ ساتھ بلا واسطہ طور پر خدمت خلق کو واجب ٹھہراتی ہیں اور جن میں خدمت خلق ہی وہ عبادت قرار دی گئی ہے جس سے انسان اپنے نفس کا تزکیہ اور اپنے رب کی رضا حاصل کر سکتا ہے۔ زکوٰۃ سے جہاں حب مال فنا ہوتا ہے اور تزکیہ و تصفیہ قلب ہوتا ہے وہیں بندگان خدا کی مالی مدد بھی ہوتی ہے اور معاشرے میں معاشی عدل بھی قائم ہوتا ہے۔ صدقۂ فطر اور قربانی ایسی عبادات ہیں جن سے خدمت خلق کے ذریعے تقرب الٰہی حاصل ہوتا ہے۔ قرآن نے ان لوگوں کی مصطلح عبادات کو بھی نہ صرف یہ کہ بے کار بلکہ باعث ہلاکت قرار دیا ہے جو خدمت خلق کا جذبہ نہ رکھتے ہوں:

اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُکَذِّبُ بِالدِّیْنِ فَذٰلِکَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الْمِسْکِیْنِ فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ یُرَآءُوْنَ وَیَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝

کیا تو نے اس شخص کی حالت پر غور کیا جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے۔ وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر نہیں ابھارتا۔ افسوس ان نمازیوں پر جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے ہیں جو نیک کام بھی کرتے ہیں تو دکھاوے کے لئے کرتے ہیں اور جو دوسروں کو چھوٹی چھوٹی چیزیں دینے سے بھی دریغ کرتے ہیں۔

اس اسپرٹ کی بہترین تعبیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک ہے:

اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰہِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللّٰہِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰی عِیَالِہٖ۔

(بیہقی فی کتاب الایمان)

ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ سب سے زیادہ اس شخص سے محبت کرتا ہے جو اس کے عیال کے لئے اچھا ہو۔

اور اسی کی تفسیر وہ حدیث قدسی پیش کرتی ہے جس میں وارد ہوا ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ایک انسان سے کہے گا کہ میں بیمار ہوا تھا مگر تو نے میری عیادت نہیں کی۔ بندہ عرض کرے گا

کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے تو تو رب العالمین ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تھا تو اگر اس کی عیادت کو جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے تجھ سے کھانا مانگا تھا لیکن تو نے نہیں دیا۔ بندہ پھر عرض کرے گا تو تو پروردگار ہے تجھے بھوک کیسے لگ سکتی ہے؟ ارشاد ہوگا کیا تجھ سے میرے فلاں بھوکے بندے نے کھانا نہیں مانگا تھا تو اگر اسے کھلاتا تو اسے میرے پاس موجود پاتا۔ اسی طرح اللہ کہے گا اے بندے میں نے تجھ سے پانی مانگا تھا۔ بندہ پھر حیرت سے پوچھے گا اے پروردگار تجھے پیاس کیسے لگ سکتی ہے؟ ارشاد ہوگا کیا میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی نہیں مانگا تھا، تو اگر اسے پانی پلاتا تو اسے میرے پاس موجود پاتا۔

اسی بلند پایہ اور انسانیت نواز تعلیم نے مسلمانوں کو انسانیت کا نگہبان اور محافظ بنایا تھا جبکہ ان اقدار سے بغاوت آج افراد و اقوام کو بھیڑیوں میں تبدیل کر دیا ہے۔

اسلامی نظام اقدار کی ایک اہم وقعہ فرد کی کلیدی اہمیت اور اس کے وقار اور عزت نفس کا تحفظ ہے۔ شرائع الہیہ کا اصل خطاب فرد سے رہا ہے اور ان کا منتہائے مقصود ان کا تصفیہ و تزکیہ ہے اس لئے کہ فرد معاشرے کی بنیادی اکائی ہے اور اگر بنیادی اکائی ہی خراب ہو تو صالح معاشرہ کبھی وجود میں نہیں آ سکتا۔ اسی بنا پر ہر انسان کو آپ اپنے عمل کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔

وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ إِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۔ (الانعام)

ہر نفس جو کچھ کماتا ہے اس کا بوجھ اسی پر ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی اور کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔ اور آخرت میں ہر انسان سے فرداً فرداً بازپرس ہوگی۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۔ (الانعام)

تم ہمارے پاس اکیلے آئے ہو جیسا ہم نے تمہیں پہلی دفعہ اکیلا پیدا کیا تھا۔

اسلامی معاشرے کی تشکیل و تنظیم اور فرد و سماج کے باہمی تعلق میں فرد کی اس کلیدی اہمیت کی مکمل رعایت رکھی گئی ہے۔ سماج کا اصل مقصد ایک ایسے مثالی ماحول کا قیام ہے کہ جس میں افراد کے درمیان نیکیوں میں مسابقت کا جذبہ پیدا ہو جائے اور برائیوں کو پنپنے کا موقع نہ ملے ایک ایسے ماحول کا قیام جس کی ایک نظیر تاریخ قرون اولیٰ میں دیکھ چکی ہے۔ معاشرتی زندگی کے ہر پہلو میں فرد کے وقار اور اس کی آزادی کے تحفظ کی ضمانت فراہم کی گئی ہے۔ سیاسی زندگی میں فرد پر صرف

یعنی نیکی اور خیر کے کاموں میں حکام کی اطاعت لازم قرار دی گئی ہے۔ اور آزادی کے اس شعور کا اعلان کیا گیا ہے کہ لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق یعنی مخلوق کی ایسی اطاعت جس سے خالق کی نافرمانی ہوتی ہو جائز نہیں۔ سماج کے ادنیٰ ترین فرد کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ سربراہ مملکت کو برملا ٹوکے۔ اس کی غلطیاں اس پر واضح کرے اور اس کو غلط راہ پر جانے سے روک دے۔ غیر مسلم رعایا کو اپنے شخصی قانون (Personal law) کے معاملات میں مکمل آزادی دی گئی ہے اور اس آزادی کے تحفظ کے لئے حکومت اسلامیہ کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔

اقتصادی حیثیت سے استحصال اور ناجائز نفع اندوزی کے طریقوں مثلاً سود، جوا، لاٹری سٹہ، احتکار وغیرہ کو حرام قرار دے کر ایک فرد کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ اس میدان میں جتنا آگے بڑھ سکے بڑھ جائے مگر زکوٰۃ اور صدقات کی صورت میں بندگان خدا کے حقوق ادا کرتے رہے معاشرتی سطح پر ایسے مخرب اخلاق اعمال جن سے معاشرے پر عیش پرستی اور شہوانیت کے دورے پڑتے ہیں مثلاً شراب خوری اور بے پردگی کو حرام قرار دے کر فرد کو مکمل آزادی بخش دی گئی ہے۔ اسلام اس احمقانہ تصور کو رد کر دیتا ہے کہ فرد کو قربان کر کے معاشرے کی فلاح کا سامان کیا جائے اس لئے کہ فرد ہی اگر نہ ہوتا تو معاشرہ چہ معنی دارد؟ وہ فرد کی بے قید آزادی پر بھی اسی لئے پابندیاں عائد کرتا ہے تاکہ اس سے ایسا معاشرتی فساد رونما نہ ہو جس سے بالآخر فرد کی تباہی لازم آئے۔

اس مختصر مضمون میں جن نمایاں ترین اسلامی اقدار کا اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے ان کے آخر میں ارتباط وسیلہ و مقصد کی قدر کا ذکر کروں گا۔ یہ بھی اسلام کا ایک طرۂ امتیاز ہے کہ اس نے مقصد اور ذریعہ دونوں کے پاک اور جائز ہونے کو لازم قرار دیا ہے۔ یوں کہنے کو تو یہ آسان سی بات ہے اور بہت سے نظام ہائے فکر و عمل اس کا دعویٰ بھی کرتے ہیں مگر حق یہ ہے کہ اس بلند و بالا اصول پر اسلام کے بغیر کسی اور نظام نے عمل کر کے نہیں دکھایا ہے۔ اس اصول کا مطلب یہ ہے کہ جائز اور پاک مقصد کو کبھی ناجائز اور ناپاک وسائل اختیار کر کے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ مقصد کی پاکی و بلندی ہر جائز و ناجائز ذریعہ کا جواز نہیں بن سکتی اس لئے کہ اس طرح سے مقصد کا حصول ہی ناممکن ہے۔ اسلام نے کسی بھی حالت میں حق و صداقت اور عدل و انصاف کے اصول سے

انحراف جائز قرار نہیں دیا گیا ہے۔ حضرت جعفر بن ابی طالب جب مہاجرین حبشہ کے سرخیل کی حیثیت سے نجاشی کے دربار میں بلائے جاتے ہیں تو اس وقت حالت یہ ہوتی ہے کہ مکہ سے یہ لوگ نکل چکے ہیں اور خوف کے پیاسے دشمن ان کا تعاقب کرتے ہوئے حبشہ پہنچ گئے ہیں وہ حبشہ کے بادشاہ نجاشی سے ان کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ لوگ بتوں ہی کے دشمن نہیں بلکہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں بھی گستاخی روا رکھتے ہیں۔ نجاشی اس بارے میں جب مہاجرین سے سوال کرتا ہے تو حضرت جعفرؓ بغیر کسی لگی لپٹی کے حضرت عیسیٰ کے بارے میں اسلام کا یہ عقیدہ دہراتے ہیں کہ وہ اللہ کے بندے رسول تھے اور الوہیت کا ان میں کوئی شائبہ نہ تھا۔ اسلام نے اگر مداہنت کو روا رکھا ہوتا تو ایسے اضطراری موقعہ پر اس سے ضرور کام لیا جاتا۔ اسی اصول کا یہ ثمرہ ہے کہ اسلام نے بگڑے ہوئے حالات کا ناجائز فائدہ اٹھانے FISHING IN TROUBLED WATERS کا "مہذبانہ" طریقہ کبھی اختیار نہیں کیا۔ یہ آج کے فرزندان تہذیب ہی کا نرالا کارنامہ ہے کہ وہ حالات کے تعلق سے ہر حلال کو حرام اور ہر حرام کو حلال کر سکتے ہیں۔

وقت کی قدر

امام رازی نے لکھا ہے کہ کسی نے ایک برف بیچنے والے کو دیکھا کہ وہ آواز لگا رہا تھا کہ "رحم کرو اس شخص پر کہ جس کا سرمایہ گھلا جا رہا ہے، رحم کرو اس شخص پر کہ جس کا سرمایہ گھلا جا رہا ہے" اس کی بات سن کر انھوں نے کہا، "آج سورۂ العصر کی تفسیر سمجھ میں آگئی"، ان کے کہنے کا مقصد یہ تھا کہ عمر کی جو مدت انسان کو دی گئی ہے وہ برف کے گھلنے اور پگھلنے سے بھی زیادہ تیزی سے گزر رہی ہے اور انسان غفلت میں پڑا ہوا ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب کسی آدمی کو بیکار دیکھتے تو اسے درہ لگاتے اور فرماتے:

اِنِّی لَاَکْرَہُ اَنْ اَرٰی اَحَدَکُمْ سَبَھْلَلًا	میں تم میں سے کسی کو بیکار دیکھنا پسند نہیں کرتا
لَا فِی عَمَلِ الدُّنْیَا وَلَا فِی عَمَلِ الْاٰخِرَۃِ	کہ جو تو دنیا کے کام میں لگو اور نہ آخرت کے کام میں۔

ذرائع پیداوار اور ذرائع تقسیم کی ملکیت[1]

مجیب اللہ ندوی

۲۰ر تا ۲۶ر اکتوبر ۱۹۸۹ء کو اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی کی طرف سے ایک سیمینار "اسلام اور جدید دنیا" کے موضوع پر منعقد ہوا تھا۔ یہ مضمون اسی میں پڑھا گیا۔

جناب صدر اور محترم حضرات! یہ موضوع بہت وسیع ہے جس کے لئے مستقل ایک کتاب درکار ہے، اس کے سارے پہلوؤں کو ایک مقالہ میں سمیٹنا ذرا آسان نہیں ہے، مگر پھر بھی کوشش کی گئی ہے کہ اس کے ہر پہلو پر کچھ نہ کچھ روشنی ڈالی جائے اب یہ فیصلہ سامعین کر سکیں گے کہ اس میں راقم الحروف کو کتنی کامیابی ہوئی ہے۔

ذرائع پیداوار اور ذرائع تقسیم کی ملکیت کے سلسلہ میں دنیا میں اس وقت رائج دو نقطۂ نظر موجود ہیں اور انہی کے مطابق اس وقت ساری دنیا میں عمل ہو رہا ہے۔

ایک نقطۂ نظر "قومی ملکیت" کا ہے جس پر کمیونسٹ ملکوں یا ان کے زیر اثر ملکوں میں تھوڑے اختلاف کے ساتھ عمل ہو رہا ہے اور دوسرا نقطۂ نظر "سرمایہ دارانہ جمہوریت" کا ہے جس پر جمہوری ملکوں میں تھوڑے تھوڑے اختلاف کے ساتھ عمل درآمد ہو رہا ہے

قومی ملکیت کے نقطۂ نظر سے ضروری ہے کہ ملکیت اور سارے ذرائع پیداوار پر حکومت کا کنٹرول ہو، اس نقطۂ نظر کے ماننے والے انفرادی ملکیت کو سرے سے تسلیم نہیں کرتے اگر تسلیم کرتے ہیں تو بہت محدود معنی میں جس کی مثال بدن پر پہنے ہوئے لباس سے زیادہ نہیں ہے۔ جہاں اس نقطۂ نظر

---

[1] ادھر چند برسوں کے اندر دنیا کی سیاسی تبدیلیوں کے پیش نظر روس اور اس کے ہمنوا ملکوں میں زمینوں اور دوسری اشیاء کو محدود طور پر انفرادی ملکیت میں رکھنے کی اجازت دیدی گئی ہے مگر اس کا اصل فلسفہ وہی ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

کی حکومت ہے وہاں اس پر عمل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کیمونزم پر یقین رکھنے والے کہتے ہیں کہ جب تک سارے ذرائع پیداوار اور ذرائع تقسیم کو مشترکہ قومی ملکیت نہ قرار دیدیا جائے اسوقت تک نہ تو معاشی مساوات لائی جا سکتی ہے اور نہ انفرادی ملکیت کی وجہ سے جو معاشی عدم توازن غریبوں مزدوروں کا استحصال اور ان پر جو ظلم و زیادتی ہوتی ہے وہ ختم کی جا سکتی ہے۔ اس کے برخلاف جہاں سرمایہ دارانہ جمہوریت ہے وہاں انفرادی ملکیت کے لئے پوری آزادی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ قومی پیمانہ کے ذرائع پیداوار اور اس کے ذرائع تقسیم پر حکومت کا کنٹرول ہے یا اُس کی تحویل میں ہیں اور انفرادی ملکیت کے ذرائع پیداوار پر بھی کچھ پابندیاں عائد ہیں۔

قومی ملکیت کا نقطۂ نظر رکھنے والوں نے سارے ذرائع پیداوار اور ذرائع تقسیم کو قومی ملکیت اسلئے قرار دیا کہ انسان کو زیادہ سے زیادہ معاشی مساوات حاصل ہو مگر عملاً آج ۶۰ - ۶۲ برس کے تجربہ کے بعد بھی معاشی مساوات قسم کی کوئی چیز ان ملکوں میں دکھائی نہیں دیتی حتیٰ کہ اس "مزدور راج" میں مزدوروں کے معیار زندگی اور افسروں کے معیار زندگی میں کم سے کم بیس پچیس گنا فرق ضرور دکھائی دیتا ہے۔ اور ارکان حکومت اور عام مزدور کے معیار زندگی میں اس سے زیادہ فرق موجود ہے۔ قومی ملکیت کے حامی انفرادی ملکیت کے خلاف جو سب سے بڑی دلیل پیش کرتے ہیں وہ یہ کہ انفرادی ملکیت کو برقرار رکھنے میں اس استحصال کو نہیں روکا جا سکتا جو سرمایہ دار "قدر زائد" سے غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کو محروم کر کے کرتا ہے آگے ہم اس طرف اشارہ کریں گے کہ ذرائع پیداوار و تقسیم کے ذرائع کی ملکیت میں انفرادی دخل اندازی کے باوجود اسلامی شریعت اسے استحصال سے کیسے محفوظ رکھتی ہے۔ اسی طرح ان ملکوں میں جہاں سیکولر جمہوریت اور "بے قید معیشت" ہے وہاں انفرادی ملکیت کی آزادی کی وجہ سے عام ذرائع پیداوار پر افراد کا قبضہ ہے اور کچھ قومی پیمانہ کے ذرائع حکومت کی تحویل میں ہیں جیسا کہ ہمارے ملک میں بھی ہے مگر ان ملکوں میں انفرادی ملکیت کی آزادی اور بے قید معیشت کی وجہ سے ملک کے چند ہزار یا چند لاکھ افراد تو دولت سے کھیلتے ہیں اور کروڑوں بندگانِ خدا شکل سے یا تو اپنی ضروریات پوری کر پاتے ہیں یا پھر بے روزگاری کی سطح پر زندگی گزارتے ہیں، خود ہمارے ملک میں اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں نقطۂ نظر

---

[۱] تفصیل کے لئے راقم الحروف کی کتاب "اسلامی قانون اجرت" دیکھنی چاہئے۔

سے ہٹ کر اسلام نے ذرائع پیداوار اور ذرائع تقسیم کے بارے میں ایک اعتدال کا راستہ اختیار کیا ہے۔ وہ انفرادی ملکیت کی نفی نہیں کرتا بلکہ اس کی ہمت افزائی کرتا ہے مگر اسے "لاضرر و لاضرار" "نہ خود کو نقصان و تکلیف میں ڈالا جائے اور نہ دوسروں کو نقصان اور تکلیف میں مبتلا کیا جائے" کے تحت پابند کرتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ انفرادی ملکیت پر احتساب و نگرانی کے حدود و قیود کے پہرے بھی لگاتا ہے، تو می پیمانہ کے ذرائع پیداوار کو حکومت کی تحویل میں رکھنے کی وہ اجازت اس لئے دیتا ہے کہ انفرادی ملکیت کی وجہ سے معیشت اور معاشرت میں جو عدم توازن پیدا ہو سکتا ہے اسے ختم کیا جا سکے۔ وہ معاشی مساوات کا غیر فطری نعرہ نہیں لگاتا بلکہ وہ معاشی انصاف کا فلسفہ اور عملی حل پیش کرتا ہے۔

پھر وہ ذرائع پیداوار ہو یا تقسیم پیداوار ہو اس کی ملکیت کے مسئلہ اور پیدا شدہ ظلم کو وہ محض مادی نقطۂ نظر سے حل نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ اخلاقی نقطۂ نظر کو بھی سامنے رکھتا ہے، وہ معاشی انصاف کے لئے صرف قانون کا سہارا نہیں لیتا بلکہ انسان کی اخلاقی حس کو بھی بیدار کرتا ہے تاکہ جہاں قانونی گرفت نہ ہو سکے وہاں اخلاقی گرفت سے کام لیا جا سکے۔ اسلام کی اور خصوصیات کے ساتھ یہ خصوصیت بھی اس کو دوسرے معاشی نظاموں سے علیحدہ کر دیتی ہے، قانون سے بچنے کی انسان بےشمار صورتیں پیدا کر لیتا ہے مگر اخلاقی احساس قانون کی گرفت کو بھی مضبوط کرتا ہے اور کسی کام کو خوش دلی سے کرنے کا جذبہ بھی پیدا کرتا ہے، اس قانونی گرفت اور اخلاقی احساس کا ذکر آگے آ رہا ہے

ذرائع پیداوار اور ذرائع تقسیم کی ملکیت پر گفتگو کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں ملکیت کا جو تصور ہے مختصراً اس کی وضاحت کر دی جائے۔

ملکیت کے لغوی اور اصطلاحی معنی ملکیت اور ملک کے لغوی معنی کسی چیز کا پورے طور پر قبضہ اور دائرہ اختیار میں آجانا، اور فقہ کی اصطلاح میں اس کی تعریف یہ ہے، علامہ ابن ہمام نے فتح القدیر میں یہ تعریف کی ہے۔

الملك هو القدرة يثبتها الشرع ابتداءً على التصرف۔	ملکیت اس قدرت کا نام ہے جس کے ذریعہ شریعت کسی چیز میں ابتداءً کسی تصرف کا اختیار دیتی ہے۔

شیخ ابو زہرہ نے مختلف فقہا کی تعریفات کی روشنی میں ملکیت کی یہ تعریف کی ہے

اختصاص حاجز شرعاً یسوغ صاحبہ التصرف الا لمانع [1] — ملکیت تصرف کے اس مخصوص اختیار کا نام ہے جو شریعت مالک کو اس وقت تک دیتی ہے جب تک کوئی مانع پیش نہ آجائے

"اختصاص حاجز" کا مطلب یہ ہے کہ مالک کی اجازت کے بغیر دوسرا کوئی اس میں نہ تصرف کر سکے اور نہ فائدہ اٹھا سکے اور مانع کا مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسا سبب پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے اپنی ملکیت یا قبضہ کی چیز میں تصرف کا اختیار نہ ہو جیسے نابالغ بچے یا اس چیز میں کسی دوسرے کا حق شامل ہو یا شترکہ مال یا رہن رکھی ہوئی چیز یا حجر کی صورت پیدا ہو جائے۔

اس تعریف سے پہلی بات یہ واضح ہوتی ہے کہ دولت یا ذرائع دولت کے ساتھ جو منفعت وابستہ ہے اور اس سے انسان کا جو تعلق قائم ہوتا ہے اسی کا نام ملکیت ہے۔ اور اس تعلق کے حدود اور اس سے جو منافع وابستہ ہیں اس کی تعین شریعت کرتی ہے۔

اس تعریف سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی ہے کہ ملکیت کوئی مادی چیز نہیں ہے۔ بلکہ بہت سے حقوق میں سے یہ بھی ایک حق ہے اور ملکیت کا یہ حق شریعت قائم کرتی ہے یا توڑتی ہے۔ اب جہاں انسان اور مال اور سرمایہ کے درمیان یہ مخصوص تعلق شریعت قائم کرتی ہے وہاں ملکیت ثابت ہوتی ہے اور جہاں وہ اس کی نفی کرتی ہے وہاں ملکیت قائم نہیں ہوتی [2]

اوپر ملکیت کی جو تعریف فقہ اسلامی سے نقل کی گئی ہے اس سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو گئی ہوگی کہ ملکیت اور ذرائع ملکیت اور انسان کے درمیان جو حق اور منفعت کا تعلق قائم ہوتا ہے اسے اسلامی شریعت مقرر کرتی ہے اور ملکیت کی حیثیت اور اس کے حدود کی تعین بھی اسلامی شریعت ہی کرتی ہے اور اسلامی شریعت نام ہے اللہ تعالیٰ کے مجموعۂ احکام کا جس سے یہ بات خود بخود نکلتی ہے کہ خدا تعالیٰ جس طرح پوری کائنات کا خالق اور مالک ہے اسی طرح کائنات کے اندر اس نے جو ذرائع منفعت اور وسائل معاش رکھے ہیں اصلاً اس کا مالک حقیقی اور سبب اصلی وہی ہے، اس نے انسانوں کو اس سے مستفیض ہونے کا جو حق دیا ہے وہ اس کا عطا کردہ اور نیابتہ ہے اس لئے وہ انکے استعمال کے لئے کچھ فرائض اور کچھ حقوق مقرر کرتا ہے، ملکیت کا یہ تصور اس تصور سے بالکل مختلف ہے

---

[1] المدخل الفقہی العام ج اول ص ۲۲۰ المجلۃ الاحکام العدلیہ دفعہ ۱۲۵، ۱۲۶۔ [2] فقہ حنفی میں مال سرمایہ اور ملکیت میں فرق ہے اس میں ملکیت کو حق اور مال کو مادی چیز سمجھا گیا ہے اس لئے فقہائے احناف منافع کو ملک تو کہتے ہیں مگر مال نہیں کہتے

جو اشتراکی حضرات کرتے ہیں یا مغربی ماہرین قانون کرتے ہیں۔ مشہور محقق اور ماہر قانون جان آسٹن نے ملکیت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

" ملکیت " اپنے اصل مفہوم کے اعتبار سے کسی متعین شے پر ایک حق کی نشاندہی کرتی ہے جو استعمال کے اعتبار سے غیر محدود اور تصرف اور انتقال کے اعتبار سے بے قید ہے۔[۱]

اسلامی تصور ملکیت میں اور مغربی ماہرین قانون کی تعریف ملکیت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ ملکیت کو مطلق اور بے قید حق تسلیم کرتے ہیں جو حدود و قیود سے ناآشنا ہے اس کے برخلاف اسلام میں ملکیت کا تصور ایک پابند اور ذمہ دارانہ حق ہے اور وہ پابندی اور ذمہ داری خدا تعالیٰ کی طرف سے اس پر عائد ہے جس کی وجہ سے فرد اور حکومت دونوں اپنی ملکیت میں ایک ذمہ دار اور جوابدہ کی حیثیت تصرف کرتے ہیں فرد اپنی انفرادی ملکیت کے استعمال میں اور حکومت اپنی "حاکمانہ" ملکیت کے سلسلہ میں اپنے کو ذمہ دار امین اور نائب اور جوابدہ تصور کرتی ہے اس کے پیش نظر یہ ہدایات ہوتی ہیں۔ قرآن پاک میں ہے:

ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل۔

اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ تم اپنی امانتوں (ذمہ داریوں کو) ان کے اہل تک پہنچاؤ اور جب فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الا کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ[۲]

خبردار! تم میں سے ہر شخص ذمہ دار ہے اور اپنی ذمہ داری کے بارے میں اس سے باز پرس ہوگی۔

اس تصور سے نہ تو وہ بے قید معیشت پیدا ہوتی جو اپنے جلو میں معاشی کشمکش کے نہ جانے کتنے مسائل لئے ہوئے ہے اور نہ فرد کی ملکیت کے ذریعہ استحصال کی وہ صورت پیدا ہوتی ہے جس سے بچنے کے لئے مارکس نے قومی ملکیت کا فلسفہ پیش کیا، اس مختصر توضیح کے بعد اب ہم ملکیت کی قسمیں اور اس کے ذرائع کی تفصیل کریں گے پھر ذرائع پیداوار اور تقسیم ذرائع کی ملکیت پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

۱۔ اسلام کا نظریۂ ملکیت ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی۔

۲۔ اس سلسلہ میں قرآن کی متعدد آیات اور بے شمار حدیثیں وارد ہوئی ہیں۔

ملکیت کی قسمیں | کسی ملکیت سے مالک کے تعلق کی تین صورتیں ہوتی ہیں۔

(۱) ملک العین (۲) ملک المنفعۃ (۳) ملک الدین

(الف) ملک العین کو ملک لرقبہ بھی کہتے ہیں اس میں آدمی اس چیز کی ذات کا مالک ہوتا ہے۔ اس کی دو قسم ہے جیسے اموال منقولہ مد روپیہ پیسہ، سامان، مشین، جانور اور سواری وغیرہ، غیر منقولہ جیسے زمین مکان دوکان وغیرہ۔

(ب) ملک المنفعۃ جس میں آدمی اس چیز کی ذات کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل چیز کو باقی رکھتے ہوئے اس سے استفادہ کا حق اسے حاصل ہوتا ہے۔ کرایہ کا مکان، کرایہ کی دوکان یا سواری یا مزدور مالک کا آپسی معاہدہ وغیرہ۔

(ج) ملک الدین جیسے کسی کے ذمہ کوئی بقایا ہو یا کوئی قرض دار ہو یا اس کے ذمہ کوئی تاوان کی ادائگی باقی ہو۔

ملکیت قائم ہونے کی صورتیں | اسلامی شریعت میں کسی چیز پر ملکیت چار طریقوں سے قائم ہوتی ہے۔

(۱) احراز المباحات کے ذریعہ (۲) عقد و معاہدہ کے ذریعہ (۳) وراثت کے ذریعہ (۴) ملکیت سے پیدا شدہ یا قدرتی طور پر حاصل شدہ چیزوں کے ذریعہ۔

(۱) احراز المباحات یعنی اس مباح مال یا مباح چیز کو اپنے قبضہ میں کر لینا جو کسی مخصوص آدمی کی ملکیت میں نہ ہو اور نہ شریعت کی طرف سے قبضہ کرنے میں کوئی مانع موجود ہو، مثلاً دریا، چشمہ اور بارش کا پانی، جنگل کی گھاس، لکڑی، درخت کی پتی اور خشکی اور سمندر کا شکار، بے کار زمینیں[1]۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی،

اب کوئی شخص ان مباحات میں سے کسی چیز کو اپنے ملک میں لینے کے ارادہ سے قبضہ کرے تو وہ اس کا مالک بن جائے گا اس کا نام احراز المباحات ہے۔ مگر کسی مباح کا مالک بننے کے لئے دو شرطیں ہیں

(۱) پہلی شرط یہ ہے کہ اس مباح کو کسی دوسرے شخص نے پہلے سے قبضہ میں نہ لے لیا ہو مثلاً کسی شخص نے اپنے کھیت میں کوئی گڈھا کھود کر بارش کا پانی جمع کر لیا، جنگل سے لکڑی کاٹ کر جمع کر لی بے کار زمین میں مینڈ بنا لی یا کسی چیز سے گھیر دیا تو دوسرے کو اس کی اجازت کے بغیر پانی لکڑی اور زمین

[1] نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "الناس شرکاء فی الماء والکلاء والنار" سارے انسان پانی گھاس اور آگ میں شریک ہیں۔

کے استعمال کا حق نہیں ہے۔ فقہ کا قاعدہ ہے کہ

من سبق الی مباح فقد ملکہ — جو کسی مباح کو اپنی ملکیت میں لینے میں سبقت اور پہل کرے وہ اس کا مالک ہے۔

(المجلہ دفعہ ۱۲۴۹)

(۱۱) دوسری شرط یہ ہے کہ اس نے مالک بننے کا قصد کیا ہو اب اگر کوئی چیز بغیر قصد کے اس کے قبضہ میں آجائے تو وہ اس کا مالک نہیں بن سکتا۔ مثلاً کسی نے اپنا جال خشک ہونے کے لئے پھیلا دیا اور اس میں کوئی شکار پھنس گیا تو وہ جال میں پھنس جانے کی وجہ سے اس کا مالک نہیں بن سکتا۔ اگر اس نے شکار کے مقصد ہی سے اسے پھیلایا تھا تو پھر وہ مالک ہو جائے گا بشرطیکہ کسی دوسرے کا حق اس میں ثابت نہ ہو لیکن اگر کوئی مباح چیز اس کی ملکیت میں بغیر قصد آگئی اور اس میں کسی دوسرے کا حق نہیں ہے تو وہ اس کا مالک سمجھا جائے گا۔ مثلاً سیلاب کی وجہ سے اس کے کھیت میں مٹی آگئی یا بالو آگیا تو وہ اس مٹی یا بالو کا مالک سمجھا جائے گا۔ لیکن اگر اس کی زمین میں کوئی ہوائی جہاز یا کوئی اور سواری حادثہ کا شکار ہو کر گر جائے تو وہ اس کا مالک نہیں بن سکتا۔ اسلئے کہ اس میں دوسرے کا حق شامل ہے۔

احراز المباحات سے جس طرح افراد اس کے مالک بن جاتے ہیں اسی طرح اسلامی حکومت اگر کوئی مباح چیز کو اپنے قبضہ میں لاتی ہے تو وہ افراد کی نہیں بلکہ قومی ملکیت قرار پائے گی۔ مثلاً حکومت نے سروے کراکے زمین کے اندر پٹرول معلوم کیا یا سونا چاندی یا کوئی اور دھات دریافت کی تو وہ افراد کی نہیں بلکہ اسلامی حکومت کی ملک ہوگی اسی طرح احیاء موات یعنی غیر آباد زمینوں کو آباد کرنے کی صورتیں افراد کے لئے بھی ہیں اور حکومت کے لئے بھی البتہ افراد کے لئے حکومت کی اجازت ضروری ہے[۱]۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جو چیزیں حکومت اپنے قبضہ میں لے گی ان پر حکومت کا قبضہ مالکانہ نہیں بلکہ حاکمانہ ہوگا یعنی اس کو اس میں تصرف اور تقسیم میں اسی دائرہ کے اندر رہنا ہوگا جو شریعت نے اس کے لئے مقرر کر دیا ہے آگے اس کی تفصیل آتی ہے۔

عقد و معاہدہ | کسی چیز کا مالک بننے کے لئے دوسرا ذریعہ تبادلۂ اشیاء اور آپس کا معاہدہ ہے اسلامی فقہ کی اصطلاح میں اسے عقد کہتے ہیں۔ عقد کے لفظی معنی دو رسیوں کو ملا کر گرہ دینے کے ہیں، جب گرہ لگا دی جاتی ہے تو دونوں رسیاں اس گرہ سے بندھ جاتی ہیں اور فقہ اسلامی کی اصطلاح

---

[۱] یہ قید امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے لگائی ہے، دوسرے ائمہ حکومت کی اجازت کو ضروری نہیں سمجھتے، موجودہ حالات میں امام صاحب کی رائے ہی قابل عمل ہے۔

میں عقد کی تعریف یہ ہے:

ارتباط ایجاب بقبول علی وجہ مشروع یثبت اثرہ فی محلہ [1]

شرعی طریقہ پر ایجاب وقبول کے ذریعہ اس طرح بندھ جانا کہ موقع اور محل میں اس کا اثر ظاہر ہو۔

جب دو آدمی ملکر کسی معاملہ کے بارے میں شرعی طریقہ پر اپنی رضامندی دے دیتے ہیں مثلاً ایک آدمی کسی چیز کو فروخت کرنے کی بات کرتا ہے اور دوسرا اسے خریدنے کی رضامندی ظاہر کرتا ہے تو اسے ایجاب وقبول کہتے ہیں، اب پہلے جس نے معاملہ کی بات شروع کی اس کو موجب (ابتدا کرنیوالا) کہیں گے۔ اور جس نے بعد میں اس پر اپنی رضامندی ظاہر کی اسے قابل (قبول کرنیوالا) کہیں گے گویا دونوں میں سے معاملہ کی بات جس کی طرف سے پہل ہوگی اسے یجاب اور بعد میں جو رضامندی ظاہر ہوگی اسے قبول کہیں گے جس طرح یہ عقد ایجاب وقبول ملک عین یا ملک رقبہ یعنی اشیاء کی لین دین خرید وفروخت اور تبادلہ میں ہوتا ہے اسی طرح منفعت میں بھی ہوتا ہے البتہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلے عقد میں عاقدین اس چیز کی ذات کے مالک ہو جاتے ہیں اور منفعت میں وہ کسی شے کی ذات کے مالک نہیں ہوتے بلکہ انھیں صرف منفعت یعنی فائدہ اٹھانے کا حق ہے [2]

شلاً ایک شخص کو آپ مزدوری پر رکھتے ہیں یا ایک کارخانہ دار بہت سے مزدوروں کو کارخانے میں کام کرنے پر مامور کرتا ہے یا ایک میاں بیوی ایجاب وقبول کے ذریعہ عقد نکاح میں بندھ جاتے ہیں یہ سب منفعت کا عقد ہے اس میں آپ مزدور یا بیوی کی ذات کے مالک نہیں بلکہ صرف یہ فائدہ اٹھانے اور فائدہ پہنچانے کے لئے معاہدہ ہوا ہے۔ اسی طرح شرکت مضاربت وغیرہ کا معاملہ ہے جس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

اس معاہدہ کے صحیح ہونے کی دو شرطیں ہیں ایک تو معاہدہ کرنے والے اس کے اہل ہوں اور پھر وہ بااختیار ہوں، مثلاً بچہ نہ ہو یا مُکرَہ نہ ہو یعنی ایسا شخص جسے کسی کام کے کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہو تو لوگوں کے عقد ومعاہدے صحیح نہیں ہوں گے۔

---

[1] المجلۃ الاحکام العدلیۃ موجودہ دور کے انسانی قانون میں بھی اس تعریف کو تسلیم کر لیا گیا ہے مگر چونکہ ان کے یہاں حرام و حلال کی قید موجود نہیں ہے اس لئے ان کے نزدیک کسی معاملہ میں دو آدمی کی رضامندی ہونا بس اتنا کافی ہے مگر فقہ اسلامی کی تعریف "بوجہ مشروع" کی قید لگا کر عام انسانی قانون سے اسے جدا کر دیا۔ [2] اصطلاح فقہ میں پہلی صورت کو ملک العین یا ملک الرقبہ اور دوسری صورت کو ملک المنفعۃ کہتے ہیں۔

عام حالت میں قانونی اور تمدنی لحاظ سے ملکیت کا سب سے بڑا سبب یہی عقد و معاہدہ ہوتا ہے یہ عقد معاہدہ ہی ہے جو انسان کے لئے حقوق و فرائض اور اقتصادی سہولتوں کے لئے وسیع میدان پیدا کرتا ہے۔

عقد کی جبری صورتیں اوپر عقد و معاہدہ کی جو وضاحت کی گئی ہے اس کا تعلق عام افراد انسانی سے ہے جس میں آپس کی رضامندی ضروری ہے مگر عقد و معاہدہ کی کچھ جبری صورتیں بھی ہوتی ہیں جسمیں دوسرے فریق کی رضامندی ضروری نہیں ہوتی، اس کی کئی صورتیں ہیں:

(الف) ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ حکومت یا عدالت خود ایک فریق بنکر کوئی فیصلہ کردے، ایسی صورت میں عدالت یا جج کا فیصلہ بھی اسی طرح نافذ ہوگا جس طرح دو آدمی رضامندی سے کوئی معاملہ کر لیتے ہیں اور وہ نافذ ہوتا ہے مثلاً کوئی مقروض قدرت رکھنے کے باوجود قرض ادا نہ کرتا ہو تو جج یا قاضی جبراً اس کے مال کو فروخت کرکے قرض دینے والے کا قرض ادا کردے گا یا کسی مال میں تصرف کو روک دے یا کسی عقد کو کالعدم قرار دے دے تو ان تمام صورتوں میں اس کا یہ فیصلہ بھی ایک عقد سمجھا جائے گا یا موجودہ دور میں ہر محکمے اور مختلف شعبے زندگی کے لئے کچھ مخصوص پابندیاں عائد کرتے ہیں ان کی حیثیت بھی عقد ہی جیسی ہے بشرطیکہ شریعت کے کسی صریح حکم سے وہ ٹکراتی نہ ہوں۔

(ب) دوسری صورت یہ ہے کہ کسی شخص کی ملکیت اس کی رضامندی کے بغیر دوسرے کو مل جائے یا حکومت مصالح عامہ کے تحت اس پر قبضہ کرلے شلاً ایک شخص ایک زمین خریدے مگر اس کا شریک یا پڑوسی اس پر شفعہ کردے تو اب شفعہ کے حق کی وجہ سے خریدار کو مجبوراً قیمت لے کر اپنی خریدی ہوئی جائداد کو شفیع کے حوالہ کرنا ہوگا۔

اسی طرح شریعت نے اجازت دی ہے کہ مصالح عامہ کے تحت کسی زمین یا جائداد کو حکومت یا جسے عدالتی یا تنفیذی اختیارات ہوں وہ لے سکتی ہے مثلاً مسجد کی توسیع کی ضرورت ہے اور پڑوسی اپنی زمین نہیں دے رہا ہے تو پوری قیمت ادا کرکے اس سے زمین لی جا سکتی ہے۔ اسی طرح راستہ یا سڑک کی توسیع کی ضرورت ہے یا مدرسہ، اسپتال بنانے کی ضرورت ہے تو ان مصالح عامہ کے لئے کسی دوسرے کی زمین لی جا سکتی ہے حتیٰ کہ فقہا نے تصریح کی ہے کہ راستے کی تنگی کی وجہ سے

عام لوگوں کو تکلیف ہو اور اس کی توسیع کی ضرورت ہو تو مسجد کا کوئی فاضل حصہ بھی اس میں لیا جا سکتا ہے[1] اس لئے فقہا نے قرآن پاک کی آیت

لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْن — نہ تم کسی پر ظلم کر سکنے اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پائے گا۔

اور حدیث نبوی

لَا ضَرَرَ وَ لَا ضِرَار — تکلیف اور نقصان نہ خود اٹھانا چاہئے اور نہ دوسروں کو پہنچانا چاہئے۔

کی روشنی میں یہ اصول (قاعدے) بنا دئے (ہیں) کہ

التصرف علی الرعیۃ منوط بالمصلحۃ — ملکیت اور ذمہ داری میں تصرف مصلحت کے ساتھ وابستہ ہے

الضرر یزال، الضرورات تبیح المحظورات — تکلیف دور کی جائے گی، ناگزیر صورتیں بعض ممنوع چیزوں کو مباح کر دیتی ہیں جب کسی معاملہ میں تنگی ہوگی تو اس میں وسعت پیدا کی جائے گی۔

الامر اذا ضاق اتسع[2]

ان تمام مذکورہ بالا صورتوں میں اس جبری "عقد" کی حیثیت وہی ہوگی جو فریقین میں "تراضی" کی ہوتی ہے، تو گویا ملکیت کے انتقال میں یا اس کی منفعت سے روک دینے میں کبھی فریقین کی رضامندی ہوتی ہے اور کبھی عقد جبری ہوتا ہے۔

(ج) ملکیت کا تیسرا سبب وراثت اور عوض ہے، وراثت کا مفہوم تو واضح ہے کہ کسی مرنے والے کے جو ورثہ ہوتے ہیں وہ سب اپنے اپنے حصہ کے بقدر جائداد اور رقم کے مالک بن جاتے ہیں۔ عوض کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص نے کسی دوسرے کی چیز ضائع کر دی یا بغیر اجازت کسی کی چیز لے لی اور وہ ضائع ہو گئی یا اس میں کوئی نقص پیدا ہو گیا تو اس شخص کو مالک کے نقصان کا عوض یا تاوان دینا ہوگا اور پانے والا اس عوض کا مالک ہوگا۔ اسی طرح خوں بہا یا کسی دوسرے نقصان

---

[1] رد المحتار ج ۳ ص ۳۸۳ تجوز الزیادۃ فی الطریق من المسجد لانہا کلہا للعامۃ (مطبوعہ اکمل المطابع۔ ہندوستان) مصالح عامہ کے تحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زمین کے سلسلہ میں مختلف مواقع پر مختلف طرز عمل اختیار فرمایا ہے اس بنا پر حضرت عمرؓ نے سواد عراق کی زمینوں کو قرآن پاک کی روشنی میں مصلحت عامہ کے تحت حکومت کی تحویل میں لے لیا تھا تفصیل کیلئے امام ابو یوسف کی کتاب الخراج اور راقم الحروف کی کتاب اجتہاد اور تبدیلی احکام دیکھنا چاہئے۔ [2] المجلۃ لاحکام العدلیۃ

میں جو چیز دی جائیگی وہ بھی عوض شمار ہوگی اور نقصان پانے والا اس کا مالک ہوگا۔

(۵) عام طور پر فقہا مذکورہ بالا تین صورتوں کے ذریعہ جو چیز حاصل ہوا سے ملکیت میں شمار کرتے ہیں جیسا کہ مجلۃ الاحکام العدلیہ میں بھی ہے مگر اس کا ایک چوتھا سبب اور قرار دیا جاسکتا ہے وہ ہے ملکیت سے جو چیزیں پیدا ہوں مثلاً کھیت کی پیداوار، درخت کے پھل، پالتو جانوروں کے بچے، ان کا دودھ اور بال وغیرہ اگر یہ چیزیں انفرادی ملکیت میں ہوں تو انفرادی ملکیت ہوں گی اور اگر مشترکہ مال یا جائداد سے پیدا ہوں تو پھر مشترکہ ملکیت قرار پائیں گی اب اگر کوئی شخص کسی کی جائداد یا زمین کو غصب کرے یا جانور یا درخت کو غصب کرے تو اس کی پیداوار اور بچے کا مالک غاصب ہی نہیں بلکہ اصلی مالک ہی ہوگا، البتہ غاصب نے کھیت میں اپنا بیج ڈالکر اسے بو دیا تو اگر بوائی کا وقت نکل چکا ہے تو غاصب زمین کی مالگزاری دے کر وہ پیداوار لے سکتا ہے لیکن اگر ابھی بوائی کا وقت باقی ہے تو اس کے مالک کو حق ہوگا کہ وہ اس سے کہے کہ تم اپنا بیج نکال لو یا پھر مالک قیمت لینے پر خود بخود راضی ہو جائے مگر اسے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ (باقی)

(بقیہ صفحہ ۵۲ سے)

يَسْتَحِبُّ جَوَامِعَ مِنَ الدُّعَاءِ (ابوداؤد) آپؐ جامع دعائیں پسند فرماتے تھے۔

۵۔ امام کو صرف اپنی ذات کیلئے یعنی صیغۂ واحد سے دعا نہ کرنی چاہئے بلکہ دعا میں ہمیشہ جمع کا صیغہ استعمال کرنا چاہئے۔

۶۔ دعا حال اور مستقبل دونوں کی مصیبتوں اور تکلیفوں کیلئے کرنی چاہئے۔ حال کی مصیبت میں اس سے صبر پیدا ہوتا ہے اور مستقبل کی مصیبت کے دور ہو جانے کا امکان ہو جاتا ہے، حدیث میں ہے۔

إِنَّ الدُّعَاءَ يَنْتَفِعُ مِمَّا نَزَلَ وَمِمَّا لَمْ يَنْزِلْ فَعَلَيْكُمْ عِبَادَ اللّٰهِ بِالدُّعَاءِ

دعا حال و مستقبل دونوں کی ضرورتوں اور مصیبتوں میں مفید ہوتی ہے۔

(مرتب)

خوش اخلاقی کا معیار

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ جو شخص ہم سے خوش اخلاقی سے پیش آتا ہے ہم بھی اس سے خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ جو بد اخلاقی کرے ہم اس سے بھی حسن اخلاق سے پیش آئیں، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش اخلاقی کی وضاحت یہ فرمائی ہے کہ صرف خوش اخلاقی کے جواب میں خوش اخلاقی نہ ہونی چاہئے بلکہ جس نے آپ کے ساتھ برائی اور بد اخلاقی کی ہے اس کے ساتھ بھی حسن اخلاق کا ثبوت دینا چاہئے اور حسن اخلاق کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ برائی کرنے والے کے ساتھ ظلم و زیادتی کا معاملہ نہ کیا جائے تاکہ ہمارا اخلاق محض لین دین کا اور کاروباری نہ بن جائے بلکہ ہمارے اندر حقیقی اخلاق پیدا ہونا چاہئے۔

عن حذیفة قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تکونوا امّعةً ان احسن الناس حسنّا وان اساء وا ظلمنا ولکن وطنّوا انفسکم ان احسن الناس ان تحسنوا وان اساء وا فلا تظلموا۔

(مشکوٰة باب الظلم)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اِمَّعَة (طفیلی) نہ بنو یعنی یہ کہنے لگو کہ جو لوگ ہمارے ساتھ اچھا سلوک کریں گے ہم بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے اور جو ہمارے ساتھ برائی کریں گے تو اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے، تو تم اپنے کو اس کا عادی بناؤ کہ جب دوسرے تمہارے ساتھ اچھا سلوک کریں تو ان کے ساتھ ضرور اچھا سلوک کرو مگر جب وہ تمہارے ساتھ برائی کریں تو تم کم سے کم ان کے ساتھ ظلم نہ کرو۔

ایک دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا:

لیس الواصل بالمکافی و لکن الواصل الذی اذا قطعت رحمہ وصلہا

اچھا سلوک کرنے والا وہ نہیں ہے جو اچھے سلوک کے بدلے میں اچھا سلوک کرے بلکہ اچھا سلوک کرنے والا وہ کہا جائے گا جو اس سے بے تعلق برتے اس سے وہ جڑ ملے اور تعلق قائم کرے۔

آپ نے فرمایا کہ مجھے میرے رب نے نو باتوں کا حکم دیا ہے، ان میں تین باتیں یہ بھی ہیں:

ان اصل من قطعنی و اعطی من حرمنی و اعفو عمن ظلمنی (مشکوٰۃ)

میں اس سے جڑوں جو مجھ سے کٹے میں اس کو دوں جو مجھ کو محروم کرے اور میں اسے معاف کردوں جو مجھ پر ظلم کرے۔

★

اخلاق سلف

(شائع کردہ مولانا عمار احمد صاحب . بیت المعارف الٰہ آباد ۔)

حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانی متوفی ۹۷۳ھ دسویں صدی کے ان بزرگوں میں ہیں جو اپنے زمانہ میں نہ صرف علم و فضل کے لحاظ سے ممتاز تھے بلکہ ان کا شمار اولیائے کاملین میں ہوتا ہے حدیث و فقہ میں ان کی کئی قیمتی تصانیف متداول ہیں۔ خاص طور پر ائمہ اربعہ کی فقہ پر ان کی "میزان" آپ اپنی مثال ہے، اس میں انھوں نے ائمہ اربعہ کے مجتہدانہ اختلافات کی بہترین توجیہ اور ان کے موقع و محل کی تعیین کی ہے اور دکھایا ہے کہ مسائل اجتہادیہ میں ائمہ میں کسی نے عزیمت کے مطابق فتویٰ دیا ہے اور کسی نے رخصت کے جس نے امت کے لئے آسانیاں پیدا کر دی ہیں۔

شیخ نے تصوف پر بھی کئی کتابیں یادگار چھوڑی ہیں انہی میں ایک "تنبیہ المغترین" بھی ہے۔ جس کا اردو ترجمہ بہت پہلے کسی صاحب نے کیا تھا اب یہ کتاب بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڈھی مدظلہ العالی کی توجہ، ترمیم اور نظر ثانی کے بعد دوبارہ مولانا عمار احمد صاحب نے مدرسہ بیت المعارف کی طرف سے شائع کر دیا ہے اس کتاب میں سلف صالحین کے اخلاق کا ایک ایسا اچھا مرقع پیش کیا گیا ہے کہ جس سے ایک طرف یہ پہلو ذہن نشین ہوتا ہے کہ کتاب وسنت نے مومن کی زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ صرف سینوں اور سفینوں میں بند نہیں رہا بلکہ ہر زمانہ میں وہ ہمارے اسلاف کی عملی زندگی میں بھی دیکھا جا سکتا ہے دوسری طرف اس سے عام لوگوں میں بھی عمل کرنے کا داعیہ و جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ مولانا پرتاپگڈھی مدظلہ نے اس پر ایک مختصر مقدمہ بھی تحریر فرمایا ہے جس کی چند سطریں یہ ہیں :-

عرصہ سے میری دلی خواہش تھی کہ کوئی ایسا رسالہ مرتب کیا جائے جس میں سلف صالحین کا تذکرہ اور ان کے اخلاق وارشادات اختصار کے ساتھ درج کر دیئے جائیں تاکہ عام مسلمانوں کے حق میں موجب موعظت ونصیحت اور باعث نزول رحمت وحصول برکت ہو اور اپنے اسلاف کے اخلاق سے آراستہ ہونے کی رغبت پیدا ہو نیز ان کی سیرت کے مطالعہ سے کتاب وسنت پر عمل کا داعیہ ان کے قلب میں موجزن ہو۔

چنانچہ حضرت علامہ شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ جو دسویں صدی کے مشاہیر علماء اور اکابر اولیاء اللہ میں سے ہیں، ان کی تصنیف "تنبیہ المغترین" جو اس موضوع پر لکھی گئی ہے نظر سے گذری تو اس کے اکثر مضامین کو گویا اپنے دل کا ترجمان پایا اور قلب میں شدید تقاضا پیدا ہوا کہ اگر اس کتاب کے مضامین منتخب کرکے طبع کرا دیئے جائیں تو امت کے لئے بے حد نافع ومفید ثابت ہوں گے......

اللہ تعالیٰ ان مضامین سے عوام وخواص سب کو فائدہ پہنچائے اور اس خدمت کو قبول فرماکر میرے لئے نجات اخروی کا وسیلہ بنائے، آمین ثم آمین۔

حضرت مولانا کے اس مختصر سے مقدمہ ہی سے اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے مگر ہم مصنف رحمۃ اللہ علیہ کے خطبہ کا کچھ حصہ بھی یہاں نقل کر دیتے ہیں اور جس سے اس کی افادیت کی اور وضاحت ہو جائے گی، اور انشاء اللہ آئندہ پرچوں میں اصل کتاب کے اقتباسات بھی نقل کئے جائیں گے۔

حمد وصلوٰۃ کے بعد مولف عرض کرتا ہے کہ میں نے اس کتاب کو اپنے دانست میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے عین مطابق تحریر کیا ہے اور طریق باطن میں اس کتاب کی حیثیت بالکل وہی ہے جو امام نووی کی کتاب المنہاج[1] کی ہے۔ جس طرح علماء ظاہر فقہ ظاہر میں امام نووی کی کتاب مذکور سے فتویٰ دیتے ہیں اسی طرح عرفاء باطن کو اس کتاب کی عمدہ تحریرات کے مطابق فتویٰ دینا چاہئے........ یہ کتاب کسی کتاب سے منقول نہیں بلکہ کتاب وسنت اور اقوال ائمہ

---

[1] امام نووی نے المنہاج کے نام سے دو کتابیں لکھی ہیں ایک اسی نام سے ان کے فتاویٰ کا مجموعہ ہے دوسرے منہاج العابدین کے نام سے ایک کتاب غالباً تصوف پر لکھی ہے۔

سے مستنبط ہے امیرالمومنین حضرت عمر بن خطاب جب لوگوں کو فتویٰ دیا کرتے
تھے تو فرما دیتے کہ یہ عمر کی رائے ہے اگر ٹھیک ہے تو خدا تعالیٰ کی طرف سے ہے اور
اگر خطا ہے تو عمر کی طرف سے سمجھو، اس طرح امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ لوگوں کو فتویٰ
دے کر فرماتے تھے کہ یہ میرے علم کا انتہائی نتیجہ ہے اگر کسی کو اس سے زیادہ معلوم واضح ماخذ
ہو جائے تو وہی درست ہوگا۔ اکثر فرماتے تھے یہ نعمان کا فتوی ہے اگر درست
ہے تو اللہ کی طرف سے ہے اور اگر خطا ہے تو نعمان کی طرف سے ہے اور دنیا و آخرت
میں اس کا مواخذہ نعمان کی گردن پر ہے۔ بعینہ یہی بات اس کتاب کے مولف
نے اپنے متعلق بھی لکھی ہے۔

(بقیہ دعا کے بارے میں کچھ باتیں صفحہ ۵۵ سے)

۲۔ حتی الامکان دعا اچھے اور دلجمعی کے اوقات میں کرنا چاہیئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے
جن اوقات میں اکثر دعا کرتے تھے اور جن اوقات میں دعا کی تلقین فرمائی ہے وہ بے شمار ہیں
چند خاص اوقات کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) فرض نمازوں کے بعد (۲) پچھلے پہر یعنی تہجد کے وقت (۳) سفر کی حالت میں (۴) اذان و
اقامت کے درمیان (۵، جمعہ کے دن عصر کے بعد سے مغرب تک (۶) حج کے مختلف اوقات اور
مقامات میں۔

۳۔ دُعا ہاتھ اٹھا کر کرنا چاہیے اور دعا کرنے کے بعد دونوں ہاتھوں کو منہ پر مل لینا چاہیئے حضرت
سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمھارا پروردگار بڑا صاحب
حیا اور کریم ہے، جب کوئی بندہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے تو اُسے خالی واپس کرتے ہوئے حیا
معلوم ہوتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں وارد ہے کہ دعا کے بعد اپنے چہرہ مبارک پر ہاتھ مل
لیا کرتے تھے اور یہ حکم بھی فرمایا کہ فاذا فرغتم فامسحوا بھا وجوھکم جب دعا سے فارغ ہوجاؤ
تو اپنے ہاتھوں کو اپنے چہروں پر پھیر لیا کرو۔

۴۔ جہاں تک ممکن ہو ایسی دعائیں کرنی چاہئیں جو دنیا و آخرت دونوں کی بھلائیوں کو
جامع ہوں اور ان کے الفاظ کم ہوں اور معانی زیادہ ہوں، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں:

(بقیہ صفحہ ۴۲ پر)

دعا کے بارے میں کچھ باتیں

دعا تقدیر اور توکل کے منافی نہیں ہے، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دعا مانگنا تقدیر اور توکل کے منافی ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ دعا توکل سے روکتی نہیں بلکہ اس کی ترغیب دیتی ہے حالات کی ناسازگاری کے باوجود خدا کی مدد پر بھروسہ رکھنے کا نام توکل ہے۔ قرآن مجید میں جن برگزیدہ بزرگوں کی دعائیں وارد ہوئی ہیں وہی دین حق کے دست و بازو ہیں اور توکل میں بلند مقام رکھتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ دعا کی قبولیت کے لئے توکل یعنی اللہ کی ذات پر اعتماد ایک بنیادی شرط ہے چنانچہ اصحاب موسیٰ نے پہلے توکل کا اظہار کیا، اس کے بعد دعا کی:

علی اللہ توکلنا ربنا لا تجعلنا فتنۃ للقوم الظالمین ؕ

ہم نے اللہ پر بھروسہ کیا۔ خدایا تو ہمیں ظالم لوگوں کے لئے آزمائش نہ بنا۔

تقدیر کی دو قسمیں ہیں

ایک تقدیر مبرم نہ ٹلنے والی دوسری تقدیر معلق جو کچھ اعمال کے ساتھ لٹکی ہوئی ہے، تقدیر مبرم میں تغیر و تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے مگر تقدیر معلق مشروط ہے کہ اگر صدقہ خیرات دوا دارو یا کوئی کار خیر کر لیا جائے تو وہ بدل جائے گی اور جس عمل کے ساتھ وہ مشروط ہوگی اگر اسے پورا کر دیا گیا تو بیماری ٹل سکتی ہے، عمر بڑھ سکتی ہے اور بھی بہت سی تبدیلیاں ہو سکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں واضح طور پر فرما دیا ہے:

یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتَابِ

اللہ تعالیٰ جس چیز کو چاہتا ہے مٹا دیتا ہے جس چیز کو چاہتا ہے باقی رکھتا ہے، اس کے خزانۂ غیب میں ہر چیز لکھی ہوئی ہے۔

حدیث نبوی میں بہت سے اعمال کے بارے میں کہا گیا ہے کہ فلاں عمل سے عمر بڑھتی ہے اور فلاں عمل سے مصیبت ٹل جاتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

قبولیت دعا کے شرائط

لیکن دُعا کے سلسلہ میں چند آداب اور شرطوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے، ان میں بعض شرطیں ایسی ہیں کہ اگر وہ نہ پائی گئیں تو کسی حال میں دعا قبول نہیں ہوسکتی۔ وہ آداب اور شرطیں یہ ہیں:

۱۔ اپنی معمولی سے معمولی جائز ضرورت کے لئے بھی خدا سے دُعا کرنی چاہئے آپؐ نے فرمایا ہے کہ

لِیَسْئَلْ اَحَدُکُمْ رَبَّہٗ حَاجَتَہٗ کُلَّھَا حَتّٰی یَسْاَلَ شِسْعَ نَعْلِہٖ اِذَا انْقَطَعَ (ترمذی)

تم کو اپنی تمام ضرورتوں کو خدا سے مانگنا چاہئے یہاں تک کہ اگر تمہارے چپل کا تسمہ ٹوٹ جائے تو اس کے لئے بھی خدا سے کہنا چاہئے۔

لیکن کسی ایسی چیز کے لئے دُعا نہ کرنی چاہئے جسے شریعت نے معصیت قرار دیا ہے یا اس سے کسی کی حق تلفی کسی پر ظلم یا کسی سے تعلق منقطع ہوتا ہو، قرآن و حدیث میں صراحۃً اس سے روکا گیا ہے۔

یُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَالَمْ یَدْعُ بِاِثْمٍ اَوْ قَطِیْعَةِ رَحْمٍ

بندہ کی ہر دعا قبول کی جاتی ہے جب تک اس دعا میں کوئی گناہ کی اور قطع رحم کی بات نہ ہو۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ دُعا کرنے والے کا ذریعہ معاش حلال ہو، حرام کی آمیزش اس میں قصد وارادہ سے نہ کی گئی ہو، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص کی تمثیل بیان فرمائی ہے جو حرام خوری میں ڈوبا ہوا اور پھر خدا کے سامنے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ آپ ایک دن کسب حلال کی ترغیب دے رہے تھے اور اس اثنا میں:

ثم ذکر الرجل یطیل السفر اشعث اغبر یمد یدیه الی السماء یا رب یارب ومطعمه حرام وملبسه حرام وغذی بالحرام فانی یستجاب لذالک (مسلم)

آپ نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جو لمبے سفر میں نہایت ہی پریشان حال ہو اور خدا سے گڑگڑا کر دعا کر رہا ہو کہ اے میرے پروردگار! میری یہ عرضداشت سن لے (گو سفر قبولیت دعا کا وقت ہے) لیکن اس کی حالت یہ ہے کہ اس کا کھانا بھی حرام ہے اس کا پہننا بھی حرام ہے اور حرام ہی سے اس کی پرورش بھی ہوئی ہے تو ایسے آدمی کی دعا کیسے قبول ہوسکتی ہے۔

علماء نے ان ہی حدیثوں کی روشنی میں فرمایا ہے کہ:

إِنَّ لِلدُّعَاءِ جَنَاحَيْنِ أَكْلُ الْحَلَالِ وَصِدْقُ الْمَقَالِ۔

دعا کے دو بازو ہیں، ایک حلال غذا اور دوسرے سچ بولنا۔

۳۔ تیسری ضروری بات یہ ملحوظ رکھنی چاہئے کہ اگر دعا سے اس کی حاجت برآری نہ ہو رہی ہو یا اسکے نتیجہ میں تاخیر ہو رہی ہو تو اکتا کر دعا ترک نہ کر دینی چاہئے۔ ہو سکتا ہے اس کی کسی کوتاہی کی وجہ سے یہ تاخیر ہو رہی ہو، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

يُسْتَجَابُ لِلْعَبْدِ مَا لَمْ يَدْعُ بِإِثْمٍ أَوْ قَطِيعَةِ رَحِمٍ مَا لَمْ يَسْتَعْجِلْ قِيلَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ مَا الْاسْتِعْجَالُ قَالَ يَقُولُ قَدْ دَعَوْتُ فَلَمْ أَرَ يُسْتَجَابُ لِي فَيَسْتَحْسِرُ عِنْدَ ذَالِكَ وَيَدَعُ الدُّعَاءَ۔

بندہ کی دعا اس وقت تک قبول کی جاتی ہے جبتک وہ کسی گناہ کی بات یا قطع رحم کے لئے دعا نہ کرے بشرطیکہ وہ تعجیل سے کام نہ لے۔ آپ سے سوال کیا گیا کہ تعجیل سے کام لینے کا کیا مطلب ہے آپ نے فرمایا کہ تعجیل یہ ہے کہ دعا کرنے والا یہ کہنے لگ جائے کہ میں نے اس طرح دعا کی مگر میں سمجھتا ہوں کہ اب میری دعا قبول نہ ہوگی، پس مایوس ہو کر دعا کرنا چھوڑ دے۔

(مسلم)

آدابِ دُعا

(۱) دعا کرنے والے کو پورے عزم و یقین کے ساتھ دعا کرنی چاہیے اس لئے کہ وہ جس سے دعا کر رہا ہے اس کے قبضہ قدرت میں پوری کائنات ہے دعا کرتے وقت دل میں کسی طرح کا ریب و شک و تذبذب نہ ہونا چاہئے۔ اور نہ غفلت و بے پروائی ہونی چاہئے بلکہ حضورِ قلب کے ساتھ دعا ہونی چاہئے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

أُدْعُوا اللّٰهَ وَأَنْتُمْ مُوقِنُونَ بِالْإِجَابَةِ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَجِيبُ دُعَاءً مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ۔ (ترمذی)

جب تم اللہ تعالیٰ سے کسی بات کے لئے دعا کرو تو تم کو اس کی قبولیت کا پورا یقین رکھنا چاہئے۔ اللہ قلب غافل کی دعا قبول نہیں کرتا۔

دوسری حدیث میں ہے کہ جب تم میں سے کوئی دعا کرے تو یہ نہ کہے کہ اے اللہ اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے اور اگر تو چاہے تو مجھے روزی دے۔ بلکہ:

وَلْيَعْزِمْ مَسْأَلَتَهُ إِنَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ۔

بہت عزم و یقین کیساتھ دُعا کرنی چاہئے اس لئے کہ جس سے وہ دعا کر رہا ہے وہ جو چاہتا ہے وہ تو کرتا ہی ہے وہ فعال لما یرید ہے۔ (بخاری)

(بقیہ صفحہ ۵۲ پر)

باب الاستفسار والجواب

(۱)

دار العلوم دیوبند کے دار الافتا کے چند استفسارات

بخدمت گرامی حضرات علمائے کرام و مفتیان عظام دامت برکاتہم السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دنیا میں اس طرح کے واقعات آئے دن دیکھنے میں آتے رہتے ہیں کہ جمہوری طرز پر ووٹوں کے ذریعہ ممبران کا انتخاب ہوتا ہے۔ پھر وہ منتخب ممبران حکومت کی تشکیل کرتے ہیں پھر وہ افراد حکومت یا پارلیمنٹ اسمبلیوں اور ملک کے ارباب حل وعقد کی منظوری اور تعاون سے ملک کا ایک دستور بناتے ہیں جس کی پابندی ہر شخص کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ حکومت کے اہم مناصب پر جب کسی شخص کا تقرر ہوتا ہے تو دستور و قانون کی پابندی کا اس سے حلف بھی لیا جاتا ہے مگر کسی وقت حکومت میں اختلاف و انتشار کی وجہ سے نظم و انتظام درہم برہم ہو جاتا ہے اور حالات قابو سے باہر ہو جاتے ہیں تو فوج کا سربراہ جو حکومت کا ایک ملازم اور ماتحت ہوتا ہے اور ضابطے کے اعتبار سے دستور کی وفاداری و پاسداری کا حلف بردار بھی ہوتا ہے۔ وہ طاقت کے زور پر حکومت پر قبضہ کرکے حالات پر کنٹرول کرتا ہے اور اگر ضرورت محسوس کرتا ہے تو سابقہ دستور کو منسوخ کرنے کا اعلان کر دیتا ہے اور دوسرا دستور بناتا ہے کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ وزراء اور ارباب حکومت کو گرفتار کرکے ان پر مقدمہ چلاکر ان کو سزائیں بھی دیتا ہے۔

اس سلسلہ میں چند سوالات کے جوابات آپ سے مطلوب ہیں یہ بھی مؤدبانہ گذارش ہے کہ ہر جواب مدلل اور مفصل اور سائل کو مطمئن کرنے والا ہو۔

۱. ایک وقت کے ارباب حل وعقد نے ملک کے لئے جو دستور بناکر نافذ کیا ہو تو اس میں آئندہ ترمیم و تنسیخ کا شرعاً حق ہے یا نہیں اور حق ہے تو کس کو یہ حق ملے گا۔

۲۔ ارباب حکومت میں اختلاف وانتشار اور ملکی انتظام درہم برہم وحالات بگڑنے کی صورت میں اگر فوجی سربراہ جو حکومت کا ماتحت ہوتا ہے وہ یہ یقین کرکے کہ میرے سخت اقدام کے بغیر حالات پر کنٹرول کرنا مشکل وناممکن ہے تو کیا اس کو ایسا کرنا شرعاً جائز ودرست ہوگا یا وہ اپنے اس اقدام میں کسی معصیت کا مرتکب ہوگا۔؟

۳۔ حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد فوجی سربراہ کا دستور کو منسوخ کرنا اور ارباب حکومت کے مجرمین افراد کو مقدمہ چلاکر ان کو سزائیں دینا، اس کو اس کا شرعاً حق ہوگا یا نہیں اور اس کا یہ فعل ازروئے شرع مستحسن ہوگا یا معصیت وجرم کا ارتکاب۔؟

۴۔ ایسے سربراہ کے ساتھ لوگوں کو تعاون کرنا اور ان کی بات کو ماننا یا اس کے بنائے ہوئے نئے دستور کو تسلیم کرنا شرعاً کیسا ہوگا ؟

۵۔ عوام وخواص کو ایسے سربراہ کی اطاعت کرنا ضروری ہوگا یا بغاوت ونافرمانی کرنا ازروئے شرع واجب وضروری ہوگا۔

نوٹ :۔ یہ استفسار ملک وبیرون ملک کے بہت سے اہم اور مشہور اداروں اور شخصیات کو بھیجا جارہا ہے اس لئے آپ حضرات سے درخواست ہے کہ ادلہ اربعہ شرعیہ کی روشنی میں مسائل کی کماحقہ ایسی وضاحت فرمائیں کہ کسی پہلو سے تشنگی محسوس نہ کی جائے۔

فقط والسلام ۔ بینوا توجروا

مکرمی ومحترمی ! السلام علیکم

آپکے روانہ کردہ استفسار کے سلسلہ میں چند باتیں پیش خدمت ہیں۔

أ۔ کسی دستور کی حیثیت دو ہوتی ہے، ایک حیثیت دستور کے مقاصد اور بنیادی اصولوں کی ہوتی ہے، دوسرے ان مقاصد کو عملاً بروئے کار لانے کے لئے جو انتظامی قوانین اور ضوابط بنائے جاتے ہیں۔ اسلامی قانون میں تو یہ مقاصد اور اصول خدا کی طرف سے متعین ہیں اور ان کی تشریح توضیح وحی کی روشنی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں جو کتاب وسنت میں درج ہیں اور فقہ میں اس کی مزید تفصیل ہے اور انسان کے بنائے ہوئے دستور میں وہ مقاصد اور

اصول یا تو کوئی جماعت متعین کرتی ہے یا جو شخص کسی ادارہ کا بانی یا کسی حکومت کا قائم کرنے والا ہوتا ہے وہ کرتا ہے۔

مقاصد اور اصول میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی چاہئے۔ خدا کے قانون میں تو کسی وقت تبدیلی ممکن نہیں ہے البتہ انسانی دستور میں یہ تبدیلی اس وقت ممکن ہے جب ان مقاصد کے بجائے جن کے تحت یہ حکومت یا ادارہ قائم ہوا تھا اب کوئی دوسرے مقاصد کے تحت اس کے چلانے کا ارادہ کرلیا جائے، لیکن جب تک ادارہ کے بنیادی مقاصد میں تبدیلی کا ارادہ نہ کر لیا جائے اس کو تبدیل کرنا شرعاً اور اخلاقاً صحیح نہیں ہے۔ مثلاً ہندوستان کی پہلی پارلیمنٹ نے اس ملک کو سیکولر اسٹیٹ قرار دیا ہے، اب اگر کوئی ایسی جماعت برسر اقتدار آجاتی ہے جو اسے ہندو اسٹیٹ یا خالص سوشلسٹ اسٹیٹ بنانا چاہتی ہے تو وہ بدل سکتی ہے، البتہ وہ قوانین و ضوابط جو ان مقاصد کو بروئے کار لانے کے لئے انتظاماً بنائے جاتے ہیں ان میں تبدیلی نہ صرف صحیح ہے بلکہ بسا اوقات انتہائی ضروری ہو جاتی ہے۔ اگر اسے فقہی زبان میں آپ ادا کرنا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ کتاب و سنت کے صریح احکام میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی مگر اجتہادی مسائل تبدیل ہو سکتے ہیں۔

۲۔ جن مقاصد کے تحت کوئی ادارہ قائم ہوا ہے یا وہ قوانین جو بعد میں انتظاماً بنائے گئے ہیں اس میں خلل پڑ رہا ہے یا وہ مقاصد جن کے لئے یہ قوانین بنائے گئے ہیں ان کو بروئے کار لانے میں یہ مفید نہیں بن رہے ہیں یا بعض لوگ غلط طور پر استعمال کرنے لگے ہیں تو اگر کوئی شخص دیانت داری سے یہ سمجھتا ہو کہ اس میں سرے سے تبدیلی کی ضرورت ہے تو موجودہ نظام کو اگر وہ قوت سے بدل سکتا ہو تو بدل سکتا ہے اور پارلیمنٹ یا جو مجلس اس کے قائم مقام ہو اسے ختم کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کا یہ اقدام واقعی ان مقاصد کی تکمیل کے لئے ہو، ظلم و زیادتی کے ذریعہ محض شخصی اقتدار کے لئے نہ ہو۔

فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہ سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے پھر خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی تنہا خلیفۂ وقت نے (جن کو بیت المال سے کفاف ملتا تھا) عام صحابہ کے اختلاف کے باوجود کتنے فیصلے کئے ہیں اور پھر پوری اسلامی تاریخ اس طرح کے واقعات سے بھری پڑی ہے کہ

ایک شخص یا ایک خاندان کے بعد دوسرے شخص یا خاندان نے اس پر قبضہ کر لیا ہے اور عام لوگوں نے اور علماء و خواص نے ان کی حکومت کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ ان کے نام کا خطبہ بھی پڑھا ہے حضرت علی کی خلافت کو معرض بحث میں لانا مناسب نہیں ہے مگر حضرت معاویہ کی خلافت تو بیعت عام کے طریقہ کے مطابق نہیں قائم ہوئی تھی مگر ان کی خلافت کو ہم برحق سمجھتے ہیں اور ان کے اس اقدام نے بیس برس تک پورے عالم اسلام کو متحد رکھا، یہی بعد میں بھی ہوا ہے۔ بڑے بڑے صاحب عزیمت حضرات نے بھی جزئی طور پر برسر اقتدار آنے والے خلفا اور بادشاہوں پر گرفت کی ہے مگر اس نظام کو تسلیم بھی کیا ہے۔

۳۔ ظاہر ہے کہ جب اقتدار پر قبضہ تسلیم کر لیا جائے تو پھر وہ قوانین جو اس کے مطابق نے انتظاماً بنائے ان کو آنے والا بدل سکتا ہے اور اس تبدیلی کے لئے جن افراد کو چاہے وہ مقرر کر سکتا ہے۔

۴۔ ۵۔ اوپر صورت مسئولہ کی جو تفصیل کی گئی ہے اس کی روشنی میں اس کے ساتھ تعاون کرنا شرعاً ضروری ہے، اب اس کی حیثیت امیر کی ہوگی اور امیر کی اطاعت ضروری ہے اگر ایسا نہ کیا جائے تو مزید انتشار پیدا ہوگا۔ حدیث نبوی میں مکرہ اور منشا یعنی جی چاہے یا نہ چاہے دونوں حالت میں امیر کی اطاعت ضروری قرار دی گئی ہے، جیسا کہ اس وقت بھی کئی اسلامی ملکوں میں اس طرح برسر اقتدار آنے والے اشخاص کے سلسلہ میں علما کا عام رویہ اطاعت ہی کا ہے۔ نظام کی تبدیلی کے بعد مجرمین کو سزا دینے کا جہاں تک تعلق ہے وہ البتہ قابل غور ہے۔ مسلمانوں کا عمومی طور پر مزاج انتقامی کارروائی کرکے مخالفین کو سزا دینے کا ہے مگر یہ ضروری نہیں ہوتا کہ جو کسی دوسرے نظام میں اس کا حامی رہا ہو وہ نئے نظام کے لئے مفید نہ ہو، اس لئے اس سلسلہ میں بڑے احتیاط کی ضرورت ہے اور اس کے لئے آزادی کے بعد ہندوستان کی مثال کو سامنے رکھنا چاہئے۔ انگریزوں کے زمانہ میں ملک کے سیاسی لیڈروں کو جن لوگوں نے جیلوں میں ڈالا ڈنڈے مارے اذیت دی آزادی کے بعد انھوں نے ان مجرمین سے ہی ملک کی خدمت لی ان کو پھانسی نہیں کر دیا جیسا کہ ایران میں ہو رہا ہے البتہ جو کسی فتنہ و فساد کا بانی ہو تو اس کو سزا دی جا سکتی ہے۔

میں نے اختصار سے آپ کے فتویٰ کا جواب لکھ دیا ہے، امید ہے کہ اتنی وضاحت ان مسائل میں میری ذاتی رائے معلوم کرنے کے لئے کافی ہوگی۔

(خادم)
مجیب اللہ ندوی

باب الاستفسار والجواب

(۴)

سود سے متعلق چند اور باتیں

رکی ہوئی یا کاٹی ہوئی تنخواہ پر جو اضافہ انٹرسٹ کے نام سے ملتا ہے وہ سود ہے یا نہیں ہے اپریل ستمبر ۱۹۸۰ء کے شمارے میں راقم الحروف نے جو کچھ لکھا تھا اس پر جن ممتاز علماء کے تائیدی خطوط ملے ان میں ایک ملک کے مشہور عالم مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی مدظلہ شارح مشکوٰۃ بھی ہیں۔ اس سلسلہ میں کئی اہل علم نے زبانی گفتگو کی اور وہ مطمئن ہوئے مگر ایک صاحب علم نے گجرات سے اس کے خلاف ایک تحریر بھی جسے پچھلے شمارہ میں نقل کرکے اس کا اطمینان بخش جواب دینے کی کوشش کی گئی مگر وہ مطمئن نہیں ہوئے اور غصہ کا ایک خط لکھا ہے۔ اس خط کا زبانی جواب دینا ہی مناسب معلوم ہوا، البتہ اس خط کے ایک جملہ کی وضاحت عام فائدے کے لئے ضروری معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ "آپ بے جا طور پر تحریم ما احل اللہ کے عظیم منصب پر فائز ہونے کی کوشش نہ کریں"۔ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ یہ مسئلہ نیا ہے اس لئے اسے اجتہادی مسائل میں شمار کرنا چاہئے اور "ما احل" کا فاعل اپنے بجائے اللہ تعالیٰ کو بنانا بڑی جرات کی بات ہے۔ راقم الحروف تو حلال کو حرام نہیں بنا رہا ہے بلکہ تحلیل ما حرم اللہ (یعنی جو چیز اللہ نے حرام کیا ہے یعنی سود، اسے حلال کرنے) کی شناعت اور برائی سے لوگوں کو آگاہ کر رہا ہے، اگر کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے میں شک ہو تو اس کے لئے فقہا کے ان اصولوں کو سامنے رکھنا چاہئے جو کتاب و سنت کی روشنی میں نئے اجتہادی مسائل کے سلسلہ میں انھوں نے بنا دئے ہیں۔

(۱) اذا اجتمع الحظر والاباحۃ کان الحکم للحظر — اگر کسی چیز کے ممنوع اور مباح ہونے کے دونوں پہلو موجود ہوں تو حکم ممنوع کے پہلو کے مطابق دیا جائے گا۔

(۲) درء المفاسد اولیٰ من جلب المنفعۃ — مفاسد کا دور کرنا فائدہ حاصل کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔ (سود اس دور کا سب سے بڑا مفسدہ ہے)

(۳) اذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام — جب حلال و حرام کے دونوں پہلو موجود ہوں تو حرام کے پہلو کو غالب رکھا جائے گا۔

(اگلے شمارہ میں شیخ الحدیث مولانا عبید اللہ صاحب رحمانی مدظلہ کا فتویٰ ہم نقل کریں گے)

باب الاستفسار والجواب

(۳)

محترم جناب مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب
جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
مزاج گرامی !

درج ذیل امور میں آپ کی رہنمائی کا طالب ہوں امید ہے کہ میری رہنمائی فرماکر ثواب دارین حاصل فرمائیں گے۔

سوال	جواب
(۱) کیا شیعہ (اثنا عشری) اہل اسلام ہیں؟	اگر وہ تحریف قرآن اور صحابہ کے ارتداد کے قائل نہیں ہیں تو وہ مسلمان ہیں۔
(۲) کیا ان کے عالم کے پیچھے نماز پڑھی جاسکتی ہے؟	نہیں پڑھی جاسکتی اور باتوں کے علاوہ ہمارے یہاں وضو میں پیر دھونا فرض ہے اور انکے یہاں مسح کافی ہے اس لئے ان کے امام کے پیچھے نماز جائز نہیں۔
(۳) کیا ان کے مساجد اور مجالس میں شرکت کی جاسکتی ہے؟	اگر ان کی مجلس میں تبرا وغیرہ نہ ہوتا ہو تو شرکت کی جاسکتی ہے۔
(۴) کیا ان سے اتحاد کیا جاسکتا ہے؟	ملی وقومی معاملات میں ان سے اتحاد کیا جاسکتا ہے۔
(۵) کیا مسلمان ایران کے اسلامی انقلاب کی تائید و مدد و حمایت کرسکتے ہیں؟	بظاہر اس کی حمایت کرنے میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا۔
(۶) علامہ خمینی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟	علامہ خمینی کو بعض لوگ معتدل شیعہ کہتے ہیں اور بعض

لوگ کہتے ہیں کہ وہ کٹر شیعہ ہیں اور سنیوں کے دشمن
ہیں اور اسی وجہ سے وہ سعودی حکومت کی
مخالفت کرتے ہیں اور عراق کے شیعوں کو وہاں کی
حکومت کے خلاف ابھارتے ہیں اور ایران میں کرد
قوم جو خالص سنی حنفی ہے اس کا قتل عام کراتے
ہیں، اسی طرح انقلاب کے بعد جتنے لائق اور باصلاحیت
افراد کا انھوں نے خون بہایا ہے اسلامی تاریخ
میں اس کی مثال نہیں ملتی، پھر یہ بات بھی قابل
غور ہے کہ آج تک کسی ایک تقریر یا تحریر میں تاریخی
حقیقت کے طور پر بھی انھوں نے خلفائے ثلاثہ کا
ذکر نہیں کیا۔

آپ تحقیق کر لیں اگر پہلی بات ہو تو ان کو اچھا
آدمی سمجھنا چاہئے اور اگر دوسری صورت ہو تو
پھر ان کو امت کے حق میں اچھا آدمی نہیں کہا
جا سکتا۔

فقط والسلام
خادم
محمد ابراہیم
۱۸۔ سوشیلا اا کراس
ماولی۔ بنگلور۔ ۴

"نیکی کر دریا میں ڈال"

کسی کے ساتھ نیکی اور احسان کر کے بھول جانا چاہئے، نیکی اور احسان کا بھول جانا شرافت و بلندی کی بات ہے اور اس کے یاد رکھنے میں احسان کے بدلہ کی توقع ہوتی ہے، اور توقع پوری نہیں ہوتی تو آدمی کڑھتا ہے اور یہ چیز نیکی اور احسان کے ثواب اور فائدہ کو ختم کر دیتی ہے۔ "نیکی کر دریا میں ڈال" کا یہی مفہوم ہے۔

کوائفِ جامعۃُ الرشاد

ماہنامہ جامعۃ الرشاد کے سلسلہ میں اپنے خریداروں اور ہمدردوں سے

جامعۃ الرشاد بنیادی طور پر ایک دینی عربی مدرسہ ہے اور بحمد اللہ اس حیثیت سے وہ ملک اور بیرون ملک میں روشناس ہو چکا ہے مگر اس کے کاموں کا دائرہ محض مدرسہ تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ بہت سے ملی کاموں تک پھیلا ہوا ہے، گو ذرائع آمدنی کے اعتبار سے ضلع کا یہ غریب ترین ادارہ ہے مگر اس کے ذمہ داروں کے پیش نظر ہمیشہ پیسہ کے بجائے دینی و ملی ضرورت رہی اس لئے انھوں نے بہت سے دینی و ملی کام ظاہری و مادی ذرائع کے بغیر ہی شروع کر دیئے اللہ خدا تعالیٰ نے دستگیری فرمائی اور وہ کام جاری رہا، یہی صورت حال ماہنامہ جامعۃ الرشاد کے سلسلہ میں پیش آئی کہ کچھ دینی و ملی ضرورتوں کے پیش نظر بغیر کسی مستقل ذریعہ آمدنی کے اس کا اجرا کر دیا گیا خدا کا شکر ہے کہ دس مہینے کے اندر اس کی اشاعت پانچ سو سے زیادہ ہو گئی ہے مگر کتابت و طباعت اور کاغذ کی غیر معمولی گرانی کی وجہ سے ابھی تک ہر ماہ پرچہ کو کئی سو کا خسارہ ہو رہا ہے، راقم الحروف اپنے خریداروں اور ہمدردوں سے دردمندانہ گذارش کر رہا ہے کہ اگر آپ اس پرچہ کو مفید تصور کر رہے ہوں تو براہ کرم آپ حضرات اپنے اثر سے صرف ایک ایک خریدار کا اضافہ کر دیں، اتنے اضافہ کے بعد یہ پرچہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا اور ادارہ کئی سو روپئے ماہوار خسارہ سے بچ جائے گا، میں امید کرتا ہوں کہ میری درخواست رد نہ ہو گی۔

آج سے چند ماہ پہلے مولانا مختار احمد ندوی صاحب نے اپنے ادارہ سے بہت سی مطبوعات

مدرسہ کو بھی بھیجیں، ادھر برادرم مولانا تقی الدین صاحب ندوی ابوظبی سے چند دنوں کے لئے اعظم گڑھ اپنے وطن آئے تھے، ازراہ کرم دو شب مدرسہ میں ان کا قیام رہا اور انھوں نے طلبہ اور اساتذہ کو خطاب بھی کیا، ان کی اخلاقی و مالی مدد تو مدرسہ کو بہت پہلے سے ملتی رہی ہے مگر اس بار انھوں نے کچھ علمی اعانت کا بھی وعدہ کیا ہے خاص طور پر المعجم المفہرس کی فراہمی کا وعدہ کیا ہے۔ "المعجم المفہرس" حدیث نبوی کے پندرہ مشہور مجموعوں کی سب سے بڑی اور مفصل فہرست ہے، اگر کسی حدیث کا ایک لفظ بھی معلوم ہو تو آپ بہت آسانی سے اس کے ذریعہ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ حدیث کے پندرہ مجموعوں میں یہ لفظ کس کتاب میں اور کہاں کہاں آیا ہے اس کی چھ ضخیم جلدیں ہیں جو سب سے پہلے لوزاک کمپنی لندن کی طرف سے شائع ہوئی تھی اب اسے عرب ملکوں کے کئی ناشروں نے چھاپ دیا ہے، امید ہے کہ اس کے علاوہ کئی اور اہم کتابیں مولانا مدرسہ کے لئے فراہم کریں گے۔

انجمن تعلیمات دین ضلع اعظم گڈھ (شاخ دینی تعلیمی کونسل اترپردیش) کی طرف سے ضلع کے مکاتب اسلامیہ کے تعلیمی معیار کو بلند کرنے اور ان میں زیادہ سے زیادہ دینی زندگی پیدا کرنے کیلئے جو جد و جہد برسوں سے کیجا رہی ہے اس کے تحت ان مکاتب میں کیجائی سالانہ امتحان کا انتظام اور سال میں ایکبار مکاتب کے بچوں کا تعلیمی اور کھیل کود کا مقابلہ بھی کرایا جاتا ہے، اس سال سات چیزوں میں مقابلہ کا پروگرام بنایا گیا تھا اور بحمد اللہ پورا ہوا۔ (۱) ادائے مخارج کے ساتھ قرآن کا پڑھنا۔ (سورۃ والضحٰی سے سورۃ ناس تک کی کوئی بھی سورۃ حصہ لینے والے بچے سے بروقت پڑھنے کیلئے کہا گیا۔) (۲) تقریر (۳) نظم خوانی (۴) مکالمہ (۵) اردو خوشخطی (۶) ہندی سلیکھ (۷) لمبی کود جس میں صرف چار فٹ چار انچ اونچے بچے شامل کئے گئے، یہ مظاہرہ ضلع کے ۱۵۔ ۲۰ سنٹروں پر ہوتا ہے اور ہر سنٹر پر جو بچے اول آتے ہیں ان کا ایک مرکزی مقابلہ جامعۃ الرشاد میں ہوتا ہے۔ چنانچہ ۷؍ جنوری ۱۹۸۳ء کو یہ مرکزی مقابلہ ہوا اور بحمد اللہ مکاتب کے ذمہ داروں اور اساتذہ نے ذوق و شوق سے بچوں کو اس میں شریک کیا، اول، دوم، سوم آنے والے بچوں کو خصوصی انعام تقسیم کئے گئے اور تمام شریک ہونیوالے بچوں کو عمومی انعامات دیئے گئے۔ اس موقع پر ہمارے ایک ہندو دوست ایودیا مشرا نے تقریباً سو روپئے کے نقد انعامات مختلف بچوں کو دیئے۔ جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

۱۸ رجنوری ۱۹۸۲ء کو مولانا محمود الحسن صاحب ناظم دینی تعلیمی کونسل پروگرام کے مطابق اعظم گڈھ تشریف لائے ۱۹ رکی شام کو ان کے ایما پر انجمن تعلیمات دین ضلع اعظم گڈھ کی میٹنگ بلائی گئی مولانا نے اس میں ضلع کے کام کے سلسلہ میں ضروری مشورے دیئے۔ ۲۰ رکو مولانا کا پروگرام مئو اور ۲۱ رکو رسڑا ضلع بلیا کا تھا۔ اس سفر میں راقم الحروف کو ساتھ چلنے کے لئے انھوں نے پہلے سے لکھدیا تھا۔ اگر میں اپنی مشغولیتوں اور صحت کے پیش نظر ان سے معذرت کردینا چاہتا تھا لیکن یہ دیکھکر کہ مجھ سے تقریباً دس برس بڑے ہوتے ہوئے اور صحت کی انتہائی خرابی کے باوجود اس کام کے لئے یہ اتنے لمبے لمبے سفر طے کرتے ہیں تو معذرت کرتے ہوئے شرم محسوس ہوئی اور مولانا کی معیت میں ہم لوگ ۲۰ رکو مئو پہنچے وہاں دار العلوم مئو میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں دس پندرہ مخصوص افراد شریک ہوئے اور انجمن کی ایک ایڈہاک کمیٹی کی تشکیل ہوئی جس کے کنوینر مختر اعظمی صاحب بنائے گئے۔ مئو سے شام کو ۴ بجے روانہ ہوکر ہمارا قافلہ رسڑا پہنچا دوسرے دن ضلع بلیا کے مختلف مقامات سے آئے ہوئے حضرات کا اجتماع ہوا جس میں ہر طبقہ کے پڑھے لکھے اور سمجھدار لوگ موجود تھے۔ راقم الحروف اور مولانا محمود الحسن صاحب کی تقریروں کے بعد ضلع انجمن تعلیمات دین کی جدید تشکیل ہوئی جس کے کنوینر جناب محمد علی قریشی صاحب بنائے گئے۔ محمد علی قریشی صاحب پروجیکٹ آفیسر تھے جو ریٹائر ہونے کے بعد اپنا سارا وقت ملی کاموں میں لگاتے ہیں ان کے ساتھ ڈاکٹر عبید اللہ صاحب اور ڈاکٹر امین صاحب وغیرہ نے پوری دلچسپی اور ہر طرح کا تعاون کیا ان حضرات کی لگن، خلوص اور محنت سے اندازہ ہوتا ہے کہ ضلع بلیا میں ایک مدت کے بعد دینی تعلیمی کونسل کی تحریک پھر سے زندہ ہوگی۔

ششماہی امتحان

۲۵ رتا ۲۸ رجنوری ۱۹۸۲ء کو درجہ عربی اور حفظ کے ششماہی امتحانات ہوئے۔ بحمد اللہ طلبہ نے پوری محنت سے امتحانات میں شرکت کی اور نتیجہ تقریباً ۸۰ فی صدر رہا۔ پورے مدرسہ میں سب سے زیادہ نمبر درجہ ششم کے طالب علم عزیزی عبد المجید لائے اور حفظ میں سب سے زیادہ نمبر عزیزی خلیق احمد لائے۔ پورے مدرسہ میں اول، دوم اور سوم پوزیشن لانے والے طلبہ کو انعامات دئے گئے۔ اس سے پہلے دسمبر میں مکتب کے بچوں کا امتحان ہوا تھا جس میں اول، دوم، سوم آنے والے طلبا کو انعامات تقسیم کئے گئے تھے

۲۶ رجنوری کو مدرسہ میں ہر سال کی طرح اس سال بھی بچوں کا ایک پروگرام رکھا گیا تھا جس میں مختلف بچوں نے تقریر اور نظم خوانی وغیرہ کا پروگرام پیش کیا، آخر میں راقم الحروف نے ۲۶ر جنوری کی اہمیت پر کچھ باتیں عرض کیں، خاص طور پر یہ بات ذہن نشین کرائی گئی کہ ۱۵ر اگست ہماری سیاسی آزادی کا دن ہے اور ۲۶ر جنوری ہماری دستوری آزادی کا دن ہے۔ اس لحاظ سے ہم بھی اس دن کی خوشی میں شریک ہیں مگر یہ افسوس ضرور ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں دستور کا نفاذ ہے ان کی کوتاہی کی وجہ سے ہماری اس خوشی میں کچھ غم کا پہلو بھی شامل کر ہو گیا ہے۔

کوائف جامعۃ الرشاد لکھے جا چکے تھے کہ اس درمیان میں مولانا محمد نعیم صاحب صدیقی اپنی سالانہ چھٹی پر ابوظبی سے وطن آئے۔ ان کو ابتدا سے جامعۃ الرشاد سے جو تعلق رہا ہے اس کی بنا پر متعلقین مدرسہ کو ان کی آمد و ملاقات سے کیا کم خوشی تھی کہ وہ مدرسہ کے حق میں سالماً غانماً بھی آئے۔ ایک معتد بہ رقم کے ساتھ وہ اپنے ساتھ کئی قیمتی کتابیں بھی لائے، ان کتابوں میں دو دو جلدوں میں ایک ضخیم فقہی کتاب مصادر الحق اور دوسری التفسیر والمفسرون ہے، تیسری اہم کتاب الامام محمد بن مسلم بن عبید اللہ ابن شہاب زہری (۵۱-۱۲۴ھ) کی "المغازی" ہے امام زہری زمرۂ تابعین کے سرسبد اور حدیث و تفسیر کے مرجع کل اور مغازی یعنی سیرت نبوی کے امام سمجھے جاتے ہیں اور سیرت نبوی کے موضوع پر یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو عہد صحابہ ہی میں مرتب ہوئی اسی لئے سیرت کی تمام کتابوں میں ان کی مغازی کی روایتوں کا ذکر آتا ہے یہ کتاب [illegible] چھپ چکی ہے مگر اغلاط سے پر تھی۔ اب ڈاکٹر سہیل زکا نے اس کے مراجع کی پوری تحقیق اور تصحیح کے ساتھ شائع کیا ہے، انشاء اللہ آئندہ اس پر مستقل تبصرہ کیا جائے گا، راقم الحروف کو پہلی بار اس اہم کتاب کی زیارت ہوئی ہے اس لئے وہ اسے نعمت غیر مترقبہ سمجھتا ہے۔ ان قیمتی تحائف کے لئے متعلقین مدرسہ مولانا محمد نعیم صاحب صدیقی کے صمیم قلب سے مشکور ہیں اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ہم برادران عزیز مولانا ظہور الاسلام ندوی، مولانا محمد پاشا ندوی اور ابو سعد ندوی کے بھی مشکور ہیں کہ وہ مولانا محمد نعیم صاحب کے شریک کار بھی رہے اور خود بھی ہر ایک نے انفرادی طور پر مدرسہ کی اعانت کی، جناب مسرت حسین صاحب کے بھی ہم صمیم قلب سے شکر گزار ہیں کہ صرف اسلامی رشتہ اور جذبۂ خیر کی بنا پر ایک اجنبی دینی ادارہ کی اتنی دور رہ کر مدد کی۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس کی بھرپور جزائے خیر دے۔

الرشاد کی ڈاک

الرشاد کے خریداروں کا حلقہ تو بہت وسیع نہیں ہے مگر بحمد اللہ پڑھنے والوں اور قدر دانوں کا حلقہ روز بروز وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ کوئی دن ایسا خالی نہیں جاتا کہ پرچے کے بارے میں کوئی نہ کوئی خط نہ آتا ہو۔ سارے خطوط کو شائع کرنا تو ممکن نہیں ہے مگر جن میں کسی علمی یا ملی مسائل کے بارے میں کوئی رائے دی گئی ہو اسے شائع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس مہینے دو خط شائع کئے جا رہے ہیں . . . . .

از فتن سرائے سیتاپور
۱۳ر جنوری ۸۲ء

محترم گرامی قدر، السلام علیکم

ادھر بھائی طاہر صاحب اعظم گڑھ اپنے ایک عزیز کے وفات کے سلسلہ میں گئے تھے ان سے وسیلہ سے خطبۂ نکاح اور الرشاد کا ایک شمارہ بابتہ ماہ اکتوبر و نومبر مطالعہ کرنے کا شرف حاصل ہوا۔ رسالہ کے علمیت اور افادیت کی کیا تعریف کی جائے خدا کرے جلد طباعت وکتابت بھی رسالہ اور جامعہ کے شایان شان ہو جائے۔ زیادہ تر مضامین آپ کے کاوش کے نتائج ہیں اور سب سیر حاصل مضامین ہیں اس پر بے ساختہ زبان پر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو نظر بد سے محفوظ رکھے۔ "مسئلہ کفارت" پر ایک طویل عرصہ سے میں بھی یہی رائے رکھتا تھا۔ مگر میری تائید میں نہ کوئی شخص تھا اور نہ کوئی مضمون اس قسم کا گذرا تھا جب سے ہم لوگوں نے ایک خاص نہج سے اس مسئلہ کو پکڑ رکھا ہے اس وقت سے اچھے خاندانوں کے بننے کا راستہ مسدود ہوتا گیا۔ اس مسئلہ کو تو ایک تحریک کی شکل میں چلنا چاہئے تھا کہ

اس لعنت کی روک تھام ہو سکے، اگر آپ کے انداز پر لوگوں میں سوچنے کا انداز پیدا ہو جائے
تو کتنے غیر مسلمین اور خاص طور سے اچھوت اسلام میں داخل ہونے لگیں۔ زمانہ ہر مسئلہ کو
عقل کے ترازو پر تولنے کا عادی ہوتا جا رہا ہے، اگر ہونے والے مسلمانوں کو فی الواقع ہمارے
یہاں مساوات کا مرتبہ ملنے لگے تو جو لوگ متردد ہیں وہ اسلام سے مشرف ہونے لگیں
ہندو شریعت کے رو سے گائے کا گوبر اور پیشاب تو متبرک ہے بلکہ اس کا کھانا پینا تک
باعث برکت ہے مگر اچھوت کا سایہ بھی ناپاک ہے۔ قانون بننے سے مذہب کے تصورات
کیسے بدل سکتے ہیں اعلیٰ ذات کے لوگ جو کئی پشت قبل مشرف باسلام ہوئے تھے آج تک
نو مسلم کہکر ان کو اپنے سے فروتر سمجھا جاتا ہے حالانکہ اگر وہ ہندو رہے ہوتے تو ان کے معاشی اور
معاشرتی حالت اس سے بہتر ہوتی اور ان کے بچوں کی شادی میں سہولت رہتی۔ جب یہ
نمونہ موجود ہے تو کوئی مسلمان کیوں ہو؟ ایک معزز اور ذی علم ہندو نے قرآن شریف کے ترجمہ
کے ایک ایک جز کے پڑھنے کے بعد فرمایا کہ قرآن جو کچھ کہتا ہے وہ حق ہے مگر عملاً مسلمانوں کے
طور طریق میں ہندوؤں کے مقابلہ میں کوئی فرق نہیں، اسلام جن چیزوں سے روکتا ہے وہ سب
معائب مسلمانوں میں موجود ہیں۔ اب اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ایک
بہتر معاشرے سے بدتر معاشرہ میں داخل ہو گیا اور پھر میری لڑکیوں سے شادی کون کریگا؟

والسلام

آپکا خادم۔ سید محمد آفاق ریٹائرڈ ٹیچر

فتن سرائے۔ سیتاپور

مکرمنا المحترم زادکم اللہ مجداً و کرامۃ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا، خیریت طرفین مطلوب ہے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی
رحمۃ اللہ علیہ کی تصنیف، فتح الرحمٰن فی اثبات مذہب النعمان کا ایک نسخہ بذریعہ رجسٹری ہدیۃً
ارسال خدمت ہے۔ احناف کی تائید میں احادیث کا بے نظیر سرمایہ ہے۔ اس کی خوبی کا

صحیح اندازہ اس کے مطالعہ سے ہی ہو سکتا ہے پہلی بار طبع ہو رہی ہے اس لئے بطور ہدیہ جناب
کی خدمت میں پیش ہے اس کتاب کا صرف ایک قلمی نسخہ موجود ہے جو جامعہ ملیہ دہلی کے مخطوطات
میں ہے اس میں اور اس پیش نظر کتاب میں صرف نام کا فرق ہے اس کتاب کے مقدمہ میں
شیخ نے فتح المنان فی تائید مذہب النعمان لکھا ہے۔ باقی پوری کتاب حرف بہ حرف ایک ہے
احقر نے اس کتاب کا مقابلہ خود جامعہ ملیہ کے نسخہ سے خود جاکر کیا ہے، البتہ شائع ابھی صرف ایک جلد
ہوئی دوسری و تیسری جلد دعا فرمائے جلد شائع ہو کر ہاتھوں میں آجائے۔
غالباً خلیق نظامی صاحب نے اس کتاب کا ذکر اپنی تصنیف میں کیا ہے، بہرحال ایک نسخہ
ہدیۃً بھیج رہا ہوں قبول فرما کر ممنون فرمائیں۔

فقط والسلام

بندہ نظام الدین۔ دارالعلوم دیو بند ۱۲ر۳ر۱۴۰۲

نوٹ:۔ مفتی مولانا نظام الدین صاحب کا گرامی نامہ اس اہم کتاب کے تعارف کے لئے کافی ہے اس لئے
اسے شائع کیا جا رہا ہے۔ امید ہے ہماری درسگاہوں کے طلبہ اور اساتذہ اس سے پورہ فائدہ
اٹھائیں گے۔

"آمدنی و خرچ"

کمانا آسان ہے مگر خرچ کرنا مشکل ہے، زندگی میں اطمینان و سکون محض آمدنی کے
بڑھانے سے نہیں بلکہ خرچ پر کنٹرول کرنے اور کفایت شعاری سے حاصل ہوتا ہے۔ کفایت شعاری
اور بخالت کی سرحد ملی ہوئی ہے اس لئے بخالت سے بچنا بھی ضروری ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو
باحیثیت بنایا ہے تو اپنے بچے اور بچیوں کی شادی کے لئے کچھ پیسہ بچا کر کسی غریب عزیز یا کسی پڑوسی
کی بچی یا بچے کا نکاح بھی اپنے بچے یا بچی کے ساتھ کر دینا اپنے اوپر ضروری قرار دے لیں، ایسا
کرنا آپ کا دینی و اخلاقی فرض ہے۔

نئی کتابیں

تفسیر بسم اللہ اور سورہ فاتحہ | از مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ۔ مکتبۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ۔ صفحات ۴۸ قیمت ۲/۵۰

مولانا حمید الدین صاحب فراہی نے قرآن پاک پر برسوں غور و فکر کر کے اس کی تفسیر اور اس کے درس کے ایک نئے تحقیقی انداز سے اہل علم کو روشناس کیا، خاص طور پر نظم قرآن ان کا خاص موضوع تھا، اس انداز پر وہ پورے قرآن پاک کی تفسیر تو نہیں لکھ سکے مگر انھوں نے جو کتابیں یادگار چھوڑی ہیں اور کئی متفرق سورتوں کی جو تفسیریں وہ لکھ گئے ہیں انہی میں یہ رسالہ بھی ہے جسے انھوں نے عربی میں لکھا تھا اور اس کا ترجمہ مولانا امین احسن صاحب اصلاحی نے کیا ہے۔

اس میں سب سے پہلے بسم اللہ اور سورۃ فاتحہ کے نظم پر بحث ہے اور پھر اس کے ایک ایک جملہ کی تفسیر مولانا نے اپنے خاص تحقیقی انداز سے کی ہے اور دکھایا ہے کہ علوم سہ گانہ، توحید رسالت اور معاد کا بیان جو قرآن کا اصل موضوع ہے اس مختصر سورت میں سمیٹ کر رکھدیا گیا ہے، پھر یہ سورت نظم قرآن کا نمونہ ہے اور تکمیل نماز کی سورہ ہے، اور پھر یہ دکھایا ہے کہ سورۃ فاتحہ کے بنیادی مضامین کی تعلیم تمام انبیاء کو دی گئی مگر مکمل صورت میں یہ نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو عنایت ہوئی جس جگہ مولانا ادنی مناسبت سے نظم پر بحث کرتے ہیں وہاں ضروری نہیں کہ ذہن کو اس سے پوری تسکین ہو مگر اس سے اُنکی دقیقہ سنجی کا اعتراف کئے بغیر بھی چارہ کار نہیں ہے۔ امید ہے کہ یہ رسالہ بھی ان کے دوسرے رسالوں کی طرح اہل علم کے نئے ذوق تحقیق کا سامان فراہم کرے گا۔

القرأة العربیہ
حصہ اول ، دوم

از مولانا عبدالمجید صاحب اصلاحی ۔ مکتبۃ الاصلاح ، سرائمیر اعظم گڈھ
قیمت ۵ ـ ۰۰ ـ ۵

آج سے سو برس پہلے ندوۃ العلماء نے رائج عربی نصاب تعلیم میں دو طرح کی تبدیلیوں کی ضرورت محسوس کی تھی پہلی یہ کہ ہر فن کی بہت سی کتابوں کے بجائے چند بنیادی کتابیں رکھی جائیں اور انکو فن کی حیثیت سے پڑھایا جائے اور پوری مدت تعلیم میں قرآن پاک اور حدیث نبوی کو بنیادی اہمیت دی جائے۔ دوسری یہ کہ صرف ونحو اور عربی ادب و بلاغت میں متقدمین کی کتابیں یا اس طرز کی کتابیں داخل کی جائیں یا ان موضوعات پر خود ایسی کتابیں تیار کی جائیں جو جدید ضروریات کو پوری کر سکیں اور طلبہ میں عربی تقریر و تحریر کی صلاحیت بھی پیدا ہو سکے۔ اور براہ راست کتاب و سنت کے سمجھنے کی صلاحیت بھی۔ ندوہ نے ان دونوں پہلوؤں سے اپنے یہاں نصاب میں تبدیلی کی اور کامیابی سے اس پر عمل بھی کیا۔

خوش قسمتی سے مدرسۃ الاصلاح کو ابتدا ہی سے مولانا حمید الدین فراہیؒ کی سرپرستی کے ساتھ علامہ شبلیؒ کی رہنمائی بھی حاصل رہی جو اصلاح نصاب کے سب سے بڑے حامی تھے اور جس کا تجربہ وہ ندوہ میں کر چکے تھے اس لئے ان کی وجہ سے یہاں کا نصاب تعلیم بھی ندوہ کے بنیادی فکر سے ہم آہنگ رہا پھر ایک مدت تک ندوہ کے کئی فضلا مدرسہ کے ممتاز اساتذہ میں رہے اس لئے عملاً بھی اسے ندوی فکر سے استفادہ کا موقع ملا مگر اتحاد فکر کے باوجود مولانا فراہی کی علمی سرپرستی کی وجہ سے مدرستہ الاصلاح نے بہت سے پہلوؤں سے اپنا ایک امتیاز بھی قائم رکھا۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی وہ کتابیں ہیں جو مولانا حمید الدین صاحب نے تیار کیں یا ان کے بعد وہاں کے متعدد فضلا نے ترتیب دیں، انہی کتابوں میں القرأۃ العربیہ بھی ہے جسے عربی ادب کے ایک معروف استاذ مولانا عبدالمجید الاصلاحی صاحب نے ترتیب دیا ہے۔ یہ کتاب اس طرح ترتیب دی گئی ہے کہ اس سے طلبہ کو عربی ادب سے بھی مناسبت پیدا ہو جائے گی اور صرف ونحو کے پڑھتے ہوئے قواعد کا اجرا بھی ہوتا جائے گا اور بہت سے مترادف الفاظ بھی ذہن نشین ہو جائیں گے جن سے طلبہ کو انشا لکھنے میں مدد ملے گی۔ بعض وہ اصطلاحیں جو مولانا حمید الدین صاحب نے اسباق النحو میں استعمال کی ہیں انہی کو مرتب نے بھی دہرایا ہے، مثلاً مضارع اخف، خفیف وغیرہ، لیکن

عام عربی مدارس کے اساتذہ و طلبہ ان سے واقف نہیں ہیں اس لئے ضرورت تھی کہ وہ عمومی اصطلاحیں استعمال کی جاتیں جو صرف و نحو کی عام کتابوں پر مستعمل ہیں اور ان مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں تو زیادہ مفید ہوتیں۔ بہر حال یہ رسالے اس قابل ہیں کہ عربی مدارس کے ابتدائی درجات میں داخل کئے جائیں۔ امید ہے کہ عربی مدارس کے ذمہ دار اور اساتذہ اس مفید رسالہ کو اپنے یہاں ضرور داخل کریں گے۔

المیہ دارالعلوم دیوبند

از مولانا محمد عارف صاحب اعظمی استاذ دارالعلوم مئو ناتھ بھنجن۔

آہ جو علم نبوت کا تھا اک حصن حصین
قابل رشک جناں جسکی بدولت تھی زمین

ہند میں ایک صدی سے تھا بصد شان و شکوہ
سید کیؐ کے اقوال مبارک کا امین

جس نے پیدا کئے محمود بہت عالم میں
افق علم پہ جو لوگ ہوے ماہ مبیں

قاسم و اشرف و امداد حسین و انور
ہند کی جس کی بدولت ہے درخشندہ جبیں

اہل حق کے لئے ایک قلعہ مستحکم تھا
ہو نہیں سکتا تھا باطل دخل انداز کہیں

کتنی طاقت سے چلا دہر میں سیلاب فرنگ
وہ رہا سینہ سپر پاؤں ہٹے اس کے نہیں

آہ وہ آج ہے اپنوں ہی کے ہاتھوں مظلوم
قصۂ درد کہوں کس سے بتا قلب حزیں

القياس في الاسلام

(٢)

مجيب الله الندوی

المصادر القاعدية للشرع الاسلامی

المصادر القاعدية للشرع الاسلامی اربعة ودليل الحصر هو ان مسائل الفقه الاسلامی انما تنحصر فی اربع صور اما هی ماخوذة من نص (١) القران واما هی ماخوذة من السنة النبوية او من اجماع الامة او من استنباطات المجتهدين منها واجتهاداتهم وفق اشارات الكتاب والسنة ومرادهما فی ضوء القواعد الشرعية ـ وبناء على ذالك فقد قرر العلماء لاخذ القانون اربعة مصادر اساسية وهی الكتاب والسنة والاجماع والقياس والاجتهاد۔

الكتاب يراد به القران (٢) وهو المصدر الرئيسی للتشريع الاسلامی فهو يختص المبادئ الاساسية كلها لاحكام الاسلام ويوضح الطريق ومعالمها الى العلم باحكام الشرع والاتصال بها. الا ان العقائد قد ذكرت فيه بشئ من التفصيل والعبادات والحقوق الانسانية جاءت على سبيل الاجمال و القرآن شانه كشأن

---

۱ النص هو المتن الخالص لحكم من الاحكام وكلمة النص تطلق على الوجه الاعم للاحكام القطعية والعلماء اذا قالوا هذا منصوص فانما يعنون بذالك ثبوت الحكم بالكتاب والسنة والاجماع ثبوتا قطعيا. ۲ كتاب الله فی المصطلح الشرعی هو القران المنزل على رسول الله صلى الله عليه وسلم المكتوب فی المصاحف المنقول عن النبی صلى الله عليه وسلم نقلا متواترا بلا شبهة وهو النظم والمعنى (شرح الاصول) ولكن العلماء لم ياتوا بهذه القيود فی التعريف بالقران الا منذ ان

الدستور (٣) — فى الشرائع الوضعية وهو سراج منير للنبى صلى الله عليه وسلم للامة على السواء ولاجل ذالك فقط اتخذوه مصدرا رئيسيا للتشريع الاسلامى ولكن بالرغم من كونه متصفا بصفة الدستور يذكر الاحكام بالاجمال (٤) وقلما يفصل الجزئيات القانونية وصورها وذالك لانه بطول ذكر التفاصيل يفوت القرآن مقاصده الاخرى من بلاغة كلامه واعجاز بيانه وغيرذالك من المعانى الاخر فالصلوة والصوم جاء بذكرهما القرآن مثلا على سبيل الاجمال ولم يفصل الكيفية لهما ولا الكمية.

وهذا الذى فصلته السنة وهى تحتوى على اقوال النبى صلى الله عليه وسلم وافعاله وكذالك الشان فى العقود والعهود فالقرآن يامر بايفاء كل وجه من وجوه هذه العقود كما هو يامر بتحليل البيع وتحريم الربوا على سبيل الاجمال ولم يات لذالك بتفصيل ولم يبين وجوها للحق والباطل فى الصفقات و البيع فلم يقل ذالك واجب لايجوز العدول عنه وهذا يجب تركه وانما السنة هى التى تتعرض لبيان وجوه الحلال والحرام فى المعاملات وتقرر الاحكام.

---

* نشاء البحث عن ذات الله وصفاته ومن مسئلة خلق القران بصفة عامة اما الصحابة فقد كانوا يكتفون باسم الكتاب اوكتاب الله فقط وقد اكد القران له هذا لا لغير مرة كما قال " تنزيل الكتاب من الله العزيز الحكيم" و تنزيل من الرحمن الرحيم"

(٣) هذه اشارة الى المصطلح القانونى الذى يميز به الخبراء بالقانون بين القانون وبين الدستور.

(٤) ان العلماء يعرفون بالحكم المجمل فى المصطلحات الشرعية كما يلى:

"المجمل ما ازدحمت فيه المعانى واشتبه المراد اشتباها لا يدرك بنفس العبارة بل بالرجوع الى الاستفسار ثم الطلب والتامل (البزدوى ص ٢٨)

وبعد ربكم ان تذكروا هنا شيئا آخر وهو انه لابد لفهم القران ان لا يكتفى بعبارة نصه

هكذا اعادة القرآن بصفة عامة مع انه يفصل الجزئيات لبعض الاحكام
فلقد جاء ببيان تفصيلي لاحكام الارث(١) واللعان وبعض الجنايات والعقوبات
عليها كما انه فصل القول في محرمات النكاح.

ومن ابرز خصائص القرآن وافضلها انه اجمل القول في بيان الاحكام المدنية
او الاحكام الاجتماعية والسياسية وذالك من اجل انه بفضل هذا الاجمال يوفر
على الانسان فرصة امعان النظر في تلك الاحكام والاهتداء الى تطبيقها في صور
مختلفة ووجوه متنوعة محكومة بحدود النصوص القرآنية وهذا الامعان فيها
السعى وراء ادراك حقائقها كل ذالك يجعلها صالحة لتلبية جميع الحاجات المتجددة في
حدود قانونه هو وحسب اتجاهه الذاتي وييسر العمل بها على اختلاف الزمان حتى
لا تمس مبادئ الشريعة الاسلامية ولو قيد شعرة.

ومن امثلة ذالك ان القرآن قد أمر بالشورى (١) في الامور السياسية ولكنه
لم يدل على صورة معينة لها فلابد ان يكون هذا الأمر موجها الى الهيئات الادارية
التي تخلو من الاستبداد بالقوة وسلطان الدكتاتورية ديموقراطية كانت ام على

فحسب بل لانه مما يلزمه ايضا ان ينظر في اشارة نصه ودلالته واقتضائه فانه
بذالك تستنبط مسائل كثيرة وعلى ذالك فالنص على اربعة أقسام: عبارة النص
دلالة النص واشارة النص واقتضاء النص.

٥) المراد بالكيفية كيفية اداء الاركان الظاهرة والافقد اوضح القرآن بكلماته
من الخشوع والخضوع والانابة والاخلاص والمحافظة ما في بواطن الصلوة والصوم
الزكوة من معان سامية.

١) ذكر حكم الوراثة في اول سورة النساء وآخرها وذكر اللعان في سورة النور وجيئي بتفاصيل
المحرمات في سورة النساء وذكرت الحدود في سورة النور وسورة المائدة وغيرهما.

١) جاء في القرآن "وأمرهم شورى بينهم (سورة الشورى) و"شاورهم في الأمر"
(سورة آل عمران)

طراز الامبراطورية الشرعية (٢) او من نوع نظم للحكم قامت على رعاية مصالح عامة الناس حيث لا يتمتع (٣) فرد ولا جماعة بالارجحية على الاستمرار هذا وهي لا تزال تعيش تحت ظلال الشورى وتعتز بآراء ذوي العقول من اصحاب الرای والعلم۔

اهمية السنة

المصدر الثاني للقانون الاسلامي هو هذه السنة وقد تبين لكم مما سبق من خصائص القرآن أن كثيرا من الاحكام القرآن لا مندوحة لبيان معانيها وشرحها وذكر تفاصيلها من هذه السنة على صاحبها الف الف تحية و سلام كما ان هذه السنة يتعذر ايضا بدونها تعيين كثير من الاحكام و تطبيقها في مختلف مجالات الحياة ولا تعرف بغيرها تلك الحدود التي تتميز بها الصور المختلفة لأي حكم من احكام الشرع ولاجل ذالك نرى أن القران يامرنا في مثل هذه التفاصيل ان نبحث عنها في السنة فهو يقول: وما آتاكم الرسول فخذوه (٤) وما نهاكم عنه فانتهوا - (سورة الحشر)

(٢) توجد الامبراطورية الشرعية في انجلترا و غيرها من الأقطار التي تحذ وحذوها و من قبل وجدت في يابان و مصر والفارس والعراق و غيرها۔

(٣) مثلما يتمتع به الحزب الشيوعي من الارجحية في النظام الاشتراكي بصورة دائمة فرجال هذا الحزب لهم الحق دائما في التنازع للحصول على سلطة الدولة اما اذا اراد احدهم ان يولف هيئة سياسية او مؤسسة اجتماعية أخرى فلا۔

(٤) هنا في القرآن ايات كثيرة غيرها مما يزيح الستار عن اهمية السنة ومسيس الحاجة اليها في بيان احكام القران وتفاصيلها نحو "وانزل اليك الذكر لتبين للناس و انزلنا عليك القران لتبين لهم الذي اختلفوا فيه ومعنى ذالك ان البيان الذي جاء به الرسول في تاويل اية من ايات القران وفي القضايا العصرية والشئون الخلافية انما هو العمدة والجدير بالاستناد به فان الله تعالى رفعه الى هذه المكانة العليا ولاجل ذالك نرى العلماء يكتبون دائما "السنة تفسر الكتاب" و اليكم من القران اية اخرى تهدد الذين يخالفون احكام الرسول وهي اعظم دليل على كون السنة مصدرا من مصادر القانون الاسلامي " فليحذر الذين يخالفون عن امره ان تصيبهم فتنة او يصيبهم عذاب اليم "

وعلى ذالك قالوا ان السنة النبوية هي مفتاح كتاب الله (اى التي يفتح معانيه) والسنة تطلق على اقوال النبى صلى الله عليه وسلم وافعاله وتقريره (١) ومن هذا الوجه فهي مترادفة لكلمة " الحديث " وهي ربما (٢) تطلق على التعامل الواقع في عهد النبى صلى الله عليه وسلم وعهد الخلفاء الراشدين والفرق لا يظهر الا اذا رأينا ان حديثا لفظيا ينقل عن حكم ثم رأينا في التاريخ الأسلامى خلاف ذالك فان اهل العلم عملا في عهد النبوة وهو يخالف الحديث او يقولون ان الخلفاء الراشدين لم يزالوا يعملون ضد ذالك الى امد بعيد فهنالك يقال كذا ورد في الحديث ولكن العمل خلاف ذالك۔

---

(١) التقرير معناه الفعل الذى أتى به بين يدى الرسول أو في عصره فرآه او سمعه ولم ينكره — (٢) سئل عبد الرحمن المهدى امام الجرح والتعديل عن سفيان الثورى والامام الأوزاعى فقال سفيان الثورى امام الحديث والامام الاوزاعى امام السنة (اى امام علم التعامل الذى وقع في عهد النبى وعهد الخلفاء الراشدين) والامام مالك امام الحديث والسنة معا (شرح الموطا للزرقانى) فنبه بقوله الى الفرق القائم بين الحديث والسنة وبهذه المناسبة لابد من النظر في الفرق بين الحديث والرواية فان عدم النظر في ذالك قد اوقع كثيرا من الناس في اخطاء جمة عن حقيقة الحديث والسنة فالحديث أو السنة هي الروح والرواية هي القالب وبعبارة أخرى الحديث او السنة هي المتن والرواية هي السند ويعنون بذالك ان الرواية هي الوسيلة الى بيان ما يحوى الحديث او السنة من لأجل ذالك نرى انها وردت لبيان حديث واحد اوسنة واحدة روايات مختلفة وعلى ذالك فان كتب الحديث حيث تذكر ان هذه الرواية ضعيفة او شاذه فلا تعنى البتة ضعف الحديث أو السنة بل انما تعنى ما في الحديث او ما في القالب من قصور ولا غير فعسى أن يكون نفس الحديث قد روى بصحة من سند آخر وأما ما يذكرون من ان بعض المحدثين كانوا يحفظون الفا من الاحاديث فانهم يعنون بذالك كثيرة السند وكثيرة الرواية ولا عجب فانه يوجد الحديث الواحد عشرونات طرق الاسناد۔

وفي هذه الصورة اذا ثبت الحديث والسنة كلاهما بطريق صحيح حاول اهل العلم تطبيقا بينهما فان حصل لهم ذالك فذالك والا فان وجدوا الترجيح بعضهما على بعض اسبابا متوفرة فعلوا ذالك كما انه اذا تعارض حديثان صحيحان ر او أحدهما ناسخا الاخر ثم فكروا فيما هو الناسخ وفيما هو المنسوخ السنة النبوية مصدر للقانون الاسلامى من حيث أنها تفصل ما جاء فى القران من احكام مجملة (١) وتبين منه مشكله (٢) وتقيد منه مطلقة (٣) ويأتى بما لم يأت به القران-

فالسنة هى مصدر للشريعة الإسلامية بصورة دائمة من حيث انها تعرف بها احكام لم تذكر فى القرآن معرفة تنبع من نفس القران ومبادئه وهى لازمة فى غالب الاحوال لفهم القران فليس لاحد ان يصرف النظر عنها فى فهمه على الوجه الصحيح وفى تعيين مواقع احكام وهى لاتنافى روحه ولا تعارض اتجاهه بالرغم من أن فيها أمورا ليس فهمها موقوفا على فهم القران (٤)

(١) المجمل قد أوضحناه فيما سبق (٢) المشكل يراد به الحكم الذى لم يظهر مراده وله وجهان- أحدهما ان تكون العبارة عنه بحيث لا يظهر مرادها والاخر ان يضطرب معناه بعبارة أخرى وهذا يقال له الخفى والاول هو المشكل اذا تعين مراده بعد الفكر والروية . (٣) اذا بقيت على عمومها وثمة لم تكن كلمة اخرى تنال من شانها فهى مطلقة وانا لم تكن كذالك فهى مقيدة ومثال ذالك ان تقول "جاء رجل" فهذا الرجل مطلق واذا قيدت الرجل بكلمة "رشيد" فهو اذن مقيد ومن وجوه المقيد التخصيص ولكن بينهما فرقا وهو ان القيد يظهر فى التخصيص من اللفظ وفى المقيد لا يظهر والعام قريب من المطلق ولكن بينهما فرقا لطيفا- (٤) والمعنى ان السنة النبوية الصحيحة بالرغم من أنها ثابتة لا يمكن ان تخالف روح القران وتصوراته الاساسية بل انما هى ترفو الاحكام بالنظر الى روحه فالقرآن مثلا يقيد فى المعاملات هكذا "لا تظلمون ولا تظلمون" و "لا تأكلوا أموالكم بينكم بالباطل" او يقيد

ولا يغيبن عن بالك أن رواية الحديث والسنة انما بدأت بعد عهد النبي صلى الله عليه وسلم ومعنى ذالك انه لما انتهت اقواله بعد انتهاء حياته بدأوا يحفظونها في صدورهم ودفاترهم صيانة لها من ضياعها. (۱)

= في المعاملات التجارية بقيد التراضي واذا درست الحديث رأيت هناك تفصيل الظلم واللاظلم بكماله وكذالك وجدت هناك توضيح الاكل بالباطل وتعيين التراضي وعدمه في صور مختلفة فالسنة من أنها لم تبتعد عن الروح الشاملة للقرآن ومبادئه تابعة له ومتصلة به ولكنها منفصلة عنه من حيث انها تعطي احكاما زائدة على القرآن حسب اتجاهه الذاتي.

(۱) وليس معنى ذالك ان الناس كانوا لا يروون الحديث ولا يكتبون ولا في حياته بل انما المراد ان عنايتهم بها بدأت بعد ان غابت العين المنورة عن أعين الأمة وليكن بالك هنا ايضا ان بعض الناس وقعوا في خطأ اوهم اوقعوا الناس فيه عمدا حين يقولون ان كتابة الحديث انما بدأت بعد وفاة النبي بقرن كامل والان فلا مجال لهذا الخطأ اذ ظهرت مجموعات من الاحاديث التي ضبطت في عهد الصحابة كصحيفة همام ابن منبه وغيرها ولو لم تكن موجودة في ايام الصحابة ولكن رواية كانت مستمرة لم تقف يوما ما وهي مستمرة الى يومنا هذا فقولوا الي بربكم هل يوجد في الدنيا من شد سبق له مثيل لحفظ روايات اقواله كما يوجد له وهذا انما قلناه على سبيل فرض دعواهم والحق ان قولهم بان كتابة الحديث بعد النبي بقرن كامل قول خاطئ لا اصل له من الوجهة التاريخية ولا فصل فالروايات التي أسست ليها هذه الفكرة لا تعني بداية كتابة الحديث بعد قرن بل انما تهدف الى أن تدوين الحديث حصل بعد قرون واعلم انه بين كتابة الحديث وبين تدوينه فرق كبير لا ريب ان تدوين العلوم الاسلامية بكاملها لم تبدأ الا بعد قرن ونصفه ولكن ليس معنى ذالك ان تلك العلوم لم تكن موجوده قبل ذالك فعلوم الفقه والتفسير وغيرها بدأ تدوينها بعد قرن ولكن ليس يعني ذالك ان تفسير القرآن واستنباط الاحكام والاجتهاد كل ذالك لم يكن موجودا في عهد النبي وعهد الصحابة رضي الله عنهم =

وعلى ذالك لا يقبل فى الفقه الاسلامى الا الاحاديث التى ثبتت صحته حسب الشروط
المعينة ولاجل ذالك وضع اصحاب الحديث اصولا ومبادى نستطيع ان تعرف
بها مكانة الحديث

الاجماع (٢)

هو اتفاق عامة الفقهاء والمجتهدين على حكم من احكام الشرع فى عصر من العصور
وهذا هو مصدر ثالث للشرع الاسلامى ولا فرق فى اتفاق الراى بعد وفاة النبى بين
فقهاء الصحابة وبين فقهاء الطبقات التى جاءت من بعد هم والمجتهدين منها (١)

ومن اجل النيل جاروا بروايةقال النبى فيها " لا تكتبوا عنى غير القرآن " وغاب عنهم
انه صلى الله عليه وسلم منع عن كتابة الحديث ولم يمنع عن رواية على انه منع من كتاب
الحديث فى بداية الامر لئلا يختلط كلام الله بكلام النبى ولا ينشأ فى الامة فكرة
اضلت امما قبلها خلطوا كلام الرسول بكلام الله فالهوا الرسول

(٢) للاجماع معنيان من جهة اللفظ الاول هو عقد العزيمة الأكيدة والثانى هو
اتفاق القوم على امر واذا قيل " اجمع فلان على كذا " فمعناه انه عزم عليه وقد
جاءت هذه الكلمة فى القرآن فى نفس المعنى حيث قال " فاجمعوا أمركم " (يونس)
وجاء فى الحديث " لا صيام لمن لا يجمع الصيام من الليل " وكذالك اذا قيل
" اجمع القوم على كذا " وقد جاء فى القرآن " اذ اجمعوا أمرهم " و " اجمعوا ان يجعلوه "
اى اتفقوا على ان يلقوه فى البئر وفى هذا المعنى تطلق كلمة العزم أيضا وبالنظر
الى المعنى الاول تطلق هى ايضا لرجل واحد وبالنظر الى المعنى الثانى فهى لا تطلق
على الأقل الا على رجلين . والتعريف الشرعى الذى عرف به الاجماع يدخل فيه المعنيان .

(١) وفى كشف الاسرار زاد صاحبه الى هذا التعريف لفظة وهى " من هذه الأمة " اى المراد
بالاجماع اجماع المجتهدين من الأمة المسلمة والقيود التى قيد بها هذا التعريف
كلها احترازية اى لا يشملها القول هذا ولاذالك نعلم من ذالك ان الاجماع
لا يختص بعصر دون عصر ولا بطبقة دون اخرى بل هو عام لجميع العصور ولكل طبقة .

لحمینہ
سرگرم اور پُرجوش
زندگی گزارنے کے لیے
کھوئی ہوئی طاقت و توانائی حاصل کرنے کے لیے
لحمینہ لیجیے! جسے بارہ سو سے زیادہ
دوائیں بنانے والے ہمدرد نے طویل عرصہ کی
تحقیق اور تجربات کے بعد تیار کیا ہے۔
لحمینہ ان چالیس اجزا کا مرکب ہے جو
عضلات اور اعصاب کو نئی قوت و تازگی دیتے اور
ان کو صحیح کارکردگی کے لیے متحرک کرتے ہیں۔ آپ کو
اگر ایک چست و توانا جسم کی ضرورت ہے تو لحمینہ آزمائیے۔
اسے آپ کامیاب پائیں گے اور نتیجہ میں آپ بھی کامیاب ہوں گے۔
LAHMINA
لحمینہ
مردوں اور عورتوں کے لیے
کلیدی اعضاء کی قوت
ہمدرد

سالانہ چندہ	جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان ماہنامہ الرشاد جامعۃ	سالانہ چندہ
ممالک غیر سے بارہ ڈالر امریکی 12/= ؍		ہندوستان سے 20/- چندہ ششماہی 12/- قیمت فی پرچہ 2/-

جلد ۲ — بابت مارچ و اپریل ۱۹۷۰ء مطابق جمادی الاخریٰ و رجب ۱۳۹۰ھ — شمارہ ۴-۵

فہرست مضامین

مجلس ادارت

مولانا مجیب اللہ ندوی پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نے نشاط پریس ٹانڈہ میں چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ سے شائع کیا

رشحات

۱۴ سو برس کے اندر اسلام اور اسلامی علوم و تہذیب پر مختلف حیثیت سے برابر حملے ہوتے رہے اور بہت سی داخلی اور خارجی قوتوں نے اس کی صورت بگاڑنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی مگر اسلام کے چشمۂ صافی کو جس چیز نے ہر طرح کی آلائش اور کدورت سے پاک و صاف رکھا وہ تھی دعوت و تبلیغ اور تجدید دین کی مسلسل کوشش دعوت و تبلیغ کے ذریعہ اسلام کا دائرہ وسیع ہوا اور تجدید دین کے ذریعہ نہ صرف اس کی فطری تابانی اور کشش باقی رہی بلکہ اس کا عملی نمونہ ایک لمحہ کے لئے بھی دنیا کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو سکا اور خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دین کو جس صورت میں چھوڑ کر اس دنیا سے تشریف لے گئے تھے وہ اتنی مدت گذر جانے کے باوجود اپنی اصلی صورت میں علم اور عمل دونوں اعتبار سے موجود ہے اور ہر آنکھ رکھنے والا اسے دیکھ سکتا ہے، مگر یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ اس کام کے پیچھے ایثار و قربانی کی ایک طویل تاریخ ہے اس کے لئے اللہ کے ہزاروں ہزار نیک بندے انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے وطن سے دور دنیا کے مختلف حصوں میں پھیل گئے اور اپنا نام و نشان مٹا کر دین کی روشنی سے ساری دنیا کو منور کر گئے خود ہمارے ملک کا کوئی شہر، قصبہ اور گاؤں ایسا نہیں ہے جہاں کسی نہ کسی شہید یا بزرگ کا مزار نہ ہو مگر آپ ان کا وطن خاندان اور نام دریافت کریں تو ہزار میں سے ایک دو کے نام کا آپ کو علم ہوگا اور ان میں ایک فی ہزار افراد کا ذکر تاریخ کے صفحات

میں آیا ہوگا بقیہ حضرات نے کاغذ کے صفحات پر لکھی ہوئی تاریخ تو نہیں چھوڑی مگر لاکھوں مسلمان آبادیوں کی صورت میں وہ اپنی زندہ تاریخ ضرور چھوڑ گئے ہیں ......

بحمد اللہ اس دور میں بھی مختلف افراد اور جماعتوں کے ذریعہ انفرادی اور اجتماعی طور پر یہ کام تسلسل کے ساتھ جاری ہے مگر دعوت و تبلیغ کے اس مبارک کام کو پروپیگنڈہ، شہرت، سیاسی نعرہ بازی اور جذباتی انداز خطابت سے کوئی مناسبت نہیں ہے بلکہ یہ کام اسی وقت بار آور ہو سکتا ہے جب ان چیزوں کی طرف سے نظریں پھیر لی جائیں۔

دور ہماری محفل تاریخ بھی ہے

حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے آج سے ۶۰ برس پہلے انفرادی طور پر دعوت و تبلیغ کے اس مبارک کام کو ایک محدود پیمانے پر شروع کیا تھا اور انھوں نے اس کام کے لئے نہ کوئی پروپیگنڈہ کیا اور نہ لمبے لمبے کاغذی پلان پیش کئے اور نہ کوئی جذباتی نعرہ لگایا بلکہ اس کے بجائے انھوں نے نبوت کے نہج اور اسلاف کے طرز پر خاموشی اور اخلاص و للہیت کی بنیاد پر اس کام کو شروع کیا اور پھر اپنی پوری شخصیت کو اس میں گم کر دیا وہ فرمایا کرتے تھے کہ "عام طور پر ہمارا کام پیچھے رہتا ہے اور پروپیگنڈہ آگے مگر میں چاہتا ہوں کہ کام آگے رہے اور پروپیگنڈہ پیچھے رہے" اس مخلصانہ اور تعمیری ذہن کے ساتھ مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی زندگی بھر کام کرتے رہے اور یہی ذہن انھوں نے ساتھ چلنے والوں اور اس کام کے کرنے والوں میں پیدا کیا ان کی اس مبارک کوشش کا نتیجہ یہ ہے کہ بغیر کسی اخباری پروپیگنڈہ اور دوسرے ذرائع ابلاغ کے بغیر آج اس کام نے بین الاقوامی حیثیت اختیار کرلی ہے جو عند اللہ اس کی قبولیت کی علامت اور اس دور میں دین کی تاثیر کی ایک معجزانہ زندہ تصویر ہے۔ ایک منحنی دبلے پتلے سے آدمی جن کی اس دور کے علماء میں کوئی ممتاز حیثیت نہیں سمجھی جاتی تھی اور نہ ان کو وہ مادی وسائل حاصل تھے جو دوسروں کو حاصل تھے مگر ان کے کام کو اتنی عمومیت اور قبولیت کا سبب اخلاص و للہیت کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے؟ انھوں نے پوری مدت میں یہ ذہن پیدا کرنے کی کوشش کی کہ دعوت و تبلیغ کا کام نہ تو صرف علماء کی

ذمہ داری ہے اور نہ خواص کی اور نہ تنخواہ دار مبلغین کی بلکہ یہ ذمہ داری امت کے ہر فرد
کی ہے اس ذمہ داری کا تقاضہ ہے کہ ہر شخص اپنی زندگی اور اپنے وقت کا ایک حصہ
اس کام میں لگائے۔ چنانچہ ابتدا میں یہ ذہن عام نہیں ہو سکا مگر بحمد للہ ایک طویل مدت
کے بعد نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں میں بلکہ اسلامی ملکوں، یورپ، امریکہ تک
اس احساس ذمہ داری کی لہر دوڑ گئی ہے۔ اور آج نوجوان بوڑھے اور امیر غریب
سب جوق در جوق اس سے زیادہ خوشی کے ساتھ اس کام کے لئے سفر کرتے ہیں۔ آج دنیا
کی کوئی سیاسی یا مذہبی جماعت ایسی نہیں ہے کہ جس کے اشارے پر ہزاروں نہیں بلکہ
لاکھوں آدمی دنیا کے مختلف گوشوں میں اپنی گاڑھی کمائی اور ذاتی خرچ سے کسی مادی
مادی فائدے اور کسی دنیاوی غرض سے نہیں بلکہ محض ایک دینی مقصد کی خاطر سفر
کرتے ہوں۔ دوسری مذہبی اور سیاسی جماعتیں سو دو سو آدمیوں کو بھی اس طرح
مسلسل حرکت نہیں دے سکتیں۔ لاکھوں آدمیوں کا صرف دین کی نسبت سے حرکت
دیدینا کیا یہ کوئی معمولی کارنامہ ہے؟ پھر اس سے بھی بڑی بات یہ کہ کام کی اتنی عمومیت
کے باوجود کام کرنے والے افراد میں ابتک کوئی ایسی عمومی خرابی پیدا نہیں ہوسکی ہے
جس کی بنا پر اہل بصیرت یہ کہہ سکیں کہ آئندہ اس سے کوئی فتنہ برپا ہوسکتا ہے معمولی
خرابیوں کا ذکر نہیں ہے۔ ابھی ۲۷، ۲۸ر فروری اور یکم مارچ ۸۲ء کو ہمارے ضلع
کے ایک گاؤں بڑیدیہہ میں تبلیغی جماعت کا جو بین الاقوامی اجتماع ہوا تھا اس میں
ان خوبیوں کو جن کا ذکر کیا گیا ہے زندہ طور پر مشاہدہ کیا جاسکتا تھا۔ عام طور پر علما چندہ لینے
کے عادی ہیں دینے کے نہیں مگر اس گاؤں کے ایک عالم نے تنہا سات ہزار روپیہ اس
اجتماع میں لگایا۔ اس اجتماع کے موقع پر رات میں تیز ہوا چلی اور بارش آئی جس سے
سارے خیمے گر گئے، بجلی فیل ہوگئی پنڈال اور خیموں کی سیکڑوں بلیاں گر کر زمین پر
آپڑیں کتنے لوگ گھنٹوں خیموں کے نیچے دبے رہے مگر نہ کوئی افراتفری ہوئی اور نہ
بھگدڑ مچی اور نہ کوئی موت واقع ہوئی۔ اور نہ کسی کو قابل ذکر چوٹ آئی بلکہ صبح
کے وقت لاکھوں آدمیوں نے اسی حالت میں باجماعت نماز ادا کی اور ہلکی ہلکی

بارش میں بیٹھے ہوئے اطمینان سے تقریر سنتے رہے۔ بقول کئی غیر مسلموں کے کہ اگر ہمارا کوئی فنکشن یا میلہ وغیرہ ہوتا تو ایسی بھگدڑ مچتی کہ اس میں پچاسوں آدمی کچل کر مرجاتے اور سیکڑوں زخمی ہو جاتے۔ الحمد للہ علیٰ ذلک ۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ تحریک صرف کلمہ اور نماز کا ذہن پیدا کرتی ہے اس لئے ان کے افراد میں کوئی ہمہ گیر تصور نہیں پیدا ہوتا۔ راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ اگر یہ کوئی نقص ہے تو ہمیں اس نقص کا اعتراف ہے مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو لوگ کلمہ نماز کی بات کرتے ہیں وہ یہ نہیں سوچتے کہ دین سے عام غفلت اور اس کی غربت کے اس دور میں امت کو کلمہ و نماز پر ہی کھڑا کر دینا کوئی معمولی بات ہے آج امت کی ساری خرابیاں اسی کلمہ پر یقین کی کمی کی وجہ سے ہی پیدا ہوئی ہیں تو پہلے اس یقین پر لوگوں کو لانا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکی دور میں سب سے پہلے اس کلمہ کے یقین ہی پر جمع کیا تھا آپ مکہ وادیوں عکاظ و مجنہ کے بازاروں اور طائف کے مرغزاروں میں یہی آواز تو لگاتے تھے یا ایھا الناس قولوا لا الٰہ الا اللہ تفلحوا پہلے تو ہمیں دل و نگاہ میں یہی یقین پیدا کرنا ہے ؎

زباں سے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

یہ بات اس لئے عرض کی جارہی ہے کہ آپ کلمہ و نماز کا کام کہکر اس کی تحقیر نہ کیجئے اس کام کو کم نہ جانئے اور یہ کہکر آپ "ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیب است" کے مصداق نہ بنئے، اسی کلمہ کی تحریک نے نہ جانے کتنوں کی زندگیاں بدل دیں، بیشمار افراد نے اپنی پوری زندگی اسلامی سانچے میں اس طرح ڈالدی ہے کہ کمی و خامی کی باتیں کرنے والوں کے لئے وہ باعث رشک ہیں، ہم اپنے مدرسوں میں جہاں دن رات قال اللہ قال الرسول کی آواز بلند ہوتی رہتی ہے مجموعی طور پر ویسے مخلص، دیندار، تہجد گزار، اپنا نقصان کرکے دوسروں کو فائدہ پہونچانے والے افراد اتنی مقدار میں نہیں پیدا کر پا رہے ہیں جو اس کام کی برکت سے کالجوں، یونیورسٹیوں کے غیر اسلامی ماحول در

دوسرے شر و فساد کے اڈوں سے نکل کر پیدا ہو رہے ہیں۔ کاش ہمارے مدارس کے ذمہ دار اور اساتذہ اس پہلو پر سنجیدگی سے غور کرتے اور اپنی تعلیم و تربیت کا ایسا نہج اختیار کرتے جس سے ہمارے مدرسوں سے مخدوم کے بجائے خادم اور لینے والوں کے بجائے دینے والے پیدا ہونے لگتے۔

مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے بنیادی چھ اصولوں کے بارے میں خود فرمایا کرتے تھے کہ یہ چیزیں صرف دین میں داخل ہونے کا راستہ بتاتی ہیں یہ کل دین نہیں ہے کیا جس مریض کا معدہ اور دل و جگر سب خراب ہو اسے مونگ کی کھچڑی اور ہلکی غذا دینا مناسب ہوگا یا ماء اللحم اور مقویات دینا ہوگا۔

آخر میں ایک بات مشورۃً ضرور عرض ہے کہ ادھر کچھ دنوں سے بیشمار افراد کے اندر اکرام مومن کا جذبہ کم دکھائی دینے لگا ہے۔ اکرام مومن کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ آپ اپنے قریب یا آپ کے مقصد سے جو لوگ وابستہ ہیں انہی کا اکرام کریں بلکہ اکرام اپنوں سے زیادہ غیروں کا ہونا چاہیئے۔ اس کی طرف شدید توجہ کی ضرورت ہے۔

مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کسی کے کام پر تنقید کرنا جانتے ہی نہ تھے۔ ایک بار علامہ اقبال کے ڈاڑھی منڈنے کا کسی نے تذکرہ کیا تو فرمایا کہ اجی وہ اہل دل تھے۔ ایک بار کسی نے مولانا حسین احمد صاحب مدنی کی حد سے بڑھی ہوئی سیاسی مشغولیت کا ذکر کیا تو فرمایا کہ اجی ان کی وجہ سے تو ہم کو کام کا موقع مل گیا ہے۔ انگریزوں کی ساری توجہ ان کی طرف ہے اس لئے ہم کو اطمینان سے کام کا موقع مل گیا ہے میری خواہش ہے کہ جو افراد یا جو جماعتیں دین و ملت کا کام کم و بیش یا خدمت خلق کا کام کر رہی ہیں ان پر کوئی تنقید نہ کی جائے اور نہ ان کو حقیر سمجھا جائے بلکہ ان کے ساتھ اعزاز و اکرام کا معاملہ کیا جائے

ـــــــــــــــــــــــــــــــ

ہندوستان کے جو پانچ چھ مشہور صحافی ہیں ان میں ایک اندر جیت بھی ہیں ابھی حال ہی میں اندر جیت پاکستان گئے ہوئے تھے جس کی رپورٹ اخبارات میں آچکی ہے۔ انھوں نے پاکستانی صحافیوں سے ایک دن کہا کہ آج ہم لوگوں کو بالکل

کھل کر بات کرنی چاہیئے کوئی چیز ہم دل میں نہ رکھیں جو کچھ دل میں ہے وہ سب کہدیں
ان لوگوں میں آپس میں بہت سے سوالات وجوابات ہوئے۔ اندرجیت کا بیان ہے
کہ جب میں نے پاکستانی صحافیوں سے کہا کہ اگر ہندوستان کی حکومت اپنے کو ہندو
اسٹیٹ ہونے کا اعلان کردے تو آپ بتائیں کہ وہاں کے ۱۲ کروڑ مسلمانوں کا کیا ہوگا
اس سوال پر سارے پاکستانی صحافی بغلیں جھانکنے لگے اور کوئی جواب نہیں دے سکے
یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آئی کہ اندرجیت صاحب نے یہ سوال پاکستان کے
صحافیوں سے کیوں کیا۔ پاکستان کی حکومت یا صدر ضیاء الحق ہندوستانی مسلمانوں کے
نہ تو ٹھیکے دار ہیں اور نہ وہ ان کی قسمت کے مالک ہیں کہ ان سے ہمارے بارے میں سوال
کیا جائے۔ یہ سوال اگر کرنا ہے تو ان کو یہاں کے مسلمانوں سے کرنا چاہیئے وہ اس کا جواب
دیں گے کہ ہندو اسٹیٹ میں ان کی حیثیت کیا ہوگی اور وہ اس میں کیا طرز عمل اختیار
کریں گے۔ ہمارے بارے میں کسی دوسرے ملک یا کسی اسلامی ملک سے سوال کرنا ہماری
سب سے بڑی توہین ہے اور اندرجیت اس قابل ہیں کہ ان پر ہندوستانی مسلمان
ہتک عزت کا دعویٰ کریں۔ ہم اس ملک میں نہ تو سیکولر ہندو اسٹیٹ کے سہارے
زندہ ہیں اور نہ خالص ہندو اسٹیٹ سے ہمیں کوئی خطرہ ہے، ہم خدا کے سہارے اور اپنی قوت
ارادی اور خود اعتمادی سے یہاں رہ رہے ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک رہیں گے۔

اگر اس سوال کا مقصد یہ ہے کہ پاکستان نے اپنے اسلامی اسٹیٹ ہونے کا جو اعلان
کر دیا ہے اس لئے اب یہاں اقلیتوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے تو یہ ایک انتہائی
نادانی اور تاریخ سے انتہائی عدم واقفیت کی بات ہے۔ آج کون سا اسلامی ملک ہے
جہاں دوسری اقلیتیں امن وسکون سے نہیں رہ رہی ہیں۔ آج متحدہ عمارات کے کئی ملکوں
میں ہزاروں کی تعداد میں ہندو رہ رہے ہیں اور ان کے اپنے ادارے چل رہے ہیں
جنمیں ہندی زبان کی تعلیم تک ہوتی ہے اور ۱۴ سو برس سے اسلامی ملکوں میں یہ
اقلیتیں اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ موجود ہیں حتیٰ کہ عرب ملکوں کے سب سے بڑے دشمن
یہودی آج لاکھوں کی تعداد میں اسلامی ملکوں میں موجود ہیں۔

اس سوال سے ایک سوال اور ذہن میں ابھرتا ہے کہ کیا ہندو اسٹیٹ ایک تنگ نظر اسٹیٹ ہوگی جس میں دوسری قوموں اور اقلیتوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوگی اگر ہندو اسٹیٹ اسی کا نام ہے تو ایسی اسٹیٹ موجودہ دور میں کہیں قائم ہی نہیں ہو سکتی اور اگر قائم ہوگی تو زیادہ دن تک باقی نہ رہ سکے گی اور اگر یہ قائم ہو جائے تو مسلمانوں کو اس کی ذرہ برابر فکر نہیں ہے۔ وہ تیس برس سے وہ سب بھگت رہے ہیں جو کسی ہندو اسٹیٹ میں ان کو بھگتنا پڑتا مگر وہ اس سے نہ تو اب گھبراتے ہیں اور نہ آئندہ گھبرائیں گے۔ بہر حال اس سوال کے سلسلے میں ہم حکومت ہند اور ان کے ذمہ داروں سے بطور احتجاج عرض کرتے ہیں کہ ملک کے کسی بڑے سے بڑے آدمی کو بھی ہماری حیثیت اور ہمارے مستقبل کے بارے میں کسی دوسرے ملک سے یہ سوال کرنے کی آئندہ کبھی اجازت نہ دی جائے۔

(۳)

مجیب اللہ ندوی

اوپر رجم کے سلسلہ کی تین روایتوں کے متن اور سند پر بحث آچکی ہے، اس سلسلہ کی چوتھی روایت حضرت عمرؓ کے اس خطبہ سے متعلق ہے جو آپ نے حج سے واپس ہو کر مدینہ منورہ میں دیا تھا اس تقریر کو مکمل طور پر صرف امام بخاری نے نقل کیا ہے۔ دوسرے محدثین نے محض اتنے حصہ کو اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے جس میں رجم کی فرضیت کا ذکر ہے۔ امام بخاری کی پوری روایت نقل کی جا چکی ہے۔ اب دوسرے ائمہ حدیث کی روایتیں یہاں درج کی جا رہی ہیں، امام مسلم نے اس روایت کو اپنے چار شیوخ ابو الطاہر حرملہ بن یحییٰ، ابو بکر بن ابی شیبہ اور زہیر بن حرب سے، روایت کیا ہے اور یہ تمام واسطے حضرت عبد اللہ بن عباسؓ پر منتہی ہوتے ہیں، پوری روایت یہ ہے:

انہ سمع عبد اللہ بن عباس یقول قال عمر بن الخطاب وھو جالس علی منبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ بعث محمدا صلی اللہ علیہ وسلم بالحق وانزل علیہ الکتاب فکان مما انزل اللہ علیہ اٰیۃ الرجم قرأناھا

عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے عبد اللہ بن عباسؓ سے کہتے ہوئے سنا کہ حضرت عمرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ممبر پر بیٹھ کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دین حق دیکر بھیجا اور آپ پر کتاب نازل کی تو جو کچھ اللہ نے

ووعیناها وعقلناها فرجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورجمنا بعدہ فاخشی ان طال بالناس زمان ان یقول قائل ما نجد فی کتاب اللہ تعالی فیضلوا بترک فریضۃ انزلها اللہ وان الرجم فی کتاب اللہ حق علی من زنا اذا احصن من الرجال والنساء اذا قامت البینۃ او کان الحبل او الاعتراف۔

آپ پر نازل کیا ان میں آیت رجم بھی ہے اس کو ہم نے پڑھا، محفوظ رکھا اور سمجھا تو اس کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کی سزا دی اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کی سزا دی تو میں ڈرتا ہوں کہ ایک مدت گزرنے کے بعد کوئی شخص یہ نہ کہنے لگے کہ میں کتاب اللہ میں اس کا صریح حکم نہیں پاتا ہوں تو اس طور پر ایک فریضہ کو جس کو اللہ تعالیٰ نے نازل کیا ہے اسے ترک کرکے یہ لوگ گمراہ ہو جائیں۔ بیشک رجم اللہ کی کتاب ایک ثابت شدہ حکم ہے یہ اس پر جاری کیا جائے گا جو مرد یا عورت شادی شدہ ہوتے ہوئے زنا کرے۔ جب شہادت مل جائے یا حمل ٹھہر جائے یا مجرم خود اعتراف کرے۔

(مسلم ج ۲ ص ۶۵ مطبوعہ ہندستان)

یہی روایت انہی الفاظ کے ساتھ سنن ابو داؤد میں بھی ہے اور اس کا سلسلہ بھی امام زہری کے واسطے سے حضرت ابن عباسؓ ہی پر منتہی ہوتا ہے اس میں ایک جملہ آخر میں زیادہ ہے

وایم اللہ لولا ان یقول الناس زاد عمر فی کتاب اللہ لکتبتھا

خدا کی قسم اگر لوگ یہ نہ کہتے کہ عمر نے اللہ کی کتاب میں زیادتی کر دی تو یہ حکم بھی قرآن میں (کسی گوشہ یا حاشیہ پر) لکھ دیتا۔

اس روایت کو امام ترمذی نے دو واسطوں سے نقل کیا ہے پہلی روایت کی سند مسلم اور ابو داؤد کی طرح امام زہری کے واسطے سے حضرت ابن عباس پر منتہی ہوتی ہے دوسری روایت انھوں نے سعید بن المسیب سے مرسلاً روایت کی ہے پہلی روایت میں اس کو قرآن میں لکھ دینے کا ذکر نہیں ہے مگر دوسری روایت جو انھوں نے سعید بن المسیب سے مرسلاً روایت کی ہے

ان کا یہ ہے:

لولا انی اکرہ ان ازید فی کتاب اللہ لکتبتھا[1] فی المصحف (ترمذی ص ۲۴۶ ہندوستان)

اگر میں یہ بات ناپسند نہ کرتا کہ کتاب اللہ میں کوئی زیادتی کروں تو اس حکم کو مصحف کے کسی گوشہ یا حاشیہ میں لکھ دیتا۔

آخر میں اپنی عادت کے مطابق انھوں نے یہ بھی لکھ دیا کہ وفی الباب عن علی اس باب میں حضرت علی سے بھی روایت ہے، حضرت علی کی روایت جس کا ذکر امام ترمذی نے کیا ہے وہ یہ ہے کہ جسے امام احمد اور امام بخاری نے نقل کیا ہے وہ یہ ہے۔

ان علیا رضی اللہ عنہ حین رجم المرأۃ ضربھا یوم الخمیس و رجمھا یوم الجمعۃ وقال جلدتھا بکتاب اللہ و رجمتھا بسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت علی نے جب ایک عورت کو رجم کیا تو جمعرات کے دن انھوں نے اسے کوڑے لگائے اور جمعہ کے دن رجم کیا اور پھر فرمایا کہ میں نے اس کو کوڑے کتاب اللہ کے صریح حکم کی بنا پر لگائے اور رجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق کیا۔

اوپر ہم نے بخاری مسلم، ترمذی اور ابوداؤد کی جو روایتیں نقل کی ہیں ان میں سے بعض میں یہ ذکر ہے کہ رجم ایک فریضہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اور کسی میں ذکر ہے کہ اللہ تعالےٰ نے آیت رجم نازل کیا جسے ہم نے پڑھا اور سمجھا کسی میں اتنا ذکر ہے کہ رجم ثابت شدہ ہے مگر ان میں سے کسی کی روایت میں آیت رجم کے وہ الفاظ مذکور نہیں ہیں جسے امام مالک اور ابن ماجہ نے نقل کیا ہے۔

ابن ماجہ نے بھی حضرت عمر کی تقریر کے الفاظ انہی واسطوں سے ذکر کیا ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے یعنی امام زہری، عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ عن ابن عباس پوری روایت یہ ہے

---

[1] امام احمد بن حنبل کی ایک روایت کے مطابق اس لکھنے کی مزید وضاحت ہو جاتی ہے یہ روایت بھی عبداللہ بن عباس ہی سے مروی ہے اس کے الفاظ یہ ہے "ولولا ان یقولوا قائلون ان عمر زاد فی کتاب ما لیس منہ لکتبت فی ناحیۃ من المصحف (تفسیر ابن کثیر ج ۳ ص ۲۶۱) اگر کہنے والے یہ نہ کہنے لگیں کہ عمر نے کتاب اللہ میں کچھ زیادتی کر دی ہے تو مصحف کے حاشیہ پر اس حکم کو لکھ دیتا۔

قال عمر ابن الخطاب لقد خشیت ان یطول بالناس زمان حتی یقول قائل ما اجد الرجم فی کتاب اللہ فیضلوا بترک فریضۃ من فرائض اللہ الاوان الرجم حق اذا احصن الرجل وقامت البینۃ اوکان حمل او اعتراف وقد قرأتھا الشیخ والشیخۃ اذا ازنیا فارجموھا البتۃ رجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورجمنا بعدہ۔

حضرت عمر بن خطاب نے فرمایا کہ میں ڈرتا ہوں کہ ایک مدت گزر جائے اور کوئی کہنے والا یہ کہنے لگے کہ میں رجم کا صریح حکم کتاب اللہ میں نہیں پاتا ہوں تو ایک فریضہ ترک کرکے وہ گمراہ ہو جائے بے شک رجم حق ہے جب شہادت ملجائے یا حمل ٹھہر جائے یا اگر مجرم اعتراف کرے میں نے پڑھا ہے الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھا البتۃ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا ہے اور آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کی سزادی ہے۔

(ابن ماجہ ص ۱۸۷، ہندوستانی)

اس میں پہلے صرف وہی الفاظ ہیں جو دوسری روایتوں میں ہیں کہ یہ ایک فریضہ ہے مگر آخر میں قرأتھا کے بعد الشیخ والشیخۃ کے الفاظ بھی نقل کئے ہیں مگر اس کو مؤکد کرنے کے لئے یہ کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی رجم کیا اور آپ کے بعد ہم نے بھی رجم کیا ہے یعنی یہ تعامل چلا آرہا ہے۔ مذکورہ بالا سلسلہ سند سے حضرت ابن عباس کے واسطے امام مالک نے بھی جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

سمعت عمر بن الخطاب یقول الرجم فی کتاب اللہ حق۔

میں نے حضرت عمر کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ الرجم اللہ کی کتاب سے ثابت شدہ حکم ہے۔

اس روایت میں نہ تو آیت رجم کا ذکر ہے اور نہ الشیخ والشیخۃ وغیرہ کے الفاظ ہیں مگر امام مالک نے جو دوسری روایت سعید بن المسیب سے مرسلاً نقل کی ہے اس میں یہ الفاظ ہیں:

قدم المدینۃ فخطب الناس ثم قال ایھا الناس قد سنت لکم السنن وفرضت لکم الفرائض وترکتم علی الواضحۃ الا ان تضلوا الناس یمینا و

حضرت عمر حج سے جب واپس آئے مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ تمھارے سنتیں اور فرائض مقرر کر دیے گئے ہیں اور تم لوگ کو ایک واضح اور

وشمالاً وضرب باحدى يديه على
الاخرى ثم قال اياكم ان تهلكوا
عن آية الرجم ان يقول قائل لا
نجد حدين فی كتاب الله فقد رجم
رسول الله صلى الله عليه وسلم
ورجمنا بعده والذی نفسی بيده
لولا ان يقول الناس زاد عمر فی
كتاب الله لكتبتها الشيخ والشيخة
اذا زنيا فارجموهما البتة ۔
(موطا ۳۴۸)

اور صاف راستہ پر چھوڑا گیا ہے تاکہ تم ادھر
ادھر نہ بھٹکو، آپ نے اپنا ایک ہاتھ دوسرے
پر مار کر یعنی زور دے کر فرمایا کہ دیکھو آیت رجم
کے سلسلہ میں کہیں ہلاکت میں نہ پڑنا کہ ہم
کتاب اللہ میں زنا کے سلسلہ میں دو سزاؤں
کا ذکر نہیں پاتے، حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا ہے اور ان کے
بعد ہم نے بھی رجم کیا ہے، خدا کی قسم لوگ اگر
یہ نہ کہتے کہ عمر نے کتاب اللہ میں کچھ بڑھا دیا
ہے تو میں یہ لکھ دیتا الشیخ والشیخۃ اذا زنیا
فارجموھا البتۃ ۔

(ہندوستان)

امام مالک نے الشیخ والشیخۃ کی تشریح الثیب والثیبۃ سے کی ہے یعنی وہ شادی شدہ ہوں۔ اوپر ابن ماجہ اور امام مالک کے علاوہ جو تین روایتیں اس سے پہلے نقل کی جا چکی ہیں ان میں سے کوئی بھی صحیح روایت ایسی نہیں معلوم ہوتی جس سے یہ معلوم ہو کہ اس آیت کے نزول کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوا ہے اور آپ نے اسے لکھوانے سے پہلے منسوخ التلاوت قرار دے دیا ہو۔

اوپر بخاری، مسلم، ابوداؤد اور ترمذی وغیرہ کی روایتیں نقل کی جا چکی ہیں ان کے الفاظ بعینہ وہی ہیں جو امام مالک کی اس مرفوع روایت کے ہیں مگر امام مالک کی دوسری مرسل[1] روایت ہے اس میں ان الفاظ کا اضافہ ہے۔

ان تفصیلات کی روشنی میں راقم الحروف کا خیال ہے کہ رجم کا ثبوت اس ٹکڑے سے جسے منسوخ التلاوت آیت قرآنی کہا گیا ہے نہیں ہوتا ہے مگر ادھر تو صحیح روایت کے

---

[1] وہ روایت جس میں الشیخ والشیخۃ کے الفاظ آئے ہیں اسے سعید بن المسیب نے روایت کیا ہے اور سعید بن المسیب حضرت فاروق کی وفات کے وقت صرف ۶،۷ برس کے تھے اس لئے راقم الحروف نے اس روایت کو مرسل کہا ہے اصطلاح میں اس کی گنجائش ہے گو سعید بن المسیب کے مراسیل معتبر ہیں

اعتبار سے صحیح ہے اور نہ زبان و بیان کے لحاظ سے اسے صحیح کہا جا سکتا ہے، پھر اس ٹکڑے کو جن محدثین نے اپنی کتابوں میں جگہ دیا ہے ان کے الفاظ میں بھی بڑا اضطراب ہے، کسی میں البتۃ کا لفظ ہے کسی میں نکالا من اللہ ہے کسی میں نکالا من اللہ العزیز الحکیم ہے وغیرہ وغیرہ اور پھر روایت کے اعتبار سے اگر اسے صحیح مان بھی لیا جائے تو عربیت کے اعتبار سے بھی یہ ٹکڑا کسی طرح کلام الٰہی کیا کلام رسول بننے کے لائق نہیں معلوم ہوتا جیسا کہ خود حضرت عمرو بن العاص کے بیان میں (اگر وہ صحیح ہے تو) اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ غرض یہ کہ رجم کا ثبوت اس ٹکڑے سے قطعی نہیں ہوتا جس کا ذکر دوتین محدثین نے کیا ہے اسی بنا پر شیخ آلوسی اس مسئلہ پر بحث کر کے اپنی رائے لکھتے ہوئے علامہ ابن ہمام کی رائے نقل کرتے ہیں،

ومن الناس من ذهب ان الناسخ الآية المنسوخة التي ذكرها عمر رضي الله وقال العلامة ابن الهمام ان كون الناسخ السنة القطيعة اولى من كون الناسخ ماذكر من الآية لعدم القطع ثبوتها قرآناً ثم نسخ تلاوتها ثم لا شك في ان الطريق في ذالك الى عمر رضي الله عنه ظني[1]

(روح المعانی ج ۱۸ ص ۷۹)

بعض لوگ اس طرف گئے ہیں جلد کی آیت میں رجم کا اضافہ منسوخ التلاوت آیت کے ہوتا ہے مگر اسی سلسلہ میں علامہ ابن الہمام کی رائے ہے کہ آیت جلد میں رجم کا اضافہ سنت قطعیہ سے کہنا زیادہ بہتر ہے کہ یہ کہا جائے کہ اس کی ناسخ منسوخ التلاوت آیت ہے جس کا قرآن میں ہونا بالکل قطعی الثبوت نہیں ہے پھر اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ حضرت عمر کی طرف اس کی نسبت ظنی ہے،

رجم کا ثبوت اب سوال یہ رہ جاتا ہے کہ اگر قرآن پاک میں کوئی صریح آیت رجم کے سلسلہ میں نازل نہیں ہوئی ہے تو پھر رجم کا کوئی ایسا ثبوت ہونا چاہئے جو قطعی الدلالت ہو۔ اس سلسلہ میں راقم الحروف نے اس مضمون کے شروع میں جو کچھ لکھا تھا اس کی مزید

---

[1] نسخ سے مراد یہاں سورہ نور کے حکم پر زیادتی ہے نہ کہ منسوخ الحکم۔

تفصیل یہاں کی جاتی ہے تاکہ رجم کے سلسلہ میں کوئی شک دماغوں میں باقی نہ رہ جائے مگر رجم کے شرعی دلائل کی وضاحت سے پہلے یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینی ضروری ہے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں ایک وحی جلی دوسرے وحی خفی وحی جلی کا نمونہ پورا قرآن پاک ہے اور وحی جلی آپ پر ہمیشہ حضرت جبرئیل کے واسطہ سے آتی تھی اور اس کے سارے الفاظ خدا کی طرف سے نازل ہوتے تھے اور اس کے نازل ہوتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسے کاتبین وحی کو بلا کر لکھوا دیتے تھے اور اس کو صحابہ کی ایک بڑی تعداد زبانی یاد کر لیتی تھی، عام صحابہ کو اس کا علم ہو جاتا تھا اور نمازوں میں نازل شدہ آیتیں پڑھی جانے لگتی تھیں۔

اس کے برخلاف وحی خفی کے لئے حضرت جبرئیل کا آنا ضروری نہیں تھا اور نہ اس کے پورے الفاظ خدا تعالیٰ کی طرف سے اترتے تھے اور نہ عام صحابہ کو اس کا علم ہو جانا ضروری تھا اور نہ وہ الفاظ نمازوں میں پڑھے جاتے تھے، جو صحابہ موجود ہوتے تھے آپ انکو یہ وحی یعنی حکم الٰہی اپنے الفاظ میں سنا دیا کرتے تھے، اس وحی خفی کے متعدد دلائل قرآن پاک میں بھی موجود ہیں اور احادیث کا بہت بڑا ذخیرہ اس پر شاہد عدل ہے جب آپ معراج میں تشریف لے گئے تو وہاں پر آپ پر بے شمار چیزیں وحی کی گئیں اور بیشمار چیزوں کا مشاہدہ کرایا گیا۔ قرآن نے تو صرف "فاوحیٰ الی عبدہ ما اوحیٰ" اللہ تعالےٰ کو جو وحی کرنی تھی کیا، کہا ہے اس کی کوئی تفصیل قرآن پاک میں نہیں کی گئی ہے مگر احادیث میں ما اوحیٰ کی بیشمار تفصیل ملتی ہے، سورہ تحریم میں جب آپ نے بعض ازواج مطہرات سے ایک راز کی بات کہی اور انھوں نے اس کا ذکر دوسری ازواج سے کر دیا چونکہ یہ نبی کا راز تھا اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو فوراً خبر دیدی گئی کہ آپ کا راز فاش ہو گیا آپ نے اسی وحی الٰہی کے مطابق زوجہ محترمہ سے دریافت کیا تو وہ تعجب سے بولیں کہ یہ بات آپ کو کس نے بتادی کہ میں نے آپ کی راز کی بات دوسرے سے کہدی ہے قرآن نے اس پورے قصہ کو بڑے فصیح انداز میں نقل کیا ہے۔

وَاِذْ اَسَرَّ النَّبِیُّ اِلٰی بَعْضِ اَزْوَاجِہٖ   اور جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی

حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللّٰهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هٰذَا قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ ٥ (تحریم)

بعض ازواج سے ایک بات چپکے سے کہدی تو انھوں نے اسے (دوسری) کو بتایا اور اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ ظاہر فرما دیا تو کچھ بات تو ان کو آپنے بتادی اور کچھ ٹال گئے جب انکو آپ نے ان کی کہی ہوئی بات کی زوجۂ محترمہ کو خبر دی تو انھوں نے تعجب سے پوچھا کہ یہ بات آپ کو کس نے بتادی آپنے فرمایا کہ مجھے خدا نے یہ بات بتادی ہے۔

غور فرمایئے کہ اس وحی خفی یعنی نبأنی اللہ کی کوئی تفصیل قرآن میں کسی دوسری جگہ موجود نہیں ہے اور نہ اس وحی کے الفاظ کہیں ملتے ہیں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن پاک کی آیات کے علاوہ بھی بہت سے مواقع پر وحی خفی کے ذریعہ آپ پر احکام نازل فرماتے تھے۔ احادیث قدسیہؐ جتنی ہیں سب وحی خفی ہیں ان کے علاوہ بھی قرآن کے بیشمار اقتضاءات النص، اشارات النص اور دلالات النص کی تشریح آپ نے فرمائی ہے وہ سب وحی خفی ہیں۔

اب اس مسئلہ کے دوسرے پہلو پر غور کیجئے وہ یہ ہے کہ صحابہ کرام جب یہ کہتے تھے کہ یہ حکم کتاب اللہ میں ہے یا یہ فریضۃ من فرائض اللہ یا یہ آیۃ من کتاب اللہ یا یہ حکم اللہ ہے کے الفاظ استعمال فرماتے تھے تو اس سے لازماً قرآن کا حکم یا مصحف میں لکھی ہوئی قرآن کی آیات ہی مراد نہیں ہوتی تھیں بلکہ بسا اوقات اس سے مراد وہ احکام ہوتے ہیں جو آپ پر وحی خفی کے ذریعہ نازل ہوتے تھے وہ بھی بالکل اسی طرح قطعی الدلالت ہوتے ہیں جس طرح وحی جلی کے احکام ہیں بعض لوگ اس کہنے کی تو اہمیت محسوس کرتے ہیں کہ یہ حکم قرآن میں ہے لیکن جب یہ کہدیجئے کہ وحی خفی کے ذریعہ یا سنت نبوی کے ذریعہ یہ حکم ثابت ہے تو وہ چاہے انکار نہ کریں مگر ان کے دل میں یہ ہی نہیں کہ اس کے قطعی ہونے کا پورا یقین نہیں بیٹھتا بلکہ وہ شکوک وشبہات میں مبتلا رہتے ہیں یہاں

ہم چند واقعات نقل کرتے ہیں جن سے اندازہ ہو جائے گا کہ صحابہ جب کتاب اللہ یا آیات اللہ وغیرہ کا لفظ بولتے تھے اس سے مراد وحی خفی ہی ہوتی تھی، اور قرآن کے حکم کی طرح اسے وہ قطعی الدلالت سمجھتے تھے اور پوری امت اسی کے مطابق عمل کرتی رہی ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص نے ایک بار فرمایا:

نزلت فیّ اربع ایات من کتاب اللہ کانت امی حلفت ان لا تاکل ولا تشرب حتی افارق محمد صلی اللہ علیہ وسلم فانزل اللہ عزوجل وان جاھداك علی ان تشرك ما لیس لك به علم فلا تطعھما وصاحبھما فی الدنیا معروفا والثانیة انی کنت اخذت سیفا اعجبنی فقلت یا رسول اللہ ھب لی ھذا فنزلت یسئلونك عن الانفال والثالثة انی کنت مرضت فاتانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فقلت یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی ارید ان اقسم مالی افاوصی بالنصف فقال لا فقلت الثلث فسکت فکان الثلث جائزا والرابعة انی شربت الخمر مع قوم من الانصار فضرب رجل منھم انفی بلحیی جمل فاتیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فانزل اللہ عزوجل تحریم الخمر۔

میرے بارے میں چار آیتیں اتریں میں جب اسلام لایا تو میری ماں نے قسم کھائی کہ جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے الگ نہ ہو جائے گا میں نہ کھانا کھاؤں گی اور نہ پانی پیوں گی اس پر یہ آیت اتری کہ اگر کافر والدین کوشش کریں کہ تم شرک کرو تو ان کی اطاعت نہ کرو۔ البتہ ان کے ساتھ دنیاوی اچھا سلوک کرتے رہو۔ دوسری آیت یسئلونک عن الانفال اتری تیسرا حکم مال میں ثلث وصیت کرنے کا اترا جس کی تفصیل یہ ہے کہ میں ایک بار سخت بیمار ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عیادت کے لئے تشریف لائے میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں چاہتا ہوں اپنا سارا مال راہ حق میں خرچ کر دوں آپ نے فرمایا کہ نہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ نصف خرچ کر ڈالوں آپ نے فرمایا کہ نہیں پھر میں نے کہا کہ تہائی کے لئے میں وصیت کر جاؤں تو آپ خاموش رہے پھر فرمایا کہ ہاں ثلث کر سکتے ہو۔

(الادب المفرد، مسلم، ابو داوٗد وغیرہ)

چوتھا حکم میرے بارے میں یہ نازل ہوا

اس میں تین حکم تو قرآن میں صریح طور پر مذکور ہیں مگر مال میں سے ⅓ وصیت کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا قرآن پاک میں کہیں اس کی صراحت نہیں ہے مگر اس کو سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کتاب اللہ کی ایک آیت فرما رہے ہیں۔ ایک بار عبداللہ بن مسعود نے فرمایا:

لعن اللہ الواشمات والمستوشمات والمتنمصات والمتفلجات للحسن المغیرات خلق اللہ فجائته امرأة فقالت بلغنی انك لعنت کیت وکیت فقال مالی لا العن من لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومن ھو فی کتاب اللہ فقالت لقد قرأت ما بین اللوحین فما وجدت فیه تقول قال لئن کنت قرأتیه لقد وجدتیه اما قرأت ما آتاکم الرسول فخذوه وما نھاکم عنه فانتھوا قالت بلی قال فانه قد نھی عنه۔

اللہ تعالیٰ نے گودنا گدونے والی اور گودنے والی، چہرے کے روؤں کے اکھاڑنے والی اور دانتوں میں مصنوعی حسن پیدا کرنے والیوں پر لعنت کی ہے جو اللہ کی بنائی صورت شکل میں تبدیلی کرتی ہیں ایک عورت ابن مسعود کے پاس آئی اور اس نے کہا کہ مجھے علم ہوا ہے کہ آپ نے ایسی عورتوں پر لعنت کی ہے انھوں نے فرمایا کہ میں کیوں نہ ان پر لعنت کروں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر لعنت کر گئے ہیں اور جن پر قرآن نے لعنت کی ہے وہ عورت بولی کہ میں نے تو پورا قرآن پڑھا ہے اس میں تو ایسی عورتوں پر لعنت کہیں نہیں پاتی آپ نے فرمایا کہ اگر تم واقعی غور سے پڑھتی تو اس میں یہ ضرور پاتی، کیا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی ہے کہ رسول جو حکم دیں اسے پکڑ لو اور جس بات سے روک دیں اس سے رک جاؤ

اس نے کہا کہ ہاں یہ صحیح ہے کہ آپنے اس سے روکا ہے۔ (بخاری و مسلم)

اس تفصیل کی غرض یہ ہے کہ حضرت عمر یا دوسرے صحابہ نے جو رجم کے حکم کو کتاب اللہ کا حکم کہا ہے یا اس کے لئے آیت من آیۃ اللہ یا فریضۃ من فرائض اللہ وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ سورہ نساء کی آیت او یجعل اللہ لہن سبیلا کے تحت آپ نے جو توضیح فرمائی ہے اس کی حیثیت کتاب اللہ کے صریح حکم جیسی ہے اس بنا پر تمام روایات میں جہاں یہ ذکر ہے اللہ تعالیٰ نے آیت رجم نازل کی یا رجم کا حکم کتاب اللہ میں ہے وہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں۔

وقد رجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورجمنا بعدہ

اور اس کے حکم الہی ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کی سزا جاری کی اور آپ کے بعد ہم نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔

چنانچہ امام مسلم نے رجم کے سلسلہ میں وحی خفی کی حضرت عبادہ بن صامت نے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ بالکل ویسے ہی جیسے وحی جلی کے لئے صحابہ استعمال فرماتے تھے ملاحظہ ہو۔

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا نزل علیہ الوحی کرب لذالک وتربد لہ وجہہ قال فانزل علیہ ذات یوم فلما سری عنہ قال خذوا عنی خذوا عنی قد جعل اللہ لہن سبیلا الثیب بالثیب والبکر بالبکر الثیب جلد ماۃ ورجم بالحجارۃ والبکر جلد ماۃ ثم نفی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تھی اس کی وجہ سے آپ انتہائی پریشان ہوجاتے اور آپکے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا، ایک دن آپ پر وحی نازل ہوئی اور جب وحی کی کیفیت دور ہوگئی تو آپنے دوبار فرمایا کہ مجھ سے وحی کی یہ بات لے لو اور اچھی طرح یاد کرلو کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لئے

(الادب المفرد، مسلم، ابو داوٗد وغیرہ)

چوتھا حکم میرے بارے میں یہ نازل ہوا

اس میں تین حکم تو قرآن میں صریح طور پر مذکور ہیں مگر ماں میں باپ وصیت کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا تھا قرآن پاک میں کہیں اس کی صراحت نہیں ہے مگر اس کو سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کتاب اللہ کی ایک آیت فرما رہے ہیں۔ ایک بار عبداللہ بن مسعود نے فرمایا:

لعن اللہ الواشمات والمستوشمات والمتنمصات والمتفلجات للحسن المغیرات خلق اللہ فجائتہ امرأۃ فقالت بلغنی انک لعنت کیت فقال مالی العن من لعن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ومن ھو فی کتاب اللہ فقالت لقد قرأت ما بین اللوحین فما وجدت فیہ تقول قال لئن کنت قرأتیہ لقد وجدتیہ اما قرأت ما اتاکم الرسول فخذوہ وما نھاکم عنہ فانتھوا قالت بلی قال فانہ قد نھی عنہ۔

اللہ تعالیٰ نے گودنا گدونے والی اور گودنے والی، چہرے کے روؤں کے اکھاڑنے والی اور دانتوں میں مصنوعی حسن پیدا کرنے والیوں پر لعنت کی ہے جو اللہ کی بنائی صورت شکل میں تبدیلی کرتی ہیں ایک عورت ابن مسعود کے پاس آئی اور اس نے کہا کہ مجھے علم ہوا ہے کہ آپ نے ایسی عورتوں پر لعنت کی ہے انھوں نے فرمایا کہ میں کیوں نہ ان پر لعنت کروں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پر لعنت کر گئے ہیں اور جن پر قرآن نے لعنت کی ہے وہ عورت بولی کہ میں نے تو پورا قرآن پڑھا ہے اس میں تو ایسی عورتوں پر لعنت کہیں نہیں پاتی آپ نے فرمایا کہ اگر تم واقعی غور سے پڑھتی تو اس میں یہ ضرور پاتی، کیا تم نے یہ آیت نہیں پڑھی ہے کہ رسول جو حکم دیں اسے پکڑ لو اور جس بات سے روک دیں اس سے رک جاؤ

اس نے کہا کہ ہاں یہ صحیح ہے کہ آپ نے اس سے روکا ہے۔ (بخاری و مسلم)

اس تفصیل کی غرض یہ ہے کہ حضرت عمر یا دوسرے صحابہ نے جو رجم کے حکم کو کتاب اللہ کا حکم کہا ہے یا اس کے لئے آیت من آیۃ اللہ یا فریضۃ من فرائض اللہ وغیرہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ سورہ نساء کی آیت او یجعل اللہ لہن سبیلا کے تحت آپ نے جو توضیح فرمائی ہے اس کی حیثیت کتاب اللہ کے صریح حکم جیسی ہے اس بنا پر تمام روایات میں جہاں یہ ذکر ہے اللہ تعالیٰ نے آیت رجم نازل کی یا رجم کا حکم کتاب اللہ میں ہے وہیں وہ یہ بھی کہتے ہیں۔

وقد رجم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ورجمنا بعدہ

اور اس کے حکم الٰہی ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کی سزا جاری کی اور آپ کے بعد ہم نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔

چنانچہ امام مسلم نے رجم کے سلسلہ میں وحی خفی کی حضرت عبادہ بن صامت نے جو روایت نقل کی ہے اس کے الفاظ بالکل ویسے ہی جیسے وحی جلی کے لئے صحابہ استعمال فرماتے تھے ملاحظہ ہو۔

کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا نزل علیہ الوحی کرب لذالک وتربد لہ وجہہ قال فانزل علیہ ذات یوم فلما سری عنہ قال خذوا عنی خذوا عنی قد جعل اللہ لہن سبیلا الثیب بالثیب والبکر بالبکر الثیب جلد مائۃ ورجم بالحجارۃ والبکر جلد مائۃ ثم نفی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب وحی نازل ہوتی تھی اس کی وجہ سے آپ انتہائی پریشان ہو جاتے اور آپ کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا ایک دن آپ پر وحی نازل ہوئی اور جب وحی کی کیفیت دور ہو گئی تو آپ نے دوبار فرمایا کہ مجھ سے وحی کی یہ بات لے لو اور اچھی طرح یاد کر لو کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کے لئے

سنة

زنا کے سلسلہ میں یہ راستہ پیدا کر دیا ہے اب اس کے بعد اگر شادی شدہ مرد یا عورت زنا کرے تو سو کوڑے لگائے جائیں اور پھر رجم کر دیا جائے اور اگر غیر شادی شدہ ہوں تو سزا سو کوڑے اور ایک سال کے لئے جلاوطنی۔ اس روایت کو امام احمد اور دوسرے محدثین نے بھی ایک دو لفظ کے اختلاف سے روایت کیا ہے۔

(مسلم ج ۲ کتاب الحدود)

یہ ایک ایسی محکم دلیل ہے کہ اس کے بعد کسی دلیل کی قطعی ضرورت نہیں ہے اس وحی خفی کو صحابہ کرام عام طور پر جو کتاب اللہ، یا فریضۃ من اللہ یا حکم اللہ وغیرہ فرمایا کرتے تھے تو یہ وہ اپنے جی سے نہیں فرماتے تھے بلکہ قرآن پاک کی صراحت جیسا کہ اوپر ذکر آچکا ہے اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق کہتے تھے آپ نے بیشمار مواقع پر اس وحی خفی کو اللہ کا حکم و کتاب اللہ فرمایا ہے، اسی رجم کے سلسلہ میں ایک حدیث ملاحظہ ہو جسے تمام محدثین نے نقل کیا ہے، جسے دو ممتاز صحابہ حضرت ابوہریرہ اور زید بن خالد الجہنی بیان کرتے ہیں:

قال کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم فقال رجل فقال انشدك الا قضیت بینا بکتاب اللہ فقام خصمہ وکان افقہ منہ فقال اقض بینا بکتاب اللہ وائذن لی قال قل قال ان ابنی کان عسیفا علی ھذا فزنی بامرتہ فافتدیت منہ بمائۃ شاۃ وخادم ثم سالت رجالا

ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود تھے کہ ایک شخص مجلس میں کھڑا ہوا اور اس نے کہا میں آپ سے برملا پوچھ رہا ہوں کہ آپ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کریں پھر اس کا دوسرا فریق جو اس سے زیادہ سمجھدار تھا بھی کھڑا ہو کر کہنے لگا کہ آپ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کر دیجئے اور ہمارے سناکتی

من اهل العلم فاخبرونی ان علی
ابنی جلد ماۃ وتغریب عام وعلی
امرته الرجم فقال النبی صلی اللہ علیہ
وسلم والذی نفسی بیدہ لاقضین
بینکما بکتاب اللہ المائۃ الشاۃ
والخادم رد علیک وعلی ابنک جلد
مأۃ وتغریب عام واغد یا انیس
علی امرتہ ھذا فان اعترفت فارجمھا
فغدا علیھا فاعترفت فرجمھا۔

کو پوری بات کہنے کی اجازت عنایت فرمائیے
آپ نے فرمایا کہو اب پہلے شخص نے کہنا شروع
کیا کہ میرا نوجوان لڑکا ان کے یہاں کام کرتا
تھا اتفاق سے ان کی بیوی کے ساتھ زنا
کر بیٹھا جب مجھے علم ہوا تو میں نے اس
غلطی کے عوض سو بکریاں اور ایک خادم
ان کو دیدیا مگر بعد میں کچھ اہل علم حضرات
نے بتایا کہ تمھارے لڑکے کو سو کوڑے کی سزا
اور ایک سال کے لئے شہر بدر ہے اور
عورت کے لئے رجم کا حکم ہے۔ نبی صلی اللہ
علیہ وسلم نے واقعہ سنکر فرمایا کہ خدا کی قسم
میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرونگا
یہ بکریاں اور خادم تو واپس لے لو اور تمھارے
لڑکے کو سو کوڑے لگیں گے اور ایک سال
کی شہر بدری اور انیس تم اس عورت کے
پاس جاؤ اگر وہ اقرار کرلے تو رجم کردو۔ چنانچہ

اس روایت سے پہلی بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ آپ نے کتاب اللہ سے مراد وہ
حکم لیا ہے جو آپ نے او یجعل اللہ لہن سبیلا کے تحت دیا ہے اور اسی کے مطابق کم از
کم چار پانچ بار خود آپ نے رجم کی سزا کا نفاذ فرمایا اس سے دوسری سب سے اہم بات
یہ ثابت ہوتی ہے کہ حضرت ابوہریرہ اور حضرت زید بن خالد دونوں حضرات یہ بیان
کر رہے ہیں کہ جس وقت یہ معاملہ پیش ہوا اس وقت کنا عند النبی صلی اللہ علیہ وسلم
ہم لوگ آپ کی خدمت میں موجود تھے۔ ان دونوں حضرات کا یہ بیان کہ ہم لوگ اس فیصلہ
کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود تھے ان لوگوں کا کتنا زبردست

مسکت جواب ہے جو سورہ نور کے نزول کے بعد رجم کے واقعات کی تنسیخ کا سوال اٹھاتے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ ۷ سنہ ھ میں اسلام لائے۔ ابن سعد نے جو اس کی تفصیل کی ہے اس کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو۔

حضرت ابوہریرہ سات ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مدینہ آئے اور آپ اس وقت خیبر میں تھے پھر وہاں سے وہ خیبر گئے اور پھر آپ کے ساتھ مدینہ واپس ہوئے۔

اقدم ابوهريرة سنة سبع والنبی صلی اللہ علیہ وسلم بخیبر فسار الی خیبر حتی قدم مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی المدینة۔

(ج ۴ ص ۳۲۷)

اور زید بن خالد الجہنی کی عمر آپ کی وفات کے وقت صرف ۱۷ برس تھی ظاہر ہے کہ یہ بیان کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس موجود تھے، اگر سورہ نور سے پہلے کا مان لیا جائے تو اس وقت ان کی عمر ۱۰۔۱۱ سال کی تھی اور یہ بیان دس بارہ سال کے بچے کا نہیں بلکہ کم از کم ۱۵۔۱۶ سال کی عمر کے نوجوان ہی کا ہو سکتا ہے، اگر مان لیا جائے کہ وہ دس برس کی عمر میں آپ کی مجلس میں شریک ہونے لگے تھے جب بھی یہ حضرت ابوہریرہ کے اسلام لانے کے بعد ہی تو ان کی شرکت ہوئی۔ اس اعتبار سے اس کے ۷ سنہ ھ کے بعد کا واقعہ ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ اور سورہ نور کا سنہ نزول سے زیادہ ۶ سنہ ھ کے درمیان ہے اسی طرح ماعز بن مالک کے سن رجم کا ذکر کسی کتاب میں نظر سے نہیں گذر مگر یہ سن اس طرح متعین ہو سکتا ہے کہ یہ اسلمی تھے اور بنو اسلم کے ایک دو صاحبان کے علاوہ کسی اور کا ذکر صلح حدیبیہ یا غزوۂ خیبر سے پہلے کہیں نہیں ملتا۔ سب سے پہلے صلح حدیبیہ کے موقع پر ابن سعد نے کئی اسلمیوں کا ذکر کیا ہے کہ وہ اسلام لائے اور حدیبیہ میں شریک ہوئے ابن سعد نے فتح مکہ سے کچھ پہلے جو لوگ اسلام لائے ان میں ماعز[1] اور ھزال

---

[1] ماعز یتیم تھے انکے والد نے مرتے وقت ان کو ھزال کی کفالت میں دیدیا تھا، ھزال نے ان کی پرورش کی اور شادی بیاہ کیا ماعز نے سب سے پہلے اپنی غلطی کا انہی سے اعتراف کیا اور انھوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا (ابن سعد)

جنھوں نے ماعزؓ کی پرورش کی تھی، کا ذکر کیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ یہ ماعز اور ھزال وغیرہ بنو اسلم کی اس شاخ کے فرد تھے جو بنو اسلم سے الگ ہو کر بنو مالک کے نام سے موسوم تھی اس کے دو فرد اسماء بن حارثہ اور ہند بن حارثہ جو آپس میں بھائی تھے ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے موقع پر بھیجا کہ بنو اسلم کے لوگوں سے کہو کہ رمضان یہیں گزاریں اس لئے کہ رمضان ہی میں آپؐ کا ارادہ فتح مکہ کا تھا (ابن سعد جلد ۴ ص ۳۲۲) اس طرح یہ بات متعین ہو جاتی ہے کہ یہ واقعات سورہ نور کے نزول کے بہت بعد کے ہیں۔ اس حدیث سے تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ شادی شدہ زانی یا زانیہ کا رجم ایسا قطعی اور ثابت شدہ مسئلہ تھا کہ اس کا علم ہر خاص و عام کو تھا۔ چنانچہ آپ کی خدمت میں آنے سے پہلے فریقین کو کچھ لوگوں نے یہ مسئلہ بتا دیا تھا کہ ایک کو جلد اور ایک رجم ہے۔ آپ نے زور دے کر جو یہ فرمایا کہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ایک پنچائتی فیصلہ کر چکے تھے اب اس کو اسی صورت میں رد کیا جا سکتا تھا جب رسول کی زبان سے وہ خدا کا حکم سن لیں۴۔ ان تفصیلات کے بعد اگر کوئی صاحب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ رجم کے سارے واقعات سورہ نور کے نزول کے پہلے کے ہیں تو ہٹ دھرمی کے علاوہ کوئی دلیل ان کے پاس نہیں ہے۔ اور اگر اس کی کوئی دلیل ہو تو انھیں پیش کرنا چاہئے۔ محض دعویٰ کر لینا کافی نہیں ہے۔

رجم کے مخالفین کے دلائل صحابہ کرام کے گروہ میں کسی ایک شخص کے بارے میں یہ نہیں جا سکتا ہے کہ ان میں سے کسی نے رجم کے شرعی سزا ہونے میں کسی ادنیٰ شبہہ کا اظہار کیا ہو۔ البتہ حضرت عمرؓ کی مذکورہ بالا تقریر سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں کچھ ایسے افراد اسلام میں داخل ہونے لگے تھے جن کو مختلف مسائل سے اطمینان نہیں تھا اور انہی کو مطمئن کرنے کے لئے حضرت عمرؓ نے اپنے آخری حج کے موقع پر اپنا وہ مشہور خطبہ دیا جس کا خلاصہ پہلے گذر چکا ہے گو کہ اس میں یہ ذکر نہیں ہے کہ خاص طور پر کسی نے رجم کی سزا کے بارے میں اپنے شبہہ کا اظہار کیا تھا۔ اس میں

۴ بخاری ج ۲ ص ۱۰۰۵ مسلم

صرف اتنا ذکر ہے کہ حضرت عمر اپنے آخری حج کے موقع پر منیٰ میں تھے کہ کسی نے حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کے بارے میں کہا کہ حضرت ابوبکر صدیق کی بیعت اچانک ہو گئی تھی حضرت عمر کے انتقال کے بعد میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ کے ہاتھ پر بیعت کروں گا، اس بات سے حضرت عمر کو ناگواری ہوئی اور انھوں نے ان لوگوں کو تنبیہ کرنے کے لئے فرمایا کہ آج شام کو ایک اہم تقریر کروں گا اسوقت آپ کی مجلس میں عبدالرحمٰن بن عوف موجود تھے انھوں نے کہا۔

یا امیر المومنین لا تفعل فان الموسم یجمع رعاع الناس وغوغاءهم وانهم الذی یغلبون علی قربك حین تقوم فی الناس وانا اخشی ان تقوم فتقول مقالة یطیرها عنك کل مطیر والا یعوها و الا یضعوها مواضعها فامهل حتی تقدم المدینة فانها دار الهجرة والسنة فتخلص باهل الفقه واشراف الناس فتقول ما قلت متمکنا فیعی اهل العلم مقالتك فیضعوها مواضعها

(بخاری شریف ج ۲ کتاب الحدود)

امیرالمومنین آپ ایسا نہ کریں یہ حج کا زمانہ ہے اس میں معمولی اور غیر ذمہ دار قسم کے لوگوں کا مجمع ہے، جب آپ تقریر کرنے کے لئے کھڑے ہوں گے تو یہی لوگ آگے بڑھکر آپکے قریب بیٹھ جائیں گے اور آپ کوئی بات کہیں گے اور یہ بے سمجھے بوجھے لے اڑیں گے اور اس کے نہ جانے کیا کیا معنی پہنائیں گے۔ تو آپ توقف کریں جب مدینہ پہونچ جائیں گے تو وہاں یہ تقریر کریں وہ دارالہجرت اور سنت نبوی کا مرکز ہے تو وہاں سمجھدار اور ممتاز لوگوں کو جمع کر کے ان کے سامنے وہ تقریر کریں جو بیان کرنا چاہتے ہیں یہ لوگ آپ کی بات سمجھیں گے اور محفوظ رکھیں گے اور اس کو صحیح معنی میں استعمال کریں گے۔

چنانچہ حضرت عمر نے منیٰ میں وہ تقریر نہیں کی اور مدینہ منورہ پہنچتے ہی یہ تقریر فرمائی اور اس میں بہت سی ضروری باتوں کے ساتھ رجم کے بارے میں کہا

وہی بات فرمائی جس کی پوری تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

یہاں اس واقعہ کی تفصیل بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ رجم کے سلسلہ میں اس وقت کسی کے ذہن میں کوئی شبہہ نہیں تھا مگر حضرت عمر کی چشم بصیرت یہ دیکھ رہی تھی کہ اسکی فرضیت کے بارے میں بعض تنگ پسند طبیعتیں وسوسہ اندازی کر سکتی ہیں چنانچہ بعد میں خوارج[1] کے ایک گروہ اور بعض دوسرے افراد نے اس کی فرضیت کا انکار کیا حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ خلافت میں کچھ لوگوں غالباً خوارج نے یہ کہنا شروع کیا کہ رجم کا حکم کتاب اللہ میں نہیں۔ تو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کو بلایا

الزمهم باعداد الركعات ومقادير الزكوات فقالوا ذالك من فعله صلى الله عليه وسلم والمسلمين فقال لهم وهذا ايضا كذالك[2]

اور ان سے سوال کرتے ہوئے فرمایا کہ نماز کی رکعتوں اور زکوۃ وصدقات کی مقدار وغیرہ کے بارے میں کیا خیال ہے کہ یہ کتاب اللہ کا حکم ہے یا نہیں تو وہ بولے کہ ہاں یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے عمل سے ثابت ہے فرمایا کہ بس یہی صورت رجم کی ہے اس کا وہ کوئی جواب نہ دے سکے، غالباً مطمئن ہو گئے۔

اس تفصیل سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جب بھی رجم کے بارے میں صحابہ کے سامنے یا تابعین کے زمانہ میں یا بعد کے زمانہ میں یہ مسئلہ آیا تو ان میں سے ایک شخص کے دل میں اس کی فرضیت کے بارے میں شبہہ تک نہیں ہوا۔

عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ میں جو لوگ یہ بات کہہ رہے تھے ان کو حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جب یہ الزامی جواب دیا تو وہ خاموش ہو گئے مگر اس دور کے حضرات

---

[1] خوارج تو عام طور پر رجم کا انکار کرتے تھے مگر معتزلہ کے بارے میں کوئی ثبوت نہیں مل سکا کہ وہ بھی رجم کو شرعی سزا نہیں سمجھتے تھے۔ صاحب کشاف تو سورہ نور سے جو اس کے نسخ کے قائل ہیں اس کا جواب دیا ہے۔

[2] روح المعانی تفسیر سورہ نور۔

جو ان تنگ پسندوں کی تاریخ کو دہرا رہے ہیں وہ اپنے مغرب زدہ عقلی دلائل کی بنا پر اتنی بات سے خاموش ہونے والے نہیں ہیں اس لئے ہم ان کے دلائل کا ذکر کرکے انشاء اللہ ایک ایک کا جواب دینے کی کوشش کریں گے، سب سے مفصل مضمون شاید اس سلسلہ میں سابق چیف جسٹس مسٹر محمد یعقوب علی صاحب کا "کیا رجم اسلامی سزا ہے؟" کے عنوان سے پاکستان کے انگریزی اخباروں میں شائع ہوا ہے جس کے جواب میں ماہنامہ الحق، ترجمان القرآن وغیرہ مضامین شائع ہوئے ہیں۔ اسی کے ساتھ مختلف مدارس فکر کے ۲۶ علما کا ایک مشترکہ بیان بھی ترجمان القرآن نے نقل کیا ہے، جس کی چند سطریں یہ ہیں:-

> شادی شدہ زانی اور زانیہ کی سزائے رجم تمام مسلم ائمہ مجتہدین کے نزدیک حدود میں شامل ہے۔ احادیث متواترہ اور اجماع امت سے واضح طور پر اس کا ثبوت موجود ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے بہ طور حد رجم کی سزا سنائی گئی ہے۔
>
> (ترجمان الفرقان اپریل ۱۹۸۱ء)

پاکستان میں جو آواز ۸۱ء میں اٹھائی گئی ہے آج سے بیس برس پہلے یہی آواز غلام محمد کے دور میں ۵۳ء میں بھی اٹھائی گئی تھی کہ رسنگساری کی سزا بعد کی وضع کردہ ہے) جسٹس محمد یعقوب صاحب کا پورا مضمون دیکھنے کا اتفاق تو نہیں ہوا مگر ان کے مضمون کا جو خلاصہ ترجمان الفرقان کے ذریعہ ہمیں مل سکا ہے اور اس میں جو دلائل رجم کی سزا کے خلاف دئے گئے ہیں وہ یہ ہیں:-

۱۔ اسلام سے پہلے سنگین، وحشیانہ اور ظالمانہ سزائیں رائج تھیں مگر اسلام چونکہ انسانیت سکھانے آیا تھا اس نے دوسرے شعبوں کی طرح جرم وسزا میں بھی تبدیلی پیدا کی۔ پتھر مار کر ہلاک کرنا ایک وحشیانہ سزا ہے۔

۲۔ سورہ نور کی آیت بسلسلہ سزائے زنا (آیت ۲) میں چونکہ زانی اور زانیہ کے الفاظ "ال" کے ساتھ آئے ہیں لہٰذا آیت ہر قسم کے ارتکاب زنا کو محیط ہے زانی و

زانیہ کے کنوارا یا نکاحی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا یعنی سب کی سزا سو کوڑے رہے گی۔

۳۔ رجم کے متعلق جتنی احادیث ہیں اور احادیث میں حد رجم کے نفاذ کے جو واقعات اور صحابہ کرامؓ کے ارشادات مذکور ہیں وہ سب سورہ نور کی آیت نمبر ۲ کے نازل ہونے سے پہلے کے ہیں۔

۴۔ اگر حد رجم کے قرآن میں مذکور نہ ہوتے ہوئے اس کو دین یا قرآن کا تقاضا کہا جائے تو اس کے دوسرے معنی یہ ہوں گے کہ قرآن تمام امور میں اپنی جگہ مکمل نہیں ہے۔

۵۔ سورہ نور کی مقرر کردہ حد کو حدیث سے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

۶۔ قرآن میں ۹ مقامات پر زنا موضوع کلام ہے مگر کسی ایک جگہ بھی رجم کا ذکر نہیں ہے۔

۷۔ خوارج اور معتزلہ کے حوالے سے یہ دلیل بھی دی گئی ہے کہ سورہ نسا میں چونکہ یہ حکم ہے کہ اگر کوئی کنیز زنا کا جرم کرے تو اسے آزاد عورت کے مقابلے میں آدھی سزا دی جائے اور رجم کی سزا کا آدھا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ لہذا رجم کوئی شرعی حد نہیں ہے۔

یہ سوال کہ رجم ایک وحشیانہ سزا ہے یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں دو باتیں کہی جا سکتی ہیں ایک یہ کہ مغرب کے مستشرقین نے اپنی اباحیت پسندی کے تحت اسلام کیخلاف کئی صدیوں سے جو زبردست مہم چلا رکھی ہے اس کا ایک جزیہ ہے کہ اسلام نے جرائم کے سلسلہ میں جو سزائیں تجویز کی ہیں وہ بہت سخت بلکہ وحشیانہ ہیں انہی خیالات کو ہمارے مشرقی ملکوں کے متغربین دھراتے رہتے ہیں۔ ایک رجم کی سزا ہی پر کیا منحصر ہے دوسری سزاؤں کے بارے میں کیا وحشیانہ سزا ہونے کا الزام اسلام پر عائد نہیں کیا گیا ہے؟ رجم کی سزا تو آجتک گواہی و شہادت سے ثابت بھی نہیں ہو سکی ہے جو سزا دی گئی ہے وہ اعتراف پر اس لئے کہ اس کے ثبوت کیلئے جتنی زبردست شہادت کی ضرورت ہے وہ مشکل سے فراہم ہو سکتی ہے[1] پھر اس کے ساتھ اسلام کی رحمۃ للعالمینی یہ ہے کہ اس نے ادرؤا الحدود بالشبہات کا بھی اصول بنا دیا ہے یعنی شبہہ کا فائدہ مجرم کے حق میں جائے گا جس اصول پر اسوقت ساری دنیا جرائم کی سزا کے سلسلہ میں عمل کر رہی ہے اسکے برخلاف چوری کی سزا اور قذف کی سزا تو بڑی آسانی سے دی جا سکتی ہے، غور کیجئے کہ رجم سے بڑا اعتراض تو ڈاکہ اور چوری کی سزا پر ہو سکتا ہے۔

---

[1] گواہی کے سلسلہ میں دو شرطیں بنیادی ہیں ایک یہ کہ شہادت بالکل عینی ہو گواہوں نے اس طرح دیکھا ہو جس طرح سلائی سرمہ دانی میں ڈالی جاتی ہو، ڈول کنوئیں میں۔ دوسری بنیادی شرط یہ ہے کہ سب گواہوں کے بیان میں اتفاق ہو کہ انھوں نے کہاں کس کو اور کس کے ساتھ زنا کرتے دیکھا ہے۔

سو دو سو روپئے کی چوری میں کسی کا ہاتھ کاٹ کر زندگی بھر کے لئے اسے بے کار کر دیا جائے اور دوبارہ وہ چوری کرے تو دوسرا ہاتھ بھی کاٹ دیا جائے، ڈاکہ ڈالے تو ہاتھ پیر کاٹ دیئے جائیں یا سولی پر چڑھا دیا جائے وغیرہ وغیرہ۔ جو لوگ رجم کے بارے میں اس کے وحشیانہ سزا ہونے کی بات کرتے ہیں ان سزاؤں کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے کہ یہ سزائیں بھی اسلام کی رحمۃ للعالمینی کے خلاف ہیں یا نہیں اگر وہ ان کو بھی وحشیانہ کہتے ہیں تو رجم کے بارے میں ایک مسلمان کی حیثیت سے ان کو یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ اس کا ذکر قرآن میں نہیں موجود ہے اس لئے کہ ان سزاؤں کا ذکر صراحتہً قرآن میں موجود ہے۔ اور اگر وہ ان سزاؤں کو وحشیانہ نہیں کہتے تو رجم کے بارے میں صرف اس بنا پر کہ قرآن پاک میں صراحتہً اس کا ذکر نہیں ہے ان کو اسے وحشیانہ کہنے کا حق نہیں پہنچتا اس لئے کہ یہ کوئی نیا جرم یا نئی سزا نہیں ہے جو اس زمانہ میں پیدا ہو گئی ہو بلکہ یہ قدیم جرم ہے اور قدیم سزا ہے جس پر عہد نبوی سے لے کر عہد راشدہ بلکہ بہت بعد تک برابر عمل ہوتا رہا ہے۔ اور پوری امت میں اس بارے میں کبھی دو رائے نہیں ہوئی ہے۔ رجم کی سزا کو وحشیانہ کہکر اس کی سنگینی کو ظاہر کرنا ایک اباحیت پسندانہ جذباتی بات سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، اس سلسلہ میں یہ کہنا کہ اسلام سے پہلے ان جرائم کی سزا بہت سخت تھی مگر اسلام نے اصلاح کرکے آسان بنا دیا یہ بھی جذباتی اور مغالطہ آمیز بات ہے جس کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے۔ ان جرائم کی اسلام سے پہلے تو کوئی اہمیت تھی ہی نہیں جیسا کہ مغربی تہذیب سے متاثر ملکوں میں آجکل کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اسلام کے نزدیک چونکہ ایک اچھے خاندان اور اچھے معاشرہ کو وجود میں لانا اس کا بنیادی مقصد ہے اس لئے اس نے ان جرائم کے سلسلہ میں جن سے معاشرہ خراب ہوتا ہے یا اس میں فساد و بگاڑ پیدا ہوتا ہے تمام مذاہب کے مقابلہ میں سب سے پہلے سخت نوٹس لیا اور اسکے لئے سخت سزائیں مقرر کیں۔ کیا جاہلیت میں چور کا ہاتھ کاٹا جاتا تھا یا زنا کے جرم میں خانہ قید بھی کیا جاتا تھا یا سو کوڑے مارے جاتے تھے اور اسلام نے

انھیں ہلکا کر دیا؟ ان سزاؤں کو سخت کہنے والے اس کی اخلاقی اہمیت کو یا تو قصداً نظر انداز کرتے ہیں یا پھر اپنے اعتراض کو وزنی بنانے کے لئے یہ جذباتی بات دھراتے رہتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ ایک ایسے مسئلہ کے بارے میں جس کے بارے میں امت محمدیہ میں کبھی کوئی دو رائے نہیں ہوئی ہے اس کے بارے میں ۱۴ سو برس بعد احساس کمتری اور مرعوبیت کی بنا پر آپ کو اپنے عقلی استدلالات کے زور پر اسے رد کر دینے کا حق کہاں سے پہونچتا ہے۔ مغربی مستشرقین نے اجماع امت کے بارے میں جو وسوسہ اندازی کی ہے اور شکوک پیدا کئے ہیں بلکہ اس پر خط نسخ پھیرنے کی کوشش کی ہے اسی کو ہمارے مشرقی مستغربین بعینہ دھراتے رہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک کسی اجماعی مسئلہ میں اور خاص طور پر جس کا وقوع عہد نبوت سے عہد صحابہ تک ہو چکا ہو اس کے بالکلیہ غیر شرعی ہونے کے بارے میں انفرادی رائے دینے کا قطعی کسی کو حق نہیں پہونچتا۔ البتہ اس کے جزیات یا موقع ومحل یا معاشرہ کے فساد و بگاڑ کے پیش نظر اس میں کوئی عارضی تخصیص کی جائے یا نہیں تو اس حیثیت سے اس پر بحث کی جا سکتی ہے مگر نفس اس کے مسئلہ کے شرعی یا غیر شرعی ہونے پر بحث کرنا کسی طرح صحیح نہیں کہا جا سکتا اور نہ کسی اسلامی حکومت کو اس کی اجازت دینی چاہیئے ایسا ہم اس لئے نہیں کہہ رہے ہیں کہ علمی دلائل کے اعتبار سے اس مسئلہ میں امت کا پہلو کمزور ہے جیسا کہ اوپر کی تفصیلات سے اندازہ ہو گیا ہوگا۔ بلکہ اس اصول کو نہ ماننے کی صورت میں ایک مذہبی انارکی پھیل سکتی ہے اور پھیل رہی ہے اسلئے اس کا انسداد ضروری ہے۔

ہم اس وقت چونکہ اس مسئلہ کے قانونی اور علمی پہلو پر گفتگو کر رہے ہیں اس لئے ہم اس کے اخلاقی پہلو پر گفتگو کو اس وقت نظر انداز کر رہے ہیں کہ سخت سزاؤں کے نتیجہ میں معاشرہ کا اخلاقی پہلو کتنا بلند ہوا ہے اور مغرب کی اباحیت پسندی نے دنیا کی اخلاقی سطح کو کتنا نیچے گرا دیا ہے۔ اور آج بھی جہاں یہ سزائیں رائج ہیں

ان جرائم کا ارتکاب کتنا کم ہو گیا ہے۔ شاید اس وقت پاکستان کے معاشرہ پر بھی اس کے کچھ اچھے اثرات نمایاں ہونے شروع ہو گئے ہیں، اسی لئے کچھ لوگوں کو اس سے پریشانی لاحق ہو رہی ہے۔

جسٹس صاحب نے رجم کے خلاف جو دوسری دلیل دی ہے۔ وہ یہ ہے کہ الزانی والزانیۃ میں جو الف لام آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زنا کا صدور شادی شدہ سے ہو یا غیر شادی شدہ سے سب کے لئے عام ہے اور سب کے لئے ایک ہی سزا ہے۔ ہم جسٹس صاحب سے پوچھتے ہیں کہ کیا الف لام جس لفظ پر آجائے اس میں عمومیت پیدا ہو جاتی ہے یا خصوصیت، کسی لفظ پر الف لام آنے کی متعدد صورتیں ہیں مگر اس کے ذریعہ کسی لفظ کے مفہوم میں بنیادی تبدیلی یہ ہوتی ہے کہ الف لام نکرہ کو معرفہ بنا دیتا ہے[1] اور آپ الف لام داخل کر کے اسے معرفہ سے نکرہ بنا رہے ہیں پھر آپ کے کہنے کے مطابق یہ الف لام یا تو استغراق کا ہوا یا جنس کا تو یہاں یہ سوال ہوتا ہے کہ اگر اس میں ہر طرح کی سزا کا حکم ہے تو پھر اگر کوئی مرد اور عورت بلوغ کی عمر کو نہ پہونچے ہوں اور زنا کریں تو ان کا حکم کیا ہوگا کیا وہ بھی اس عمومیت میں داخل ہوں گے، اسی طرح عمل لوط کو بھی آپ اس میں شامل کریں گے یا نہیں، جسٹس صاحب سے ہم یہ عرض کریں گے کہ یہ الف لام استغراق کا نہیں بلکہ عہد خارجی ہے یہ الف لام ویسا ہی ہے جیسا کہ السارق والسارقۃ کا الف لام ہے اگر آپ اس کو عمومی مفہوم میں لے لیں تو پھر ہر چوری پر ہاتھ کاٹ دیا جائے، کیا ایک کاپی اور پنسل کے چرانے پر بھی ہاتھ کاٹ دیں گے؟ اگر آپ یہاں الف لام کے ہونے میں تخصیص اور تحدید کے قائل ہیں تو پھر الزانی والزانیۃ میں کیوں اس کے قائل نہیں ہیں۔

جسٹس صاحب سے بے ادبی کی معافی چاہتے ہوئے ہم عرض کریں گے کہ اگر وہ کوئی نحو کی معمولی کتاب ہی دیکھ لیتے تو وہ الزانی والزانیۃ کے اوپر الف لام کو جنس یا

---

[1] الف لام کا بنیادی کام یہی ہے، جس طرح انگریزی میں THE آتا ہے تو خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے۔

استغراق کے مفہوم میں نہ لیتے۔ الف لام کی تھوڑی سی تفصیل ملاحظہ ہو۔ الف لام کی چار قسمیں ہیں، استغراقی، جنسی، عہد خارجی، عہد ذہنی، کسی کلمہ پر الف لام کے داخل ہونے کی دو صورتیں ہیں یا تو اس سے مراد اس کی ماہیت ہوگی یا افراد، اگر ماہیت مراد ہو تو اس کو الف لام جنسی کہتے ہیں جیسے الرجل خیر من المراۃ اور اگر مراد افراد ہیں تو اس کی بھی دو صورتیں ہیں۔ یا تو اس کے کل افراد مراد ہوں گے یا بعض۔ اگر کل مراد ہیں تو اس کو استغراقی کہتے ہیں جیسے الحمد للہ، ان الانسان لفی خسر۔ اور اگر بعض مراد ہیں تو پھر اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں یا تو بعض افراد پہلے سے متعین اور معہود ہوں گے یا نہیں۔ اگر متعین و معہود ہوں گے تو اس کو عہد خارجی کہتے ہیں جیسے فعصیٰ فرعون الرسول اور اگر غیر متعین و غیر معہود ہوں تو اس کو عہد ذہنی کہتے ہیں جیسے فاکلہ الذئبُ۔

ہم جیسا کہ اوپر عرض کر چکے ہیں کہ اگر اسے الف لام جنسی یا استغراقی کہیں تو وہ تمام سوالات ابھرتے ہیں جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے لامحالہ اسے عہد خارجی ہی کہہ سکتے ہیں۔ الف لام عہد خارجی کا مطلب یہ ہوگا کہ خارج سے اس کی تعیین اور تحدید کی جائے گی، محض لفظ سے اس کے افراد کا تعین نہیں کیا جا سکتا، تو جس طرح السارق والسارقۃ کے سلسلہ میں ہم مطلقاً اس پر عمل نہیں کرتے بلکہ چوری شدہ مال کی مقدار اور حالات وغیرہ کی تعیین میں ہم کو حدیث نبوی سے مدد لینی پڑتی ہے اسی طرح زنا کے سلسلہ میں بھی اس کی تعیین و تحدید کے بارے میں قرآن کی دوسری آیات اور احادیث نبوی سے مدد لینی ضروری ہے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو قرآن کی بیشمار آیات کی تاویل اور تطبیق مشکل ہو جائے گی، پھر آپ تفسیر کی تمام کتابیں اور نحو کی کتابیں دیکھ لیں اس میں سب نے اس الف لام کو التی اور الذی کے معنی میں لیا ہے اور الذی اور التی جب اسم فاعل اور اسم مفعول پر داخل ہوتے ہیں تو موصول میں تخصیص پیدا ہو جاتی ہے۔

بہرحال جسٹس صاحب یا دوسرے حضرات جو اس کو اپنے استدلال کی بنیاد

بتاتے ہیں وہ نہایت ہی کمزور بنیاد ہے۔

۳۔ حسبنسؔ صاحب کا تیسرا دعویٰ یہ ہے کہ رجم کے سارے واقعات سورہ نور کے نزول کے پہلے کے ہیں۔ سورہ نور کے بعد رجم کا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا یہ ایک بے دلیل دعویٰ ہے اگر حسبنسؔ صاحب کوئی ضعیف سے ضعیف حدیث یا کسی صحابی کا قول یا کوئی تاریخی روایت پیش کر دیتے تو ان کا دعویٰ قابل غور بن جاتا مگر وہ ایک وکیل کی طرح ایک دعویٰ کرکے علیحدہ ہو گئے اور انھوں نے اس کے ثبوت کی ذمہ داری رجم کے قائلین پر ڈال دی۔ بہر حال ہم اس ذمہ داری کو قبول کرتے ہیں۔ اوپر ہم نے رجم کے واقعات کے سلسلے میں تاریخ کی جو تعین کی ہے ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان میں اکثر واقعات ۸ھ کے بعد کے ہیں۔ رجم کا وہ مقدمہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مدعی اور مدعا الیہ دونوں نے ساتھ پیش کیا اس کے بارے میں تو صراحۃً معلوم ہوتا ہے کہ وہ ۹ھ یعنی سورہ نور کے نزول کے دو یا تین سال بعد کا ہے[1]۔ اس کے علاوہ ہم نے ماعز اور ان کے مربی ھزال کے سلسلہ میں ارباب سیر و تاریخ تصریحات کی روشنی میں جو یہ عرض کیا ہے کہ ماعز کے رجم کا واقعہ بھی صلح حدیبیہ کے بعد یا غزوہ خیبر سے کچھ پہلے یا بعد کا ہے۔

پھر سب سے بڑا سوال یہ ہے کہ اگر آپ اسے سورہ نور کے بعد کے واقعات مانتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ۶ھ کے بعد ۹ھ تک رجم کے واقعات پیش آئے گویا دو تین سال تک اسلام کی رحمۃ للعالمینی کے خلاف عمل ہوتا رہا اور تین سال بعد اس میں آسانی پیدا کی گئی ہے۔ یہاں بھی ایک مغالطہ سے کام لیا جا رہا ہے ورنہ جرائم کے سلسلہ میں جتنی سزائیں اسلام نے مقرر کی ہیں ان میں آہستہ آہستہ سختی کی گئی ہے نہ کہ نرمی اور زنا کے سلسلہ میں بھی

---

[1] بخاری شریف میں ہے کہ ابو اسحاق الشیبانی نے عبد اللہ بن اوفی سے سوال کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم سورہ نور کے بعد کیا یا پہلے کیا تو انھوں نے کہا کہ میں تو نہیں بتا سکتا مگر آپ نے رجم کیا۔ اس پر حافظ ابن حجر نے بھی قریب قریب وہی بات لکھی ہے جو راقم الحروف نے عرض کی ہے اور اسی عسیف والی حدیث سے استدلال کیا ہے۔

یہی تدریج قائم رہی ہے اور آپ الٹے اس میں آہستہ آہستہ آسانی پیدا کرنے کی بات کرتے ہیں۔ گویا ۳-۴ برس تک اسلام میں جاہلیت کی وحشیانہ سزا پر عمل ہوتا رہا غور کیجئے یہ کتنی غیر معقول اور غیر تاریخی بات ہے۔

۴- چوتھا سوال جسٹس صاحب نے یہ اٹھایا ہے کہ قرآن میں حد رجم کا ذکر نہ ہوتے ہوئے اسے دین کا یا قرآن کا تقاضا کہا جائے تو اس کے معنی ہیں کہ قرآن اپنی جگہ مکمل نہیں ہے، یہ انتہائی عامیانہ سوال ہے، جس کی ایک پڑھے لکھے آدمی سے بالکل توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ ہم جواباً جسٹس صاحب سے پوچھتے ہیں کہ نماز کی پوری ہیئت تعداد رکعات اوقات نماز کی تحدید، زکوٰۃ کی مقدار، اس کی ادائیگی کی مدت، غلہ، پیسہ اور زیور کی زکوٰۃ کا الگ الگ نصاب کا صراحتہ قرآن مجید میں کہاں ذکر ہے، خالہ اور بھانجی کو ایک ساتھ جمع کرنے سے قرآن نہیں روکتا تو کیا آپ اس کی اجازت دینا صحیح سمجھیں گے، اس کے علاوہ بیشمار مسائل ہیں جن کا ذکر قرآن میں صراحتہ نہیں ہے، کیا یہ سب قرآن کے نامکمل ہونے کے دلائل ہیں؟ یہ سب معلوم نہیں جسٹس صاحب کے نزدیک دین اور قرآن کا تقاضا ہیں یا نہیں؟ اگر اہل قرآن کی طرح اس کو وہ دین اور قرآن کا تقاضا نہیں سمجھتے تو پھر آپ جو چاہیں لکھ سکتے ہیں لیکن واقعی اگر آپ اس کو قرآن اور دین کا تقاضا سمجھتے ہیں تو قرآن کے تقاضے کو اسیوقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک صراحتہ النص کے ساتھ اس کے اشارۃ النص دلالت النص اور اقتضاء النص[1] کو بھی نہ سمجھا جائے اور ان سب کی تعیین کے لئے آپ کو حدیث نبوی کی طرف رجوع کرنا لازمی ہوگا۔ یہ سوال کر کے جسٹس صاحب نے اپنے موقف کو مضبوط کرنے کے بجائے کمزور کر دیا۔ قرآن اصول و کلیات کے اعتبار سے یقیناً مکمل ہے مگر قرآن کا کام جزیات کی تفصیل نہیں ہے اور نہ بائبل لازم بنتا ہے اس کی مزید وضاحت آ رہی ہے۔

---

[1] ہم اس کی مثالیں دیکر اس بحث کو طول نہیں دینا چاہتے مگر آپ اسے بعد کی وضع کردہ اصطلاح نہ سمجھیں بلکہ قرآن کی تفسیر اور تفصیل میں ان کا استعمال خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور صحابہ نے بھی قرآن سے بیشمار قطعی الدلالت مسائل اخذ کئے ہیں۔

۵۔ ان کی پانچویں دلیل یا پانچواں سوال یہ ہے کہ سورہ نور کی مقرر کردہ حد کو حدیث سے تبدیل نہیں کیا جاسکتا، اوپر اس کی پوری تفصیل گزر چکی ہے کہ یہاں نسخ و تبدیل کا سوال نہیں ہے بلکہ تخصیص و تحدید کرنے اور مطلق کو مقید اور مجمل کو مفصل کرنے کا سوال ہے اوپر اس کی کچھ مثالیں دی جا چکی ہیں کہ اگر آپ حدیث کو الگ کریں تو قرآن کے بیشمار احکام و فرائض کو نہ ہم سمجھ سکتے ہیں اور دان پر عمل ہی کر سکتے ہیں، قرآن کی حیثیت کانسٹی ٹیوشن کی ہے اور حدیث کی حیثیت کانسٹی ٹیوشن کی بھی ہے اور لا کی بھی۔ کیا کسی کانسٹی ٹیوشن میں تعزیرات ہند پاک کی ساری دفعات کا احاطہ ممکن ہے یا دنیا کے کسی کانسٹی ٹیوشن میں ساری قانونی دفعات کا احاطہ کیا جا سکتا ہے بلکہ اس میں رہنما اصول دیئے جاتے ہیں۔ بالکل قرآن کی حیثیت بھی رہنما اصول کی ہے۔ نہ تو اس کے بغیر کوئی قانون بن سکتا ہے اور نہ ہر قانونی جزیہ کو اس میں تلاش کیا جا سکتا ہے، اس بات کو ہم سے زیادہ جسٹس صاحب جانتے ہوں گے۔

۶۔ آپ کہتے ہیں کہ قرآن میں ۹ جگہ زنا کا ذکر ہے مگر کہیں رجم کا ذکر نہیں ہے۔ ہم اوپر عرض کر چکے ہیں کہ قرآن میں صراحتہً رجم کا ذکر نہیں ہے مگر او یجعل اللہ لھن سبیلا کے تحت آپ کو وحی خفی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جو حکم دیا وہ یہ تھا کہ شادی شدہ زانی یا زانیہ کو رجم کیا جائے اور آپ نے اس حکم کے مطابق عمل فرمایا اور عہد راشدہ اور اس کے بعد تک اس پر عمل ہوتا رہا۔ یہ قرآن کا اشارۃ النص ہے جس کی توضیح آپ نے فرمائی اور پوری امت نے اس پر عمل کیا، بس اس کی قطعیت اور اس کے حکم الٰہی ہونے کے لئے یہی کافی ہے۔

۷۔ ساتواں سوال یہ اٹھایا گیا ہے کہ سورہ نساء میں لونڈی کے لئے یہ حکم ہے کہ اگر اس سے زنا کا صدور ہو تو اسے آدھی سزا دی جائے، تو رجم کی آدھی سزا تو دی نہیں جا سکتی، اس کا جواب بھی متعدد علماء نے دیا ہے مگر اس پر سب سے زیادہ مفصل تحریر مولانا مودودی مرحوم کی ہے جسے ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

سرسری نگاہ میں یہاں ایک پیچیدگی واقع ہوئی ہے جس سے خوارج اور دوسرے لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہے جو رجم کے منکر ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ــــ اگر شادی شدہ عورت کے لئے شریعت اسلام میں زنا کی سزا رجم ہے تو اس کی نصف سزا کیا ہو سکتی ہے جو لونڈی کو دی جائے لہٰذا یہ آیت اس بات پر دلیل قاطع ہے کہ اسلام میں رجم کی سزا ہے ہی نہیں ــ لیکن ان لوگوں نے قرآن کے الفاظ پر غور نہیں کیا۔ اس رکوع میں لفظ مُحْصَنٰتُ (محفوظ عورتیں) دو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ ایک شادی شدہ عورتیں جن کو شوہر کی حفاظت حاصل ہو دوسرے خاندانی عورتیں جن کو خاندان کی حفاظت حاصل ہو اگرچہ وہ شادی شدہ نہ ہوں۔ آیت زیر بحث میں محصنات کا لفظ لونڈی کے بالمقابل خاندانی عورتوں کے لئے دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے نہ کہ پہلے معنی میں جیسا کہ آیت کے مضمون سے صاف ظاہر ہے۔ بخلاف اس کے لونڈیوں کے لئے محصنات کا لفظ پہلے معنی میں استعمال ہوا ہے اور صاف الفاظ میں فرمایا کہ جب انھیں نکاح کی حفاظت حاصل ہو جائے (فَاِذَآ اُحْصِنَّ) تب ان کے لئے زنا کے ارتکاب پر وہ سزا ہے جو مذکور ہوئی۔ اب اگر غائر نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ خاندانی عورتوں کو دو حفاظتیں حاصل ہوتی ہیں ایک خاندان کی حفاظت جس کی بنا پر وہ شادی کے بغیر بھی محصنہ ہوتی ہے دوسری شوہر کی حفاظت جس کی وجہ سے اس کے لئے خاندان کی حفاظت پر ایک اور حفاظت کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ بخلاف اس کے لونڈی جب تک لونڈی ہے محصنہ نہیں ہے کیونکہ اس کو کسی خاندان کی حفاظت حاصل نہیں ہے البتہ نکاح ہونے پر اس کو شوہر کی حفاظت حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی ادھوری کیونکہ شوہر کی حفاظت میں آنے کے بعد

بھی نہ تو وہ ان لوگوں کی بندی سے آزاد ہوتی ہے جنکی ملک میں وہ تھی، نہ اسے معاشرت میں وہ مرتبہ حاصل ہوتا ہے جو خاندانی عورت کو نصیب ہوا کرتا ہے لہذا اسے جو سزا دی جائیگی وہ غیر شادی شدہ عورتوں کی سزا سے آدھی ہوگی نہ کہ شادی شدہ عورتوں کی سزا سے، نیز یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ سورہ نور کی دوسری آیت میں زنا کی جس سزا کا ذکر ہے وہ صرف غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کے لئے ہے جنکے مقابلے میں یہاں شادی شدہ لونڈی کی سزا نصف بیان کی گئی ہے، رہیں شادی شدہ خاندانی عورتیں تو وہ غیر شادی شدہ محصنات سے زیادہ سخت سزا کی مستحق ہیں، کیونکہ وہ دوہری حفاظت کو توڑتی ہیں۔ (ترجمان القرآن اپریل ۱۹۵۳ء)

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ لونڈی کے زنا کی سزا کا ذکر سورہ نور میں نہیں بلکہ سورہ نساء میں ہے اور سورہ نساء میں محصنات کا لفظ ایک جگہ آزاد اور خاندانی عورت کے لئے استعمال ہوا ہے اور دوسری جگہ شادی شدہ لونڈی کے لئے آیت ملاحظہ ہو:

فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ .... فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۔	جو شخص تم سے اتنی قدرت نہ رکھتا ہو کہ وہ کنواری آزاد خاندانی لڑکی سے شادی کر سکے تو وہ مومن لونڈیوں سے شادی کر لیں اور لونڈیاں جب شادی شدہ ہو جانے کے بعد اگر پھر زنا کا ارتکاب کریں تو ان کو آزاد عورت کی آدھی سزا دی جائیگی (یعنی پچاس کوڑے)

(نساء رکوع ۴)

اس آیت کے پہلے ٹکڑے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں محصنات کا لفظ کنواری شریف لڑکی کے لئے بولا گیا ہے اس لئے شادی شدہ سے نکاح کا کوئی

سوال تو ہوتا ہی نہیں اور اس آیت سے پہلے والی آیت میں اس کو حرام بھی قرار دیا جا چکا ہے تو اب اس سیاق وسباق میں شادی شدہ لونڈی کی سزائے زنا کا بیان کیا گیا ہے

فعلیھن نصف ما علی المحصنات من العذاب — یعنی آزاد اور کنواری لڑکی کو زنا کے ارتکاب پر جتنی سزا دی جائے گی اس کی آدھی سزا لونڈی کو دی جائے گی۔

تو پھر یہاں شادی شدہ آزاد اور خاندانی عورت کو اس کے ساتھ جوڑنا کیسے صحیح ہوگا۔ اگر اوپر سے شادی شدہ عورت کا ذکر آرہا ہوتا تو یہ بات کسی حد تک صحیح ہو سکتی تھی،

اب تک حد رجم کے قطعی اسلامی سزا اور اس کے حکم الٰہی ہونے کی جو تفصیلات بیان کی گئیں ہیں اور جو علمی دلائل فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اگر ہٹ دھرمی سے کام نہ لیا جائے تو اس کی قطعیت اور جرائم کی دوسری سزاؤں کی طرح اس کے حد شرعی ہونے میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا۔ اب فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کوشش کو قبول فرمائے اور لوگوں کے دلوں کو اس کے لئے کھول دے۔

استاذ مجیب اللہ ندوی

ذرائع پیداوار اور ذرائع تقسیم کی ملکیت

(۲)

انفرادی ملکیت اور قومی ملکیت | ملکیت کے سلسلہ میں اوپر جو تفصیل کی گئی ہے اس سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اسلامی شریعت ایک طرف انفرادی ملکیت کو بھی باقی رکھتی ہے اور دوسری طرف حکومت کو بھی مصالح عامہ کے تحت بہت سی چیزیں اپنی تحویل یا ملکیت میں لے لینے کی اجازت دیتی ہے، انفرادی ملکیت سے استحصال ختم کرنے اور قومی ملکیت سے جبر کو ختم کرنے کے لئے افراد اور حکومت دونوں کو وہ احتساب کا حق دیتی ہے ایک طرف حکومت اس بات پر بھی نظر رکھتی ہے کہ انفرادی ملکیت اجتماع اور معاشرہ کے لئے مضر تو نہیں ہو رہی ہے یا اس سے ظلم وزیادتی اور حق تلفی تو نہیں ہو رہی ہے اسی طرح افراد کو بھی یہ حق پہنچتا ہے کہ حکومت اگر عدل وانصاف کے دائرہ سے قدم نکال رہی ہے تو وہ اس کا احتساب کر سکیں انفرادی ملکیت کے حقوق اور اجتماعی ملکیت کے دائرہ اختیار کے بارے میں یہ بات بھی پیش نظر رکھنی چاہئے کہ اجتماعی ملکیت جس کی نمائندگی حکومت کرتی ہے اس کی تحویل میں جو چیز رہے گی اس کی حیثیت مالکانہ نہیں بلکہ حاکمانہ ہوگی یعنی وہ تمام چیزیں جو حکومت کے تحویل میں ہوں گی وہ حکومت کے افراد یا سربراہ کی ذاتی ملکیت نہیں اور نہ ان کی منفعت کے لئے مخصوص ہوں گی بلکہ وہ مفاد عامہ کے لئے وقف ہوں گی، ایسا نہیں ہو سکتا کہ حکومت کے افراد اور ملک کا سربراہ تو ایرکنڈیشن کمروں میں آرام کریں اور لباس اور غذا اور آرام و آسائش میں اسراف بیجا کریں اور عام آدمیوں کو سر چھپانے کے لئے مکان اور بدن چھپانے کے لئے مناسب کپڑا اور پیٹ بھرنے کے لئے غذا بھی میسر نہ ہو۔

پیدائش دولت کے عوامل | اوپر ملکیت کے حدود اور ذرائع ملکیت کی جو تفصیل کی گئی ہے

اس سے یہ بھی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ اسلامی شریعت نے جس طرح انفرادی ملکیت کی اجازت دی ہے اسی طرح اس نے ہر شخص کو یہ آزادی بھی دی ہے کہ وہ جو ذرائع پیداوار اور وسائل معاش چاہے اختیار کرے خواہ وہ تنہا کرے یا مشترکہ طور پر کرے اسے آزادی ہے پھر وہ پیداوار سرمایہ یا زمین کے ذریعہ حاصل کرے یا تجارت و زراعت یا صنعت وحرفت کے ذریعہ یا اپنی جسمانی و دماغی محنت اور تنظیم سے یا شغل اصل کی اور جو صورتیں اختیار کرنا چاہے وہ کرسکتا ہے بشرطیکہ اس میں سود کی آمیزش کسی کی حق تلفی نہ ہو اور نہ ہو مفاد عامہ کے لئے مضرت رساں ہو اگر یہ باتیں نہ ہوں تو ہر طرح کے ذرائع پیداوار کو وہ اپنی ملکیت میں لے سکتا ہے اور کچھ پابندیوں کے ساتھ وہ اپنی پیداکردہ چیز کا مالک تسلیم کیا جائے گا خواہ وہ ملکیت پیداواری اشیاء کی ذات سے متعلق ہو یا اس سے جو منفعت ہو

سرمایہ دارانہ معیشت میں عوامل پیدائش چار تسلیم کئے جاتے ہیں، سرمایہ، زمین، محنت اور تنظیم اور پیداوار شدہ دولت کے مستحق یہی سمجھے جاتے ہیں مگر یہاں پر ہمیں ایک پانچویں عامل کو بھی تسلیم کرلینا چاہئے وہ ہے "قدرت الٰہی کی ہم آہنگی" دوسرے الفاظ میں ہم اسے فیور آف سپرنیچرل ریسورسز (FAVOR OF SUPER NATURAL RESOURCES) کہہ سکتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ قدرت نے جو وسائل ہمارے لئے پھیلا دئے ہیں انھیں ہم اپنے اختیار سے استعمال کرکے اپنے لئے نفع آور بناتے ہیں اور انھیں زمین کی تعریف میں لاتے ہیں مگر یہ عطیات قدرت اور وسائل حیات مثلاً ہوا، پانی، روشنی، موسم کی سازگاری، اختیاری وسائل اور تدابیر سے ہم آہنگ نہ ہوں تو یہ سارے عوامل پیداوار بیکار ہو جائیں گے مثلاً کوئی آفت ناگہانی آجائے. سیلاب، آندھی، طوفان یا زلزلہ آجائے، اس لئے ہمیں اسے بھی ذرائع پیداوار کا ایک عامل تصور کرنا چاہئے اسکو عامل ماننے سے دو خاص فائدے ہیں ایک تو یہ کہ معاشی جدوجہد کی سطح حیوانیت کی سطح سے ذرا بلند ہو جائے گی اور اس میں ایک اخلاقی حسن پیدا ہو جائے گا، دوسرا بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ تقسیم دولت میں معاشرہ کے ایک اہم عنصر یعنی غریبوں اور بے سہارا لوگوں کو جو نظر انداز کر دیا گیا ہے ان کی حیثیت بھی دوسرے عوامل پیدائش کے برابر ہو جائے گی اس لئے کہ جب عطیات قدرت کی ہم آہنگی ہی سے آپ اپنے وسائل کو نفع آور بناتے ہیں تو اس کا حق الگ سے آپ کو دینا ہوگا اور اس کے مستحق یہی بے سہارا افراد ہوں گے، اسی بنا پر افراد کے حاصل کئے ہوئے مال

غنیمت اور مال فے میں خمس نکالا جاتا ہے اور اسی بنا پر مصالح عامہ کے تحت ہم بہت سی چیزوں کو افراد کی ملکیت سے نکال کر حکومت کی تحویل میں لے لیتے ہیں، اس عامل کو تسلیم کرنے کے بعد ہی صحیح معنی میں معاشی وسائل انسان کو اطمینان وسکون دے سکیں گے اور اس کے اندر رشتۂ انسانیت کا احترام اور اخلاقی ذمہ داری کا احساس پرورش پا سکے گا۔

اشتراکی معیشت میں اصل عامل محنت ہے ان کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دوسرے عوامل پیدائش "قدر زائد" پیدا کرنے سے محروم ہیں قدر زائد مزدور پیدا کرتا ہے زمین اور سرمایہ کا زیادہ سے زیادہ حق یہ ہے کہ انھیں برقرار رکھا جائے، مثلاً ایک سامان کے پیدا کرنے میں زمین کے کرایہ مشین کی ٹوٹ پھوٹ اور خام مال کی قیمت اور مزدور کی اجرت دینے میں دو ہزار روپے صرف ہوئے اور اس سامان کی قیمت پچیس سو روپے ہوئی تو لاگت پر پانچ سو روپے جو بچے وہ "قدر زائد" ہے جسے مزدور نے پیدا کیا، ان کے خیال میں قدر زائد کے پیدا کرنے میں مشین، زمین اور کاروباری آدمی کا کوئی دخل نہیں ہے، لیکن یہ بات انتہائی مبالغہ آمیز اور غیر حقیقت پسندانہ ہے۔ یہ ایک مستقل بحث ہے جس پر اس مقالہ میں گفتگو کرنا ممکن نہیں ہے۔

اسلام عوامل پیدائش میں سرمایہ، زمین، محنت اور تنظیم اور قدرت الٰہی کی ہم آہنگی سب کو تسلیم کرتا ہے اور پیداوار میں سب کا حصہ بھی تسلیم کرتا ہے مگر ان سب کے سلسلہ میں کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے۔

سرمایہ، زمین اور محنت کی تعریف (۱) سرمایہ دارانہ معیشت میں سرمایہ کی تعریف "پیدا شدہ ذریعۂ پیدائش" سے کی جاتی ہے جس میں نقد روپیہ اشیا خوردنی، مشینری وغیرہ سب شامل ہیں لیکن اسلام میں سرمایہ کی تعریف یہ ہوگی "وہ وسائل پیداوار جس کا عمل پیدائش میں استعمال کرنا اس وقت تک ممکن نہ ہو، جب تک اسے خرچ نہ کیا جائے اسی لئے ان کو کرایہ پر دینا صحیح نہیں ہوگا، مثلاً نقد روپیہ اور اشیا خوردنی وغیرہ اس تعریف کی بنا پر مشینری وغیرہ سرمایہ میں داخل نہیں ہیں۔

(۲) زمین یعنی وہ وسائل پیداوار جن کو عمل پیدائش میں اسی طرح استعمال کیا جاتا ہے کہ ان کی اصل صورت باقی رہتی ہے اس لئے انھیں کرایہ پر دیا جا سکتا ہے مثلاً زمین، مکان، مشینری

اور سایان وغیرہ۔

(۱) محنت یعنی وہ انسانی فعل جو کسی دولت پیدا کرنے کا ذریعہ ہو خواہ یہ محنت جسمانی ہو یا دماغی اگر محنت کی تعریف میں جسمانی محنت کے ساتھ دماغی محنت کو شامل کر دیا جائے تو تنظیم اور منصوبہ بندی وغیرہ کو الگ عامل پیدائش ماننے کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے۔ سرمایہ دارانہ معیشت میں تنظیم کو آجر کی حیثیت اس لئے دی گئی ہے کہ وہ اپنی دماغی جدوجہد سے کاروبار میں تنظیم پیدا کرتا ہے اور نقصان کا خطرہ مول لیتا ہے، راقم الحروف کے نزدیک اس کو عامل ماننے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بلکہ ضروری ہے، اسلام ہر کام میں تنظیم اور تقسیم کار چاہتا ہے، اگر ایک شخص یا حکومت ایک کاروبار میں دوسرے عوامل پیدائش کو جوڑ کر انھیں کام میں لگائے اور اسمیں نقصان کا خطرہ مول لے تو اس کو الگ منافع ملے تو اس میں کوئی ایسی قباحت نہیں ہے اس کو محنت کی حق تلفی اور ارتکاز دولت سے روکا جا سکتا ہے اور اس کی صورتیں اسلامی شریعت میں موجود ہیں مگر اسے سرمایہ اور محنت سے الگ چیز نہ ماننا زیادتی ہے۔ اگر تنظیم کو موجودہ معاشیات کی اصطلاح سے ہٹ کر وسیع معنی لیا جائے تو شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اشتراکیت میں اصل عامل محنت نہیں بلکہ تنظیم ہی ہے، سرمایہ دار ملکوں میں ایک شخص تنظیم کا مالک یا آجر ہوتا ہے اور یہاں حکومت کے تمام افراد جبری طور پر اس "قدر زائد" کا بڑا حصہ کسی نہ کسی صورت میں جو مزدوروں کا حصہ ہونا چاہئے، خود بانٹ لیتے ہیں یا اپنے مسرفانہ آرام و آسائش پر صرف کر دیتے ہیں۔

اوپر سرمایہ کی جو تعریف کی گئی ہے اس کی رو سے روپیہ کو کرایہ پر نہیں چلایا جا سکتا سرمایہ پر منافع تو ملے گا مگر اس پر متعین سود کی کوئی صورت نہیں پیدا ہو سکتی اس لئے کہ نقصان کی صورت میں سرمایہ کا حق تو محفوظ رہتا ہے اور محنت کو بسا اوقات کچھ نہیں ملتا اسی بنا پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اصول بنا دیا ہے۔ الخراج بالضمان (فائدہ نقصان کی ذمہ داری اٹھانے کے ساتھ ہے)

ایک دوسری حدیث میں ہے کہ

نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن ربح مالم یضمن	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نفع سے منع فرما دیا ہے جس میں نقصان کی ذمہ داری نہ لی گئی ہے۔

اسی بنا پر ذرائع پیداوار میں سود کو اسلامی شریعت نے ممنوع قرار دیا، اس کے بارے میں ہم ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی جو جدید معاشیات کے ساتھ اسلامی معاشیات پر بھی نظر رکھتے ہیں، کی رائے یہاں نقل کرتے ہیں:

پیداآور کاروبار عدم تیقن کی فضا میں انجام پاتا ہے نفع ایک غیر یقینی امر ہے کاروبار میں سرمایہ کی شرکت لازماً نفع پر منتج نہیں ہوتی کیونکہ کاروبار میں نفع اور نقصان دونوں کا امکان رہتا ہے، جب سرمایہ کاروبار میں لگنا لازماً نفع پر نہیں منتج ہوتا تو یہ بات انصاف کے خلاف ہے کہ اس سرمایہ پر بہر صورت ایک متعین سالانہ "نفع" کا مطالبہ کیا جائے کاروبار میں لگے ہوئے سرمایہ پر "نفع" کی ایک متعین شرح کا مطالبہ اسی صورت میں حق بجانب ہو سکتا ہے جب خود کاروبار میں "نفع" کا وقوع اور اس کی مقدار متعین اور یقینی ہو، چونکہ ایسا نہیں ہے اس لئے سرمایہ پر ایک متعین شرح سود کی ادائیگی کا مطالبہ درست نہیں قرار دیا جا سکتا۔

نفع آوری سرمایہ کی لازمی صفت نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو جس کاروبار میں بھی سرمایہ لگایا جاتا نفع ہوتا۔ سرمایہ کاروباری فیصلوں کے نفاذ کا ذریعہ اور آلہ ہے اس کی مدد سے عوامل پیدائش کو یکجا کیا جا سکتا ہے۔ "پیداوار" حاصل کی جا سکتی ہے لیکن اسے اس بات میں کوئی دخل نہیں کہ اس پیداوار کی فروخت سے آمدنی کتنی ہوئی ہے نفع کا انحصار آمدنی پر ہے نہ کہ پیدوار کی مقدار پر سرمایہ اور سامان (Capital and Goods) پیداواری عمل میں جو حصہ بھی لیتے ہیں وہ پیداوار کی تیاری تک محدود ہے یہ پیداوار بازار میں فروخت ہو سکے گی یا نہیں کس قیمت پر فروخت ہوگی اور اس کی فروخت سے حاصل ہونے والی مجموعی آمدنی لاگت سے کم ہوگی یا اس سے زیادہ ان باتوں کا انحصار سرمایہ پر نہیں دوسرے امور پر ہے۔

کاروباری فرد سے کاروبار میں لگائے جانے والے قرض سرمایہ پر سود کے مطالبہ کی غیر معقولیت کو سمجھنے کے لئے اس صورت حال پر غور کیجئے جب کاروبار میں خسارہ ہوا ہو ایک طرف تو کاروباری کو خسارہ کے باوجود اس قرض کی واپسی کا انتظام کرنا ہے

اور دوسری طرف اپنی سعی و جد و جہد کے باوجود ایک عرصہ تک کاروبار کے نتیجہ میں کوئی آمدنی نہیں حاصل کر سکا اس کے ساتھ ہی اس سے یہ مطالبہ کرنے کی بنیاد یہ ہے کہ وہ اپنی جیب سے سود کی رقم بھی ادا کرے۔

چونکہ قرض سرمایہ دینے والا کاروبار میں نقصان کی شکل میں کوئی ذمہ داری نہیں لیتا اور اپنا پورا سرمایہ واپس لیتا ہے لہذا اگر قرض سرمایہ لے کر کاروبار کرنے والے کو نفع ہو تو اس شکل میں بھی سرمایہ دار کو اس نفع میں سے کسی حصہ کا حق نہیں پہنچتا، اس لئے سرمایہ نے دراصل کاروبار میں کوئی حصہ ہی نہیں لیا ہے، یہ بات بظاہر قابل تعجب معلوم ہوگی لیکن تھوڑے سے غور و فکر سے سمجھ میں آسکتی ہے، قرض سرمایہ کی بحفاظت واپسی کی شرط پر دیا جاتا ہے قرض دیتے وقت سرمایہ دار کاروبار سے اس بات کی قانونی ضمانت حاصل کر لیتا ہے کہ اس کا اصل سرمایہ واپس کر دیا جائے گا، عام طور پر اس غرض کے لئے کاروباری فرد کو اپنا کارخانہ کوئی اور جائداد یا کوئی ایسی چیز ضمانت میں دینی پڑتی ہے جس کے ذریعہ خسارہ کی شکل میں اصل سرمایہ کی بازیافت ممکن ہو کاروباری فرد بلاشبہہ قرض لئے ہوئے سرمایہ کو عوامل پیدائش کی فراہمی اور مختلف کاروباری اغراض کے لئے استعمال کرتا ہے لیکن استعمال کے باوجود یہ سرمایہ اس خطرہ سے بری الذمہ رہتا ہے جو استعمال میں مضمر ہے غرض سرمایہ اس عدم تیقن سے بری اور بلند رہتا ہے جو کاروبار کا خاصہ ہے اگر کاروباری فیصلوں کی غیر موزونیت کے سبب سرمایہ کا ایسا استعمال عمل میں آئے جس کے نتیجہ میں کاروبار میں خسارہ ہو تو اس سرمایہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا جو عملاً استعمال کیا جا رہا ہے اس خسارہ تمام تر اثر کاروباری فرد پڑتا ہے، اسے کسی نہ کسی طرح اصل سرمایہ کی واپسی کا اہتمام کرنا ہوتا ہے اگر وہ کسی ذریعہ سے اتنا سرمایہ دوبارہ نہیں فراہم کر سکتا تو اس خسارہ کا اثر اس کی اس جائداد پر پڑتا ہے جو اس نے ضمانت میں درج کرائی ہے لہذا کاروبار میں پیش آنے والے خطرات اور عدم تیقن کی کیفیت کو برداشت کرنے والی چیز وہ سرمایہ نہیں جو قرض لے کر استعمال کیا جا رہا ہے بلکہ اصل سرمایہ کی واپسی کے وہ متبادل

ذرائع یا وہ چیزیں ہیں جن کی سرمایہ دار کو ضمانت دی گئی ہے۔

اسلام کے نزدیک کاروباری اغراض کے لئے دے جانے والے قرضوں پر بھی سود حرام ہے کیونکہ اس کے اصول کے مطابق سرمایہ دار اسی صورت میں اپنے سرمایہ کے ذریعہ نفع کما سکتا ہے۔ جب وہ ہر حال میں کاروبار کے نتائج میں شریک رہے نفع ہو تو نفع پائے اور نقصان ہو تو نقصان اٹھائے نفع وہی حاصل کر سکتا ہے جو نقصان ہونے کی شکل میں نقصان بھی گوارا کرے، نقصان کی ذمہ داری سے کنارہ کش رہ کر سرمایہ پر نفع کمانے کی کوئی بھی شکل اسلام میں جائز نہیں ہے جیسا کہ ہم اوپر حدیثیں نقل کر چکے ہیں۔

ذرائع پیداوار کا دائرہ اور اس کی صورتیں اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے اندر لا متناہی آرزوئیں اور تمنائیں اور خواہشات رکھی ہیں، قرآن پاک نے بار بار اس کا ذکر کیا ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَالِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَآبِ۔

(سورہ آل عمران)

انسان کے خواہشات کی محبت بسا دی گئی ہے افراد انسانی کی خواہش، اولاد کی خواہش، دولت کے ڈھیر کی خواہش مثلاً سونا چاندی اچھی سواری جانور، کھیتی باڑی، یہ سب دنیا کے استعمال کی چیزیں ہیں اور اللہ کے پاس بہتر انجام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کے ان فطری خواہشات کی حوصلہ شکنی نہیں کی ہے بلکہ کچھ حدود کے اندر رکھکر اس کی تکمیل کی پوری آزادی دے دی ہے۔ اس نے انسان کی آزادی کی تکمیل کیلئے ساری کائنات کو اس کا خادم بنا دیا ہے اسے زمین اور زمین سے پیدا ہونے والی چیزوں ہی سے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دیا بلکہ وہ سارے وسائل قدرت ہوا، پانی، سورج کی روشنی اور فضائے بسیط کی ہر چیز سے اسے مستفیض ہونے کا موقع فراہم کیا ہے خلقکم ما فی الارض جمیعا

موجودہ دور کے معاشین کے نزدیک دولت میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جس میں افادہ اور استبدال کی صلاحیت موجود ہو، ان کے نزدیک افادہ کی تعریف یہ ہے کہ اس کے اندر خواہشات

انسانی کے پورا کرنے کی صلاحیت موجود ہو۔

مثلاً شراب کے اندر سود کے اندر افادہ کی صلاحیت موجود ہے اس لئے یہ چیزیں موجودہ معاشین کے نزدیک مفید ہیں اور ان کا استعمال، کاروبار اور استبدال صحیح ہے مگر اسلامی شریعت افادہ کی اس تعریف کو صحیح نہیں سمجھتی اس لئے کہ اس نے ایک صالح معاشرہ کی تعمیر کے لحاظ سے بھلائی اور برائی کا معیار مقرر کر دیا ہے اور حلال و حرام کی حدیں قائم کر دی ہیں اس لئے وہ چیز جس میں افادہ اور استبدال کی صلاحیت موجود ہو وہ ہر حال میں دولت نہیں کہلائے گی اور نہ وہ ذرائع پیداوار بن سکتی ہے۔ مثلاً شراب کو لیجئے، ساری دنیا کے ڈاکٹر اسے صحت کے لئے مضر بتاتے ہیں مگر وہ چونکہ انسان کی ایک خواہش کو پورا کرتی ہے اسی طرح سود، قمار اور اس کی مختلف صورتوں سے بھی بہت سی انسانی خواہشات پوری ہوتی ہیں اس لئے اسے بارآور دولت سمجھا جاتا ہے، مگر اسلامی شریعت ان چیزوں میں نہ افادہ تسلیم کرتی ہے اور نہ استبدال اس لئے اس کی ملکیت کا سوال بھی اسلامی شریعت کے نزدیک خارج از بحث ہے جیسا کہ ملکیت کی تقسیم میں اس کی تفصیل آچکی ہے۔

اب دولت کی تعریف یہ ہوگی کہ جن چیزوں سے انسان کی اچھی خواہشات پوری ہوتی ہوں اس میں افادہ بھی ہے اور وہ استبدال کے لائق بھی ہیں اب ان حدود کے اندر رہکر انسان قدرت کے عطا کئے ہوئے خزانوں سے ذاتی اور مشترکہ کاروبار کے ذریعہ زرعی زمینوں اور اصل شغل[۱] کے اور جتنے طریقے ہیں ان کے ذریعہ پورا فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے اور اکفیں اپنے لئے اور دوسروں کے لئے نفع آور بھی بنا سکتا ہے اور اس میں مالک کی حیثیت سے ہر طرح کا تصرف کر سکتا ہے۔

عطیات قدرت سے استفادہ اوپر ذکر آچکا ہے کہ خدا تعالیٰ نے زمین سے لے کر فضائے بسیط تک اپنی نعمتوں کے بیشمار خزانے بکھیر رکھے ہیں اور انسان کو پورا اختیار دے دیا ہے کہ وہ ان نعمتوں سے جتنا چاہے مستفیض ہو، یہ پوری کائنات اور اس کی ساری چیزیں اسی کے لئے

---

[۱] وسائل قدرت پر محنت کرنے سے جو دولت حاصل ہوتی ہے اگر حاصل کی ہوئی دولت کو مزید دولت پیدا کرنے کے لئے لگایا جائے تو اسے اصل یا کیپٹل (Capital) یا راس المال کہیں گے۔

خوان یغما ہیں گویا خدا تعالیٰ نے زبان حال سے ہی نہیں بلکہ زبان قال سے بھی کہدیا ہے کہ یہ زمین و آسمان کی وسعت، لیل و نہار کی گردش، سورج و چاند کی روشنی، ہوا و پانی کی افادیت یہ سب تیرے لئے ہیں اور یہی نہیں بلکہ

یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

قرآن پاک نے اس طرف بڑی وضاحت سے اشارہ کیا ہے، ہم چند آیتیں یہاں نقل کرتے ہیں:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا

ہم نے بنی آدم کو مکرم بنایا ہے اور اسے خشکی و تری میں سواریاں دیں اور پاکیزہ رزق عطا کیا اور بہت سے مخلوق پر ہم نے اسے بڑی فضیلت دی ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا
وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ

وہی ذات ہے جس نے دن رات کو تمھارے کام میں لگا دیا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا
اللّٰهُ الَّذِي سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيهِ بِأَمْرِهِ وَالْخَيْلَ وَالْبِغَالَ لِتَرْكَبُوهَا وَزِينَةً
سُبْحَانَ الَّذِي سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهُ مُقْرِنِينَ

وہی ذات ہے جس نے سمندر اور دریا کو مسخر کر دیا ہے کہ تم اس میں اپنے جہاز اور کشتیاں چلاتے ہو اللہ کے حکم سے گھوڑے خچر کو تمھارے قبضہ میں دیدیا ہے کہ تم ان پر سوار ہوتے ہو پاک ہے وہ ذات جس نے ان کو مسخر کر دیا ورنہ ہم ان کو قبضہ میں نہیں کر سکتے تھے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الناس شرکاء فی الماء والکلاء والنار

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تین چیزوں میں سارے انسان شریک ہیں پانی، گھاس اور آگ۔

ایک حدیث میں نمک کے بارے میں بھی یہی ارشاد ہے (کتاب الاموال ابو عبید ص ۲۹۵)

ان آیات و احادیث کی روشنی میں ایک آدمی قدرت کے ان عطیات میں سے

جس طرح چاہے استفادہ کرے اور ان کو نفع آور بنا کر اپنے کام میں لائے وہ حیوانات سے فائدہ اٹھانے کی جتنی صورتیں ہیں اختیار کر سکتا ہے، نباتات اور جمادات سے بھی فائدہ اٹھانے میں اسے آزادی ہے کہ وہ ان میں سے جس چیز پر اپنا سرمایہ یا اپنی محنت صرف کر کے حاصل کرے گا وہ اس کی ملک ہوگی۔ قدرت نے جن چیزوں کو سارے انسانوں کے لئے مشترکہ ملکیت قرار دیا ہے، مثلاً پانی، آگ، گھاس، ان میں سے ہر ایک کی کچھ تفصیل کر دی جاتی ہے۔

پانی | پانی سارے انسانوں کا مشترکہ سرمایہ ہے اور ہمارے ذرائع پیداوار کا سب سے بڑا ذریعہ ہے بارش کا پانی ہو یا سمندر یا بڑے دریاؤں کا، جھیل و تالاب کا پانی ہو یا چشموں کا ان سے ہر انسان کو فائدہ اٹھانے اور اپنی ملک میں لینے کا حق ہے، وہ ان سے پینے کے لئے اور آبپاشی کے لئے پانی لے سکتا ہے، ان سے نہر نکال سکتا ہے ان میں شکار کر سکتا ہے پانی میں مچھلی یا جو دوسری مخلوق پائی جاتی ہیں وہ اپنی محنت اور سرمایہ لگا کر ذاتی طور پر انھیں نفع آور بنا سکتا ہے۔ اسی طرح زمین کے اندر جو عام پانی ہے وہ بھی مباح ہے اور اس کے اندر معدنی پانی کے جو ذخائر ہیں وہ بھی مباح ہیں۔

اس سلسلہ میں قرآن پاک کی متعدد آیتیں اوپر نقل کی جا چکی ہیں۔

دریا و سمندر کی مچھلیوں کے ذریعہ لاکھوں آدمی دنیا میں اپنی روزی حاصل کرتے ہیں اور ذاتی کاروبار کے ذریعہ اسے نفع آور بناتے ہیں اسلام ان کی ہمت افزائی کرتا ہے، اگر حکومتیں اس کے لئے سہولتیں فراہم کریں تو دنیا کے کروڑوں آدمی اس سے اپنی روزی پیدا کر سکتے ہیں۔ اس کرۂ زمین پر تین حصہ پانی ہے اس لئے بعض مغربی ماہرین نے لکھا ہے کہ "جوں جوں آبادی بڑھتی جائے گی سمندری پیداوار ہماری قومی زندگی میں روزی کمانے کے لئے بہت زیادہ اہمیت حاصل کرتی جائے گی"۔ البتہ سمندر، دریا، جھیل اور بڑے بڑے قدرتی تالاب سے استفادہ کیا جا سکتا ہے اور جو لوگ ان سے جو چیزیں حاصل کریں گے وہ ان کی ملک ہوگی مگر یہ انفرادی ملکیت نہیں بن سکتے، پانی کے اندر جو قیمتی اشیاء قدرت نے پھیلائے رکھی ہیں ان میں ہر چیز سے انسان فائدہ اٹھا سکتا ہے، اس کی مزید

تفصیل اکاز کے بیان میں آرہی ہے۔

نباتات | نباتات میں گھاس، ہر حال میں مباح ہے اگر وہ کسی کے کھیت میں یا کسی کے صحن میں اگ جائے جب بھی وہ مباح ہے، اسے آدمی کاٹ سکتا ہے جانور چرا سکتا ہے۔ اتنا فرق ہے کہ وہ اگر عام جگہوں یا جنگل میں اُگے تو کوئی روک ٹوک نہیں لیکن اگر کسی شخص کے کھیت میں یا صحن میں ہے تو گھاس سے تو نہیں مگر اپنے کھیت یا صحن میں جانے سے روک سکتا ہے۔ المجلہ دفعہ ۱۲۵۷

لیکن وہ مباح گھاس یا لکڑی کسی ایسی جگہ میں ہو جہاں پہنچنے کے لئے کسی کی زمین یا کھیت سے گزرنا ہوتا ہے تو اسے گزرنے سے نہیں روکا جا سکتا۔ (حضرت محمد بن مسلمہ کا واقعہ)

البتہ اگر اس نے اس گھاس لگانے پر کچھ صرف کیا ہے تو وہ گھاس لینے سے منع کر سکتا ہے۔

اسی طرح جنگلوں پہاڑوں میں جو خود رو درخت ہوتے ہیں ان کی لکڑی، پتی سب کے لئے مباح ہے۔ (المجلہ صہ ۱۲۴۳)

نباتات میں خود رو جنگل بھی شامل ہیں جن کو قدرت نے ملک کے بہت بڑے حصہ میں پھیلا دیا ہے۔ جن سے لکڑی کے علاوہ بے شمار جڑی بوٹیوں اور دوائیوں کے پودے حاصل کئے جا سکتے ہیں جو بے شمار لوگوں کے لئے ذرائع پیداوار اور دولت کا سبب بنتے ہیں اور بن سکتے ہیں، قرآن پاک میں متعدد جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنی پھیلائی اس نعمت سے انسان کو مستفیض ہونے کی ترغیب دی ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ اَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا وَمَرْعَاهَا وَالْجِبَالَ اَرْسَاهَا مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ	ہم نے آسمان سے پانی نازل کیا اور اس کے ذریعہ مختلف قسم کی نباتات کے جوڑے پیدا کئے تو ان سے کھاؤ اور اپنے جانوروں کو چراؤ اللہ تعالیٰ نے زمین سے پانی نکالا اور چراگاہیں بنائیں اور پہاڑوں کو قائم کر دیا، یہ سب سامان زیست ہیں تمہارے لئے اور تمہارے جانوروں کے لئے ہے۔

آگ | قرآن پاک میں اشارۃً اور حدیث میں صراحۃً جن چیزوں کو پورے عالم انسانیت میں مشترکہ سرمایہ یا بین الاقوامی ملکیت قرار دیا ہے ان میں ایک آگ بھی ہے، ایک زمانہ میں آگ کا تصور بہت محدود تھا لیکن اگر ہم آگ کو روشنی اور حرارت کے معنی میں استعمال کریں تو کوئی شرعی مانع نہیں ہے یعنی جس طرح ہوا اور فضا کو ہم انسانیت کا مشترکہ سرمایہ سمجھتے ہیں اسی طرح روشنی و حرارت کو بھی مشترکہ انسانی سرمایہ سمجھنا چاہئے اب کوئی ہوا کو محفوظ کرکے، فضا کو استعمال کرے روشنی و حرارت کو استعمال کرے اس سے نفع آور چیز تیار کرتا ہے تو وہ اس کی ملکیت ہوگی، اگر ان چیزوں کو افراد کے بجائے کوئی حکومت نفع آور بناتی ہے تو وہ مشترکہ عوامی ملکیت ہوگی، ان چیزوں کے مشترکہ سرمایہ قرار دینے کا مطلب ایک طرف انسان کی انفرادی قوت تسخیر کی ہمت افزائی کرنی مقصود ہوگی تو دوسری طرف حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس مشترکہ دولت کو زیادہ سے زیادہ انسانوں کے لئے مفید بنائے، اگر کوئی فرد اپنی قوت تسخیر یا محنت سے ان اشیاء سے کوئی نفع آور چیز تیار کرتا ہے تو حکومت کا فرض ہے کہ اس کو معقول معاوضہ دے کر یا رائلٹی دے کر اسے زیادہ سے زیادہ عام کرے اور عام لوگوں کے لئے مفید بنائے۔

حیوانات کو نفع آور بنانا | قدرت نے بے شمار جانور پیدا کئے ہیں جس سے استفادہ کرکے آدمی دولت پیدا کرتا ہے اور کر سکتا ہے، پانی کے ضمن میں مچھلی کے شکار کا ذکر آچکا ہے اس کے علاوہ جانوروں کی پرورش کرکے ان کی نسل کو جتنا چاہے وہ بڑھا سکتا ہے حلال جانوروں کا شکار کر سکتا ہے، گھوڑا گائے بیل اور بکری، پرندے، مرغی، شہد کی مکھی وغیرہ پال سکتا ہے، ان کے گوشت ہڈی، دودھ، بال اور اون وغیرہ سے جتنی دولت چاہے پیدا کر سکتا ہے، اس زمانہ میں مرغی اور شہد کی مکھی کی پرورش کے سلسلہ میں جو نئے طریقے پیدا ہوگئے ہیں ان کے ذریعہ لاکھوں آدمی اپنی روزی کا سامان ہی نہیں بلکہ ان سے مزید پیداوار کے ذرائع پیدا کرتے اور کر سکتے ہیں، قرآن پاک کی متعدد آیات اور حدیث میں اس کی ترغیب آئی ہے، قرآن پاک میں ہے

وَإِنَّ لَكُمْ فِي الْأَنْعَامِ لَعِبْرَةً نُسْقِيكُمْ   تمھارے لئے چوپائے بھی ہیں غور کرنے کا

مِمَّا فِی بُطُوْنِهَا وَلَکُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ کَثِیْرَةٌ وَّمِنْهَا تَأْکُلُوْنَ وَعَلَیْهَا وَعَلَی الْفُلْکِ تُحْمَلُوْنَ۔

(المومنون ع ۱)

موقع ہے کہ ان کے پیٹ میں جو پینے کی چیز (دودھ) ہے اسے ہم تمھیں پلاتے ہیں اور ان میں بہت سے فائدے ہیں ان کا گوشت تم کھاتے ہو اور ان پر اور کشتیوں پر سوار ہوتے ہو۔

اَوَلَمْ یَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَیْدِیْنَا اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مَالِکُوْنَ وَذَلَّلْنَاهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَکُوْبُهُمْ وَمِنْهَا یَاْکُلُوْنَ وَلَهُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ

(یس ع ۵)

ان لوگوں نے غور نہیں کیا کہ ہم نے اپنے دست قدرت سے جو چیزیں بنائی ہیں ان میں چوپائے بھی ہیں جن کے وہ مالک ہیں بیٹھے ہیں انہیں بعض کا گوشت کھاتے ہیں اور ان میں بیشمار منافع ور پینے کا سامان ہے پھر کیوں شکر نہیں کرتے ہیں۔

شہد کی مکھی کے کچھ فائدوں کا ذکر قرآن پاک نے بھی کیا ہے۔

یَخْرُجُ مِنْ بُطُوْنِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ فِیْهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ

اللہ تعالیٰ نے ان کے پیٹ سے مختلف رنگوں کی پینے والی چیز نکالی ہے جسمیں لوگوں کیلئے علاج ہے۔

سیرت کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ مگس پروری کا کام عہد نبوی میں بھی ہوتا تھا اس طرح ریشم کے کیڑے پالے جا سکتے ہیں اور ان کو نفع آور بنایا جا سکتا ہے البتہ اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ یہ حشرات الارض ہیں ان کی خرید و فروخت صحیح نہیں ہے مگر امام محمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے زمانہ میں دیکھا کہ عام طور پر لوگ اس کی خرید و فروخت ہو رہی ہے اور اس کے خلاف کوئی نص بھی موجود نہیں ہے اس لئے انھوں نے اسی عرف عام کی بنا پر اسے جائز قرار دے دیا ہے۔

جمادات | وہ تمام چیزیں جو زمین کے اوپر یا اندر پائی جاتی ہیں اور جن میں بظاہر حس و حرکت نہیں ہوتی ان کو جمادات کہتے ہیں، وہ خشکی میں ہوں یا سمندر کی تہوں میں مثلاً پتھر لوہا، تانبا، پیتل، سونا، چاندی، مونگا، موتی، جواہرات اور دوسرے معدنی ذخائر

ان سے ہر شخص کو استفادہ کرنے ان کو نفع آور بنانے اور اپنی ملکیت میں لینے کا حق ہے۔

معدنی دخائر کی قسمیں جمادات یا دوسرے الفاظ میں معدنی دخائر دو طرح کے ہوتے ہیں، ظاہری اور باطنی۔

معدن ظاہری پانی، گھاس، جنگل کی لکڑی کی طرح وہ معدنی ذخیرے جو سطح زمین پر کھلے ہوئے پائے جاتے ہیں اور جن کے حصول میں بہت سے محنت کی ضرورت نہیں ہوتی جیسے نمک، تارکول، پارہ اور کیمیاوی خاصیت رکھنے والے پانی وغیرہ ہر فرد کو ان ذخیروں سے استفادہ کا حق ہے جو فرد جتنی مقدار میں یہ چیزیں نکالے گا وہ اسکا مالک تصور کیا جائے گا۔ البتہ ان اشیاء کے ذخیرے انفرادی ملکیت بنائے جا سکتے ہیں یا نہیں۔ اس کا ذکر اجتماعی ملکیت کے سلسلہ میں آئے گا یہی حیثیت سمندر میں پائے جانے والے موتی مرجان وغیرہ کی ہے۔

معدن باطنی جو معدنی ذخیرے سطح زمین پر نہیں ملتے بلکہ وہ زمین کے اندر یا سمندر کی تہہ میں پائے جاتے ہیں اور ان کے نکالنے میں کافی محنت اور سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے ان کے بارے میں اس حدیث سے روشنی ملتی ہے، آپ نے فرمایا؛

اطلبوا الرزق فی خبایا الارض — زمین کے پوشیدہ خزانوں میں اپنا رزق تلاش کرو۔

غالباً اسی بنا پر امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کی رائے ہے کہ اگر یہ چیزیں کسی کی ملک میں پائی جائیں تو وہ اس کا مالک ہوگا، اگر یہ غیر مملوکہ زمینوں میں پائی جائیں تو وہ اسی شخص کی ملک ہوں گی جو انھیں دریافت کرے۔

(الفقہ علی مذاہب الاربعہ)

مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں؛

تصیر الارض للسلطان — ایسی زمین جنھیں یہ چیزیں پائی جائیں اسلامی حکومت کی ملکیت ہو جائے گی۔

اسلامی شریعت کے عمومی مزاج کے لحاظ سے ائمہ ثلاثہ کی رائے نظر انداز نہیں کیجا سکتی مگر

عہد نبوی کے بعض واقعات اور مصالح عامہ کے پیش نظر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی رائے قابل ترجیح معلوم ہوتی ہے ہمارے نزدیک ان دونوں رایوں میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے. موقع ومحل اور معاشرہ کی اخلاقی حالت کے لحاظ سے دونوں صورتیں قابل عمل ہیں، اب یہ کام اس دور میں اسلامی قانون کے ماہرین کا ہے وہ ایسی صورت اختیار کریں کہ انفرادی ملکیت کے حقوق بھی مجروح نہ ہوں اور مفاد عامہ کو بھی نقصان نہ پہنچے۔

بہر حال بڑے پیمانہ پر آمدنی پیدا کرنے والے ذرائع کو حکومت کی نگرانی رکھنے میں افادیت زیادہ محسوس ہو تو اسے رکھا جا سکتا ہے اسی طرح معدن باطنی کے نکالنے کے لئے کافی محنت اور سرمایہ کی ضرورت ہو تو حکومت خود خرچ کر کے اسے مفاد عامہ لگا سکتی ہے یا پھر کسی کمپنی کو ٹھیکہ پر بھی دے سکتی ہے اس صورت میں گورنمنٹ کمپنی سے رائلٹی لے سکتی ہے۔

رکاز یعنی دفینہ | رکاز اس مال کو کہتے ہیں جو اسلامی دور حکومت سے پہلے کا ہو اور زمین میں مدفون ہو اور کسی کو مل جائے، اب اس کی کئی صورتیں ہیں اگر وہ اس کی ملک میں ملا یا عام گزرگاہ یا کسی رفاہ عام کسی زمین میں ملا ہو تو اگر کسی دوسرے کا حق اس میں پہلے سے ثابت نہ ہو جائے اس کی ملک ہوگا اور اسے حکومت کو خمس ادا کرنا ہوگا، اگر وہ حکومت کی قبضہ کی ہوئی کسی زمین میں ملے گا تو حکومت اس کی مالک ہوگی، بخاری شریف اور دوسری کتب حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جانوروں کا زخم معاف ہے کنواں معاف ہے، معدن معاف ہے، یعنی اگر کوئی جانور کسی کو سینگ یا کھر سے مار دے یا کسی کے کنویں میں کوئی گر کر مر جائے یا زخمی ہو جائے یا کسی کان کے درمیان یا اس کے اندر کوئی گر کر مر جائے یا زخمی ہو جائے تو مالک پر کوئی تاوان نہیں ہے۔

اس سے اشارہ ملتا ہے کہ معدن انفرادی ملکیت ہو سکتا ہے. امام مالک اور امام شافعی اور امام بخاری کی رائے ہے کہ اس کو مصارف زکوٰۃ میں صرف کیا جائے اور امام ابوحنیفہ رح کے نزدیک دفینہ کو پانے والا اسے ظاہر کرے یا پوشیدہ رکھے اس کو اختیار ہے اور حکومت کو اس میں خمس لینے اور نہ لینے کا بھی اختیار ہے۔ (باقی)

اسلام میں بچوں کے حقوق

مولانا جمیل احمد صاحب نذیری

عام طور پر والدین کے حقوق پر تو بحث کی جاتی ہے مگر بچوں کے سلسلہ میں والدین کے فرائض کیا ہیں اس پر بہت کم گفتگو ہوتی ہے، ہمارے نوجوان عالم مولانا جمیل احمد صاحب نذیری نے جو کئی اصلاحی کتابوں کے مصنف ہیں بچوں کے حقوق اور والدین کے فرائض کے متعلق یہ پُر معلومات مضمون لکھا ہے۔ اس لئے اسے شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

نسب کی حفاظت | بچوں کے حقوق کے سلسلے میں سب سے اہم اور بنیادی چیز نسب کی حفاظت ہے۔ جب تک بچہ کے نسب کا تعین نہ ہوگا اس وقت تک اس کی تربیت اور دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔ نسب متعین ہو جانے کے بعد والدین فطری جذبے کے علاوہ خود شریعت کی طرف سے بھی اپنی اولاد کی بھرپور نگہداشت کے ذمہ دار ہوں گے، والدین کی غیر موجودگی میں ان کے دوسرے قریبی اعزا، اس کے علاوہ حفاظت نسب پر ہی وراثت، نکاح کی حرمت، نفقہ کا وجوب اور صلہ رحمی وغیرہ امور کا دار و مدار ہے یہی وجہ ہے اسلام میں تعلیم نسب کے بجائے خود اہمیت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے کہ اپنے نسب نامہ کو یاد رکھو

تعلموا من انسابکم ما تصلون به ارحامکم فان صلة الرحم محبة فی	اپنا نسب سیکھو تاکہ رشتہ داروں کے ساتھ بہترین سلوک کر سکو، کیونکہ بہترین سلوک

الاهل مثراة فی المال منساة فی الاثر [1]

اہل تعلق میں محبت پیدا کرنے، دولت بڑھانے اور عمر میں برکت نصیب ہونے کا سبب بنتا ہے۔

جو لوگ اپنے نسب کو بدلتے ہیں اور جان بوجھ کر اپنے اصلی نسب کے علاوہ نسب بناتے ہیں ان کے لئے بڑی سخت وعید آئی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

من ادعی الی غیر ابیہ وھو یعلم انہ غیر ابیہ فالجنة علیہ حرام [2]

جو شخص جانتے ہوئے اپنے باپ کے علاوہ کسی غیر کو اپنا باپ ظاہر کرے اس پر جنت حرام ہے۔

شریعت نے باندیوں کے لئے استبراء رحم اور آزاد عورتوں کے لئے عدت کا جو قانون جاری کیا ہے اس کا مقصد بھی نسب کی حفاظت اور نسب میں اشتباہ سے بچنا ہے۔

لا یحل لامری یؤمن باللہ والیوم الاخر ان یسقی ماءہ زرع غیرہ یعنی اتیان الحبالیٰ ولا یحل لامرئ یؤمن باللہ والیوم الاخر ان یقع علیٰ امرۃ من السبی حتی یستبرئھا۔ [3]

کسی ایسے شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو حلال نہیں کہ اس کا پانی اس کے غیر کی کھیتی کو سیراب کرے یعنی حالت حمل میں ہم بستری جائز نہیں، اور کسی ایسے شخص کے لئے جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو حلال نہیں کہ وہ کسی باندی سے استبراء رحم سے قبل ہمبستری کرے۔

استبراء رحم کی حکمت بیان کرتے ہوئے مصنف ہدایہ فرماتے ہیں

لان الحکمة فیہ التعرف عن براءة الرحم صیانة للحیاة المحترمة عن الاختلاط والانساب عن الاشتباہ [4]

اسمیں حکمت یہ ہے کہ اس کے ذریعہ رحم کے حمل سے خالی ہونے کا علم ہو جاتا ہے۔ اور انسانی مادۂ منویہ اختلاط اور نسب میں اشتباہ سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

[1] ترمذی ج ۲ ص ۱۹ باب ماجاء فی تعلم النسب، [2] مسلم ج ۱ ص ۵۷ باب بیان حال ایمان من رغب عن ابیہ وھو یعلم [3] ابوداؤد ج ۱ ص ۲۹۳، [4] ہدایہ ج ۴ ص ۴۴۶ فصل فی الاستبراء وغیرہ نیز ہدایہ ج ۲ ص ۴۰۴۔

جنین کے حقوق جو بچہ رحم مادر میں ہو اس کو جنین کہتے ہیں۔ حمل کی دو حالتیں ہیں، جان پڑنے سے قبل اور جان پڑنے کے بعد۔ جان پڑنے کا عمل حمل کے ایک سو بیس دن کے بعد شروع ہوتا ہے[۱]۔ جان پڑنے سے قبل اسقاط حمل بالکراہت[۲] جائز ہے اور جان پڑنے کے بعد حرام ہے[۳]،

حالت رضاعت اور حالت حمل میں ہم بستری کرنے سے اطباء منع کرتے ہیں کیونکہ اس سے دودھ پینے والے بچے یا شکم مادر میں جو بچہ ہے اس میں جسمانی کمزوری پیدا ہوتی ہے حدیث نبوی میں بھی اسے معنیً قتل قرار دیا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لاتقتلوا اولادکم سرًّا فان الغیل یدرك الفارس فید عثرۃ عن فرسہ	اپنی اولاد کو سرًّا قتل نہ کرو اس لئے کہ غیل گھوڑ سوار میں ضعف پیدا کرتا ہے اور اس ضعف کی وجہ سے بسا اوقات وہ گھوڑے کی پیٹھ پر ٹک نہیں پاتا۔
(رواہ ابوداؤد) [۱]	

حالت رضاعت یا حالت حمل میں مجامعت کرنے کو غیل کہتے ہیں، غیل کے نتیجے میں دودھ پیتے بچے یا جنین کو نقصان پہونچنے کا اس حدیث سے ثبوت ملتا ہے، علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اس حدیث میں غسل کو فی الجملہ موثر تسلیم کیا گیا ہے۔ جہاں تک ان حدیثوں کا تعلق ہے جس میں غیل کی ممانعت کرنے سے حضورؐ نے احتراز فرمایا ہے[۲]۔ وہاں جاہلی اعتقاد کا رد مقصود ہے کیونکہ زمانہ جاہلیت کے لوگ غیل کو ہی بچے کے ضعف کے سلسلہ میں اصل موثر سمجھتے تھے، لہٰذا دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔[۳]

قتل اولاد کی حرمت زمانۂ جاہلیت میں ایک انتہائی سفاکانہ رسم یہ تھی کہ وہ اپنے معصوم بچوں کو قتل کر دیا کرتے تھے، قتل اولاد کا رواج تین وجوہ سے تھا۔

(۱) دیوی دیوتاؤں کی نذر (۲) فقر و فاقہ کا خیال (۳) عار و شرم کا احساس۔

---

[۱] فتح القدیر ج ۲ ص ۴۹۰ [۲] کراہت سے مراد کراہت تحریمی ہے۔ ڈاکٹر مصطفیٰ بیں الماذب واعلام یوسف القرضاوی کا حوالہ ہے تو وہ قابل بحث ہے۔ فقہ کی کسی معتبر کتاب کا حوالہ دینا چاہئے۔ [۳] الحلال والحرام فی الاسلام ص ۱۶۷۔

[۱] مشکوۃ ج ۲ ص ۲۷۶۔ [۲] مثلاً جدامہ بنت وہب کی حدیث مسلم ج ۲ ص ۴۶۵ [۳] مرقات مفاتیح ج ۳ ص ۴۴۳

عربوں کی طرح بہت سی بت پرست قوموں میں اس کا رواج رہا ہے۔ روم کے قانون میں باپ کو اپنی اولاد کے مار ڈالنے کا اختیار تھا، اس پر کوئی باز پرس نہیں تھی اولادکشی کا اعلانیہ کثرت سے رواج تھا، ہندوستان کے راجپوتوں میں بھی لڑکیوں کی ستی کی رسم اور دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے معصوم بچوں کا قتل ایک عام بات تھی [1]

زمانۂ جاہلیت میں بہت سے لوگ اس طرح نذر مانتے تھے کہ اگر ان کے یہاں اتنے لڑکے ہوئے تو ایک کو قربان کر دیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والد ماجد عبداللہ کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا۔ ان کے باپ عبدالمطلب نے نذر مانی کہ اگر ان کے دس لڑکے ہوئے تو ایک کو قربان کر دوں گا۔

سورہ انعام کی اس آیت میں بتوں کے نام پر قتل اولاد کی حرمت کو یوں بیان کیا جا رہا ہے۔

وکذالك زین لکثیر من المشرکین قتل اولادھم شرکاؤھم لیردوھم ولیلبسوا علیھم دینھم
(انعام ۱۳۸)

اور ایسے ہی بہت سے مشرکوں کو ان کے معبودوں نے قتل اولاد کو بہت خوبصورت بنا کر پیش کیا ہے تاکہ یہ معبود ان کو ہلاک کر دیں اور ان کے دین کو ان پر مشتبہ کر دیں۔

آگے ارشاد ہوتا ہے:

قد خسر الذین قتلوا اولادھم سفھا بغیر علم
(انعام ۱۴۱)

بیشک وہ لوگ بڑے گھاٹے میں ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کو نادانی اور جہالت سے مار ڈالا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم تھا کہ وہ مسلمان عورتوں سے بیعت لیتے وقت اور بہت سی چیزوں کے علاوہ اس بات پر بھی بیعت لیں کہ

ولا یقتلن اولادھن (ممتحنہ ۱۲) وہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں۔

قتل اولاد کا دوسرا سبب فقر و فاقہ کا خوف تھا، عربوں کو یہ ڈر تھا کہ اولاد کیلئے

---

[1] سیرت النبی ج ۲ ص ۱۵۹۔

کھانے پینے کا بھی سامان کرنا پڑے گا۔ وہ کہاں سے آئے گا، لہذا اسے قتل کرکے وہ اپنے تئیں اس خوف سے نجات پا جاتے تھے

قرآن نے بتایا کہ ہر بچہ اپنا رزق اپنے ساتھ لاتا ہے، کوئی کسی کو نہیں کھلاتا ہر ایک کو خدا ہی کھلاتا ہے، رزق رسانی اسی کے ذمہ ہے۔ ہر جاندار کی روزی کا سامان وہی کرتا ہے لہذا کسی کو اپنی اولاد کے متعلق فقر و فاقہ کے خوف میں مبتلا ہونے کی اجازت نہیں

وما من دابۃ الا علی اللہ رزقھا (ہود ۶) — زمین میں جتنے جاندار ہیں سب کا رزق اللہ ہی کے ذمہ ہے

جو لوگ فقر و فاقہ کے ڈر سے قتل اولاد جیسا جرم کرتے تھے ان کو سختی سے منع کیا گیا

لاتقتلوا اولادکم خشیۃ املاق ، نحن نرزقھم وایاکم ان قتلھم کان خطاء کبیرًا (بنی اسرائیل ۴) — اپنی اولاد کو محتاجگی کے ڈر سے قتل نہ کرو ہم ہی ہیں جوان کو اور تم کو دونوں کو رزق دیتے ہیں، ان کا مار ڈالنا بلا شبہ بہت بڑا گناہ ہے۔

دوسری جگہ شرک، نافرمانیٔ والدین اور قتل اولاد کی حرمت کو ایک ساتھ بیان کیا گیا۔

قل تعالوا اتل ماحرم ربکم علیکم الا تشرکوا بہ شیئا وبالوالدین احسانا، ولا تقتلوا اولادکم من املاق ، نحن نرزقکم و ایاھم (انعام ۱۵۲) — اے نبی! کہدیجئے، آؤ میں تمھیں بتاتا ہوں کہ تمھارے رب نے تم پر کیا حرام کیا ہے، یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراؤ اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو، اور اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے خوف سے قتل نہ کرو، ہم تم کو اور ان کو دونوں کو روزی دیتے ہیں۔

ایک حدیث سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ یہ بتایا ہے کہ کوئی شخص اس خوف سے اپنی اولاد کو مار ڈالے

کہ وہ اس کے ساتھ کھائے گی۔ [1]

قتل اولاد کا تیسرا سبب عار اور شرم کا احساس تھا۔ زمانہ جاہلیت کے لوگ لڑکیوں کی پیدائش عار کی بات سمجھتے تھے، لڑکیوں کے لئے ظاہر ہے کہ داماد کی تلاش ہوتی وہ اس میں اپنی بے عزتی محسوس کرتے تھے کہ کوئی ان کا داماد کہلائے، اس بے عزتی کا علاج ان لوگوں نے یہ سوچا کہ لڑکی پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیا کرتے تھے، سورہ تکویر میں ہے۔

وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ بِأَيِّ ذَنبٍ قُتِلَتْ (آیت ۸، ۹) — اور جب زندہ دفن کی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائیگا کہ وہ کس جرم میں مار ڈالی گئی۔

ظاہر ہے کہ لڑکی کا کوئی جرم نہیں، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص سے اتنا ناراض ہوگا کہ اس کو مخاطب بھی نہیں بنائے گا، بس لڑکی سے ہی خطاب ہوگا۔

حضرت مغیرہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ

ان اللہ حرم علیکم عقوق الوالدین ووادالبنات [2] — اللہ نے تم پر ماں باپ کی نافرمانی اور لڑکیوں کو زندہ درگور کرنا حرام فرمایا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے "عزل [3]" کو بھی سورہ تکویر کی مذکورہ آیت کے تحت رکھا ہے صحابہ کرام نے "عزل" کے بارے میں دریافت کیا تو حضور نے فرمایا

ذالک الواد الخفی — یہ واد خفی ہے

اس کے بعد حضور نے سورۃ تکویر کی مذکورہ آیت واذا الموءودۃ سئلت الخ تلاوت فرما کر بتایا کہ یہ فعل شنیع اسی آیت کے تحت آتا ہے [4]

ولادت کے بعد اذان و تحنیک | ولادت کے فوراً بعد بچے کا حق یہ ہے کہ اسی کے کان میں اذان دی جائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کے کان میں اذان دی تھی [5]

---

[1] بخاری ج ۲ ص ۸۸۷ کتاب الادب، [2] مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۱۹، [3] یعنی ہمبستری کے وقت میاں بیوی کا ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جانا تاکہ انزال باہر ہو، عام طور پر اس کی ممانعت ہے مخصوص مواقع پر اجازت ہے تفصیلات کتب فقہ میں مذکور ہیں۔ [4] مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۷۶ [5] ابوداؤد ج ۲ ص ۳۵۷،

نومولود بچہ کی تحنیک بھی مستحب ہے، تحنیک کا مطلب یہ ہے کہ بچہ کو کسی نیک اور صالح شخص کے پاس لے جایا جائے یا اسے بلا لایا جائے اور وہ شخص کھجور وغیرہ اپنے منہ میں چبا کر بچے کے منہ میں ڈال دے اور اس کے لئے برکت کی دعا کرے، تحنیک کیلئے بہتر یہ ہے کہ کھجور ہو اگر کھجور نہ ملے تو کوئی میٹھی چیز، میٹھی چیزوں میں بھی شہد زیادہ بہتر ہے اگر میٹھی چیز نہ ملے تو کسی بھی کھانے کی چیز سے تحنیک ہو سکتی ہے، شرط یہ ہے کہ وہ آگ پر پکی نہ ہو۔[1] تحنیک کی تفصیل بیان کرتے ہوئے علامہ نوویؒ فرماتے ہیں:

اتفق العلماء على استحباب تحنيك المولود عند ولادته بتمر فان تعذر فما في معناه او قريب منه من الحلو فيمضغ المحنك التمرة حتى تصير مائعة بحيث تبلع ثم يفتح فم المولود و يضعها فيه ليدخل شئ منها جوفه و يستحب ان يكون المحنك من الصالحين و ممن يتبرك به رجلا كان او امرأة فان لم يكن حاضرا عند المولود حمل اليه۔[2]

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ ولادت کے وقت نومولود بچے کی تحنیک کھجور سے مستحب ہے اگر کھجور نہ ہو تو جو میٹھی چیز بھی کھجور سے ملتی جلتی یا اس سے قریب ہو، سے تحنیک کیجا سکتی ہے۔ تحنیک کرنیوالا کھجور کو اتنا چبائے کہ وہ رقیق ہو کر نگلنے کے لائق ہو جائے پھر بچے کا منہ کھولا جائے اور اس کے منہ میں ڈالدیا جائے تاکہ اس میں سے کچھ اس کے پیٹ میں پہونچ جائے۔ تحنیک کرنیوالا صالحین میں سے اور ان لوگوں میں سے ہونا چاہئے جن سے برکت حاصل کیجاتی ہے، خواہ مرد ہو یا عورت، اگر تحنیک کرنے والا وہاں موجود نہ ہو تو بچے کو اس کے پاس لے جایا جائے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تحنیک کی ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ اپنے بڑے بیٹے کی ولادت کے موقع پر اسے لے کر حضورؐ کی خدمت میں گئے، حضورؐ نے بچے کا نام ابراہیم

---

[1] عمدۃ القاری ج ۹ ص ۱۱۷، [2] نووی علی المسلم ج ۲ ص ۲۰۸

رکھا، کھجور سے اس کی تحنیک کی اور اس کے لئے برکت کی دعا فرمائی اس کے بعد ابو موسیٰ کو واپس کر دیا [۱]

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک بچہ حضورؐ کی خدمت میں لایا گیا، حضورؐ نے اس کی تحنیک فرمائی، بچے نے حضورؐ کے کپڑوں پر پیشاب کر دیا حضور نے بعد میں دھلوایا [۲]

عبد اللہ بن زبیرؓ کی پیدائش ہوئی تو ان کی والدہ اسماء بنت ابی بکر انھیں حضورؐ کی خدمت میں لائیں اور حضورؐ کی گود میں ڈال دیا، حضورؐ نے کھجور سے ان کی تحنیک کی، دعائے برکت فرمائی، اپنا لعاب مبارک بھی ان کے منہ میں ڈالا، مہاجرین میں ہجرت کے بعد یہ پہلا بچہ پیدا ہوا تھا، مسلمانوں کو اس سے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ مخالفین نے مشہور کر رکھا تھا کہ یہود نے مسلمانوں پر جادو کر دیا ہے، اب ان کے یہاں بچہ نہیں پیدا ہوگا، [۳]

حضرت ابو طلحہؓ کے بیٹے کی بھی حضورؐ نے تحنیک فرمائی اور اس کا نام عبد اللہ رکھا [۴]

عام طور سے مسلمان تحنیک کے لئے بچوں کو حضورؐ کی خدمت میں لاتے تھے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یؤتی الصبیان نیبرک علیہم و یحنکھم [۵]	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بچے لائے جاتے تھے، حضورؐ ان کے لئے برکت کی دعا فرماتے اور ان کی تحنیک کرتے۔

عقیقہ اور نام رکھنا بچے کا ساتویں دن عقیقہ کرنا سنت ہے، عقیقہ کے دن اس کا سر منڈانا چاہئے۔ اور بالوں کے وزن سے چاندی صدقہ کرنی چاہئے، منڈے ہوئے سر پر زعفران ملنے کا حکم ہے۔ عقیقہ کر دینے سے بچہ آفات و بلا سے محفوظ ہو جاتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

مع الغلام عقیقۃ فاھریقوا عنہ دما واميطوا عنہ الاذیٰ [۶]	بچہ کے ساتھ عقیقہ ہے لہذا اس کی طرف سے جانور ذبح کرو اور اس سے آفات کو ہٹاؤ

---

[۱] بخاری ج ۲ ص ۸۲۱ [۲] ایضاً [۳] ایضاً [۴] مسلم ج ۲ ص ۲۰۹ [۵] ایضاً
[۶] بخاری ج ۲ ص ۸۲۲ ،

دوسری حدیث میں ہے

الغلام مرتهن بعقیقته تذبح عنه یوم السابع و یسمی و یحلق راسه [1]

بچہ اپنے عقیقہ میں رہن رکھا ہوتا ہے، لہذا ساتویں دن اس کی طرف سے جانور ذبح کیا جائے، بچہ کا نام رکھا جائے اور اس کا سر منڈایا جائے۔

عقیقہ میں لڑکے کے لئے دو بکرے ذبح کرنا سنت ہے اور لڑکی کے لئے ایک بکرا۔ بکرا کے بجائے بکری ہو تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا [2] حضرت حسن کے عقیقہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ اے فاطمہ! اس کا سر منڈوانے کے بعد بال کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کر دو۔ چنانچہ وزن کیا گیا تو ایک درہم کے لگ بھگ وزن ہوا [3]

حضرت بریدہؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ زمانہ جاہلیت میں بچہ کے سر پر اس کے عقیقہ کے جانور کا خون مل دیا کرتے تھے جب اسلام آیا تو ہم بچہ کا سر منڈوانے لگے اور سر پہ زعفران ملنے لگے [4]

عقیقہ کے دن بچہ کا نام رکھ دینا چاہئے۔ عقیقہ سے پہلے بھی نام رکھا جا سکتا ہے [5] نام اچھا رکھنا چاہئے۔ حضورؐ فرماتے ہیں کہ

تدعون یوم القیمۃ باسماءکم و اسماء اٰباءکم فاحسنوا اسماءکم [6]
(رواہ احمد)

تمہیں قیامت کے دن تمہارے ناموں اور تمہارے آباء کے ناموں کے ساتھ پکارا جائیگا لہذا اپنا نام اچھا رکھا کرو۔

اچھے ناموں سے مراد مثلاً انبیاء کرام کے نام پر نام رکھا یا اللہ تعالیٰ کے ناموں کے ساتھ شروع میں "عبد" لگا کر نام رکھا۔ ویسے عبداللہ اور عبدالرحمٰن کو حدیث میں بہت اچھا نام قرار دیا گیا ہے [7] ایسے نام رکھنا جس میں بڑائی ظاہر ہوتی ہو، ایسے نام رکھنا جس میں فتنہ اور جنگ و جدال کا معنی پایا جاتا ہو، ناپسندیدہ ہے۔ حضور ایسے ناموں کو بدل دیا کرتے تھے۔

---

[1] ترمذی ج ۱ ص ۲۰۳ [2] ابوداود ج ۲ ص ۴۴ [3] ترمذی ج ۱ ص ۲۰۳ امام ترمذی اس حدیث کے بارے میں کہتے ہیں کہ ھذا حدیث غریب و اسنادہ لیس بمتصل لان محمد بن علی بن حسین لم یدرک علی بن ابی طالب [4] مشکوۃ ج ۲ ص ۳۶۳ [5] فتح الباری ج ۹ ص ۵۰۷ [6] مشکوۃ ج ۲ ص ۴۰۸ [7] ابوداود ج ۲ ص ۳۳۶

اخلاق سلف

"اس سے پہلے والے پرچہ میں شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب تنبیہ المغترین اور اس کے ترجمہ کا ذکر آچکا ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے سے قلب میں وہی تاثیر محسوس ہوتی ہے جو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کے پڑھنے سے محسوس ہوتی ہے اس کتاب کے کچھ اقتباسات ہدیہ ناظرین ہیں اس کا اردو ترجمہ "اخلاق سلف" کے نام سے حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپ گڑھی مدظلہٗ کی توجہ سے ہمارے سامنے آسکا ہے۔" (ادارہ)

(۱) سلف کے اخلاق میں سب سے نمایاں چیز یہ نظر آتی ہے کہ وہ کتاب اور سنت کو ہمہ وقت اس طرح لازم پکڑے رہتے ہیں جیسے جسم کے ساتھ اس کا سایہ لازم ہوتا ہے اور ان میں سے کوئی جب تک علوم شرعیہ میں متبحر نہ ہوجاتا مسند ارشاد پر نہ بیٹھتا۔

سید الطائفہ حضرت ابوالقاسم جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "ہماری کتاب یعنی قرآن مجید تمام کتابوں کی سردار اور جامع ترین کتاب ہے۔ پس جس نے نہ قرآن پاک کو پڑھا اور نہ حدیث رسول کو یاد کیا اور نہ ہی ان دونوں کے معنی کو سمجھا اس کی اقتداء ہرگز جائز نہیں نیز آپ اپنے دوستوں سے فرماتے کہ اگر کسی آدمی کو دیکھو کہ ہوا میں چار زانو بیٹھا ہے تب بھی جب تک کہ اللہ تعالیٰ کے امر و نہی سے متعلق اس کا عمل نہ دیکھ لو اس کی پیروی ہرگز نہ کرو۔ جب دیکھ لو کہ وہ امر کا امتثال کرنے والا اور مناہی سے اجتناب کرنے والا ہے تو اس پر اعتقاد جماؤ اور اس کی پیروی کرو اور اگر اسے دیکھو کہ اوامر کے امتثال میں کوتاہی کرتا ہے اور منہیات سے پرہیز نہیں کرتا تو اس سے اجتناب کرو۔

میں کہتا ہوں کہ یہ ایک ایسا وصف ہے جو آجکل فقرا میں بالکل مفقود ہے بعض تو ان میں سے ایسے ہیں جو اس راستہ میں ایک قدم بھی نہیں چلے، صرف چند باتیں فنا و بقا کے متعلق اودھر ادھر سے ملا کر یاد لی ہیں اور چند شطحیات جن کی تائید نہ قرآن سے ہوتی ہے نہ حدیث سے تکیہ کلام بنا رکھی ہیں۔ پھر صوفیانہ لباس پہن کر لوگوں کو دھوکہ دیتے پھرتے ہیں۔

چنانچہ اسی قسم کا ایک شخص میرے پاس آیا اور بغیر علم کے اور بلا مذاق تصوف کے میرے سامنے مقام فنا و بقا میں گفتگو کرنے لگا۔ اس کے ساتھ معتقدین کا ایک گروہ بھی تھا وہ مع اپنی جماعت کے کئی دن میرے پاس رہا۔ آخر کار ایک دن میں نے ان سے دریافت کیا نماز اور وضو کے فرائض کیا ہیں تو مجھ سے کہنے لگا کہ میں کچھ پڑھا لکھا نہیں ہوں میں نے کہا بھائی ظاہری عبادات کو کتاب و سنت کے مطابق درست کرنا اجماعًا واجب ہے جو شخص واجب و مستحب اور حرام و مکروہ میں فرق نہیں کرتا وہ جاہل ہے۔ ایسے شخص کی اقتدار ظاہری و باطنی طریق میں کسی طرح بھی جائز نہیں۔ یہ سنکر وہ خاموش ہوگیا اور کچھ جواب نہ دیا پھر اسی دن مجھ سے علیحدہ ہوگیا، اس طرح اللہ تعالیٰ نے مجھ کو اس سے اور اس کی وجہ سے جو ضیق تھی اس سے نجات دیدی۔

میں کہتا ہوں وہ شخص کاذب اور مفتری ہے جو کہتا ہے کہ طریق تصوف کو قرآن و حدیث نے بیان نہیں کیا اس کا قول اس جہالت پر صاف دلیل ہے کیونکہ اہل تصوف کے نزدیک صوفی کی حیثیت سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ وہ ایک ایسا عالم ہے جو اپنے علم پر اخلاص کے ساتھ عمل کرتا ہو اور حضرات صوفیا اپنے مریدین کو جو مجاہدات تبلاتے ہیں اس سے ان کا مقصود یہی ہوتا ہے کہ سلف صالحین کے طریق پر عبادات شرعیہ کو بجالانے کا ان کو ملکہ حاصل ہو جائے بس۔ اس کے سوا اور کوئی مقصود نہیں، لیکن چونکہ سلف صالحین کے طریق پر عمل کرنے والے نایاب ہوگئے ہیں۔ اور ان کے اوصاف سے بہت کم لوگ متصف ہیں۔ اس لئے ان کا طریق ہی مٹ گیا۔ جس کی وجہ سے بعض لوگوں کو گمان ہونے لگا کہ یہ طریق شریعت سے خارج ہے اس کو خوب یاد رکھو فالحمد للہ رب العلمین۔

(۲) سلف صالحین کے اخلاق میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ہر فعل اور قول میں اس وقت

تک توقف فرماتے ہیں جب تک اس کو کتاب و سنت یا عرف کی ترازو سے تول نہ لیں کیونکہ عرف بھی منجملہ شریعت کے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ — معافی کو شیوہ بنا اور نیکی کا حکم کر

پس معلوم ہوا کہ حضرات مشائخ اپنے اقوال و افعال میں محض لوگوں کے عمل پر اکتفا نہیں کرتے کیونکہ ممکن ہے کہ یہ قول یا فعل ایسی بدعات میں سے ہو جن کی تائید قرآن و حدیث میں نہیں ملتی۔ حدیث میں آیا ہے۔

لا تقول الساعة حتی تصیر السنة بدعة اذا ترکت البدعة یقول الناس ترکت السنة۔	قیامت اس وقت تک قائم نہیں ہوگی، جبتک کہ سنت کی جگہ بدعت نہ ہو جائے یہانتک کہ اگر بدعت چھوڑی جائے گی تو لوگ کہیں گے کہ سنت چھوٹ گئی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ پچھلے لوگ اپنے بڑوں سے بدعتیں لیتے ہیں پس جب بدعت پر عمل کرتے کرتے زمانہ دراز ہو جاتا ہے تو لوگ یہ گمان کرتے لگتے ہیں کہ یہ بھی ایسی سنت ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاری فرمایا ہے۔ سلف ہمیشہ لوگوں کو قرآن و حدیث میں مقید رہنے کی ہدایت فرماتے اور بدعت سے نفرت دلاتے اور اس معاملے میں تشدد اختیار فرماتے۔

مروی ہے کہ حضرت امام زین العابدین رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادہ سے کہا کہ میرے لئے ایک ایسا کپڑا بناؤ جو قضائے حاجت کے وقت پہنا کروں اور نماز کے وقت اتار دوں۔ کیوں میں دیکھتا ہوں کہ مکھیاں نجاست پر بیٹھ کر بدن پر بیٹھتی ہیں۔ صاحبزادے نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نماز اور بیت الخلاء کے لئے ایک ہی کپڑا تھا۔ پس امام صاحب اس ارادہ سے رک گئے۔

اے بھائی! تو اپنے تمام افعال اور اقوال و عقائد میں سنت نبوی کی پیروی کرو اور کسی فعل کا ارادہ نہ کر جب تک کہ تجھے یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کتاب و سنت کے مطابق ہے۔ سو اس شخص نے جھوٹ کہا اور بہتان باندھا جو یہ کہتا ہے کہ اہل تصوف

کا طریقہ بدعت ہے۔ اسلئے کہ جو شخص شریعت کی مخالفت سے اتنا ڈرتا ہے کہ جبتک کسی عمل کا شریعت کے موافق ہونا سمجھ میں نہ آوے تب تک اسکی طرف رخ نہیں کرتا بلکہ اس میں توقف کرتا ہو بس اگر ایسا شخص بھی بدعتی ہو تو پھر سمجھ لو کہ روئے زمین پر کوئی سنی باقی نہیں رہا۔ فالحمد للہ رب العالمین۔

الرشاد کی ڈاک

محترم المقام حضرت مولانا مجیب اللہ ندوی صاحب زیدت مکارمکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

"جامعۃ الرشاد" پابندی کے ساتھ مل رہا ہے، آپ کی دینی علمی کاوشوں سے استفادہ کا موقع ملتا رہتا ہے۔ اللہ پاک آپ کی محنتوں کو قبول فرمائے اور ہمیں استفادہ کا موقع دے (آمین) امید ہے کہ "البدر" بھی پابندی کے ساتھ مل رہا ہوگا۔

جنوری و فروری ۸۲ء کے مشترک شمارہ کا باب الاستفسار والجواب ص ۶۲،۶۱ پیش نظر ہے جس میں محمد ابراہیم صاحب بنگلور نے شیعہ اثنا عشری کے عقائد و اعمال اور ایرانی انقلاب سے متعلق آپ سے کچھ سوالات کئے ہیں اور آپ نے اختصار کے ساتھ ان کے جوابات مرحمت فرمائے ہیں لیکن میں باادب عرض کروں گا کہ جوابات آپ جیسے تحقیق پسند فاضل کے شایان شان نہیں ہیں اور سائل ان جوابات کو پڑھ کر مطمئن نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ اس نے آپ کی تحقیقات کی روشنی میں فیصلہ کن شرعی رہنمائی چاہی ہے اور آپنے جواباً تحقیق کی تمام تر ذمہ داری سائل پر لوٹاتے ہوئے بات ٹال دی ہے۔ مثلاً سائل کا پہلا سوال ہے۔ (۱) کیا شیعہ (اثنا عشری) اہل اسلام ہیں؟ اس کے جواب میں آپ تحریر فرماتے ہیں کہ "اگر وہ تحریف قرآن اور صحابہ کے ارتداد کے قائل نہیں ہیں تو وہ مسلمان ہیں۔"

اب سوال یہ ہے کہ اس کی تحقیق کون کرے گا کہ شیعہ اثنا عشری تحریف قرآن اور صحابہ کے ارتداد کے قائل ہیں یا نہیں؟

محترم! اب یہ جواب بہت پرانا ہوچکا اور ہمارے علماء کے زبان و قلم سے یہ بات

اس وقت تک زیب دیتی تھی جب تک ان پر شیعی عقائد واضح نہ تھے، کیونکہ کتمان مذہب شیعہ اصول میں داخل ہے چنانچہ شیعوں کی مستند کتاب اصول کافی میں مستقل طور پر باب الکتمان موجود ہے، اسی باب میں کی ایک روایت بطور نمونہ پیش کر رہا ہوں۔

علی بن ابراھیم عن ابیہ عن ابن ابی عمیر عن یونس بن عمار عن سلیمان بن خالد قال قال ابوعبد اللہ علیہ السلام یا سلیمان انکم علی دین من کتمہ اعزہ اللہ ومن اذاعہ اذلہ اللہ (اصول کافی صـ۴۸۵ مطبوعہ لکھنؤ)

لیکن اب جبکہ ہمارے علمائے ربانین علی الخصوص حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی، حضرت مولانا حیدر علی صاحب فیض آبادی، حضرت مولانا احتشام الدین صاحب مرادآبادی اور پھر آخر میں امام اہلسنت حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی کی انتھک محنتوں کے نتیجہ میں دجل وفریب کے تمام پردے ہٹ چکے اور مذہب شیعہ کی حقیقی تصویر سامنے آچکی تو بھی ہمارے تحقیق پسند علماء کا "اگر مگر" کے ساتھ گفتگو کرنا اور کسی واضح رائے کے اظہار سے پہلوتہی کرنا اکابر کی تحقیقات کو مجروح کرنے کے مرادف تو ہے ہی۔ امت کو صحیح رہنمائی سے بھی محروم رکھنا ہے۔ آپکے اطمینان کے لئے عرض ہے کہ شیعہ اثنا عشری قرآن مجید میں پانچ قسم کی تحریف کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

اول یہ کہ قرآن مجید سے بہت سی آیات وسورتیں کم کر دی گئی ہیں۔ دوم یہ کہ قرآنمجید میں جا بجا کلام انسانی شامل کر دیا گیا ہے۔ سوم یہ کہ قرآن مجید کے الفاظ تبدیل کر دیئے گئے ہیں چہارم یہ کہ حروف میں تبدیلی کر دی گئی ہے۔ پنجم یہ کہ قرآنمجید کی ترتیب بدل دی گئی ہے۔

چنانچہ اصول کافی میں مستقل ایک باب باب فیہ نکت ونتف من التنزیل فی الولایۃ موجود ہے جسمیں تحریف قرآن کی روایات ہیں۔ علاوہ ازیں احتجاج طبرسی، تفسیر صافی، تفسیر قمی ودیگر کتب شیعہ میں بھی تحریف قرآن کی بکثرت روایات موجود ہیں، ان سب کے علاوہ علامہ نوری طبرسی کی اثبات تحریف قرآن کے سلسلہ میں مستقل تصنیف فصل الخطاب موجود ہیں۔

اسی کتاب فصل الخطاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تحریف قرآن کے سلسلہ میں

مذہب شیعہ میں دو ہزار سے زائد روایات موجود ہیں اور ان کی صحت کا علمائے شیعہ کو اقرار ہے۔ یہی نہیں بلکہ انہیں کے مطابق ان کا عقیدہ بھی ہے، چنانچہ فصل الخطاب صفحہ ۲۲۷ پر مذکور ہے۔

قال السيد نعمت الله الجزائری فی بعض مولفاته کما حکی عنه ان الاخبار الدالة علی ذالك تزید علی الفی حدیث وادعی استفاضتها جماعة کالمفید والمحقق الداماد والعلامة المجلسی وغیرهم بل الشیخ ایضا صرح فی التبیان بکثرتها بل ادعی تواترها جماعة یاتی ذکرهم۔ اسی طرح اسی کتاب کے صفحہ ۳۰ پر علامہ نوری فرماتے ہیں

قال السید المحدث الجزائری فی الانوار مامعناه ان الاصحاب قد اطبقوا علی صحة الاخبار المستفیضة بل المتواترة الدالة بصریحها علی وقوع التحریف فی القران کلاما ومادتا واعرابا والتصدیق بها۔

مزید وضاحت کے لئے ایک حوالہ اور پیش کرتا ہوں۔ علامہ نوری اسی کتاب فصل الخطاب کے صفحہ ۹۷ پر تحریر فرماتے ہیں:

کان لامیر المومنین علیه السلام قرانا مخصوصا جمعه بنفسه بعد وفات رسول الله صلی الله علیه واله وعرضه علی القوم فاعرضوا عنه فحجبه عن اعینهم وکان ولده علیه السلام یتوارثونه اماما عن امام کسائر خصائص الامامة وخزائن النبوة وهو عند الحجة عجل الله فرجه یظهره للناس بعد ظهوره ویامرهم بقرائته وهو مخالف لهذا القران الموجود من حیث التالیف وترتیب السور والایات بل الکلمات ایضا من جهة الزیادة والنقیصة وحیث ان الحق مع علی علیه السلام وعلی مع الحق ففی القران الموجود تغییر من جهتین وهو المطلوب۔

متقدمین علمائے شیعہ میں صرف چار شخص ایسے ہیں جنھوں نے تحریف قرآن کا انکار کیا ہے اور وہ ہیں۔ شریف مرتضیٰ، شیخ صدوق، ابوجعفر طوسی، ابوعلی مصنف تفسیر مجمع البیان ان کے سوا تمام علمائے شیعہ تحریف قرآن کا عقیدہ رکھتے ہیں چنانچہ تفسیر صافی کے دیباچہ میں موجود ہیں۔ واما اعتقاد مشائخنا رحمهم الله فی ذالك فالظاهر من ثقة الاسلام محمد بن یعقوب الکلینی طاب ثراه انه کان یعتقد التحریف والنقصان فی القرآن

لانه روی روایات فی هذا المعنی فی کتابه الکافی ولم یتعرض لقدح فیها مع انه ذکر فی اول الکتاب انه کان یثق بمارواه فیه وکذالک استاذه علی بن ابراهیم القمی فان تفسیره مملوٌ منه وله علو فیه وکذالک الشیخ احمد بن ابی طالب الطبرسی

(ص۱۳ مطبوعہ ایران)

علمائے شیعہ پر جب کوئی افتاد پڑتی ہے اور ان سے ایمان بالقرآن کا مطالبہ ہوتا ہے تو وہ مذکورہ بالا چار علماء میں سے کسی ایک کا قول نقل کرکے اپنا پیچھا چھڑا لیتے ہیں حالانکہ اولاً تو جمیع علمائے شیعہ اور ائمہ معصومین کے مقابلہ میں ان چار کی رائے کو کیا اہمیت حاصل ہو سکتی ہے، پھر ان چار کی بات بھی اس لئے قابل اعتماد نہیں ہے کہ خود انھوں نے تو تحریف کا انکار کیا ہے لیکن قائلین تحریف کی تکفیر نہیں کی ہے نہ ہی ائمہ معصومین کی ان دو ہزار سے زائد روایات تحریف کے سلسلہ میں کوئی معقول بات کہی ہے۔ اور ایسی صورت میں اسے ان کی ذاتی رائے سے زیادہ اہمیت حاصل نہیں ہو سکتی۔

مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں غالباً اب آپ کو اسمیں کسی قسم کا شک نہ رہ گیا ہوگا کہ تمام شیعہ اثنا عشری تحریف قرآن کے قائل ہوتے ہیں۔ بنا بریں ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

رہ گیا ارتداد صحابہ کا مسئلہ تو دراصل اس کی بنا ہی یہی چیز ہے کہ وہ قرآن کے ناقلان اول ہیں اور ان کو مجروح کئے بغیر قرآن کو مشکوک نہیں بنایا جا سکتا تھا،

تعجب ہے کہ آپ نے یہ کیسے تحریر فرمادیا کہ "اگر وہ تحریف قرآن اور صحابہ کے ارتداد کے قائل نہیں ہیں تو وہ مسلمان ہیں۔ کیا آپ کے علم میں کچھ ایسے بھی شیعہ اثنا عشری ہیں جو ارتداد صحابہؓ کے قائل نہ ہوں؟

محترم! مذہب شیعہ کی اساس دو چیزوں پر ہے، ایک تولا، دوسرے تبرا۔ تولا کا مقصد ختم نبوت کا انکار ہے اور تبرا کا مقصد قرآن مجید کو مشکوک بنانا۔ پھر بھلا شیعہ رہتے ہوئے صحابہؓ کے ارتداد کا قائل نہ ہونا کیونکر ممکن ہو سکتا ہے؟ پھر اصولی طور پر تحریف قرآن کا مسئلہ طے ہونے کے بعد مزید کسی مسئلہ پر بحث کی ضرورت بھی باقی نہیں

رہ جاتی ہے ورنہ ارتداد صحابہؓ کے علاوہ بدا، امامت اور انک وغیرہ جیسے نفیس عقائد بھی شیعہ اثنا عشری کی تکفیر کے لئے کافی ہیں۔

چونکہ سائل کے دوسرے سوالات اور آپ کے جوابات کا انحصار پہلے سوال جواب ہی پر تھا اس لئے دوسرے جوابات کے لئے بھی آپ نے نرم گوشہ رکھا ہے، اور پہلے سوال کا معاملہ طے ہونے کے بعد اس میں کوئی شک ہی نہیں رہ جاتا کہ (۲) شیعہ عالم کے پیچھے نماز نہیں پڑھی جاسکتی۔ (۳) ان کی مجالس میں شرکت تعاون علی الاثم ہونے کی بنا پر قطعی حرام ہے (۴) ان سے عملی اتحاد جائز ہے لیکن مذہبی اتحاد ممکن نہیں (۵) ایران کے انقلاب کو "اسلامی انقلاب" کا نام دینا ہی درست نہیں چہ جائیکہ اس کی حمایت اور تائید کی جائے (۶) علامہ خمینی معتدل ہوں یا غیر معتدل، ہیں بہرحال شیعہ! لہٰذا ان سے اسلامی ترقیات اور اسلامی نظام کے قیام کی توقع رکھنا عبث ہے اور ان کی انتقامی کارروائیوں اور روز افزوں مظالم کی مذمت کرنا انسانی فریضہ ہے۔

امید ہے کہ معروضات بالا کی روشنی میں آپ اس استفتار پر نظرثانی فرمائیں گے۔ اور سائل کے سوالات کے جواب میں اپنا کوئی واضح موقف پیش کریں گے۔ "البدر" کے "امام اہلسنت نمبر" پر "جامعۃ الرشاد" میں تبصرہ مطلوب تھا جو ابتک شائع نہیں ہوا ہے۔ امید ہے کہ اس طرف فوری توجہ مبذول فرمائیں گے۔ خدا کرے آپ کا مزاج گرامی بعافیت ہو۔

والسلام

مخلص

عبد العلی فاروقی

مدیر ماہنامہ البدر، کاکوری، لکھنؤ ۲۲۷۱۰۷

۳ر جمادی الاولیٰ ۱۴۰۲ھ

محترم ومکرم ذوالشرف والکرم حضرت مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی
دامت برکاتہم !

بعد سلام مسنون کے عرض اینکہ میں حضرت والا کی دعا سے
خیر وعافیت سے مکان پہنچ گیا۔ اولاً میں حضرت والا کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے
میرے ساتھ حد سے زیادہ اکرام کا معاملہ فرمایا اور احقر کو ہر طرح کی راحت رسانی فرمائی
فجزاکم اللہ، احقر حضرت والا کی ملاقات کو ایک نعمت غیر مترقبہ جانتا ہے، احقر آپ
کے اخلاق اور علم وتقویٰ سے کافی مستفیض ہوا، اور اخیر میں حضرت والا نے جو نماز
باجماعت کی پابندی کی نصیحت فرمائی وہ زندگی بھر یاد رہے گی، دعا فرمائیے اللہ
احقر کو صفات حمیدہ سے متصف فرمائے۔

آج کی ڈاک سے الرشاد ملا، واقعی آپ کا یہ رسالہ انمول موتیوں کا ایک
خزانہ ہے۔ آپ کا ہر مضمون قابل استفادہ اور اس کی زبان بھی معیاری اور اس
زمانے میں ایسے رسائل جو ایک جماعت نکالتی ہے وہ پورا کام بلکہ اس سے اچھا آپ
تنہا کر رہے ہیں۔ ذالك فضل اللہ یوتی من یشاء انشاء اللہ یہ رسالہ دن بدن
مزید ترقی کرے گا۔ میں بھی اس کے لئے کوشش کر رہا ہوں، میں نے اپنے جامعۃ الرشاد
کے قیام میں طلبہ کو خوش اخلاق اور نماز کا پابند پایا۔ اور صبح کا منظر تو ابھی تک میرے
سامنے ہے کہ چھوٹے چھوٹے طلبہ جلدی جلدی اٹھ کر قرآن کی تلاوت شروع کر دیتے
ہیں۔ اور ایک بات اور دیکھی جس کی طرف سب کو توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ صحت پر کافی
زور دیا جاتا ہے آپکے اساتذہ کرام کو بھی احقر نے حد سے زیادہ خلیق پایا اور بھائی شکیل
کو اور تمام اساتذہ کرام کو سلام۔ آپکے مضامین کو میں انشاء اللہ گجراتی میں منتقل کرنے
کی کوشش کرونگا۔ دعا فرمائیے۔

احقر غلام محمد وستانوی

محترم ومکرم مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہٗ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج گرامی!

ماہنامہ الرشاد بنام محمد ابراہیم (فرزند دلبند) موصول ہوا۔ دلی مسرت حاصل ہوئی۔ فقیر نہ صرف آپ سے واقف ہے بلکہ آپ کی دینی وعلمی حیثیت اور مساعی جمیلہ کا قدردان ہے۔

یہ بات معلوم کر کے آپ کو مسرت حاصل ہوگی کہ احقر نے سیرت صحابہ کرامؓ پر متعدد کتابیں لکھی ہیں جن میں درج ذیل کتب شائع ہو چکی ہیں۔

(۱) سیرت شہید وفا حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ

(۲) سیرت شہید راہ حق حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما

(۳) سیرت ابو تراب رضی اللہ عنہ

(۴) سیرت امام زین العابدین علی بن الحسین علیہ وعلیٰ آبائہ السلام

۵، انفاق فی سبیل اللہ

میں نے اپنی کتابوں کے سلسلہ کا نام نور وہدایت رکھا ہے۔

محترم!

جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ صحابہ کرام آسمان ہدایت کے تارے ہیں جو ہر دم اور ہر آن روشن ہیں۔ یہ ملت کی بدنصیبی ہے کہ ان ستاروں کی موجودگی کے باوجود یہ امت تاریکیوں میں بھٹک رہی ہے۔ اس احساس کے تحت میں نے صحابہ کرامؓ کی پاکیزہ زندگیوں پر کتابوں کی تالیف کا بیڑا اٹھایا ہے۔ الحمدللہ ملت کے خواص وعوام نے اس سلسلہ کو بے حد پسند فرمایا۔ اور فقیر کی دلجوئی وہمت افزائی کی۔ ان کے مطالعہ کے بعد یہ بات آپ پر واضح ہوگی کہ میری کتابیں تحریکی اور انقلابی رنگ لئے ہوئی ہیں۔ اور ادب کی چاشنی ان کے اندر موجود ہے۔

محترم مولانا! میری دلی تمنا ہے کہ میری ان کتابوں کا عربی اور فارسی ترجمہ شائع ہو جائے تو بہتر ہے۔

فارسی تراجم

ایران کے انقلاب کے بعد صحابہ کرام کی سیرت کو فارسی زبان میں پیش کرنا امت مسلمہ پر فرض عین ہے ورنہ شیعیت کے سیلاب کا مقابلہ کرنا آسان نہیں ہوگا۔ ایران کا انقلاب اپنے جلو میں علمی و نظریاتی مباحث کو سامنے لا رہا ہے۔ اور اس وقت اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ خلفائے راشدین، اصحاب بدر واحد، اصحاب الشجرہؓ عشرہ مبشرہؓ، ازواج مطہرات کی پاکیزہ سیرت پر فارسی میں کتابیں شائع کی جائیں۔

اگر جامعۃ الرشاد اس کام کا بیڑا اٹھائے تو میں اپنی کتابیں جامعہ کے نام وقف کردونگا کہ وہ ان کے عربی و فارسی تراجم شائع کرنے کا انتظار کرے۔

التماس دعا

چھوٹا منہ بڑی بات، میں نے بڑی بڑی باتیں لکھدی ہیں، ورنہ آپ حضرات کے سامنے میں کیا اور میرا علم کیا؛ خدمت گرامی میں عاجزانہ درخواست کرتا ہوں کہ کہ بندہ کے حق میں دعا فرمائیں کہ جس کام کا بیڑا اس نے اٹھایا ہے تادم زیست اس پر قائم رہے اور موت اس حالت میں آئے کہ قلم ہاتھ میں ہو اور کاغذ پر سیرت صحابہؓ کے نقش ونگار ہوں۔ جواب کا منتظر ہوں۔

فقط خادم

ابن عبدالشکور

کوائف جامعۃ الرشاد

۲۱ ر ۲۲ ر ۲۳ ر فروری کو دار المصنفین اعظم گڈھ میں ایک سیمینار ہوا تھا جس میں ملک اور بیرون ملک کے متعدد اہل علم نے شرکت کی تھی اس سلسلہ میں بغیر کسی تحریک کے ذاتی تعلق، محبت اور ذرہ نوازی کی بنا پر ضلع کے باہر کے جو قابل ذکر اہل علم راقم الحروف سے ملنے جامعۃ الرشاد آئے ان میں مولانا مفتی عتیق الرحمن صاحب، مولانا قاضی سجاد صاحب، مولانا زین العابدین صاحب میرٹھی، مولانا تقی الدین صاحب ندوی، اور ضیاء الحسن فاروقی، سید احمد صاحب انصاری، ڈاکٹر مشیر الحق صاحب، مفتی محمد ظہور صاحب، مولانا غلام احمد دستانوی گجرات، جامعہ ام القری کے ایک استاد عبد الوہاب ابو سلیمان صاحب، استاذ الاساتذہ حضرت سید سلیمان ندوی صاحبؒ کے صاحبزادے ڈاکٹر سید سلمان ندوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں، یوں تو سبھی حضرات کی ملاقات اور ان کی محبت سے مسرت ہوئی مگر عزیزی سلمان کو تقریباً تیس برس پہلے اس وقت دیکھا تھا جب ۱۳-۱۴ برس کے بچے تھے اور آج ایک بزرگ کی صورت میں دیکھکر استعجاب و مسرت کی عجیب کیفیت پیدا ہوئی، وہ جس خلوص و محبت سے ملے اس کا قلب پر بے حد اثر ہے اور ان کو دیکھ کر بے اختیار سید صاحب کی یاد تازہ ہوگئی اور آنکھوں سے آنسو نکل پڑے، بات چیت سے ان کی علمی لیاقت کے ساتھ سید صاحب جیسا توازن دیکھ کر مزید مسرت ہوئی، عربی، اردو، فارسی کے ساتھ وہ انگریزی زبان پر پورے طور پر قادر ہیں اور اسلامیات کے ہر موضوع پر ماشاء اللہ تیار نظر آئے اور بات چیت میں سید صاحبؒ کا سنجیدہ علمی وقار و انداز دیکھ کر دل

باغ باغ ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ عزیز موصوف کو تا دیر سلامت رکھے۔ اور ملت اسلامیہ کو ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچے۔

ڈاکٹر مولانا محمد نعیم صدیقی کی سالانہ آمد کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے وہ جبتک یہاں رہے بلا ناغہ مدرسہ آتے رہے اور ایک دن انھوں نے مدرسہ کے تمام اساتذہ اور طلبہ اور مدرسہ کے ہمدردوں کی ایک پر تکلف دعوت کی اور پھر مدرسہ کے اساتذہ وطلبہ نے بھی اظہار تشکر کے طور پر انکی دعوت کی جس میں شہر کے بھی دوور جن سے زیادہ ممتاز حضرات نے شرکت کی انھوں نے اس دعوت میں اور باتوں کے ساتھ یہ اعلان کیا کہ اساتذہ کا ایک اضافہ ان کی طرف سے کر دیا جائے اور اس اضافہ کے سلسلہ میں مدرسہ کے بجٹ میں جو اضافہ ہوگا وہ اپنی جیب خاص سے پورا کریں گے۔ نیز اپنے ذاتی پیسے سے انھوں نے مسجد میں تین پنکھے بھی لگوائے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس خلوص اور دینی محبت کے صلہ میں انھیں دین و دنیا میں ہر طرح کی عافیت عطا فرمائے اور ہر طرح کی ترقیات سے نوازے۔

۲۷، ۲۸، ۲۹ فروری اور یکم مارچ ۱۹۸۲ء کو جو بین الاقوامی تبلیغی اجتماع ہمارے ضلع اعظم گڈھ کے ایک گاؤں بیری ڈیہہ میں ہوا تھا اس میں جامعۃ الرشاد نے بھی علیحدہ اپنے دو کیمپ لگائے تھے ایک میں طلبہ اور دوسرے میں اساتذہ وغیرہ تھے طلبہ اور اساتذہ نے اجتماع سے بڑی حد تک فائدہ اٹھایا اور دور سے آئے ہوئے مہمانوں کی خدمت بھی کی اور تبلیغ میں عملی حصہ لینے کا جو رواج کچھ دنوں سے کم ہو گیا تھا، بحمد اللہ اس میں اضافہ ہوا۔ اس اجتماع کے تاثرات کا ذکر رشحات کے صفحات میں آچکا ہے۔

آہ مولانا محمد ثانی مرحوم مولانا محمد ثانی کے سانحۂ ارتحال کی افسوس ناک خبر اخبارات کے ذریعہ ناظرین الرشاد کو مل چکی ہوگی۔ مگر مولانا محمد ثانی کی موت اس طرح کی موت نہیں تھی جس طرح کی موت کی خبریں روزانہ اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں ان کی موت محض ایک عالم، ایک ندوی، ایک مظاہری اور حسنی خاندان کے ایک فرد کی موت نہیں ہے بلکہ ایک عالم باعمل ایک سچے مومن اور ایک خاموش مخلص کام کرنے والے کی موت ہے۔ جس نے دین کا کام ذاتی کام کی طرح شوق سے کیا۔ مگر اپنے کام کو انھوں نے ضرورت سے زیادہ نہ اہمیت دی اور نہ داد وتحسین کی خواہش نے ان کے اندر کوئی مصنوعی صورت پیدا ہونے دی اور نہ انھوں نے خارجی سہاروں کے ذریعہ اپنی حیثیت بڑھانے کی کوشش کی جب بھی ملاقات ہوتی تھی ان کی سادگی اور نیک نفسی اور فطری منکسر المزاجی کا قلب پر اثر پڑتا تھا۔ اس دور میں اس طرح کے افراد مشکل سے پیدا ہوتے ہیں۔

علمی لیاقت کے ساتھ عموماً انتظامی صلاحیت بہت کم جمع ہوتی ہے مگر ان کے انتقال کے بعد یہ علم ہوا کہ وہ کئی مدرسوں کے ناظم و سرپرست بھی تھے، یوں تو انھوں نے اپنی کئی تصانیف یادگار چھوڑی ہیں مگر خاص طور پر ماہنامہ رضوان کے ذریعہ انھوں نے عورتوں میں جو اصلاحی کام کیا ہے وہ اپنی جگہ پر بجائے خود بڑا قیمتی ہے خدا کرے ان کے بعد بھی یہ مفید کام جاری رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی خوبیوں کے بدلے ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ خاص طور پر مولانا سید

ابو الحسن ندوی مدظلہ کے لئے مولانا محمد الحسنی مرحوم کے بعد قلب کو پاش پاش کر دینے والا یہ دوسرا عظیم حادثہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو صبر و رضا کے جس درجۂ علیا پر فائز فرمایا ہے اس سے نہ صرف ان کو بلکہ ان کے پسماندگان کو بھی تسکین ملے گی ۔ ہم ان حضرات کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

ایک عالم کی وفات | ہمارے ضلع اعظم گڈھ میں مختلف مسلک اور مکتب فکر کے تقریباً دو درجن قابل ذکر عربی مدرسے ہیں۔ ان میں اہل حدیث حضرات کے اب کئی مدرسے ہو گئے ہیں۔ مگر ایک زمانہ میں مشرقی اضلاع میں ان کا سب سے ممتاز ادارہ مدرسہ فیض عام مئو تھا اسی مدرسہ کے ایک مدرس مولانا محفوظ الرحمٰن صاحب فیضی کے ذریعہ یہ افسوسناک خبر ملی کہ ۲۵ فروری ۸۲ء کو فالج کے حملہ کے نتیجہ میں مولانا محمد احمد صاحب ناظم مدرسہ کی وفات ہو گئی، انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

راقم الحروف کو مولانا کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ مولانا اکابر کی بعض ایسی خوبیوں کے مالک تھے کہ اب وہ خوبیاں ناپید ہوتی جا رہی ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی انکی تواضع اور منکسر المزاجی اور دیانت داری تھی۔ ہم چھوٹوں سے بھی وہ اس طرح ملتے تھے کہ گویا وہ چھوٹے ہیں اور ہم بڑے ہیں۔ دیانت و امانت کا حال یہ تھا کہ مدرسہ کے ایک ایک پائی کا حساب اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ مدرسہ سے معلوم نہیں کوئی معاوضہ لیتے تھے یا نہیں۔ مگر قصبہ مئو میں گھر نہیں بلکہ کوٹھی ہوتے ہوئے وہ مدرسہ کے ایک کمرہ میں رہتے تھے۔ اسی میں ۵۰ - ۶۰ سال کی مدت گزار دی اور مدرسہ کی کوئی چیز وہ اپنی ذات کے لئے کبھی استعمال نہیں کرتے تھے۔ مدرسہ فیض عام کی نظامت کے ساتھ انھوں نے اہل قصبہ کی مدد سے ایک مسلم انٹر کالج بھی قائم کیا جس کے وہ شروع سے اخیر تک منیجر رہے۔ عربی مدرسہ کی ذمہ داری کے ساتھ ایک انٹر کالج کی نیجری خود ایک زبردست صلاحیت اور عوام کے غیر معمولی اعتماد کی دلیل ہے اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو ان کی ان خوبیوں کے صلہ میں اپنے جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔

ایک صاحب خیر کی وفات | البعث الاسلامی کے ذریعہ یہ افسوسناک خبر ملی کہ کویت کے ایک صاحب خیر عبدالرزاق الصالح صاحب کا انتقال ہو گیا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ سنہ ۶۲ء میں جامعۃ الرشاد کا قیام عمل میں آیا اس کے قیام سے تقریباً ایک سال پہلے جب اس کا خاکہ ذہن میں بننے لگا تو ایک خط راقم الحروف نے ڈاکٹر عبداللطیف کو کویت لکھا جو مجھ سے معارف کے مضامین کی وجہ سے واقف تھے، میں نے لکھا کہ اعظم گڈھ شہر میں ایک مدرسہ قائم کرنا چاہتا ہوں آپ اس کے لئے دعا کریں ان سے کوئی مالی مطالبہ نہیں کیا تھا مگر انھوں نے تین قسطوں میں نہ صرف ڈھائی ہزار روپئے بھیجے بلکہ کویت کے چالیس اہل خیر کی ایک لسٹ بھی بھیجی اور ہدایت کی کہ ان کو خط لکھے جائیں۔ ان سب حضرات کو خط لکھا گیا جس کے نتیجہ میں کئی حضرات نے مدرسہ کی مدد بھی کی۔ انھیں میں ایک عبدالرزاق الصالح صاحب بھی تھے انھوں نے پہلی بار غالباً تین ہزار روپئے کا چک بھیجا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ ڈاکٹر صاحب کی وجہ سے روپیہ بھیج رہا ہوں ورنہ ادارہ کے پیڈ پر بسم اللہ نہیں لکھی گئی ہے اس لئے مجھے نہیں بھیجنا چاہئے تھا چنانچہ انہی کی تنبیہ کے بعد پیڈ پر بسم اللہ چھپوانا شروع کیا گیا۔ دوسرے سال پھر خطوط روانہ کئے گئے تو ڈاکٹر صاحب کے علاوہ موصوف نے پھر چھ ہزار روپے بھیجے اور یہ سلسلہ کئی سال تک جاری رہا۔

سنہ ۸۴ء میں ہمارے نمائندہ کی حیثیت سے مولانا انعام الحق صاحب کویت گئے تو اس موقع پر بھی سب سے زیادہ تعاون شیخ عبدالعلی المطوع اور شیخ عبدالرزاق الصالح مرحوم نے کیا اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان کے جذبہ خیر کو قبول فرمائے اور انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے۔

نئی کتابیں

(۱) **مقالات سیرت** - صفحات ۲۲۰ کتابت وطباعت عمدہ
(۲) **خطبہ حجۃ الوداع** - " ۴۶ " " " "

شائع کردہ:۔ شعبۂ دعوت وارشاد - ادارہ تحقیقات اسلامی
اسلام آباد - پاکستان

(۱) یہ سیرنبوی کے مختلف ۸ پہلوؤں پر تقریباً ۱۵ حضرات کے مضامین کا مجموعہ ہر مضمون سنجیدہ اور تحقیقی ہے جیساکہ مرتب نے لکھا ہے ان مضامین میں سیرت کے واقعات کی تفصیل کے بجائے اس میں اختصار سے کام لیاگیاہے کہ اس مشینی دور کا مشغول انسان بھی مختصر وقت میں سیرت نبوی کا مطالعہ کرسکے۔ اس حیثیت سے ادارہ تحقیقات کی یہ کامیاب پیش کش ہے۔

مقالات کے عنوانات سے ہی پتہ چل جاتاہے کہ سیرت کے ہر پہلو پر کچھ نہ کچھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ مگر شمائل نبوی کی مزید تفصیل کی ضرورت تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی جلوت کے پہلو کی جتنی تفصیل مقالہ نگار حضرات نے کی ہے اتنی آپ کی خلوت کی تفصیل نہیں کی ہے، حالانکہ جو چیز آپ کو دوسرے انبیاء اور راہنماؤں سے ممتاز کرتی ہے اس میں آپ کی خلوت کی زندگی کی خاص اہمیت ہے۔ عبدالواحد ہالے پوتا صاحب نے شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جو عبارت نقل کی ہے اس میں تیسری چوتھی خصوصیت یعنی روحانیت اور جبرائیلیت کی مزید تفصیل کی ضرورت تھی۔ پھر آپ کی دعوت کی تاثیر کا ذکر بھی ضروری تھا اور دعوت کے ساتھ دعا کے پہلو پر بھی مستقل ایک مقالہ کی ضرورت تھی۔

پاکستان میں اسلامی نظام یا نظام اسلامی کے بجائے نظام مصطفیٰ کی جو اصطلاح چل پڑی ہے اس سے شرک فی التوحید کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ اور معنوی لحاظ سے بھی یہ کچھ صحیح نہیں ہے۔ مولانا عبدالقدوس ہاشمی صاحب کے مقالہ میں "نابادگار زمانہ" کا لفظ اچھا نہیں معلوم ہوا۔ رسول دینی کے مقالہ

میں مقالہ نگار صاحب نے سورہ انعام کے رکوع ۹ کو پیش نظر نہیں رکھا ورنہ مقالہ نگار کی مشروط فہرست میں کچھ اور انبیاء اور رسولوں کے ناموں کا اضافہ ہو جاتا۔ قرآن میں ۲۶ انبیا کا نام بنام ذکر ہے اور ان میں سے ۱۸ انبیاء کا ذکر سورہ انعام کے رکوع ۹ میں ہے۔ ان کے ذکر میں قرآن نے اجتبیناھم وھدینٰھم کے بعد اولٰئک الذین آتیناھم الکتاب والحکم والنبوۃ بھی کہا ہے یعنی کتاب اور حکم کی نسبت ان سب حضرات کی طرف کی ہے

بہرحال یہ مقالات ہر پڑھے لکھے آدمی کے مطالعہ کے لائق ہیں اور اسے ہر کتب خانہ میں موجود ہونا چاہیئے۔

(۲) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبۂ حجۃ الوداع ایک عالمی منشور ہے جس سے بہتر عالمی منشور نہ تو مرحوم لیگ آف نیشن پیش کر سکی ہے اور نہ موجودہ اقوام متحدہ کا منشور اس کا بدل ہو سکتا ہے۔ محمد میاں صدیقی نے آپ کا پورہ خطبہ نقل کر کے اسکا اردو ترجمہ کر کے اس کی مختصر تشریح بھی کر دی ہے جس سے اردو داں طبقہ آسانی سے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔

یوم نحر کے دن آپ نے مجمع سے سوال کر کے جواب ارشاد فرمائے تھے ان میں عجیب تاثیر معلوم ہوتی ہے اگر ان سوالات کے ساتھ وہ فقرے جو اس خطبہ میں آئے ہیں آجاتے تو اس کی تاثیر میں اور زیادہ اضافہ ہو جاتا۔ اور تھوڑی تلاش اور کی جاتی تو اس کے کچھ اور ٹکڑے بھی مل جاتے۔ بہرصورت یہ ایک مفید چیز ادارہ نے پیش کی ہے۔ خطبہ نقل کرنے سے پہلے جو تمہیدی باتیں مرتب نے چند صفحات میں لکھی ہیں وہ بھی بہت

فارم نمبر ۴

بیان بابت ملکیت اخبار و دیگر تفصیلات

۱۔ مقام اشاعت ۔ رشاد نگر اعظم گڈھ

۲۔ وقفہ اشاعت ۔ ماہانہ

۳۔ پرنٹر کا نام ۔ مجیب اللہ ندوی
قومیت ۔ ہندوستانی
پتہ ۔ جامعۃ الرشاد رشاد نگر اعظم گڈھ

۴۔ پبلشر کا نام ۔ مجیب اللہ ندوی
قومیت ۔ ہندوستانی
پتہ ۔ جامعۃ الرشاد رشاد نگر اعظم گڈھ

۵۔ اڈیٹر کا نام ۔ مجیب اللہ ندوی
قومیت ۔ ہندوستانی
پتہ ۔ جامعۃ الرشاد رشاد نگر اعظم گڈھ

۶۔ ملکیت ۔ مجیب اللہ ندوی برائے جامعۃ الرشاد رشاد نگر اعظم گڈھ۔ ہندوستانی

میں مجیب اللہ ندوی اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم اور یقین کے مطابق درست ہیں۔

مجیب اللہ ندوی ۔ سنہ ۱۹۸۲ء

(۱) اقبالیات
(۲) اقبال اور مغربی فکر

(۱) ایڈیٹر پروفیسر آل احمد سرور صفحات ۳۷ ناشر اقبال انسٹی ٹیوٹ کشمیر یونیورسٹی سری نگر

(۲) پروفیسر وحید الدین صفحات ۱۷ اقبال انسٹی ٹیوٹ۔

حکومت کشمیر نے کئی سال ہوئے کشمیر یونیورسٹی کے احاطہ میں ایک نیا شعبہ اقبال انسٹی ٹیوٹ پروفیسر آل احمد سرور صاحب کی سرکردگی میں کھولا ہے اور بڑی فراخ دلی کے ساتھ اس نے اس کی شاندار عمارت بنوادی ہے اور کئی لائق اہل علم اور اہل قلم اس ادارہ سے منسلک ہیں۔ اس ادارہ نے اب تک کئی اچھے سیمینار کر ڈالے ہیں۔ اقبال کے آباؤ اجداد کا مرز بوم کشمیر تھا اس لئے ان کا حق تھا کہ ان کے شایان شان ایک ادارہ اس نام سے قائم ہو "اقبالیات" ایک سالانہ ڈائجسٹ یا رسالہ ہے جو اس کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ جس میں تقریباً ۲۲ عنوانوں پر مختلف حضرات نے اقبال کے کلام اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر سنجیدہ مضامین لکھے ہیں۔ اور تقریب قریب ہر مضمون قابل مطالعہ ہے۔ خاص طور پر پروفیسر آل احمد سرور، جگن ناتھ آزاد اور غلام رسول ملک مفتی جلال الدین کے مضامین لائق مطالعہ ہیں۔ البتہ بعض حضرات خاص طور پر اسلوب احمد انصاری صاحب وغیرہ سوچتے انگریزی میں ہیں اور لکھتے اردو میں ہیں اس لئے ان کی عبارت اردو زبان پر ایک بوجھ محسوس ہوتی ہے۔ نہ جانے یہ حضرات شبلی، حالی یا ڈاکٹر عبد الحق کا انداز اختیار کرنے میں کیوں جھجک محسوس کرتے ہیں۔ بہرحال اقبال انسٹی ٹیوٹ کی یہ علمی کوشش لائق ستائش ہے۔

(۲) اقبال اور مغربی فکر پروفیسر وحید الدین صاحب کے دو توسیعی لکچر کا مجموعہ ہے جو انہوں نے اقبال انسٹی ٹیوٹ میں دیئے تھے۔ پہلا لکچر اقبال گوئٹے اور نٹشے پر ہے اور دوسرا لکچر اقبال کے فلسفیانہ افکار کی تشکیل میں مغربی فکر کا حصہ ہے۔ ان لکچروں سے اقبال کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو اور ان کے بعض اشعار کے سمجھنے میں اس سے یقیناً مدد ملے گی۔ اقبال انسٹی ٹیوٹ نے توسیعی لکچر کا یہ سلسلہ قائم کر کے اپنی کارکردگی کو مزید قابل ستائش بنا دیا ہے۔
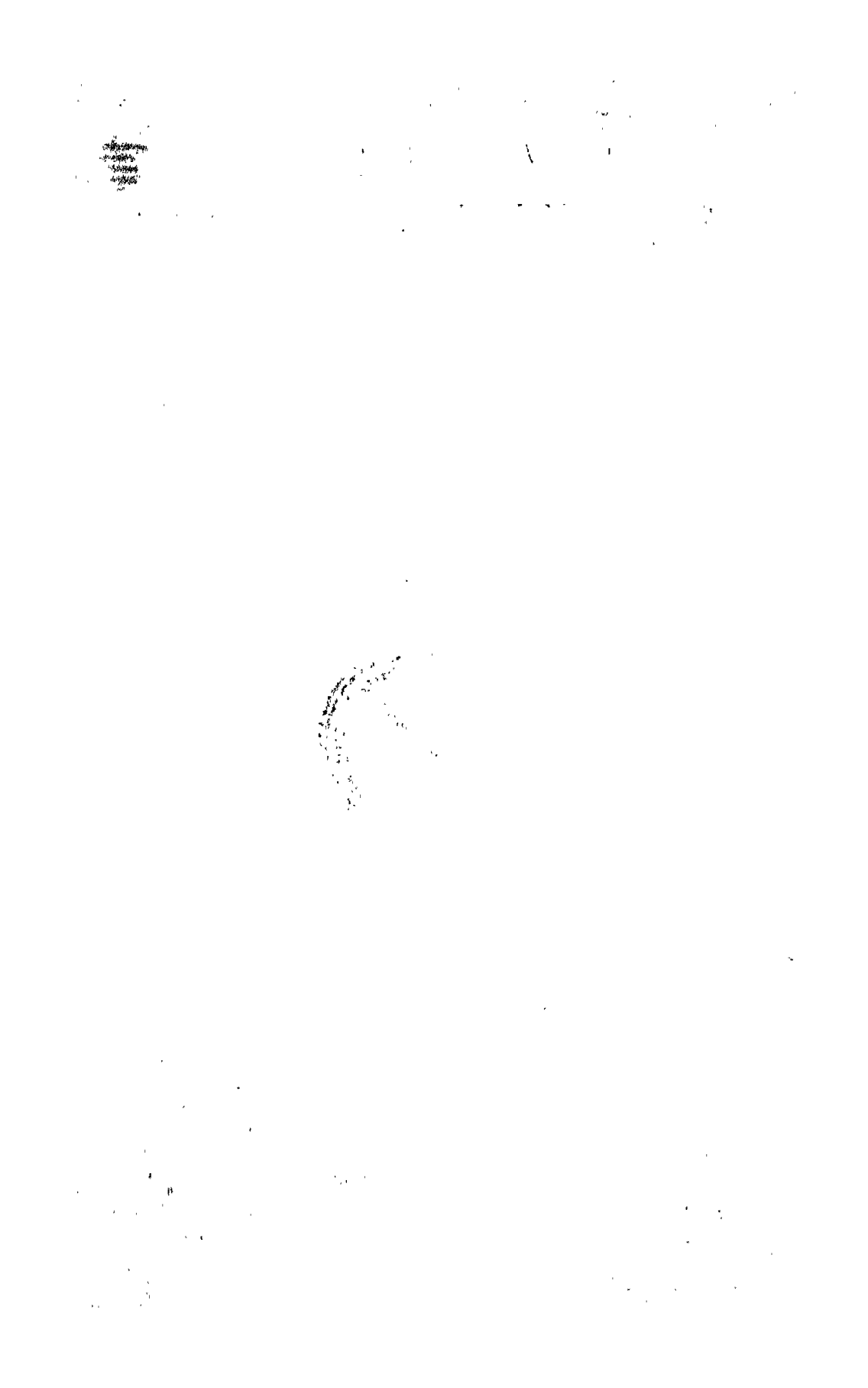
Regd. No.33937/81 U. P.R. I

Phone- 461

MONTHLY-JAMEATUR RASHAD

Azamgarh U.P.

ماہنامہ
الرشاد
مجیب اللہ ندوی

دارالتالیف والترجمہ کی تصانیف

عبادت وخدمت

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہٗ

اس رسالہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور عام انسانوں کی خدمت بھی عبادت ہے اور اس پر اسی طرح اجر و ثواب ملتا ہے جس طرح فرض عبادات پر ملتا ہے۔ اگر فرض عبادات کے اہتمام کیساتھ ہمارے اندر عام انسانوں کی خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہو جائے تو نفرت و حقارت کے بہت دبیز پردے ہٹ جائیں گے اور اسلام سے عام انسانوں کے دلوں میں ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۵۶، قیمت ۵۰ پیسے

دینی مدارس اور انکی ذمہ داریاں

یہ محترم مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد کی ان تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو طلبہ اساتذہ، منتظمین مدارس اور عربی مدارس کے ذمہ داروں کے سامنے کرتے رہے ہیں یہ تقریریں اور تحریریں درد و اثر میں ڈوبی ہوتی ہیں، ان میں بعض تقریروں کو محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہٗ نے اپنے تائیدی نوٹ کے ساتھ الفرقان میں شائع فرمایا اور شیخ الحدیث حضرت مولانا ذکریا صاحب مدظلہٗ العالی نے ایک بڑے مجمع میں پڑھوا کر سنوایا اور فرمایا کہ اسے ہر استاذ اور طالب علم کو پڑھنا چاہیے۔ سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۱۰۰ قیمت ۵۰۔۱ روپیہ

اسلامی تعلیم

حصہ اول، دوم، سوم، چہارم

بچوں کو اسلامی مسائل ذہن نشین کرانے کیلئے اردو زبان میں درجنوں رسالے لکھے گئے ہیں مگر اس رسالہ کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے، اور مسائل ایسے آسان طریقہ سے سمجھایا گیا ہے کہ بچے اسے قصہ کہانی کی کتاب کی طرح دلچسپی و شوق سے پڑھتے ہیں۔ چار حصوں میں تمام ضروری مسائل آگئے ہیں۔

سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ قیمت حصہ اول ۱۲؍، دوم ۲۵ پیسے، سوم ۳۰ پیسے، چہارم ۵۰ پیسے

تبع تابعین حصہ اول

مرتب مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہٗ

کتاب میں اکابر تبع تابعین کا مفصل تذکرہ ہے شروع میں مصنف کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے جس سے اسلام کی ابتدائی دو صدی کے دینی، تہذیبی اور سیاسی تاریخ کا علم ہو جاتا ہے

مولوی مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے نشاط پریس ٹانڈہ میں چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ سے شائع کیا

سالانہ چندہ	جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان	سالانہ چندہ
ہندوستان سے 20/-	ماہنامہ	ممالک غیر سے
چندہ ششماہی 12/-	الرشاد	بارہ ڈالر امریکی
قیمت فی پرچہ 2/-	جامعہ	12/-

جلد ۲ | مئی ۱۹۸۲ء مطابق شعبان المعظم ۱۴۰۲ھ | شمارہ ۱۶۵

فہرست مضامین

مجلس ادارت

مولانا مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے نشاط پریس ٹانڈہ میں چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد رشاد نگر۔ اعظم گڈھ سے شائع کیا

رشحات

آج سے چند سال پہلے یہودیوں نے مسجد اقصیٰ میں آگ لگادی تھی جس پر ساری دنیا کے مسلمان بلبلا اٹھے تھے۔ اس کے بعد مسلسل یہودی بیت المقدس کی اصل ہیئت کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ ادھر جلد ہی انہوں نے مسجد عمر کے سلسلہ میں بھی یہی حرکت کی۔

سوال یہ ہے کہ دنیا میں اس وقت قریب قریب ایک ارب مسلمان زندہ ہیں اور ساری دنیا میں یہودیوں کی تعداد دو کروڑ سے زیادہ نہیں ہے اور فلسطین میں ان کی تعداد چالیس پچاس لاکھ ہے اور چاروں طرف سے عرب حکومتوں سے وہ گھرے ہوئے ہیں پھر ان کو اتنی جرأت کیسے ہو جاتی ہے کہ وہ ایسے مجرمانہ اقدام مسلسل نہ صرف فلسطین کے اندر کرتے جا رہے ہیں بلکہ قریب کے تمام ملکوں کا کچھ نہ کچھ حصہ اپنے قبضہ میں کر رکھا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ امریکہ کی پشت پناہی کی بنا پر ان کو ایسا کرنے کی جرأت ہوتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ عربوں کی کئی حکومتیں امریکہ کے زیر اثر ہیں اور کئی روس کے زیر اثر ہیں۔ مگر کیا وجہ ہے کہ عربوں کی پشت پناہی میں یہ ممالک اتنے آگے نہیں جاتے جتنا کہ یہودیوں کی پشت پناہی میں آگے جاتے ہیں۔ روس کو عام طور پر عربوں کا دوست سمجھا جاتا ہے مگر وہ بھی عربوں کی حمایت میں زبانی ہمدردی کی حد سے کبھی آگے نہیں گیا۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے وہ یہ کہ یہودی محض امریکہ، برطانیہ، فرانس اور روس کے سہارے ہی یہ جرأت نہیں کر رہے ہیں بلکہ اپنی سائنس اور ٹکنالوجی کی غیر معمولی صلاحیت، صنعت و حرفت کی ترقی اور جسمانی محنت کی وجہ سے ان کا جو دنیا پر اثر

ہے اس کی بنا پر وہ یہ جرأت کرتے ہیں۔ اور امریکہ و روس اور یورپ ان کی پشت پناہی پر مجبور ہیں۔ یہودیوں کے مقابلہ میں عربوں کے پاس یہودیوں سے کئی گنا زیادہ مادی وسائل ہیں مگر ان کے پاس نہ سائنس و ٹکنالوجی کی صلاحیت ہے اور نہ صنعت و حرفت کی ترقی ہے۔ اور نہ وہ جسمانی محنت کے عادی ہیں۔ ان کے پاس جو کچھ ہے وہ مانگے کا ہے۔

دوسری چیز جس نے یہودیوں کو اس طرح کی مجرمانہ حرکتیں کرنے پر جری کر دیا ہے وہ عربوں کا آپسی اختلاف ہے۔ یہ اختلاف صرف ان کی حکومتوں کے درمیان ہی نہیں ہے بلکہ ہر ملک کے عوام و حکمراں طبقہ میں بھی موجود ہے۔ یہ اختلاف نہ ہوتا تو اخوان کے مجاہدین نے اسرائیلی حکومت کو ۱۹۵۱ء میں ختم کر دیا ہوتا مگر افسوس کہ شاہ فاروق کی ناپاک سازش کی وجہ سے یہ کوشش ناکام ہو گئی۔ اور پھر ناصر نے روس کی دوستی میں اپنی ساری طاقت اسرائیل کے بجائے اخوان المسلمین کے مخلص کارکنوں کے مٹانے میں لگا دی۔ گویا اس طرح روس نے اسلامی عناصر کو ختم کر کے یہودیوں کی مدد کی اور اسلامی نشأۃ ثانیہ کو پاش پاش کرنے کی کوشش کی۔ اس وقت ضرورت اجتماعی جلسوں اور تجویزوں کی نہیں ہے بلکہ یہودیوں کو اگر عرب شکست دینا چاہتے ہیں تو ان کو اپنے اندر ایک طرف ایمان و یقین کی پختگی اور اتحاد و اتفاق پیدا کرنا ہوگا تو دوسری طرف سائنس و ٹکنالوجی میں اپنے آپ کو بڑھانا ہوگا۔ اس کے ساتھ پیسہ کی ریل پیل نے نہ صرف عرب خواص بلکہ عوام کو بھی تعیش میں مبتلا کر دیا ہے وہ محنت و مشقت سے بالکل دور ہو گئے ہیں۔ ان کو اس لحاظ سے بھی اپنے اندر زبردست تبدیلی کرنے کی ضرورت ہے ان چیزوں کے بغیر اسرائیل کو اس کی مجرمانہ حرکتوں سے نہ تو اقوام متحدہ روک سکتی ہے اور نہ خود عرب حکومتیں۔ عرب ملکوں میں مصر قدرے ترقی یافتہ اور فوجی اعتبار سے مضبوط ہے اور اسی طاقت و مضبوطی اور سیاسی تدبر کی وجہ سے اس نے اسرائیل کو نہر سوئز سے بے دخل کر کے کیمپ ڈیوڈ معاہدہ پر مجبور کر دیا۔ یہ معاہدہ دوسری عرب حکومتوں کے لئے چاہے جتنا بھی قابل اعتراض ہو مگر صدر سادات کا یہ ایک غیر معمولی کارنامہ ہے۔ دشمن صلح پر اسی وقت آمادہ ہوتا ہے جب وہ فریق ثانی کو اپنا مد مقابل سمجھتا ہے۔ کمزور کی بات نہ اس سے پہلے سنی گئی ہے اور نہ اس وقت سنی جائے گی۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

حال ہی میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں ڈاکٹر شمیم صاحب نے ایک مقالہ "اردو ادب پر ذرائع ابلاغ کا اثر" کے عنوان پر پڑھا تھا جس میں انہوں نے صحافت اور ریڈیو و سینما کو اردو ادب کے ابلاغ کا سب سے بڑا ذریعہ قرار دیا ہے۔ (قومی آواز۔ ۱۴ اپریل ۱۹۸۲ء)

ادھر چالیس برس کے اندر ترقی پسندوں اور ان سے متاثر مصنفین نے یہ مہم چلا رکھی ہے کہ اردو زبان سے اخلاقی اثرات کو کھرچ کر پھینک دیا جائے۔ اور اخبار و سینما اور ریڈیو جیسے سطحی ذرائع ابلاغ کو اردو و ادب کی ترقی و ترویج کا سب سے بڑا ذریعہ قرار دیا جائے۔

ایک مدت سے اردو اخبار صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ ہندوؤں اور سکھوں کی بڑی تعداد پڑھتی چلی آئی ہے۔ سینما بینی ایک عام چیز بن گئی ہے ریڈیو ہر گھر میں پہنچ گیا ہے۔ مگر ان اخبار پڑھنے والوں، سینما دیکھنے والوں اور ریڈیو سننے والوں میں سے کتنے لوگ ہیں جو اپنے بچوں اور بچیوں کو اردو زبان پڑھاتے ہیں۔ پنجاب میں جب ہندی و پنجابی کا جھگڑا چل رہا تھا تو جواہر لال نہرو نے کہا تھا کہ دونوں فریق ہندی و پنجابی کے لئے جھگڑ رہے ہیں، مگر یہ لڑائی اردو اخبار کے ذریعہ ہوتی ہے تو کیا اخبار کی کثرت نے ان کو اور ان کی نسل کو اردو داں بنا دیا؟ ریڈیو اور سینما مسلمانوں کے ساتھ ہندو اور سکھ بھی دیکھتے ہیں مگر بول چال کے علاوہ ان میں ایک آدمی بھی اپنے گھر میں اپنے بچوں کو اردو نہیں پڑھاتا۔ اس صورت حال میں یہ چیزیں اردو و ادب کے لئے سب سے بڑے ذرائع ابلاغ کیسے قرار پا سکتی ہیں؟ اردو کا سب سے بڑا ذریعہ ابلاغ وہ آزاد مکاتیب ہیں جن میں ابتدا سے اردو زبان پڑھائی جاتی ہے۔ اور اس کا ذریعہ وہ مدارس ہیں جن کا ذریعۂ تعلیم اردو ہے۔ وہ مذہبی کتابیں ہیں جو لاکھوں کی تعداد میں چھپتی اور بکتی ہیں۔ وہ اخبار اور ناولوں کی طرح پڑھ کر ردی نہیں بنا دی جاتیں۔ بلکہ پڑھنے والے انہیں اپنی الماریوں کی زینت بنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ ایک صدی پہلے جب یہ سطحی ذرائع ابلاغ نہیں پیدا ہوئے تھے تو یہی کتابیں اردو زبان

کو گھر گھر پہنچاتی رہی تھیں ۔ مولانا اسماعیل شہید کی تقویۃ الایمان، مولانا خرم علی بلہوری کی نصیحۃ المسلمین مولانا کرامت علی جونپوری اور مولانا سخاوت علی کی راہ نجات اور مفتاح الجنۃ جتنی تعداد میں چھپیں اور بکیں اتنی شاید ہی کوئی اردو زبان کی کتاب چھپی اور بکی ہوگی ۔ ڈپٹی نذیر احمد کی توبۃ النصوح اور بنات النعش سے زیادہ ان کا ترجمۂ قرآن پاک چھپا اور بکا ۔ شبلی، حالی، ذکاءاللہ اور مولوی اسماعیل میرٹھی کی کتابوں کے ذریعہ اردو زبان کی جتنی ترویج ہوئی اس سے کون انکار کرسکتا ہے ۔ صرف حالی کی "مسدس حالی" لاکھوں کی تعداد میں چھپ چکی ہے ۔ اس دور میں آج مولانا تھانوی رح کی بہشتی زیور اور مولانا زکریا صاحب مدظلہ کی فضائل کی کتابیں جتنی تعداد میں چھپتی اور بکتی ہیں دوسری کتابیں کم ہی چھپتی اور بکتی ہیں ۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتابیں صرف مسلمان پڑھتے ہیں ۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اسے مسلمان ہی پڑھتے ہیں مگر اردو اخبارات اور ناولوں کے پڑھنے والے بھی غیر مسلم خال خال ہی رہ گئے ہیں ۔ وہ بھی مسلمان ہی پڑھتے ہیں ۔

اخلاق سلف

ابو عبداللہ انطاکی رح فرماتے ہیں کہ جو شخص اعمال میں خلوص پیدا کرنا چاہے اور ساتھ ہی ساتھ لوگوں کا بھی دل میں خیال رکھے (یعنی ریا و سمعہ کا)، تو وہ شخص محال امر کا طالب ہے ۔ اس لئے کہ اخلاص ایسا پانی ہے جس سے دل کو زندگی حاصل ہوتی ہے اور ریا اس کیلئے موت ہے (تو پھر ان دونوں کا اجتماع کیسے ممکن ہے ۔

ابن سباط رح فرماتے ہیں، میں نے جب بھی اپنا محاسبہ کیا تو معلوم ہوا کہ میں محض ریا کار ہوں ۔ حسن بصری رح فرماتے ہیں، جس نے محفل میں اپنے آپ کو برا کہا اس نے اپنی تعریف کی اور یہ ریا کی علامت ہے ۔

عبداللہ بن مبارک رح فرماتے ہیں، ایک آدمی خانہ کعبہ کا طواف کرتا ہے اور اہل خراسان کو دکھلاتا ہے ۔ لوگوں نے پوچھا کیونکر، آپ نے فرمایا، وہ دل سے یہ پسند کرتا ہے کہ خراسان والے کہیں "فلاں شخص مکہ میں سعی اور طواف کے لئے مجاور رہا ہے ۔ اسے یہ عمل مبارک ہو ۔

سورۂ توبہ

اور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(مولوی قاری عبد الرحمٰن صاحب چمپارنی استاذ شعبۂ تجوید جامعۃ الرشاد)

"تسمیہ یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرآن شریف کی ایک آیت ہے اور صرف سورتوں کے درمیان فصل پیدا کرنے کیلئے قرآن شریف کے اندر تحریر کی گئی ہے۔ یوں تو اس کا پڑھنا ہر کام کے شروع میں مسنون اور باعث خیر و برکت ہے مگر قرآن شریف کی تلاوت کرتے وقت ہر سورہ کے شروع میں خواہ وہ سورہ ابتدائے قرأت میں ہو یا درمیان قرأت میں ہو ضروری ہے۔ البتہ سورہ توبہ یا برأت کے شروع میں چونکہ بسملہ درج نہیں ہے اس لئے اس ترک کے بارے میں حفاظ و قراء روایتی طور پر جو شدت اپنا رہے ہیں۔ اس کے پیش نظر یہ مناسب اور ضروری معلوم ہوا کہ اصولی طور پر اس مسئلہ کی حتی الامکان وضاحت کر دی جائے تاکہ اسکے ترک و اختیار کی صحیح نوعیت معلوم ہو جائے..

قرآن پاک کی تلاوت شروع کرتے وقت جس طرح استعاذہ یعنی اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم کا پڑھنا شرط ہے اسی طرح ابتدائے سورہ کے لئے بسملہ کا پڑھنا بالاتفاق بہت ضروری ہے۔ البتہ بین السورتین بعض قراء کے نزدیک ترک بسملہ بھی ثابت ہے۔

فن قرأت کی اصطلاح میں ایک سورہ کو ختم کرکے بلا وقف دوسری سورہ شروع کرنے کو بین السورتین کہتے ہیں۔ اور اگر ختم سورہ پر وقف کرکے دوسری سورہ یا وہی سورہ شروع کی گئی ہے تو اس کو ابتدائے تعذیر کہیں گے۔ اس صورت میں بسملہ پڑھنے میں کسی کا اختلاف نہیں۔ یہ حکم عام سورتوں سے متعلق ہے، اگر بین السورتین میں دوسری سورہ، سورہ توبہ ہو تو وقف اور وصل دونوں صورتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ترک بسملہ پر اجماع ہے۔ مولانا قاری حفظ الرحمٰن صاحب سابق صدر مدرس شعبہ تجوید دارالعلوم دیوبند حاشیہ تسہیل الفرقان میں لکھتے ہیں۔

"اگر بین السورتین میں دوسری سورہ، سورہ براءت ہو تو بسم اللہ بالاتفاق کسی کے نزدیک ثابت نہیں اس سے وقف یا وصل یا سکتہ کرنا چاہئے"[1]

ہاں اگر کوئی شخص اسی سورہ سے قرأت شروع کرے تو اس کو بطور برکت بسملہ پڑھنے کی اجازت ہے۔ مگر بعض لوگ اس صورت میں بسملہ کے بجائے ایک تراشیدہ عبارت اعوذ باللہ من النار الخ جو قرآن شریف کے بعض نسخوں کے حاشیہ پر لکھی رہتی ہے پڑھا کرتے ہیں اور بسملہ پڑھنے کو ناجائز وحرام سمجھتے ہیں، حالانکہ بعض مستند روایات وآثار اور آئمہ سلف سے اس کا جواز بلکہ اس پر ان کا تعامل بھی ثابت ہوتا ہے (جیساکہ امام سخاوی کی صراحت کا آگے ذکر آرہا ہے)

یہ عجیب اتفاق ہے کہ فن تجوید کی وہ تمام کتابیں جو آجکل مدارس میں داخل درس ہیں ان میں یہی بات بیان کی گئی ہے اور قرا وحفاظ اس پر شدت کے ساتھ عامل بھی ہیں۔ عوام کے اندر بھی یہ بات اس قدر ذہن نشیں کرادی گئی ہے کہ ان کے ذہن سے اس بات کو نکالنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوگیا ہے۔

آئندہ صفحات میں ہم اس مسئلہ پر قدرے تفصیل کے ساتھ گفتگو کریں گے اور دلائل کی روشنی میں جائزہ لیں گے کہ اس مسئلہ کی صحیح نوعیت کیا ہے۔ اس وضاحت کے بعد توقع ہے کہ طالبین حق کو اس سے اطمینان ہو جائے گا اور خواہ مخواہ شدت اختیار کرنے والوں کے لئے یہ بات قابل غور ضرور بن جائے گی۔

اس اختلاف کی بنیاد چونکہ اس سورہ کے شروع میں بسملہ کے نہ لکھے جانے پر ہے اس لئے

---

[1] حاشیہ تسہیل الفرقان برمکمل جمال القرآن مؤلفہ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ ص۳۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہ متعین کر لینا زیادہ مناسب ہوگا کہ کن اسباب و علل کی بنا پر اس کے شروع میں بسملہ نہیں لکھی گئی۔ اور اس مسئلہ کا تعلق ائمہ تجوید سے زیادہ ہے یا ائمہ تفسیر سے۔

علمائے تفسیر نے اس کی مختلف علتیں بیان کی ہیں اور صاحبِ حاشیہ الجمل[1] کے قول کے مطابق اس سلسلہ میں کل پانچ اقوال بیان کئے گئے ہیں[2] اختصار کے ساتھ یہاں صرف ان کا ترجمہ اور خلاصہ لکھا جاتا ہے۔

(۱):- زمانہ جاہلیت میں عرب والوں کی عادت میں یہ بات شامل تھی کہ جب ان کے اور کسی دوسری قوم کے درمیان کوئی معاہدہ ہوتا اور پھر اس معاہدہ کو توڑنے کے لئے خط بھیجتے تو اس پر بسملہ نہیں لکھتے اور یہ سورہ مشرکین کے معاہدہ کو توڑنے کیلئے نازل ہوئی اس لئے اس کے شروع میں بسملہ نہیں لکھی گئی۔

(۲):- ابن عباسؓ نے حضرت علی سے اس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ بسملہ آیت رحمت ہے اور سورۂ برأت غضب کے ساتھ نازل ہوئی ہے پس اس میں امان نہیں، اسی کے مثل مبرد اور سفیان بن عیینہ سے بھی مروی ہے "ان البسملة رحمة وبراءة نزلت بالسيف ليس فيها امان"

(۳):- خارجہ اور ابو عمرو وغیرہ کا قول ہے کہ عہد عثمانی میں صحابہ کے اندر یہ اختلاف ہو گیا کہ آیا سورہ انفال اور سورہ برأت دونوں ایک ہی سورہ ہیں یا دونوں دو مستقل سورتیں ہیں۔ پس جو ایک سورہ کے قائل تھے ان کی رعایت کر کے بسملہ نہیں لکھی گئی اور جو دو سورہ کے قائل تھے ان کا خیال کر کے دونوں کے درمیان کچھ فاصلہ چھوڑ دیا گیا اور دونوں فریق راضی ہو گئے۔

(۴):- عبداللہ ابن عباسؓ نے خود جامع قرآن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے اس کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ سورہ انفال اوائل ہجرت میں اور یہ سورہ برأت اواخر ہجرت میں نازل ہوئی۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ جو آیات قرآنی نازل ہوتیں ان کے بارے میں آپ فرما دیتے کہ ان کو فلاں سورہ میں فلاں موقع پر رکھو۔ ان آیات کے متعلق جنہیں اب سورہ توبہ یا برأت کہا جاتا ہے آپ نے کوئی تصریح نہیں فرمائی کہ کس سورہ میں درج کی جائیں جس سے ظاہر

---

[1] علامہ الشیخ سلیمان الجمل [2] حاشیہ الجمل ج ۲ ص ۲۶۱ - حاشیہ جلالین ص ۱۵۳

ہوتاہے کہ یہ مستقل سورہ ہے کسی دوسری سورہ کا جز نہیں، لیکن عام قاعدہ یہ تھا کہ جب نئی سورہ نازل ہوتی تو پہلی سورہ سے جدا کرنے کیلئے بسم اللہ آتی تھی اور اس سورہ کے شروع میں بسم اللہ نہیں آئی، اور عمود و مضمون کے لحاظ سے دونوں میں گہرا اتصال ہے پس میں نے سمجھا کہ یہ مستقل سورہ نہیں بلکہ انفال ہی کا جز ہے۔ لہٰذا اس کے بعد ہی اس کو لکھ دیا گیا۔

اب آیئے ہم علمائے سلف کے آراء و اقوال سے اندازہ لگائیں کہ ان چاروں اقوال میں کس بات کو ترجیح حاصل ہے۔ ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد صاحب جمل فرماتے ہیں۔

والصحیح ان التسمیۃ لم تکتب لان جبریل علیہ السلام ما نزل بہا فی ھذہ السورۃ [1] قالہ القشیری وفی قول عثمان قبض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولم یبین لنا، انہا من دلیل علی ان السورۃ کلہا انتظمت بقولہ وتبیینہ وان براءۃ وحدھا ضمت الی الانفال من غیر عہد من النبی صلی اللہ علیہ وسلم لما عاجلہ من الحمام قبل تبیینہ ذالک وکانتا تدعی القرینتین فوجب ان یجمعا فتضم احدٰھما الی الاخری للوصف الذی لزمھما من الاقتران ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حی [2]

اور صحیح یہ ہے کہ حضرت جبریل اس کے شروع میں بسملہ لے کر نازل نہیں ہوئے اس لئے وہ نہیں لکھی گئی، قشیری بھی اسی کے قائل ہیں اور حضرت عثمان کے قول کا مطلب یہ ہے کہ ہر سورہ حضور کی وضاحت کے بعد درج کی گئی اور صرف سورہ برأت ایسی ہوکر اس کی وضاحت سے پہلے پہلے حضور کی وفات ہوگئی اور دونوں سورتیں ایک ہی شمار کی جاتی رہیں کیونکہ صفت مضمون میں یکسانیت تھی۔ لہٰذا یہ لازم ہوگیا کہ دونوں کو ایک میں ملا دیا جائے۔ یہ کارروائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں عمل میں آئی۔

شیخ اکبر فرماتے ہیں۔

اما سورۃ التوبہ فاختلف الناس فیہ ھل ھی سورۃ مستقلۃ کسائر السور اوھل ھی وسورۃ الانفال سورۃ واحدۃ فانہ لا یعرف کمال السورۃ الا بالفصل

رہی سورہ توبہ تو اس کے بارے میں لوگوں نے اختلاف کیا کہ آیا سورہ توبہ تمام سورتوں کی طرح ایک مستقل سورہ ہے یا یہ اور انفال دونوں ایک سورہ ہیں یہ اختلاف اس لئے ہوا کہ کوئی سورہ

---

[1] اتقان فی علوم القرآن للسیوطی ج ۱ ص ۶۵ - [2] حاشیہ الجمل ج ۲ ص ۲۶۲ -

بالبسملة ولم يجئ هنا فدل على انها من سورة الانفال وهو الاوجه وان كان لتركها وجه وهو عدم المناسبة بين الرحمة والتبرى ولكن ماله تلك القوة بل هو وجه ضعيف [1]

اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی جب تک کہ بسملہ ہر دو سورتوں کے درمیان حد فاصل نہ ہو جاتی اور اس سورہ کے شروع میں بسملہ نہیں آئی پس بسملہ کا نہ آنا اس بات کا ثبوت ہے کہ دونوں ایک ہی سورہ ہے اور یہی توجیہ بہتر ہے اگرچہ اس کے ترک کرنے کی ایک اور وجہ بیان کی جاتی ہے وہ یہ کہ رحمت وغضب کے درمیان مناسبت کا نہ ہونا لیکن یہ وجہ قوی نہیں بلکہ ضعیف ہے

پھر آگے اس وجہ کے ضعیف ہونے کے دو اسباب پیش کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔

ان البسملة موجودة فى اول سورة ويل لكل همزة وويل للمطففين واين الرحمة من الويل

سورہ ویل لکل ہمزہ اور ویل للمطففین کے شروع میں بسملہ موجود ہے اور رحمت کا ویل یعنی ہلاکت سے کیا تناسب۔

مطلب یہ ہے کہ اگر بسملہ مرقوم نہ ہونے کی وجہ رحمت وغضب کے درمیان عدم مناسبت ہوتی تو پھر ویل لکل ہمزہ اور ویل للمطففین وغیرہ سورتوں میں بھی بسملہ نہ لکھی جاتی اس لئے کہ ان کا بھی نزول حالت غضب میں ہوا ہے جبکہ ان کی پیشانی پر بسملہ مرقوم ہے اور بالاتفاق پڑھنا ضروری بھی۔

حکیم الامۃ امام الفقہ والقرأۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:۔

"اور یہ جو حضرت علی سے منقول ہے کہ بسم اللہ امان ہے اور یہ سورہ رفع امن کے لئے آئی ہے سو یہ علت نہیں بلکہ بطور نکتہ کے ایک حکمت ہے" [2]

محمد الامین بن المختار الجکنی الشنقیطی نے بھی اپنی تفسیر "اضواء البیان فی ایضاح القرآن بالقرآن" میں مذکورہ بالا اقوال نقل کرنے کے بعد اپنی جو رائے ظاہر کی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

---

[1] روح المعانی ج ۱۰ ص ۴۱۔ [2] تفسیر بیان القرآن ج ۸ ص ۹۵

قال مقیدہ عفا اللہ عنہ اظهر الاقوال عندی فی هذہ المسئلة ان سبب سقوط البسملة فی هذہ السورة هو ما قاله عثمان لابن عباس

مقیدہ فرماتے ہیں کہ تمام قولوں میں سب سے زیادہ ظاہر اور صحیح میرے نزدیک اس مسئلہ میں کہ اس سورہ میں بسملہ ساقط ہونے کا سبب کیا ہے وہ ہے جو حضرت عثمان نے ابن عباس سے فرمایا

فقد اخرج النسائی والترمذی وابوداؤد والامام احمد وابن حبان فی صحیحه والحاکم فی المستدرک وقال صحیح الاسناد[1]

اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس روایت کے بارے میں لکھا ہے "وهو المعتمد"[2]۔ یعنی یہی روایت قابل اعتماد ہے ان تمام روایتوں میں جو اس سلسلہ میں بیان کی جاتی ہیں۔

اوپر ذکر کئے گئے اقوال سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ سورہ توبہ کے شروع میں بسملہ نہ لکھے جانے کا اصل سبب وہ نہیں ہے جو حضرت علی نے فرمایا، اس کا تعلق اگر ہے تو صرف ایک نکتہ سے ہے، اصل سبب وہی ہے جو حضرت عثمان سے مروی ہے۔ اس موقع پر غیر متعلق نہ ہوگا اگر مولانا امین احسن اصلاحی کی مندرجہ ذیل عبارت بھی نقل کر دی جائے بلکہ مذکورہ بالا اقوال کو ہم سے تائید ہی ملے گی۔ مولانا لکھتے ہیں۔

> علمائے تفسیر نے اس کی مختلف توجیہیں کی ہیں، سب سے زیادہ قابل قبول توجیہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ان دونوں سورتوں میں عمود و مضمون کے لحاظ سے نہایت گہرا اتصال بھی ہے اور مقصد و غایت کے اعتبار سے فی الجملہ انفصال بھی .... اشتراک انفصال کے ان دونوں پہلوؤں کو ممیز کرنے کے لئے حکمت الٰہی مقتضی ہوئی کہ یہ سورہ سابق سورہ سے بالکل الگ بھی نہ ہو لیکن فی الجملہ نمایاں اور ممتاز بھی ہے۔ بسم اللہ نہ لکھے جانے سے یہ دونوں پہلو بیک وقت نمایاں ہوگئے۔ بسم اللہ جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں دو سورتوں کے درمیان علامت فصل کی حیثیت رکھتی ہے اس علامت فصل کے نہ ہونے سے

---

[1] اضواء البیان ج ۲ ص ۳۸۲۔ [2] فتح الباری ج ۸ ص ۲۳۵

دونوں کا معنوی اتصال نمایاں ہوگیا اور ساتھ ہی اس کے علحدہ وجود
نے اس کو علحدہ نام دے دیا جس سے اس کی امتیازی خصوصیت بھی
سامنے آگئی [1]

اوپر کی تشریح سے مذکورہ توجیہوں کی حیثیت کے بارے میں علمائے اسلام کی رائے معلوم ہوگئیں، اب آیئے فریقین کے وہ دلائل ملاحظہ کریں جن کے سہارے وہ بسملہ کے جواز یا عدم جواز کے قائل ہیں ـــــ جو لوگ عدم جواز کے قائل ہیں ان کی دلیل حسب ذیل ہے۔

بسملہ آیت رحمت ہے اور ابتدائے برأت آیت غضب، اور آیت رحمت کا غضب کے ساتھ جمع کرنا جائز نہیں۔ جیسا کہ امام الشاطبی کا قول ہے

ومَهمَا تَصِلهَا او بَدأتَ براءةً ❊ لِتَنزِيلِها بالسيفِ لستَ مبَسملَا

یعنی جب کسی سورہ سے سورہ برأت کا وصل کیا جائے یا سورہ برأت سے ابتدا کی جائے تو اس سورہ کے غضب کے ساتھ نازل ہونے کے سبب بسملہ نہیں پڑھنا چاہئے [2]

لیکن یہ توجیہ جیسا کہ ہم واضح کرچکے ہیں مرجوح ہے تو پھر اس سے استدلال کرنا کیسے صحیح ہوسکتا ہے؟

جو لوگ بسملہ کے جواز کے قائل ہیں ان کی دلیل وہی ہے جو حضرت عثمان سے مروی ہے یعنی یہ کہ اس سورہ کی حیثیت جزء سورہ کی ہے پس اس کا حکم وہی ہوگا جو دیگر سورتوں کے اوساط و اجزاء کا حکم ہے وعلة الجواز عنده كون البراءة سورة غير مستقلة فحينئذ الحكم عنده كحكم اوساط السور اور اجزائے سورہ سے قرأت شروع کرنے پر حدیث نبوی كل امر ذی بال لم يبدأ ببسم الله فهو اقطع (یعنی کوئی بھی قابل ذکر کام اگر بسم اللہ کرکے شروع نہ کیا جائے تو وہ ناقص ہے) کے تحت بسملہ پڑھنا بالاتفاق باعث خیر و برکت ہے یہ اور بات ہے کہ اس وقت چونکہ بسملہ غیر قرآن ہونے کی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس کے ترک کی بھی اجازت ہے کیونکہ قرأۃ بسملہ کا محل ابتدائے سورہ ہے درمیان سورہ نہیں لیکن نفس ابتدا کے بارے میں چونکہ حدیث بسملہ وارد ہے اس لئے اسکا پڑھنا ہی اولی ہے۔

---

[1] تفسیر تدبر قرآن ج ۳ ص ۱۱۳۔ [2] شاطبیہ ص ۱۴ تنویر المرأت ص ۷۔ حواشی مرضیہ ص ۴۔ البرہان شرح حفظ البیان ص ۱۷ و دیگر کتب تجوید

پس جس طرح سورتوں کے درمیان کی آیتوں سے قرأت شروع کرتے وقت بسملہ برکت کیلئے پڑھتے ہیں اسی طرح ابتدائے برأت سے قرأت شروع کریں تو بھی پڑھنا چاہئے ــــ مولانا سعید احمد صاحب پالنپوری امداد الفتاوی کے حاشیہ میں لکھتے ہیں :۔

"تلاوت کے شروع میں بسم اللہ برکت کیلئے پڑھی جاتی ہے لہٰذا جس طرح برأت کے درمیان کی آیتوں سے تلاوت شروع کرتے وقت بسم اللہ کو برکت کیلئے پڑھتے ہیں اسی طرح برأت کے شروع سے تلاوت شروع کریں تو بھی برکت کے لئے بسم اللہ پڑھنا چاہیئے" [۱]

امام سخاوی جمال القراء میں فرماتے ہیں :۔

اشتهر ترك التسمية فی اول براءة وروی عن عاصم التسمية اولها وهو القياس ، لان اسقاطها اما لانها نزلت بالسيف اولانهم لم يقطعوا بانها سورة مستقلة بل من الانفال ولا يتم الاول لانه مخصوص بمن نزلت فيه ونحن انما نسمی للتبرك الا تری انه يجوز بالاتفاق بسم الله الرحمٰن الرحيم وقاتلوا المشركين الآية ونحوها ، وان كان الترك لانها ليست مستقلة فالتسمية فی اول الاجزاء جائزة ، وروی ثبوتها فی مصحف ابن مسعود رضی الله عنه [۲]

برأت کے شروع میں بسملہ نہ پڑھنا مشہور ہے حالانکہ امام عاصم سے اس کے شروع میں بسملہ پڑھنا مروی اور قیاس بھی اسی کا مقتضی ہے اس لئے کہ اس کے شروع میں تسمیہ کا ساقط کرنا یا تو اس وجہ سے ہوگا کہ یہ سورہ غضب کے ساتھ نازل ہوئی ہے اس وجہ سے کہ اس کو مستقل سورہ نہیں بلکہ انفال ہی سے شمار کیا گیا ہے ۔ اور پہلی وجہ پوری نہیں اترتی اس لئے کہ ترک بسملہ ان لوگوں کے لئے لازم ہونا چاہئے جن کے بارے میں وہ نازل ہوئی ہے اور ہم تسمیہ صرف برکت کے واسطے پڑھتے ہیں کیا تم نہیں دیکھتے کہ وقاتلوا المشركين الآية اور اس جیسی آیتوں کے شروع میں بسملہ پڑھنا بالاتفاق ثابت ہے

---

[۱] حاشیہ امداد الفتاوی ص ۳۴۳ [۲] روح المعانی ج ۱۰ ص ۴۲ ۔

اور اگر تسمیہ کا ترک اس لئے ہے کہ وہ مستقل سورہ نہیں ہے تو اجزائے سور کے شروع میں بسملہ جائز ہے۔ اور اس کا ثبوت حضرت عبد اللہ ابن مسعود رضہ کے مصحف میں مروی ہے۔

وفی الاتقان نقل صاحب الاقناع ان البسملة ثابتة لبراءة فی مصحف ابن مسعود رضی اللہ عنہ[1]	صاحب اقناع نے نقل کیا ہے کہ مصحف ابن مسعودؓ میں سورہ برأت کے شروع میں بسملہ لکھی ہوئی تھی۔

یہ عبارت نہایت واضح طور پر مسئلہ زیر بحث کی تشریح کر رہی ہے مگر علامہ آلوسی نے اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے۔

ذھب ابن مناذر الی قراءتھا فی الاقناع جوازھا، والحق استحباب ترکھا حیث لم تکتب فی الامام ولا یقتدی بغیرہ واما القول بحرمتھا ووجوب ترکھا کما قالہ بعض المشائخ الشافعیة فالظاھر خلافہ ولا اری فی الاتیان بھا بأسا لمن شرع فی القراءة من اثناء السورة[3]	ابن مناذر بسملہ پڑھنے کیطرف گئے ہیں اور اقناع میں اسکو جائز قرار دیا گیا ہے اور حق یہ ہے کہ اسکا نہ پڑھنا مستحب ہے بایں وجہ کہ وہ امام[2] میں نہیں لکھی گئی ہے اور اس کے علاوہ کی اقتدا نہیں کی جا سکتی، رہا اس کی حرمت اور وجوب ترک والا قول تو اس کے متعلق بعض مشائخ شافعیہ کا قول ہے وہ یہ کہ ظاہر اس کے خلاف ہے اور اس شخص کیلئے جو درمیان سورہ سے قرأت شروع کرے اس پر بسملہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

لیکن اس عبارت میں اس کی تصریح نہیں ہے کہ شروع قرأت ابتدائے برأت میں ترک بسملہ مستحب ہے یا درمیان قرأت ابتدائے برأت میں، اگر پہلی صورت مراد لی جاتی ہے تو علامہ موصوف

---

[1] اتقان فی علوم القرآن ج ۱ ص ۱۰۱ [2] عہد عثمانی میں آرمینیہ اور آذر بائجان کی جنگ کے موقع پر قرآن کی مختلف قراتوں میں لوگوں میں سخت اختلاف ہو گیا تھا۔ جس کی وجہ سے خلیفۂ وقت نے صرف ایک قرأت (لغت قریش) کے مطابق متعدد نقلیں کرائی تھیں اور ایک ایک نقل ہر مشہور مقام پر بھیجوا دی تھی۔ اور جو نقل خود اپنے پاس رکھ لی تھی اس کا نام [illegible] امام تھا ۱۲ [3] روح المعانی ج ۱۰ ص ۴۲

کی رائے امام سخاوی کی عبارت سے متعارض معلوم ہوتی ہے مگر اس سے ہمارے دعوی پر کوئی اثر نہیں پڑتا کیونکہ ہم صرف جواز بسملہ کے قائل ہیں نہ کہ وجوب بسملہ کے، مگر تعجب ضرور ہے کہ موصوف نے ترک بسملہ کو مستحب کیسے قرار دے دیا۔ موصوف کی رائے اپنی جگہ پر کتنا ہی اہم سہی مگر یہ بات کسی طرح دل کو نہیں لگتی کہ قرآن شریف میں اس کا نہ لکھا جانا اس بات کی شہادت ہے کہ اس کا نہ پڑھنا ہی مستحب ہے۔ جبکہ ہر عمل سے پہلے اس کے کہنے کا حکم احادیث میں وارد ہے۔ مولانا سعید احمد صاحب لکھتے ہیں :۔

"جو لوگ منع کرتے ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ اس سورہ کے شروع میں بسم اللہ لکھی ہوئی نہیں ہے۔ پس اگر پڑھیں گے تو رسم و اجماع کے خلاف ہوگا لیکن مجوزین کی دلیل قوی ہے "[1]

اور دوسری صورت مراد لینے میں کوئی تعارض ہی نہیں، کیونکہ اس صورت میں خود مجوزین بھی ترک بسملہ کے قائل ہیں۔ بہر حال ان دونوں میں سے کسی بھی صورت میں نفس مسئلہ میں کوئی الجھن نہیں پیدا ہوتی۔ امام سخاوی کی مذکورہ عبارت اس مسئلہ پہ بہت صاف ہے تاہم مزید وضاحت کے لئے حضرت مولانا تھانوی رح کی تحریر نقل کی جاتی ہے۔ مولانا رقمطراز ہیں :۔

جب اس پر بسم اللہ نہ ہونے کی وجہ معلوم ہوگئی کہ احتمال جزئیت سورہ ہے تو ثابت ہوا کہ جو شخص خود سورہ سے قرائت شروع کرے یا اس کے درمیان سے کہیں شروع کرے ان دو حالتوں میں وہ بسم اللہ پڑھے اور جو اوپر سے پڑھتا آتا ہو وہ بدون بسم اللہ اس سورہ کو شروع کر دے، جیسا کہ سب سورتوں کے اجزا کا یہی حکم ہے۔ پس یہ جو آجکل حفاظ نے دستور نکالا ہے کہ پہلی دو حالتوں میں بھی وہ بسم اللہ نہیں پڑھتے بلکہ تینوں حالتوں میں ایک تراشیدہ عبارت اعوذ باللہ من النار الخ پڑھا کرتے ہیں، اس سے اول کی دو حالتوں میں دو بدعتیں لازم آتی ہیں ایک بسم اللہ نہ پڑھنا اور ایک وہ عبارت پڑھنا اور آخری حالت میں ایک بدعت لازم آتی ہے یعنی وہ عبارت پڑھنا پس مجموعہ تین حالتیں

---

[1] حاشیہ امداد الفتاوی ج ا ص ۳۴۳۔

پانچ بدعتوں کا ارتکاب ہوتا ہے۔ جیسا کوئی اور کسی سورہ کے ساتھ یہی
معاملہ کرنے لگے یقیناً وہ مخالف سنت ہوگا۔ خوب سمجھ لو۔[1]

گذشتہ صفحات کے پڑھ لینے کے بعد ایک صالح ذہن کے لئے جواز بسملہ کے باب میں کسی اعتراض یا احساس ناگواری کا کوئی سوال باقی نہیں رہ جاتا ہے تاہم کچھ لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ اس مسئلہ میں جواز اور عدم جواز دونوں طرح کے اقوال ہیں، گو مجوزین کی دلیل قوی ہے مگر ترک بسملہ پر قرا کا اجماع ہو چکا ہے۔ نکرہ میں ہے "واجمع القراء علی ترک البسملۃ فی اول براءۃ سواء ابتدأ بہا اوصلہا بالانفال" اور اجماع کی اہمیت ارباب علم پر مخفی نہیں، اصول کی کتابوں میں بعض مواقع پر "یکفرہ جاحدہ" فرمایا گیا ہے یعنی بعض احکام اجماع ایسے بھی ہیں جن کا منکر کافر ہو جاتا ہے تو کیا یہاں بسملہ پڑھنے کی صورت میں انکار اجماع لازم نہیں آتا؟

اس اعتراض کے جواب کا ایک رخ تو یہ ہے کہ یہ قول جو صاحب نکرہ کا ہے غیر معتبر ہے اس میں شک نہیں کہ اس کے غیر معتبر ہونے کی جو دلیل دی جائے گی وہ ایسی نہیں ہے کہ اس کو بیک نظر مسترد کر دیا جائے۔ ہاں اس بات کو مان لینے میں کوئی تامل نہیں کہ لوگوں نے یہ مشہور کر رکھا ہے کہ ترک بسملہ پر سب کا اتفاق ہے۔ اس سے پہلے امام سخاوی کی عبارت نقل کی جا چکی ہے۔ اس کا متعلقہ ٹکڑا یہ ہے:

اشتہر ترک التسمیۃ فی اول براءۃ	برأت کے شروع میں بسملہ کا نہ پڑھنا مشہور ہے
وروی عن عاصم التسمیۃ اولہا	حالانکہ امام عاصم سے اس کے شروع میں بسملہ
وھو القیاس	پڑھنا مروی ہے اور قیاس بھی اسی کا مقتضی ہے۔

امام عاصم کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، آپ قرا سبعہ جن کے تواتر پر امت اسلامیہ کا اتفاق ہے ان میں ایک ہیں۔ آپ ہی کی قرأت بروایت حفص صدیوں سے مکاتیب و مدارس میں پڑھی پڑھائی جاتی۔ ہم، آپ اور سب انہی کی قرأت پڑھتے ہیں، تو جب خود ان سے اس کے شروع میں بسملہ پڑھنا ثابت ہے تو ترک بسملہ پر اجماع کا دعوی کرنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے،

ثانیاً یہ کہ ہم قرأت جب امام عاصم کی پڑھتے ہیں تو بسملہ کے بارے میں بھی انہی کی پیروی

[1] تفسیر بیان القرآن ج ۸ ص ۹۵

ہم پر لازم ہے دوسرے حضرات کی پیروی کے ہم بالکل مکلف نہیں چاہے ان کا اجماع ہی کیوں نہ تسلیم کر لیا جائے۔

دوسرا رخ اس کے جواب کا یہ ہے جو حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے دیا ہے یعنی یہ کہ یہ مسئلہ فن قرأت کا نہیں اس لئے میرے نزدیک اس میں قاری کا قول حجت نہیں۔ قواعد فقہیہ کا مقتضی میرے نزدیک وہی ہے جو میں نے لکھا۔ (فلنعم ما قیل لکل فن رجال ولکل مقام مقال)

تطبیق کی ایک لطیف صورت اب آخر میں فریقین کے قولوں میں تطبیق کے متعلق ایک سوال جو مولانا تھانوی کی خدمت میں پیش کیا گیا اور مولانا نے جو اس کا جواب مرحمت فرمایا بعینہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔

سوال : عرض ہے کہ جناب نے ترک بسملہ کو جو ابتدائے تلاوت برأت سے ہو اغلاط العوام میں داخل کیا ہے اور مکروہ میں سے ہے واجمع القراء علی ترک البسملۃ فی اول براءۃ سواء ابتدأ بہا او وصلہا بالانفال ایسا ہی شاطبیہ میں ہے۔ لہذا جناب کے قول اور مکروہ کے درمیان جو صورت تطبیق کی ہو تحریر فرما دیں۔

الجواب ! واقع میں ان دونوں میں تطبیق نہیں ہو سکتی مگر یہ مسئلہ فن قرأت کا نہیں اسلئے میرے نزدیک اس میں کسی قاری کا قول حجت نہیں۔ قواعد فقہیہ کا مقتضی میرے نزدیک وہی ہے جو میں نے لکھا۔ واللہ اعلم ——— بعد سطور ہذا ایک وجہ تطبیق کی جو مجھ کو بہت لطیف معلوم ہوتی ہے خیال میں آگئی وہ یہ کہ ابتدا بسورۃ توبہ میں بسملہ پڑھنے کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت ابتدا بمطلق القرأۃ کی، دوسری حیثیت ابتدا بالسورہ کی۔ پس اغلاط العوام میں اول کا اثبات ہے اور مکروہ میں ثانی کی نفی ہے [1] فلا تعارض، واللہ اعلم

اس کو زیادہ واضح طور پر یوں سمجھئے کہ ابتدا بسورۃ توبہ کی دو صورتیں ہیں۔

① ابتدائے قرأت ابتدائے برأت ② درمیان قرأت ابتدائے برأت

پہلی صورت کو ابتدائے حقیقی کہتے ہیں۔ اور دوسری صورت میں اگر درمیان قرأت ختم سورہ انفال پر وقف کر کے برأت سے ابتدا کی جائے تو اس کو ابتدائے تقدیری کہیں گے۔ اگر بغیر وقف کئے وصل ہی کی حالت میں اس سورہ کو شروع کر دیا جائے تو بین السورتین کہتے ہیں۔ مؤخر الذکر دونوں

---

[1] امداد الفتاوی ج ۱ ص ۳۴۳۔

صورتوں میں ترک بسملہ پر اجماع ہے جیساکہ اوپر گذرا۔

اس بات کو ذہن میں رکھیئے پھر مکررہ کی عبارت پر غور کیجئے۔ صاحب مکررہ کا قول صرف اس قدر ہے کہ ابتدائے براءت میں ترک بسملہ پر اجماع ہے۔ ابتدا کے متعلق کوئی تصریح نہیں کہ آیا یہاں اس سے مراد ابتدائے حقیقی ہے یا تقدیری۔ اور مذکورہ قول صرف اس صورت میں متعارض تھا ہے جب ابتدا سے مراد ابتدائے حقیقی لیا جائے۔ لیکن عبارت جب مطلق ہے تو اس کے اطلاق کو کون مقید کر سکتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہاں بجائے ابتدا حقیقی کے ابتدا تقدیری مراد لیا گیا ہو۔ اور اس صورت میں صاحب کتاب اپنے قول میں حق بجانب ہیں اور جیساکہ ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ مجوزین بسملہ بھی اس سے متفق ہیں۔

ابتدائے تقدیری مان لینے کی صورت میں اس عبارت کا مطلب یہ ہو جائے کہ کہ سورہ انفال کے ختم پر وقف کر کے سورہ توبہ سے ابتدا کی جائے یا سورہ انفال سے وصل کر کے سورہ توبہ شروع کی جائے ان ہی دونوں صورتوں میں ترک بسملہ پر قرا کا اجماع ہے۔ بخلاف ابتدائے حقیقی کے کہ اس صورت میں بسملہ پڑھنے کی بابت قاری مختار ہے، اگر ابتدائے قرأت کا خیال ہے کہ نفس ابتدا کے بارے میں حدیث بسملہ وارد ہے تو بسملہ پڑھ کر توبہ شروع کرے اور اگر یہ خیال ہے کہ درمیان سورہ قرا کے نزدیک وجوبًا بسملہ کا محل نہیں تو صرف استعاذہ پر اکتفا کرے۔ قال القاری مخیر ان شاء بسمل فی الابتداء وان شاء اقتصر علی التعوذ ۔ واللہ اعلم بالصواب

حضرت احمد زاهد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، حقیقی ادب یہ ہے کہ انسان یہ خواہش نہ کرے کہ مجھ پر کبھی کوئی اعتراض نہ ہو۔ بلکہ کلام الٰہی کی مشابہت سے حتی الامکان بھاگتا رہے۔

(اخلاق سلف)

وحدتِ دین کی تشریح

شاہ ولی اللہؒ، شاہ عبدالقادرؒ، مولانا آزادؒ اور مولانا مودودیؒ

(از مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی)

وحدت دین کے تصور کو امام ولی اللہ الدہلوی کے حجۃ اللہ البالغہ میں مستقل ایک باب میں تفصیل سے بیان کیا ہے، شاہ صاحب نے شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحًا اور ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ (انبیاء ۹۲) سے استدلال فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ اصول دین تمام رسولوں کے ہاں ایک ہی رہے ہیں اور یہ اصول عقائد، توحید، نبوت اور آخرت پر یقین اور تقدیر کا تصور ہیں۔

اسی طرح شاہ صاحب نے یہ بتایا ہے کہ بنیادی نیکیاں، عبادت، پاکی، دعاء تلاوت اور انفاق اور صدق و دیانت بھی تمام دینوں میں مشترک رہی ہیں، البتہ اعمال صالحہ اور عبادات کی شکلیں اور طریقے ہر دور میں مختلف رہے ہیں اور یہ اختلاف ضروری بھی تھا کیونکہ ہر دور میں انسانی طبائع اور انسانی معاشرہ کے بدلتے ہوئے حالات اس اختلاف کا تقاضہ کرتے تھے، جیسے جیسے انسانی معاشرہ ترقی کرتا رہا عبادت کے طریقے میں تکمیلی رنگ پیدا ہوتا رہا۔

اس اختلاف کا اشارہ ان آیات میں کیا گیا ہے۔ لکل جعلنا شرعۃ ومنھاجًا (المائدہ ۴۸) لکل امۃ جعلنا منسکا (الحج ۶۷) یعنی خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے ہر قوم کے لئے شریعت اور منہاج (طریقہ) الگ مقرر کیا ہے،

اختلاف شریعت کا سبب شاہ صاحب نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ نبوت کا تعلق ملت سے

رہا ہے اور خدا تعالیٰ نے جس ملت میں جو نبی بھیجا ہے اور جو شریعت آئی ہے اس میں اس قابلِ اصلاح عبادات کی اصلاح کر دی جاتی ہے اور جو نیکیاں قابلِ قبول ہوتی ہیں انھیں قبول کر لیا جاتا ہے اور جن نیکیوں کے اضافہ کی ضرورت ہوتی ہے ان کا اضافہ کر دیا جاتا ہے (حجۃ اللہ صـ ۱۳۵، ۱۴۲) شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں متعدد مقامات میں اس بات کو بھی صاف کر دیا ہے کہ خدا تعالیٰ نے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو دین بھیجا ہے وہ آخری اور مکمل دین ہے۔ اور اس دین کامل کا نام "الاسلام" ہے۔

اب نجات آخرت اور فلاح دارین حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ "الاسلام" کی پیروی کی جائے، اس کے بغیر نجات کی کوئی سبیل نہیں،

شاہ صاحب نے وحدت دین کی بحث میں اس مسئلہ سے کوئی تعرض نہیں کیا کہ اس عالمگیر دین حق کا نام کیا رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ ہر آسمانی کتاب مقامی زبان میں نازل ہوئی، کوئی کتاب عبرانی میں کوئی سریانی میں اور کوئی یونانی وغیرہ میں، پھر دین واحد (اصول دین) کا ایک ہی نام کیسے ہو سکتا تھا؟

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں انبیاء سابقین کے حالات میں جہاں کہیں اسلام اور مسلم کے الفاظ آئے ہیں شاہ صاحب نے وہاں کبھی اسلام کا لغوی ترجمہ انقیاد و اطاعت کیا ہے اور کبھی اسلام کا ترجمہ لفظ اسلام اور مسلم ہی سے کر دیا ہے، آیت البقرہ اذ قال لہٗ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین میں اسلم منقاد شو اور اسلمت میں منقاد شدم کیا ہے اور آیت کے آخری فقرہ فلا تموتن الا وانتم مسلمون میں نیز دیگر مسلمان شدہ ــــ ترجمہ کیا ہے، حاصل یہ کہ شاہ صاحب نے اس عالمگیر اصولی صداقت کا کوئی نام تجویز نہیں کیا اور نہ اسے ضروری سمجھا۔

متقدمین علماء جلال الدین سیوطی نے ایک رسالہ اس مسئلہ کی تحقیق میں لکھا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام اور مسلم کے عربی الفاظ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ آئے ہوئے دین کامل کے ساتھ خاص ہیں اور مسلم امت محمدیہ کے افراد کا خاص لقب ہے۔

شاہ صاحب کے سامنے یقیناً سیوطی کی یہ تحقیق ہوگی اسی لئے شاہ ولی اللہ صاحب نے

دین واحد کے نام سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

شاہ عبدالقادر صاحب نے سب سے پہلے وحدت دین کے سلسلہ میں اس دین واحد کے نام کی بحث چھیڑی اور اس کا نام "اسلام" تجویز کیا۔

شاہ عبدالقادر صاحب کی تشریح | شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلوی نے آیت البقرہ نمبر ۱۲۸ کے حاشیہ میں یہ الفاظ لکھے ہیں: "دین اسلام ہمیشہ ایک ہے، سب پیغمبر اور سب امتیں اسی پر گذریں وہ یہ کہ جو حکم اللہ بھیجے پیغمبر کے ہاتھ وہ قبول کرنا۔ اب مسلمان ہیں سیدھی راہ پر اور تم (اے یہود و نصاریٰ) اس سے پھرے ہوئے ہو" شاہ صاحب کے اس تشریحی نوٹ سے اور شاہ صاحب نے موضح القرآن میں جو مختلف آیات کا ترجمہ کیا ہے اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شاہ صاحب نے دین واحد کو مفہوم اور معتدی حقیقت کے لحاظ سے اسلام کہا ہے، یعنی عربی میں لفظ اسلام کا جو مفہوم ہے۔ حکم برداری۔ یہی حقیقت ہر دور میں مذہب حق کی رہی ہے۔

شاہ عبدالقادر صاحب نے اپنے ترجمہ میں تقریباً اس کا التزام کیا ہے کہ جن آیات میں انبیا سابقین کے لئے اسلام اور مسلم کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہاں اسلام کا ترجمہ لغوی حکم برداری اور اطاعت گذاری کیا ہے اور جن آیات میں اسلام اور مسلم کے الفاظ دین کامل (دین محمدیؐ) کے لئے بولے گئے ہیں وہاں اسلام کا ترجمہ اسلام ہی کیا ہے۔ غور کیجئے وہ بعض آیات جنھیں اسلام بطور علم بولا گیا ہے۔

(۱) ان الدین عند اللہ الاسلام (آل عمران ۱۹)	دین جو ہے اللہ کے ہاں سو یہی مسلمانی حکم برداری۔
(۲) ورضیت لکم الاسلام دینا (المائدہ ۴)	اور پسند کیا میں نے تمہارے واسطے دین مسلمانی

جن آیات میں اسلام لغوی مفہوم میں بولا گیا ہے ان کی چند مثالیں:

(۳) ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک (البقرہ ۱۲۸)	اے رب! اور کر ہم کو حکم بردار اپنا اور ہماری اولاد میں بھی ایک امت حکم بردار اپنی
(۴) اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین	اس کو کہا اس کے رب نے حکم بردار ہو بولا میں

(البقرہ ۱۳۱) حکم میں آیا جہان کے صاحب کے۔

(۵) واذا یتلی علیھم قالوا آمنا بہ انہ الحق من ربنا انا کنا من قبلہ مسلمین۔ اور جب انکو سنائے کہیں ہم یقین لائے اس پر یہی ہے ٹھیک ہمارے رب کا بھیجا ہم ہیں اس سے پہلے کے حکم بردار۔

(القصص ۵۳)

شاہ صاحب کے ہاں بالعموم اس کا التزام ملتا ہے، بالکلیہ کا دعوٰی راقم السطور نہیں کرسکتا،

مولانا آزاد کے ہاں وحدت دین اردو مفسرین میں مولانا ابوالکلام آزاد نے اس مسئلہ پر بڑی وضاحت سے لکھا ہے، مولانا آزاد نے الفاتحہ کی تفسیر میں لکھا ہے۔

"ابتدا میں لوگ قدرتی زندگی بسر کرتے تھے اور سب اپنی قدرتی سادگی پر قانع تھے پھر نسل انسانی کی کثرت اور معاشی ضروریات کے پھیلاؤ کے سبب اختلافات پیدا ہو گئے اور اختلافات نے ظلم و فساد کی صورت اختیار کرلی، اب ضروری ہوا کہ عدل و صداقت کے لئے وحی الہی کی روشنی نمودار ہو، چنانچہ یہ روشنی نمودار ہوئی، قرآن ان رہنماؤں کو رسول کے نام سے تعبیر کرتا ہے جن کے ذریعہ یہ روشنی نمودار ہوتی ہے۔

پھر فطرت الہی کائنات ہستی کے ہر گوشہ میں ایک ہی ہے اس لئے ضروری تھا کہ یہ ہدایت آسمانی بھی ایک ہی ہو چنانچہ وہ عالم گیر قانون سعادت "ایمان وعمل صالح" کا قانون ہے یعنی توحید الہی اور نیک عملی کی زندگی جو ہر دور میں ایک ہی رہا ہے۔۔۔ اختلاف اگر ہے تو وہ "اصل دین" میں نہیں۔ دین کے فروع و ظہور ہی میں ہے، یہ فروع و ظہور ہر ہر قدم کے معاشرتی حالات اور ذہنی استعداد کے مطابق مقرر کئے گئے۔"

یہ مولانا آزاد کی تشریح کا خلاصہ ہے۔ مولانا آزاد نے "عبادات" کے لئے رسوم و ظواہر کے الفاظ استعمال کئے جو عبادات ضروریہ کی نہایت ہلکی تعبیر ہے اور ان لفظوں سے اسلامی عبادات نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ کی حیثیت محض رسم اور ایک ظاہری چیز کی معلوم ہوتی ہے، شاہ ولی اللہ صاحب نے بنیادی نیکیوں کی شکلوں اور طریقوں کا اختلاف کہا ہے جو بالکل صحیح تعبیر و توجیہ ہے۔

مولانا آزاد نے بھی شاہ عبدالقادر صاحب کی پیروی کی ہے اور دین واحد کے لئے اسلام کا لفظ استعمال کیا ہے، چنانچہ ایک حاشیہ پر لکھتے ہیں — "دین الٰہی کو اسی لئے "الاسلام" کے نام سے تعبیر کیا گیا جس کے معنی اطاعت کرنے کے ہیں۔ (البقرہ صہ ۲۱۳) ایک جگہ لکھتے ہیں — "سعادت اور نجات کی راہ یہ نہیں ہے کہ عبادت کی کوئی خاص شکل یا کھانے پینے کی کوئی خاص پابندی اختیار کرلی جائے بلکہ وہ سچی خداپرستی اور نیک عملی کی زندگی سے حاصل ہوتی ہے"۔ اس جگہ بھی مولانا نے عبادات کے لئے "ظاہری علوم و احکام" کے الفاظ استعمال کئے ہیں، جس سے اسلامی عبادات اور حلال و حرام کے احکام و واجبات کی اہمیت کم ہوتی محسوس ہوتی ہے۔

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں اس بات پر اصرار نہیں کیا کہ جہاں کہیں اسلام اور مسلم کے الفاظ آئے ہیں وہاں ان کا ترجمہ اسلام اور مسلم ہی ہے بلکہ مولانا نے انبیاء سابقین کے حالات میں بولے گئے ان الفاظ کا ترجمہ لغوی اختیار کیا ہے اور کسی جگہ "مسلم" بھی کیا ہے تو بریکٹ میں حکم بردار ضرور لکھ دیا ہے۔

مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی کی تشریحات

مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے "وحدت دین" کے نظریہ پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، مولانا کا انداز بحث یہ ہے کہ دین حق ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور وہ اسلام ہے۔ فرماتے ہیں "مسلم وہ جو خدا کے آگے سر اطاعت خم کردے اور اس کی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کرے، اس عقیدے اور اس طرز عمل کا نام اسلام ہے اور یہی تمام انبیاء کا دین تھا (حاشیہ البقرہ آیت ۱۳۰) مودودی صاحب نے وحدت دین کے الفاظ استعمال نہیں کئے لیکن مطلب وہی ظاہر ہوتا ہے جو مولانا آزاد کے ہاں وحدت دین کی تشریح میں ملتا ہے۔

مولانا اس نظریہ کی وکالت میں اس قدر جوش دکھایا ہے کہ قرآن کریم میں سابق رسولوں اور سابق اہل حق کے بارے میں جہاں کہیں اسلام اور مسلم کا لفظ آیا ہے وہاں اس کا ترجمہ انہی الفاظ سے کیا ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ہر عہد میں دین اور

اہل دین کے لئے عربی کا یہی لفظ مستعمل تھا۔ اس پرجوش ترجمانی میں مودودی صاحب کو اس بات کا بھی خیال نہیں رہا کہ ان کی عبارت سلاست اور فصاحت سے گر گئی ہے اور ترجمانی کی عبارت میں جو معیار سلاست انھوں نے قائم کیا ہے وہ مجروح ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مودودی صاحب کو حسب ذیل آیات میں کسی جگہ مجبور ہو کر قوسین بڑھانے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے اور کسی جگہ اطاعت گذار اور کسی جگہ مطیع اور فرمانبردار کے الفاظ کا اضافہ کرنا پڑا ہے۔

شلاً ــــ حضرت نوح کا ارشاد گرامی ــــ ان اکون من المسلمین (یونس ۷۲) مجھے حکم دیا گیا ہے کہ مسلموں میں شامل ہو کر رہوں۔

حضرت ابراہیم نے اپنی اولاد کو وصیت فرمائی۔ فلا تموتن الا وانتم مسلمون ــ ونحن لہ مسلمون ــ البقرہ ۱۳۱ - ۱۳۳) تم کو موت نہ آئے مگر اس حالت میں کہ تم مسلم ہو۔ اور ہم اسی کے مسلم ہیں۔

حضرت ابراہیم کے متعلق خدا تعالیٰ نے فرمایا ماکان ابراھیم یھودیا و لا نصرانیا و لکن کان حنیفا مسلمًا (آل عمران ۶۷) وہ یکسو مسلم تھا، حضرت ابراہیم و اسماعیل نے دعا فرمائی ــ ربنا واجعلنا مسلمین لك ومن امة مسلمة لك (البقرہ ۱۲۸) اے ہمارے رب ہم کو اپنا مسلم بنا اور ہماری نسل سے ایک امت پیدا کر جو تیری مسلم ہو۔

حضرت لوط کے قصہ میں فرمایا گیا ــ فما وجدنا فیها غیر بیت من المسلمین (الذاریات ۳۶) ہم نے قوم لوط کی بستی میں ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔

حضرت یوسف علیہ السلام دعا کرتے ہیں۔ توفنی مسلما والحقنی بالصالحین (یوسف ۱۰۱) مجھکو مسلم ہونے کی حالت میں موت دے ۔ اسی طرح آیت یونس ۸۴ میں حضرت موسیٰ کا قول اور ملکۂ بلقیس کا قول آیت النمل ۴۴ میں اور حضرت عیسیٰ کا قول المائدہ ۱۱۱ میں ــ ان تمام آیات میں بھی مودودی صاحب نے مسلم

کا ترجمہ تفہیم ج ۳ صہ ۶۴۶ میں مسلم ہی کیا ہے اور اپنے دعوی کو مستحکم کرنے کی کوشش کی ہے۔ مودودی صاحب نے اس تحقیق کو پیش کرتے ہوئے علامہ جلال الدین سیوطی پر نہایت سطحی قسم کی تنقید کی ہے۔ مودودی صاحب علامہ سیوطی کے دلائل کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ علامہ سیوطی رح کے سامنے جب آیت القصص ۵۳ آئی، انا کنا من قبله مسلمین۔ اہل کتاب کے صالح افراد رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر ایمان لاتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ ہم تو پہلے ہی سے مسلم ہیں۔ تو بقول مودودی صاحب کے ۔" وہ خود فرماتے ہیں کہ میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے اور میں نے خدا تعالیٰ سے شرح صدر کی دعا کی"۔ علامہ نے اس کے بعد آیت مذکورہ میں تاویلات کیں ان تاویلات کے بارے میں مودودی صاحب کے خیال میں۔ ان تاویلوں میں اللہ کے عطا کردہ شرح صدر کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا"۔

مودودی صاحب نے آیت مذکورہ کا جو مطلب حاشیہ میں بیان کیا ہے وہ یہ ہے یعنی اس سے پہلے بھی ہم انبیاء اور کتب آسمانی کے ماننے والے تھے"۔ یعنی مودودی صاحب نے حاشیہ میں مسلمین کا لغوی ترجمہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ علامہ سیوطی جو بات کہنا چاہتے ہیں اسے مودودی صاحب نے اس تشریحی فقرہ میں تسلیم کر لیا ہے لیکن صاحب تفہیم کا ایک تحریری مزاج ہے کہ وہ اپنے دعوی کو ثابت کرنے کے زور میں لکھتے چلے جاتے ہیں اور اس جوش و خروش کے عالم میں کسی مقام پر ٹھیر کر یہ نہیں سوچتے کہ میں نے کسی جگہ اپنے دعوی کو خود ہی کمزور تو نہیں کر دیا ؟

سیوطی کی تحقیق یہ ہے کہ الاسلام اور المسلم اصطلاحی طور پر اسی امت کے ساتھ مخصوص ہیں، سابق انبیاء کے لئے یہ لفظ قرآن کریم میں اپنے لغوی مفہوم "فرمانبرداری" میں استعمال کیا گیا ہے اس مفہوم کے لحاظ سے بلا شبہ ہر دور میں دین حق کا نام الاسلام ہی قرار پاتا ہے اور ہر دین حق کا پیرو کار مسلمان ہی کہلانے کا مستحق بن جاتا ہے۔

مودودی صاحب کی یہ ساری بحث بڑی دلچسپ ہے، مرحوم اپنا پورا زور استدلال صرف کرنے کے بعد خود ہی ایک شبہ نقل کرتے ہیں جس کا حاصل یہ ہے،

اس موقع پر یہ شبہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام اور مسلمان عربی زبان کے الفاظ ہیں، یہ الفاظ سابق آسمانی کتابوں میں کیسے استعمال ہو سکتے تھے۔ وہ کتابیں عبرانی، سریانی اور یونانی وغیرہ میں نازل ہوئی ہیں۔" چنانچہ آج بھی یہ کتابیں موجود ہیں، کیا ان میں یہ الفاظ استعمال کئے گئے ہیں؟ مودودی صاحب نے اس کا جواب دیتے ہوئے لکھا ہے:" یہ محض ایک نادانی کی بات ہوگی کیونکہ دراصل اعتبار عربی کے ان الفاظ کا نہیں بلکہ اس معنیٰ کا ہے جس کے لئے یہ الفاظ عربی میں مستعمل ہوتے ہیں۔"

آگے فرماتے ہیں ــــ دراصل جو بات ان آیات (مذکورہ) میں بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے آیا ہوا حقیقی دین مسیحیت یا موسویت یا محمدیت نہیں ہے بلکہ انبیاء اور کتب آسمانی کے ذریعہ آئے ہوئے فرمان خداوندی کے آگے سر طاعت جھکا دینا ہے۔

مودودی صاحب نے اس جواب میں علامہ سیوطی کی تحقیق کو تسلیم کر لیا ہے مگر اس اعتراف کے ساتھ نہیں کہ بے تیر قلم سے پہلے لغزش ہوئی ہے ــــ کیونکہ اس بحث کے آغاز میں مودودی صاحب کا علمی انا یہ بلند بانگ دعویٰ کر چکا ہے: "تعجب ہے کہ بعض بڑے بڑے اہل علم بھی اس حقیقت کے ادراک سے عاجز رہ گئے ہیں۔" (حالانکہ فکر ولی اللہی سے تعلق رکھنے والے اہل علم برابر اپنی کتابوں میں اس کی وضاحت کرتے چلے آرہے ہیں) اس ادعا کے بعد کیسے اس حقیقت کو تسلیم کیا جا سکتا تھا کہ قرآن کریم نے سابق انبیاء کرام اور ان کے متبعین کے بارے میں "مسلم" کا لفظ جہاں کہیں استعمال کیا ہے وہاں اس کا ترجمہ لغوی مفہوم کے لحاظ سے ہی درست ہے جیسا کہ شاہ عبد القادر صاحب نے کیا ہے۔ اور یہ الفاظ "الاسلام"، "المسلمین" بطور اصطلاحی ناموں کے قرآن مجید میں صرف امت محمدیہ کے لئے بولے گئے ہیں۔

مودودی صاحب نے لکھا ہے کہ بقول علامہ سیوطی کے ــــ ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، جب وہ آیت ۵۳ القصص پر پہنچے ــــ اور راقم کہتا ہے کہ مودودی صاحب کا قلم بھی سٹ پٹا گیا جب وہ الصافات آیت ۱۰۳ پر پہنچے۔

فلما اسلما وتله للجبین ــــ اس آیت میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل

کی اس کیفیت ایثار کو بیان کیا گیا ہے جس کے بعد باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کیلئے پچھاڑا اور بیٹے نے برضا و رغبت اپنا سر چھری کے نیچے رکھدیا۔ اس کیفیت تسلیم و رضا کو قرآن نے " اسلما " کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

مودودی صاحبؒ جس طرح حضرت ابراہیم کے قول " اسلمت " البقرہ ۱۳۱) میں یہ ترجمہ کیا ہے " میں مالک کائنات کا مسلم ہو گیا " اسی طرح الصافات میں بھی یہ ترجمہ کرنا چاہئے تھا " پھر جب وہ دونوں مسلم ہوگئے "، لیکن مودودی صاحبؒ ایسا ترجمہ کیسے کر سکتے تھے، کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ابراہیم و اسماعیل قربانی کرنے سے پہلے مسلم نہیں تھے۔ پھر مودودی صاحبؒ نے اس آیت کا کیا ترجمہ کیا؟ غور کیجئے " آخر کو جب ان دونوں نے سر تسلیم خم کر دیا "، یہ " اسلما " کا لغوی ترجمہ ہے۔

حاصل یہ کہ ہمیں حضرت شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ کی قرآن فہمی کو خداداد صلاحیت اور الہامی بصیرت کہنے میں ادنیٰ تامل نہیں ہوتا کیونکہ شاہ صاحبؒ نے قرآن کریم کے ایک ایک لفظ کا برمحل اور موقع کے لحاظ سے مفہوم ادا کیا ہے اور کہیں اپنے ترجمہ کو تضاد کا شکار نہیں ہونے دیا ہے ——— جبکہ مولانا مودودی صاحب جیسا وسیع النظر مترجم و مفسر بھی اپنے ترجمہ یا ترجمانی میں یکسانیت پیدا کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا اور کہیں کہیں مرحوم کی ترجمانی میں تضاد پیدا ہو گیا ہے۔

ادارہ (۱) وحدت دین کے لفظ کے ساتھ بہت سی غلط فہمیاں لپٹی ہوئی ہیں بلکہ ایک زمانہ میں اس نے ایک فتنہ کی صورت اختیار کر لی تھی اس لئے اگر مولانا اس سرخی کے بجائے " الاسلام کا مفہوم " وغیرہ قائم کرتے تو زیادہ بہتر تھا۔

(۲) راقم الحروف کے خیال میں جہاں جہاں لفظ الاسلام الف لام کے ساتھ آیا ہے اس سے مراد بظاہر وہ دین ہی معلوم ہوتا ہے جو تمام انبیاء کا مشترکہ دین رہا ہے۔ جس میں اصول و شرائع دونوں داخل ہیں۔ البتہ جہاں یہ بطور فعل یا اسم فاعل استعمال ہوا ہے، اس کا مفہوم موقع و محل کے لحاظ سے مختلف ہے۔ مولانا قاسمی نے مولانا آزاد کے وحدت دین کے سلسلہ میں جو نرم گوشہ اختیار کیا ہے اس میں کچھ سیاسی ذوق کی ہم آہنگی کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ پھر اصول دین کی وحدت کی جو بات کہی جاتی ہے وہ اس اصل دین کے اعتبار سے صحیح ہے جس کا نزول خدا کی طرف سے انبیاء پر ہوا مگر اس وقت مختلف قوموں کی کتابوں میں اور ان کے علماء کے جو تصورات ان کے بارے میں موجود ہیں۔ وہ کسی طرح وحدت دین کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ توحید، آخرت، اور رسالت کا جو تصور اسلام نے دیا ہے اس سے ان کے تصور توحید، آخرت اور رسالت سے مجموعی طور پر کوئی مناسبت محسوس نہیں ہوتی۔ البتہ اخلاقی تصورات میں وحدت ضرور موجود ہے۔

مولانا امام بخش صہبائی اور ان کی تصانیف

جناب ڈاکٹر سمیع اللہ صاحب استاد ٹریننگ کالج بنارس ہندو یونیورسٹی۔

مولانا صہبائی عربی، فارسی اور اردو کے قابل ذکر شاعر اور عالم تھے۔ اسی کے باوصف اردو کے کئی تذکرہ نگاروں نے ان کا ذکر ہی نہیں کیا ہے اور جن متداول تذکروں میں صہبائی کا ذکر ملتا ہے تو اس سے ان کی شخصیت کے ابعاد کا پوری طرح پتا نہیں چلتا۔ عصر حاضر میں بھی ابھی تک کسی نے صہبائی کو اپنی تحقیق کا موضوع نہیں بنایا ہے اس لئے ان سے متعلق ایک مضمون کی ضرورت اب بھی باقی ہے۔

صہبائی کا آبائی وطن تھانیسر تھا۔ ان کے والد مولانا محمد بخش تھانیسر سے ترک وطن کر کے دلی آئے اور محلہ کوچۂ چیلاں میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ صہبائی کی ولادت دلی ہی میں ہوئی، تاریخ پیدائش کے سلسلہ میں کوئی شہادت موجود نہیں، مولوی کریم الدین نے لکھا ہے "عمر ان کی بالفعل اس سال یعنی ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۷ء) میں قریب چالیس برس کے ہوگی[1] اشپرنگر" اودھ کیٹلاگ" میں ان کی عمر ساٹھ سال بتاتے ہیں[2] اودھ کیٹلاگ ۱۸۵۰ء کی تصنیف ہے۔ گارساں دتاسی ۱۸۵۵ء کے خطبے میں ان کی عمر ساٹھ برس بتاتے ہیں[3]۔ ان مختلف روایات سے ان کا زمانۂ ولادت ۱۷۹۰ء اور ۱۸۰۷ء کے درمیان قرار پاتا ہے لیکن ہمارے نزدیک مولوی کریم الدین کا بیان زیادہ قرین صحت ہے کیونکہ وہ صہبائی کے ملاقاتیوں میں سے تھے۔

والد کی طرف سے صہبائی کا سلسلۂ نسب حضرت عمر فاروقؓ اور والدہ کی طرف حضرت عبدالقادر جیلانی تک پہنچتا ہے۔ ۲ے ان کے حقیقی چچا پیر بخش ایک مشہور طبیب تھے۔ صہبائی کی اولاد میں دو بیٹوں اور ایک بیٹی کا پتا چلتا ہے۔ ان کے ایک بیٹے کا نام عبدالکریم سوز تھا اور دوسرے عبدالعزیز کے نام سے موسوم تھے۔ سوز صاحب دیوان بھی تھے ان کی صاحبزادی تھانیسر میں رہتی تھیں جن کے ایک بیٹے کا نام محمد حمید الدین تھا۔

مولانا صہبائی نے عبداللہ علوی سے فارسی اور مختلف لوگوں سے عربی پڑھی۔ وہ فارسی کے جید عالم تھے۔ مولانا عبدالحیٔ الحسنی کے بقول وہ اپنے عہد کے علم لغت، بیان و بدیع (علم بلاغت) اور فن چیستان گوئی کے مشہور و معروف فضلا میں شمار کیے جاتے تھے۳ے فارسی کے علاوہ انہوں نے عربی اور اردو شعر و ادب کا بھی بڑا اچھا ذوق پایا تھا۔ معاصرین کے درمیان ان کے مرتبے و مقام کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ رام بابو سکسینہ کے بقول قلعہ کے اکثر شہزادے اور متوسلین ان کے شاگرد ہوا کرتے تھے۴ے وہ نہایت سنجیدہ، متین اور روشن خیال شخص تھے۔ سرسید احمد خاں اور مولوی کریم الدین نے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ سرسید لکھتے ہیں کہ

> "فنون متعارفہ و سخن وری مثل تحقیق لغت و اصطلاحات زبان دری اور تدقیق مقالات کتابی اور تکمیل عروض و قافیہ و استکمال فن معمہ و غیرہا میں ایسا کمال بہم پہنچایا کہ ہر فن میں ایک فنی کہنا چاہیے۵ے"

دلی شہر میں ان کے فضل و کمال اور ذہانت و فطانت کا ڈنکا بج رہا تھا، لیکن دلی کالج میں ملازمت سے پہلے ۱۸۴۰ء تک صہبائی کا کوئی مستقل و معقول سلسلہ معاش نہیں تھا شرفا و امرا کے بچوں کو پڑھایا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں ہندو امرا کے یہاں بھی ان کی آمد و رفت تھی۔ چنانچہ گڑگاؤں اور کشمیری پنڈتوں کے لڑکے ان کے زیر تعلیم تھے۔ وہ کچھ دنوں تک نواب حامد علی خاں بہادر کی سرکار میں بھی بحیثیت اتالیق ملازم رہے۶ے اس کے بعد ان کا تقرر دلی کالج میں ہوگیا۔ مولوی عبدالحق نے ان کے تقرر کا واقعہ اس طور پر بیان کیا ہے۔

۱۸۴۰ء میں آنریبل مسٹر ٹامسن لفٹنٹ گورنر مدرسے کے معائنے کیلئے آئے تو انہوں نے یہ تجویز کی کہ ایک مستند فارسی مدرس کا تقرر ہونا چاہئے۔ مفتی صدرالدین خاں صدرالصدور نے عرض کی کہ ہمارے شہر میں فارسی کے استاد صرف تین شخص ہیں۔ ایک مرزا نوشہ، دوسرے حکیم مومن خاں، تیسرے امام بخش صہبائی۔ لفٹنٹ بہادر نے تینوں کو بلایا۔ مرزا نوشہ بھلا یہ روگ کیوں پالنے لگتے، انہوں نے تو انکار کر دیا مومن خاں نے یہ شرط رکھی کہ سو روپئے ماہانہ سے کم کی خدمت قبول نہ کروں گا۔ مولوی امام بخش صہبائی کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا، انہوں نے یہ خدمت چالیس روپئے ماہانہ پر قبول کرلی۔ بعد میں پچاس ہو گئے۔"[۹]

یہ پتہ نہیں چلتا کہ صہبائی کے تقرر کے وقت دلی کالج میں فارسی کا صدر مدرس کون تھا اور نہ یہی معلوم ہو سکا کہ صہبائی صدر مدرس کب بنائے گئے۔ لیکن یہ امر مسلم ہے کہ وہ جلد ہی فارسی کے صدر مدرس مقرر ہو گئے۔ مولانا صہبائی کا دلی کالج میں تقرر مشرقی شعبہ کے لئے نعمت عظمیٰ ثابت ہوئی۔ انہوں نے مشرقی شعبہ کو ترقی دینے میں کلیدی کردار ادا کیا ہے اور ترجمہ و تالیف کے کام میں غیر معمولی مدد کی۔ اکثر و بیشتر تراجم کے مسودے تصحیح کیلئے ان ہی کے پاس بھیجے جاتے تھے کالج کے طلبہ میں تالیف و تصنیف کا جو جذبہ و حوصلہ پیدا ہوا اس میں صہبائی کا بڑا ہاتھ تھا اس کام میں وہ نہایت دلچسپی کے ساتھ طلبہ کی رہنمائی کرتے تھے۔ ان کے مشہور تلامذہ میں محمد حسین آزاد، پیارے لال آشوب دین دیال اور تذکرۂ گلستان سخن کے مولف مرزا قادر بخش صابر دہلوی کے نام بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "گلستان سخن" دراصل صہبائی ہی کی تالیف ہے۔ اس کی توثیق جناب خلیق انجم کے مندرجہ ذیل بیان سے بھی ہوتی ہے۔

۵۰۰ صفحات پر مشتمل یہ تذکرہ ۱۲۷۱ء میں دلی سے شائع ہوا جس پر بہ حیثیت مؤلف مرزا قادر بخش بہادر صابر کا نام تھا۔ لیکن کچھ لوگوں کا

خیال ہے کہ یہ تذکرہ خود صہبائی کی تالیف تھا۔ غالب، منشی ذکاء اللہ
سری رام چندر اور عبدالغفور نساخ جیسے ذمہ دار لوگ اسے صہبائی ہی
کی تالیف سمجھتے تھے۔ سوال یہ ہے کہ صہبائی نے اسے اپنے نام سے
کیوں شائع نہیں کرایا۔ اس کی صرف ایک وجہ تھی۔ تذکرے میں جہاں
کہیں بھی صہبائی کی تعریف کی گنجائش نکلی ہے، خوب دل کھول کر
تعریف کی گئی ہے۔ اگر صہبائی کا نام بہ حیثیت مصنف ہوتا تو پھر یہ
گنجائش باقی نہ رہتی،، [۲۰]

اسی طرح سرسید کی شہرہ آفاق تصنیف "آثار الصنادید،، کے متعلق بھی یہ کہا جاتا ہے
کہ اس کے پہلے ایڈیشن کا متن صہبائی ہی نے لکھا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کے اس
بیان کے علاوہ کہ صہبائی نے "آثار الصنادید،، کی تصنیف میں سرسید کی کافی مدد کی تھی [۱]
مولانا حامد حسن نے لکھا ہے کہ "اس آثار الصنادید کی عبارت سرسید نے مولوی امام بخش سے لکھوائی
تھی،، [۲] اس ضمن میں مولانا حالی سے معتبر شہادت کس کی ہو سکتی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے۔ آثار
الصنادید کا سب سے پہلا ایڈیشن جس کی عبارت میں بہت کچھ ساختگی اور تکلف پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ
سرسید خود اقرار کرتے ہیں۔ مولانا صہبائی کا لکھا ہوا ہے" [۳] اس کے علاوہ قدیم عمارتوں کے کتبے
وغیرہ کی نقل اتارنے میں بھی انہوں نے سرسید کی کافی مدد کی تھی۔

مولانا فضل حق کے گھر پر نماز عصر کے بعد ادبی محفلیں جمتی تھیں۔ رات کو مفتی صدر الدین آزردہ
بھی اس قسم کی مجلسیں منعقد کرتے تھے جن میں صہبائی بھی شریک ہوتے تھے۔ علاوہ بریں دلی اور
قلعہ کے مشاعروں میں بھی وہ موجود ہوتے تھے۔ لیکن ان مشاعروں میں وہ صرف فارسی ہی میں شعر
کہتے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے اردو میں شعر نہیں کہے۔ نجم الغنی نے "بحر الفصاحت،،
میں ان کے اردو کے چند شعر درج کئے ہیں۔

مولانا صہبائی ۱۸۵۷ء کے ہنگامۂ دار و گیر میں اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ گولی کا نشانہ
بنائے گئے اور ان کا مکان کھود کر مسمار کر دیا گیا۔ معمورۂ علامہ راشد الخیری نے ایک موقع پر ان

کی شہادت کا واقعہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

مولانا قادر علی مولانا صہبائی کے حقیقی بھانجے تھے اور ان ہی کے ساتھ ......

ان کے گھر میں رہتے تھے، ایک موقع پر بیان کرتے ہیں کہ میں صبح کی نماز پڑھنے ماموں امام بخش صہبائی کے ساتھ

کٹرہ مہر پرور کی مسجد میں پڑھ رہا تھا کہ گورے دن دن کرتے آ پہنچے پہلی رکعت تھی کہ امام کے صافے سے ہماری مشکیں کس لی گئیں ..... ہم گرفتار ہوکر دریا (جمنا) کے کنارے لائے گئے۔ ہم قریب ۴۰-۵۰ آدمی تھے مسلح سپاہیوں نے اپنی بندوقیں تیار کیں۔ ایک مسلمان افسر نے ہم سے آکر کہا ..... تم میں سے جو لوگ تیرنا جانتے ہوں وہ دریا میں کود پڑیں میں بہت اچھا تیراک تھا۔ مگر ماموں صاحب ...... اور ان کے صاحبزادے مولانا سوز تیرنا نہ جانتے تھے اس لئے دل نے گوارا نہ کیا کہ ان کو چھوڑ کر جان بچاؤں۔ لیکن ماموں صاحب نے مجھے اشارہ کیا اس لئے میں دریا میں کود پڑا میں تیرتا ہوا آگے بڑھتا اور پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا پچاس ساٹھ گز گیا ہوں گا کہ گولیوں کی آوازیں میرے کان میں آئیں اور صف بستہ گر گر مر گئے۔ ۴۴ے

صدر الدین آزردہ نے اس دردناک واقعہ سے متاثر ہوکر یہ شعر کہا تھا ؎

کیوں کر آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو ؎ قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

اکبر الٰہ آبادی نے بھی ان کے انتقال پر ملال پر اپنے تاثرات نقل کئے ہیں

نوجوانوں کو ہوئیں پھانسیاں بے جرم و قصور
ماروں گولیاں پایا جسے کچھ زور آور
وہی صہبائی جو تھے صاحب قول فیصل
ایک ہی ساتھ ہوئے قتل پدر اور پسر

تصانیف (فارسی)

(ا) رسالہ گنجینۂ رموز۔ یہ رسالہ ایک معمہ کی شرح میں ہے۔ بقول سید احمد خاں "متن

اور شرح دونوں آپ ہی کے نتائج طبع کی رہین منت ہیں...... کوئی رسالہ عہد آدم سے اس دم تک کسی صاحب استعداد کے پردۂ فکر سے جلوہ گر ہوا ہے"؟[۱۵] شاید اسی تصنیف کے متعلق مولوی کریم الدین نے لکھا ہے۔" ایک رسالہ ایک معما کے حل میں انہوں نے بہت خوب لکھا ہے۔ اس میں ایک شعر سے سات سو نام نکلتے ہیں"[۱۶] لیکن سرسید نے لکھا ہے اور غالباً ان کا بیان صحیح ہے کہ" اس کے ایک بیت سے تین سو ساٹھ اسامی مستخرج ہوتے ہیں"[۱۷]

۲ ــــ جواہر منظوم عزیز ۔ یہ بھی فن معما پر مشتمل ایک منظوم رسالہ ہے۔ اس کے ہر رباعی سے اللہ تعالیٰ کا ایک نام نکلتا ہے۔

(۳) زمزمۂ جواہر۔ صہبائی کی یہ تصنیف نظم و نثر کا مجموعہ ہے جو سراج الدین بہادر شاہ ظفر کی مدح سرائی پر مشتمل ہے۔

(۴) انشائے مکاتیب۔ سرسید کے بقول اس کی نثر بیدل کے طرز کی ہے۔

(۵) قول فیصل۔ یہ تصنیف معاصر حزیں خاں آرزو سے متعلق ہے جس میں صہبائی نے حزیں کے کلام پر خاں آرزو کے اعتراضات کے جواب دیئے ہیں۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۸۶۸ء میں نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی۔[۱۸]

(۶) اعلاء الحق۔ یہ کتاب بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

(۷) سحر البلاغت۔ اس کی تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

(۸) کلیات صہبائی۔ صہبائی کے ایک شاگرد دین دیال نے ان کے فارسی کے تمام کلام کو "کلیات صہبائی" کے نام سے ۱۳۰۱ھ میں شائع کیا تھا۔ اس میں وہ تمام منظوم دیباچے اور تقریظیں بھی شامل ہیں جو انہوں نے دوسرے لوگوں کی تصانیف پر لکھی تھیں۔

فارسی کی ان تصانیف کے علاوہ فن انشاء سے متعلق چند رسائل، فارسی کی درسی کتابوں کی شرحیں اور ٹیک چند بہادر کی لغت" بہار عجم" کے بعض مشکل الفاظ کی شرح میں ایک رسالہ بھی ان سے یادگار ہے۔

اردو

(۹) حدائق البلاغت۔ بیل (Beale) کا یہ خیال خلاف واقعہ ہے کہ یہ عربی کا ترجمہ ہے[۱۹]

حقیقت یہ ہے کہ یہ شمس الدین فقیر کی اسی نام کی فارسی تصنیف کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ صہبائی نے بقول خود ۱۲۵۸ھ مطابق ۱۸۴۲ء میں دلی کالج کے پرنسپل مسٹر بوترو کی فرمائش پر کیا تھا۔[۲۰] یہ پہلی بار سید عبد الغفور کے زیر اہتمام ۱۸۴۳ء میں سید الاخبار پریس دلی میں اور دوسری بار ۱۸۴۸ء میں کریم الدین کے مطبع رفاہ عام واقع حوض قاضی، دلی میں چھپ کر شائع ہوا۔ حامد حسن قادری کے بقول "یہ ترجمہ صرف کہنے کو ترجمہ ہے ورنہ اصل میں فن بلاغت کو اردو میں منتقل کیا ہے (درحقیقت) اردو میں اس فن کی پہلی مکمل اور مستند کتاب ہے۔"[۲۱]

(۱۰) انتخاب دواوین۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ اردو کے چند شعرا کے منتخب کلام کا مجموعہ ہے۔ یہ انتخاب صہبائی نے دلی کالج کے پرنسپل بوترو کے حسب فرمائش ۱۲۵۸ھ / ۱۸۴۲ء میں مرتب کیا تھا جو ۱۸۴۴ء میں شائع ہوا۔ صہبائی نے اس میں صرف بارہ[۱۲] شاعروں کے کلام کا انتخاب مع ان کے مختصر حالات کے درج کیا ہے۔ جن کے نام یہ ہیں۔ ولی، درد، سودا، میر تقی میر، جرأت، میر حسن، شاہ نصیر، میر نظام الدین ممنون، امام بخش ناسخ، منشی مول چند، شیخ ابراہیم ذوق اور مومن خاں مومن۔[۲۲] ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے بقول "اشعار کا انتخاب پاکیزہ ہے مولف کے ذوق سلیم پر دلالت کرتا ہے[۲۳] تذکرہ نگاری کے عام روش کے برخلاف مولف نے اس مجموعے میں غزل کے علاوہ دوسری اصناف سخن کے نمونے بھی پیش کیے ہیں اور جس صنف میں کوئی شاعر امتیازی حیثیت رکھتا ہے اس کے انتخاب پر خاص توجہ دی ہے۔ حالات کے بیان میں صہبائی نے غیر معمولی اختصار سے کام لیا ہے حتی کہ مشہور و معروف معاصرین کے بارے میں بھی ان کے بیانات معدودے چند سطروں سے تجاوز نہیں کرتے۔

"انتخاب دواوین" کا دیباچہ جو اردو میں ہے طلبہ کے نقطۂ نظر سے بے حد کارآمد اور مفید معلومات کا حامل ہے۔ اس میں صہبائی نے شعر کی تعریف اور تاریخ، وزن کی اہمیت، قافیہ ردیف مبادیات عروض اور اصناف سخن کے بارے میں مختصر مگر جامع مواد یکجا کر دیا ہے۔ اصناف سخن کی تعریف اور تعارف میں نسبتاً زیادہ تفصیل سے کام لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ہر صنف کے مخصوص اوزان کی نشان دہی کے ساتھ ساتھ شعرا کے کلام سے اس کے نمونے بھی پیش کیے گئے ہیں۔

(۱۱) قواعد اردو - یہ اردو صرف و نحو پر تالیف کی گئی ہے۔ اس کی اشاعت پہلی بار ۱۸۴۹ء میں دلی سے ہوئی۔ مولوی عبدالحق کے بقول: "یہ کتاب بہت ہی اچھی ہے۔ اس کے آخر میں بہ ترتیب حروف ابجد اردو کے محاورات اور کہیں کہیں ضرب الامثال بھی درج ہیں"[۲۴]۔

صہبائی نے خواجہ میر درد کے دیوان کی تصحیح بھی کی تھی جسے دلی ٹرانسلیشن سوسائٹی نے شائع کیا تھا۔

حوالے

[۱] طبقات الشعرائے ہند طبقہ چہارم ص ۳۷ (طبع ۱۹۶۴ء)
[۲] بہ حوالہ نوائے ادب، جنوری ۱۹۶۳ء ص ۱۵
[۳] خطبات گارساں دتاسی ص ۱۸۹ (طبع ۱۹۳۵ء)
[۴] سید احمد خاں، آثار الصنادید ص ۶۳۱ (طبع ۱۹۶۵ء)
[۵] نزہۃ الخواطر ج ۷ ص ۳۰۷ (طبع ۱۹۵۹ء) [۶] تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص ۸۰ (طبع ۱۹۶۹)
[۷] آثار الصنادید ص ۶۳۱۔ [۸] خلیق انجم۔ سالنامہ "پگڈنڈی"، ۱۹۵۹ء ص ۳۷
[۹] بحوالہ مرحوم دہلی کالج ص ۱۵۳-۱۵۲ (طبع ۱۹۴۵) [۱۰] بحوالہ سالنامہ پگڈنڈی ۱۹۵۹ء ص ۳۷
[۱۱] تاریخ ادب اردو حصہ نثر ص ۸۰ [۱۲] مطالعہ سرسید احمد خاں از مولوی عبدالحق ص ۲۳۶
[۱۳] حیات جاوید حصہ اول ص ۳۵۷ (طبع ۱۹۰۱ء)
[۱۴] بحوالہ نوائے ادب، جنوری ۱۹۶۳ء ص ۲۱۔ [۱۵] آثار الصنادید ص ۶۳۲
[۱۶] طبقات الشعرائے ہند طبقہ چہارم ص ۳۹-۳۸۔ [۱۷] آثار الصنادید ص ۶۳۲
[۱۸] پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، چراغ رہ گزر ص ۶۴
[۱۹] این اوراینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری ص ۳۴۲ طبع (۱۹۷۱ء)
[۲۰] دیباچہ حدائق البلاغت بحوالہ اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری از فرمان فتح پوری ص ۳۱۴ اور ص ۴۱۵ (طبع ۱۹۷۲ء) [۲۱] داستان تاریخ اردو ص ۱۸۷ طبع ۱۹۶۶) [۲۲] تعجب ہے کہ اس انتخاب میں غالب جیسے مشہور و معروف شاعر کا نام شامل نہیں۔ [۲۳] اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ص ۳۱۶۔ [۲۴] قواعد اردو از مولوی

مولانا محمد علی جوہر
میری نظر میں

(مجیب اللہ ندوی)

(یہ مقالہ جشن جوہر کے موقع پر شبلی نیشنل کالج اعظم گڈھ کے کانوکیشن ہال میں پڑھا گیا)

مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت میں بیک وقت اتنی متنوع بلکہ متضاد قسم کی صفتیں جمع تھیں کہ ان کے معصروں میں بہت کم لوگ ان کے شریک وسہیم تھے۔ وہ ایک اونچے درجہ کے لیڈر اور مفکر تھے۔ وہ ایک شعلہ بیان مقرر ہی نہیں بلکہ مرد مجاہد بھی تھے وہ انگریزی اور اردو کے ممتاز صحافی اور ایک اچھے شاعر وادیب تھے۔ اور ان سب سے بڑھ کر وہ جذبات کے پتلے تھے۔ ان کے دل میں انسانیت کا درد تھا اور وہ اپنے سینہ میں ایک مومن کامل کا مضطرب قلب رکھتے تھے۔ گھر والوں سے تو اکثر بے خبر رہتے مگر دوستوں اور ساتھیوں کے غم گسار وپرستار رہتے۔ خاص طور پر مسلمان قوم کیلئے تو وہ فدائی فوجدار تھے۔ اگر ملک کے اندر یا ملک کے باہر کسی مسلمان کو ایک پھانس بھی لگی تو محمد علی کا قلب بے چین ہو جاتا تھا۔ کہیں کسی کی نکسیر پھوٹی تو یہ اپنا خون بہانے کیلئے تیار ہو جاتے تھے۔ کبھی ان کو خلافت عثمانیہ ترکی کا غم کھائے جاتا تھا تو کبھی مسلمانوں کی اقتصادی زبوں حالی پر وہ آنسو بہاتے نظر آتے تھے اور کبھی مسلمانوں کی سیاسی پامالی ان کو غلطاں وپیچاں رکھتی تھی۔ ان کے بارے میں شاید یہ کہنا ذرہ برابر مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ ہمیشہ زبان حال سے یہ کہتے نظر آتے " سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے "

مولانا محمد علی رام پور کے رہنے والے تھے۔ ان کی تاریخ ولادت ۱۸۷۸ء ہے۔ ابتدائی تعلیم رام پور ہی میں ہوئی اور پھر اٹھارہ سال کی عمر میں مسلم یونیورسٹی سے بی۔ اے پاس کیا اور پورے اتر پردیش میں ممتاز ہوئے۔ پھر لندن جاکر بی۔ اے آنرز کی ڈگری لی۔ جس زمانہ میں وہ گریجویٹ ہوئے اس زمانہ میں گریجویٹ ہونا بڑا امتیاز سمجھا جاتا تھا۔ اور پھر مولانا محمد علی

نے جتنی کم عمری میں اس امتیازی حیثیت سے بی۔ اے پاس کیا کہ پورے ہندوستان میں اس کی دو چار ہی مثالیں موجود تھیں۔ تعلیم کے بعد کچھ دن مولانا محمد علی نے رام پور ریاست اور پھر بڑودہ ریاست کی ملازمت کی مگر ان کی حساس اور سیال طبیعت کو ملازمت اور پھر ریاست اور غلامی کے دور کی ملازمت سے کیا مناسبت ہو سکتی تھی اس لئے جلد ہی ملازمت کی قید سے آزاد ہو گئے اور پھر زندگی بھر آزاد رہے۔

مولانا محمد علی کی سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۱۱ء سے پہلے سے ہو گیا تھا۔ مگر ان کی پبلک سیاسی زندگی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب انھوں نے ۱۹۱۰ء میں کلکتہ سے اپنا ہفتہ وار انگریزی اخبار کامریڈ نکالنا شروع کیا جس کی وجہ سے ان کے خیالات اور ان کی انگریزی دانی کا سکہ ملک کے پڑھے لکھے لوگوں کے دلوں پر بیٹھنے لگا تھا۔ اس وقت انگریزی دانی کو بجائے خود ایک اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ پھر ان کے مضامین میں جو بے باکی ہوتی تھی اس کی وجہ سے ملک میں دن بدن ان کی شہرت اور سیاسی حلقہ میں ان کی مقبولیت بڑھنے لگی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں جب حکومت برطانیہ نے اپنا دارالسلطنت کلکتہ سے دلی منتقل کیا تو کامریڈ کا دفتر بھی کلکتہ سے دلی منتقل ہو گیا۔ اور یہی ۱۹۱۲ء کا زمانہ ہے جس میں ایک واقعہ نے محمد علی کو کامیاب صحافی کی صف سے اوپر اٹھا کر ایک ممتاز عوامی لیڈر کی صف میں کھڑا کر دیا۔ ۱۹۱۰ء میں مدرسۃ العلوم کو جو اب تک کالج تھا یونیورسٹی بنانے کا چرچا شروع ہوا اور ۱۹۱۲ء میں اس نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ ایک طرف گورنمنٹ کے معتمد علیہ کچھ خواص کا خیال تھا کہ گورنمنٹ جن شرائط پر یونیورسٹی بنانے کی اجازت دیتی ہے قبول کر لیا جائے دوسری طرف عوام و خواص کے ایک بڑے طبقہ کا خیال تھا کہ ہم کو اپنے شرائط پر یونیورسٹی بنانی چاہئے اس دوسری صف میں مولانا ابو الکلام آزاد، حسرت موہانی اور خود مولانا محمد علی تھے۔ مولانا آزاد نے "الہلال" کی شعلہ بیانی کے ذریعہ اور مولانا محمد علی نے "کامریڈ" کے پرجوش انداز تحریر کے ذریعہ مسلمان عوام کے اندر جوش و ولولہ اور جو جرأت و ہمت اور خود اعتمادی پیدا کر دی تھی اس کی وجہ سے اس نے کشمکش کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اس سے پہلے چند خواص بیٹھ کر مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کے بارے میں ایک رائے دیتے تھے اور عوام آمنّا و صدقنا کہہ کر قبول کر لیتے تھے۔

مگر یہ پہلا موقع تھا کہ عوام آمنا وصدقنا کہنے پر راضی نہیں تھے اور نہ اپنے مسائل کے سلسلہ میں چند خواص کی ہدایات قبول کرنے کیلئے تیار تھے بلکہ وہ خود اس میں شریک ہوگئے تھے اور اپنی خواہش کے مطابق اپنا مسئلہ طے کرنا چاہتے تھے۔ اسی کش مکش میں مسلم یونیورسٹی فاونڈیشن کمیٹی کا جلسہ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو قیصر باغ بارہ دری میں ہوا۔ دونوں خیال کے لوگوں میں خوب گرما گرم بحث ہوئی۔ سنجیدہ لوگ مثلاً آفتاب احمد خاں وغیرہ پرجوش لوگوں کو سمجھاتے رہے۔ مگر انہوں نے کسی طرح مانکے نہ دیا۔ مجبوراً جلسہ ملتوی کر دیا گیا۔ دوسرے دن پھر جلسہ ہوا۔ آج مولانا محمد علی تقریر کیلئے خود کھڑے ہوگئے۔ ان کی تقریر میں نہ مولانا ابوالکلام کا جوش خطابت تھا اور نہ آفتاب احمد خاں کے سنجیدہ دلائل تھے بلکہ ان کی تقریر سادہ مگر دل نشیں یہ تھی۔

"محترم دوستو! بحثا بحثی بہت ہوچکی آپ لوگ بے شک یونیورسٹی چارٹر کو آنکھ بند کرکے قبول نہ کریں۔ یقیناً اپنے ہی شرائط پر کریں۔ لیکن شرائط کی تفصیل و تعیین کے لیے تو یہ بڑا جلسہ موزوں نہیں ہے۔ یہ کام چھوٹے سے وفد کے سپرد کیجئے وہ آپ کا نمائندہ بنکر گورنمنٹ سے نپٹ لے گا اس وفد میں مجھے رکھیے اور اس سلسلہ میں مجھ پر اور میرے رفیقوں پر اعتماد کیجئے۔ میں آپ سے "سادہ چک" مانگنے کھڑا ہوا ہوں۔ آپ میری ساکھ پر سادہ چک دے دیجئے۔ رقم کی خانہ پری میرے اوپر چھوڑیئے" ان کی اس سادہ تقریر نے مجمع پر جادو کا کام کیا۔ مخالفانہ نعرے رک گئے۔ پیشانیوں کے بل مٹ گئے اور ان کی تجویز تالیوں کی گونج میں پاس ہو گئی۔ یہی ۱۹۱۳ء کا سال ہے جب سے مولانا محمد علی صرف ایک ایڈیٹر ایک صحافی ہی نہیں بلکہ ملک کے اور خاص طور پر مسلمانوں کے سب سے اہم لیڈر بن گئے۔ اور ۱۹۲۴ء تک نہ صرف مسلمانوں کی سیاسی زندگی بلکہ پورے ملک کی سیاسی زندگی پر چھائے رہے۔ اپنی اسی شخصی اہمیت کی وجہ سے ۱۹۲۳ء میں وہ "انڈین نیشنل کانگریس" کے صدر منتخب ہوئے۔

صحافی کی حیثیت سے بھی مولانا محمد علی نے جو اہمیت حاصل کی ہے وہ کم لوگوں کے حصہ میں آئی۔ ان کے "کامریڈ" کی زبان و بیان کا معیار لندن کے اس وقت کے مشہور ہفت روزہ "ون" سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اگر اس کے ذریعہ وہ دنیا کمانا چاہتے تو کارو کو کھی والے

ہو سکتے تھے اور عیش و عشرت کی زندگی گذار سکتے تھے ۔ مگر مولانا محمد علی دنیادار نہیں بلکہ ایک مومن صادق اور عقلمند رصفت انسان تھے جن کے نزدیک اپنی ذات سے زیادہ ملت عزیز تھی جس کو اپنے عیش و آرام سے زیادہ ملک وملت کی آسودگی پیاری تھی ۔ ایک واقعہ ملاحظہ ہو۔

۱۹۱۳ء میں کانپور میں ایک سڑک نکالنے کے سلسلہ میں میونسپلٹی اور کلکٹر نے ایک مسجد کے غسل خانہ کو گرا دیا اس پر زبردست ہنگامہ ہوا جس میں کئی مسلمان نوجوان شہید ہوگئے ۔اسی موقع پر علامہ شبلی نعمانی رح نے اپنی مشہور نظم "ہم کشتگان معرکہ کانپور ہیں" لکھی جو اس وقت بچہ بچہ کی زبان پر تھی ۔ مولانا محمد علی اس موقع پر کب خاموش رہ سکتے تھے۔ انہوں نے کامریڈ میں مسلسل مضامین لکھنے شروع کئے اس میں نہ صرف کانپور کے کلکٹر (جو اس وقت انگریز ہی ہوتا تھا) بلکہ صوبہ کے گورنر "سر جیمس مسٹن" کی بھی توب خبر لی ۔ مسٹر مسٹن سے مولانا محمد علی کی ملاقات ہی نہیں بلکہ غالباً لندن کے قیام کے زمانہ سے یارانہ تھا ۔ اس وجہ سے وہ مولانا محمد علی کو اپنا اور حکومت کا بہی خواہ سمجھنے لگے تھے ۔ مگر مولانا محمد علی کے نزدیک ملت کے مقابلہ میں ذاتی تعلق کی کیا اہمیت تھی ۔ انہوں نے بھرپور تنقید کی ۔ پھر اس کے کچھ دنوں بعد جنگ عظیم چھڑ گئی ۔جس میں ترکی نے جرمنی کا ساتھ دیا ۔ اس پر مولانا محمد علی ترکوں کی صفائی اور حمایت پر کئی مضمون لکھ ڈالے ۔ غرض یہ تمام چیزیں ایک ساتھ جمع ہوگئیں جن کی بنا پر وہ حکومت برطانیہ کی نگاہ میں خار بن گئے اور اس کے نتیجہ میں کامریڈ بند اور خود مولانا محمد علی نظربند کر دیئے گئے ۔ اور چھنڈوارا جیل میں بھیج دیئے گئے اور پھر تین برس بعد رہا ہوئے ۔

مولانا محمد علی نے زمانہ اسیری میں قرآن پاک اور سیرت نبوی کا خوب مطالعہ کیا ۔مولانا عبد الماجد دریابادی لکھتے ہیں " جیل میں مولانا محمد علی کا خاص مشغلہ تلاوت قرآن تھا ۔حافظہ ماشاء اللہ یوں بھی بہت قوی تھا پھر جو قرآن بار بار جھوم جھوم کر ذوق وشوق سے پڑھا تو قرآن مجید ایک بڑی حد تک حفظ ہی ہوگیا ۔

ان کو مسلمان قوم کی نشاۃ ثانیہ کی کتنی فکر تھی ذیل کے واقعہ سے اندازہ ہوجائے گا ۔

مولانا عبد الماجد دریابادی کا بیان ہے کہ میں نے ان کو اس جبری نظربندی کے زمانہ میں لکھا

کہ آپ تاریخ کے جید عالم ہیں اس اسیری کی فرصت سے فائدہ اٹھا کر تاریخ پر ایک کتاب ہی کیوں نہیں لکھ ڈالتے۔ جواب انگریزی میں آیا اور کتنا سچا آیا

وہ یہ وقت تاریخ نگاری کا نہیں تاریخ سازی کا ہے۔ اغیار اپنی تاریخ بنا رہے ہیں اور آپ مجھے تاریخ نویسی کیلئے لکھ رہے ہیں۔ عالم اسلام کی بربادیوں نے دل و دماغ میں وہ سکون ہی کب قائم رہنے دیا ہے جس میں تصنیف وتالیف پر توجہ کر سکوں "

(ج ا ڈائری ص ۲۰۵)

مولانا محمد علی نے جس دور میں آنکھ کھولی اس میں صورت حال یہ تھی کہ پورا ایشیا اور افریقہ سلطنت برطانیہ، افریقہ، فرانس اور اٹلی وغیرہ کے زیرنگیں ہی نہیں بلکہ ان کا غلام تھا۔ مشرق وسطی کے جتنے اسلامی ممالک تھے ایک ایک کر کے وہ سب برطانیہ اور یورپ کی سیاسی گرفت میں آچکے تھے یا لائے جا رہے تھے۔ ایران، مصر، شام، مراکش کے بعد بلقان پر جب برطانیہ نے قبضہ کیا تو علامہ شبلی نے عالم اسلام کا نوحہ لکھا۔ جس کے دو تین شعر یہ ہیں۔

یہ طوفان بلا بلقان سے جو اٹھتا جاتا ہے ؛ اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

یہ مانا کہ تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے ؛ ہماری گردنوں پر ہوگا اسکا امتحاں کب تک

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریض سخت جاں کب تک

مولانا محمد علی انہی حالات کے پروردہ تھے اس لئے ملک کی غلامی اور ملت اسلامیہ کی زبوں حالی کا درد و غم ان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ یہی احساس غم تھا جس کی بنا پر انہوں نے خلافت عثمانیہ کو بچانے کیلئے ہندوستان میں خلافت تحریک کی بنیاد ڈالی۔ یہی جذبہ ملی تھا جس نے شریف مکہ کی مخالفت اور عبدالعزیز بن سعود کے سیاسی انقلاب کی حمایت پر آمادہ کیا۔ اسی چیز نے ان کو کانگریس کی آزادی کی تحریک میں حصہ لینے پر مجبور کیا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ آزادی کی تحریک میں جان مولانا محمد علی اور ان کی خلافت تحریک اور نان کوآپریشن یعنی ترک موالات کے پروگرام

کی وجہ سے آئی اور خود گاندھی جی کو عوامی لیڈر بلکہ مہاتما گاندھی بنانے میں تحریک خلافت کا سب سے بڑا ہاتھ تھا اور اسی بنا پر مہاتما گاندھی اور دوسرے ہندو لیڈر خلافت تحریک میں مسلمانوں کے دوش بدوش شریک رہے۔ اس وقت ہم اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ اس تحریک نے مسلمانوں میں کتنا ولولہ اور جذبہ پیدا کر دیا تھا اور مولانا محمد علی کی مقبولیت کتنی تھی۔ کسی شاعر نے مولانا محمد علی کی والدہ کی زبان سے ایک نظم کہہ ڈالی۔ جس کا ایک شعر یہ ہے۔

بولیں اماں محمد علی کی ٭ جان بیٹا خلافت پہ دے دو

شاعر نے یہ شعر تو مولانا کی والدہ کی زبان سے محمد علی کے بارے میں کہا تھا مگر اس وقت ہر ماں اپنے بیٹے کو یہی وصیت کرتی تھی کہ "جان بیٹا خلافت پہ دے دو"

مولانا محمد علی کی اس غیر معمولی مقبولیت اور صلاحیت کی بنا پر ان کو ۱۹۲۳ء میں کانگریس کا صدر منتخب کیا گیا۔ جو اس وقت کسی لیڈر کیلئے سب سے بڑا اعزاز تھا۔ مگر اس اعزاز کے ملنے کے بعد بھی مولانا محمد علی کی اسلامی حمیت اور ملی غیرت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ جیسا کہ عام طور پر اس وقت تحریک آزادی میں حصہ لینے والے مسلمانوں کا حال تھا۔ علی گڑھ کی کسی تقریر میں مولانا محمد علی نے یہ کہہ دیا تھا کہ میں ایک فاسق و فاجر مسلمان کو گاندھی جی سے بہتر سمجھتا ہوں۔ وہ صدر تو نامزد ہو گئے مگر ابھی اس کی تصدیق آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور اجلاس عام سے ہونی باقی تھی۔ اسی درمیان مولانا لکھنؤ کے ایک جلسہ میں تقریر کر رہے تھے جس میں موتی لال نہرو کی اس تحریک کی دھجیاں اڑا رہے تھے جس میں حکومت سے اشتراک اور داخلہ کونسل کی تائید کی گئی تھی۔ تقریر کے درمیان کچھ شرپسندوں نے ایک ہینڈ بل تقسیم کرنا شروع کیا جس میں لکھا تھا کہ یہ محمد علی وہی شخص ہیں جنہوں نے علی گڑھ میں یہ کہا تھا کہ ایک گنہگار مسلمان کو گاندھی جی سے بہتر سمجھتا ہوں۔ ایسا آدمی کانگریس کا صدر کیسے بن سکتا ہے۔ پھر ایک شخص نے بھرے مجمع میں سوال بھی کر دیا۔ بڑا نازک موقع تھا اور مولانا کیلئے بڑا سخت امتحان تھا۔ ملک میں پہلے سے شدھی سنگھٹن وغیرہ کی تحریک چل رہی تھی جس کی وجہ سے ہندو مسلم منافرت پیدا ہونا شروع ہو گئی تھی۔ مولانا کے سارے احباب ہینڈ بل اور سوال سے گھبرائے۔ صدر جلسہ

نے سائل سے بیٹھ جانے کیلئے کہا مگر مولانا ذرا گھبرائے نہیں اور نہ انہوں نے اپنے اس بیان کی کوئی معذرت کی۔ بلکہ مجمع سے مخاطب ہو کر کہا۔

دوستو! علی گڑھ میں میں نے جو کچھ کہا ہے اسے دہرانے کے لئے میں یہاں بھی تیار ہوں اور ہر جگہ۔ گاندھی جی آزادی ملک کیلئے جو خدمات انجام دے رہے ہیں ان کے لحاظ سے وہ اپنا نظیر نہیں رکھتے۔ اور جہاں تک ان کی بیش بہا خدمات وطن کا تعلق ہے میں مہاتما جی کو اپنے ہی سے افضل نہیں بلکہ اپنی والدہ ماجدہ سے بھی زیادہ قابل تعظیم اور اپنے پیر و مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے بھی بڑھ کر قابل احترام سمجھتا ہوں۔ لیکن ایک دوسری حیثیت اعتقاد و ایمان کی ہے۔ میں عقیدتاً مسلمان ہوں اور اس کے معنی یہ ہیں کہ عقیدۂ اسلام کو اور تمام عقاید سے کہیں بہتر اور اعلیٰ سمجھتا ہوں اور اس لحاظ سے میں اکیلے گاندھی جی ہی سے نہیں بلکہ تمام ہندوں، تمام عیسائیوں، تمام غیر مسلموں کے مجموعے سے ہزار درجہ ادنیٰ مسلمان ہر بد عمل سے بد عمل کلمہ گو کو بہتر سمجھتا ہوں۔ اسلام کی افضلیت میرا جزو ایمان ہے۔ اگر آج خدا نخواستہ میں اس کا قائل نہ رہوں تو پھر مسلمان رہنے کی بھی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ میری بات کوئی نئی بات نہیں جس طرح میں اپنے عقیدہ کی افضلیت کا قائل ہوں اسی طرح ہر مذہب والا اپنے عقیدہ کو افضل سمجھتا ہے۔ کیا پنڈت مدن موہن مالوی جی (جو اس مجمع میں موجود تھے) اپنے عقیدہ کو سب سے افضل خیال نہیں کرتے۔

اس تقریر پر مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنے جو تاثرات ظاہر کئے ہیں انہیں نقل کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

> یہ الفاظ آج کاغذ پر چھپے ہوئے وہ بھی اتنی مدت دراز کے بعد ممکن ہے کچھ زیادہ مؤثر نہ معلوم ہوں۔ لیکن جس وقت ہزاروں کے مجمع میں ایک زندہ شخصیت کی زبان سے پورے جوش و خروش کے ساتھ آواز کے مناسب حال اتار چڑھاؤ کے ساتھ ادا ہوئے تو معلوم ہوتا تھا کہ بجلی کی ایک رو سی دوڑ گئی۔ دشمن سناٹے میں آگئے۔ دوستوں کے چہرے چمک اٹھے۔ خوب تالیاں بجیں۔ خوب تائید و مسرت کے نعرے بلند ہوئے۔

> یہ جرأت و ہمت اللہ نے بس محمد علی کو دی تھی کہ عین اجلاس کانگریس کے قریب اس کا صدر منتخب ہو چکنے پر ہزارہا کے مجمع میں ہندوؤں، پارسیوں عیسائیوں کے سامنے اپنے اسلام اور اپنی اسلام پرستی کا اعلان اس صفائی اس دلیری کے ساتھ کر دیا۔ ورنہ یہاں تو ایسے مسلمان بھی ہیں اور عوام ہی نہیں اچھے اچھے اور چوٹی کے معززین بلکہ طبقہ علما کے نامور افراد دیکھنے میں آئے ہیں جنہوں نے کانگریس پارٹی میں کانگریس کے جلسوں اور کانگریس سرکار میں اپنی بات رکھنے کے لئے اپنی اسلامیت کو ذلیل و خوار کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ (محمد علی ڈائری ص ۱۳۵)

غیر علماء کی صف میں مولانا محمد علی پہلے لیڈر ہیں جنہوں نے ہندوستانی سیاست میں بڑا سے بڑا اعزاز حاصل کیا اور اس کے سارے نشیب و فراز سے گذرے۔ اور ایک مسٹر کی حیثیت سے اس وادی خارزار میں داخل ہوئے۔ مگر ان کے اسلامی احساس اور اسلامی حمیت و غیرت میں کمی کیا آتی اس میں اتنا اضافہ ہوا کہ وہ مسٹر سے مولانا محمد علی ہو گئے۔ مذہب کے راستہ سے اور بھی متعدد علماء اور غیر علماء نے ہندوستانی سیاست میں حصہ لیا۔ مگر اس کے عام ماحول یا دوسروں کی رعایت یا قدامت پرستی کے الزام کے خوف سے وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ صرف مولانا محمد علی تھے کہ وہ گھر میں ہوں یا مجمع میں، صدارت کی کرسی پر ہوں یا کانگریس کے سیاسی ہنگاموں میں، وہ ہر وقت اور ہر آن ایک حق پرست مسلمان رہتے تھے۔ اور اس میں وہ نہ کسی دوست کی رعایت کرتے تھے اور نہ دشمن کی پرواہ کرتے تھے۔ اور نہ کبھی وہ کسی طرح کی مداہنت پر آمادہ ہوتے تھے۔ ان کی حق پسندی میں دوست و دشمن یکساں تھے۔ اس لئے بسا اوقات دوستوں سے بھی ان کا خلاف ہو جاتا تھا۔ دوست تو دوست اس سلسلہ میں گھر والوں سے بھی ان کو شکایت ہو جاتی تھی۔ وہ جو کہہ گئے ہیں خود اس کے مصداق تھے۔

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے ؛ یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لئے ہے

وہ نہ صرف خود مذہبی تھے بلکہ بڑے بڑے ملحدوں پر مذہب کا اثر ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ جواہر لال نہرو نے ڈسکوری آف انڈیا میں لکھا ہے کہ مولانا محمد علی جیل میں مجھ سے ہمیشہ مذہب کی حقانیت

اور خدا کے وجود پر بحث کرتے تھے، مجھ پر اثر تو کم ہوتا تھا مگر ان کے جذبہ کی قدر ضرور تھی "
مولانا محمد علی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پڑھے ہوئے تھے مگر جب انھوں نے وہاں کی فضا کو اپنے قومی و ملی جذبات کی تکمیل کے لئے سازگار نہیں پایا تو اس میں خلفشار پیدا کرنے کے بجائے اپنا ایک الگ ادارہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے دلی میں قائم کیا۔ جس کی نگرانی ایک لائق نوجوان ٹیم کے سپرد تھی۔ جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر مجیب اور پروفیسر عابد حسین وغیرہ تھے۔ اس ادارہ کو جس ملی مقصد سے مولانا محمد علی نے قائم کیا تھا وہ مقصد تو پورا نہیں ہوا مگر آج وہ ایک یونیورسٹی کی شکل میں سرزمین ہند پر موجود ہے۔ اور مسلمانوں کو اس سے فائدہ پہنچ رہا ہے
مولانا محمد علی کی زندگی کے یہ چند پہلو تھے جن کو میں نے آپ کے سامنے رکھا ہے اس کے لئے ایک مضمون کیا ایک مختصر کتاب بھی کافی نہیں ہے۔ بلکہ

" سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے "

آخر میں ان کے چند اشعار بھی سن لیجئے جن سے آپ کو ان کی شاعرانہ صلاحیت کا پورا اندازہ ہو یا نہ ہو مگر ان کی دردمندی، دلسوزی اور پرشور ملی جذبات اور ہمت مردانہ کا اندازہ ضرور ہوگا۔ اور پھر ان سے ان کا یہ امتیاز بھی آپ کے سامنے آجائے گا کہ اردو زبان میں سیاسی غزل گوئی کی جن لوگوں کے ذریعہ نشوو نما ہوئی ان میں ایک نمایاں شخصیت مولانا محمد علی کی بھی ہے۔
مولانا محمد علی کو جیل میں اس لئے ڈالا گیا تھا کہ شاید ان کے سیاسی اور ملی جذبات کچھ سرد پڑ جائیں مگر محمد علی تو ان لوگوں میں تھے جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

" بڑھتا ہے اور ذوق گنہ یاں سزا کے بعد

وہ خود بھی کہہ گئے ہیں

" آتا ہے لطف جرم تمنا سزا کے بعد "

جیل میں انہوں نے اس ذوق گنہ کے سلسلہ میں بہت سے اشعار کہے تھے۔ چند آپ بھی سنیں۔ ممکن ہے کہ ان میں آپ کو بھی اپنے دل کی کچھ دھڑکنیں سنائی دے جائیں۔ دو غزلیں جو غالب کی غزلوں کی قافیہ اور ردیف ہی میں کہی گئی ہیں۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:

خوگر جور پہ تھوڑی سی جفا اور سہی ؛ اس قدر ظلم پہ موقوف ہے کیا اور سہی
رب عزت کے لئے بھی کوئی رہنے دو خطاب ؛ تم خداوند ہی کہلاؤ خدا اور سہی
جس نے ہنگام عدالت کا تیری دیکھا ہے ؛ اس گنہ گار کو ایک روز جزا اور سہی

یاد وطن نہ آئے ہمیں کیوں وطن سے دور ؛ جاتی نہیں ہے بوئے چمن کیا چمن سے دور
گر بوئے گل نہیں نہ سہی یاد گل تو ہے ؛ صیاد لاکھ رکھے قفس کو چمن سے دور
پاداش جرم عشق سے ہے کب تلک مفر ؛ مانا کہ تم رہا کئے دار و رسن سے دور
کچھ بھی دہاں نہ خنجر قاتل کا بس چلا ؛ روح شہید اپنی ہے نعش و کفن سے دور
آساں نہ تھا تقرب شیریں تو کیا ہوا ؛ شیشے کو کوئی رکھ نہ سکا کوہکن سے دور
ہم تک جو دور جام بھی آئے تو کیا عجب ؛ یہ بھی نہیں ہے گردش چرخ کہن سے دور

ان کے پردرد اور پرشور اشعار کو پڑھتے وقت انگریزوں کے زمانہ کی جیل کی سختیوں کو بھی سامنے رکھیئے۔ چند مومنانہ اشعار اور ملاحظہ ہوں:-

دور حیات آئے گا قاتل قضا کے بعد ؛ ہے ابتدا ہماری تیری انتہا کے بعد
قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے ؛ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد
لذت ہنوز مائدۂ عشق میں نہیں ؛ آتا ہے لطف جرم تمنا سزا کے بعد

ہر رنگ میں راضی برضا ہو تو مزا دیکھ ؛ دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضا دیکھ
یہ نور خدا کا ہے بجھائے نہ بجھے گا ؛ کچھ دم ہے اگر تجھ میں آ تو بھی بجھا دیکھ
اللہ کے بانکوں کا بھی ہے رنگ نرالا ؛ اس سادگی پر شوخی خون شہدا دیکھ
ہے سنت ارباب وفا صبر و توکل ؛ چھوٹے نہ کہیں ہاتھ سے دامان خدا دیکھ
تو طیرابابیل سے ہرگز نہیں کمتر ؛ بیچارگی پر اپنی نہ جا شان خدا دیکھ

مولانا کو نظر بند دعا بتلا نہیں ہے ٭ اللہ کے بندوں کو نہ اس طرح ستاؤ دیکھ

تنہائی کے سب دن ہیں تنہائی کی سب راتیں
اب ہونے لگیں ان سے خلوت میں ملاقاتیں

ہر لحظہ ہے تشفی سے ہر آن تسلی ہے ٭ ہر وقت ہے دلجوئی ہر دم ہیں مداراتیں
کوثر کے تقاضے ہیں تسنیم کے وعدے ہیں ٭ ہر روز یہی چرچے ہر رات ... یہی باتیں
معراج کی سی حاصل سجدوں میں ہے کیفیت ٭ اک فاسق و فاجر میں اور ایسی کراماتیں
بے مایہ ہیں ہم لیکن شاید وہ بلا بھیجیں ٭ بھیجی ہیں درودوں کی کچھ ہم نے بھی سوغاتیں

یہ پرسوز اشعار انہوں نے جیل میں لکھے تھے۔ اور مقصد شاعری نہیں تھا بلکہ یہ لخت ہائے جگر تھے جنہوں نے اشعار کی صورت اختیار کر لی۔ اور جیل سے مولانا عبد الماجد صاحب کو یہ اشعار بھیجتے ہوئے لکھتے ہیں

یہ چند اشعار ممکن ہے بقول آپ کے امت ان سے کچھ تسکین پائے۔
بہر حال مجھے کچھ نہ کچھ تسکین ہو جاتی ہے ،، (محمد علی کی ڈائری ص ۵۶ ج ۱)

مولانا چاہتے تو تمام دنیا دار لیڈروں کی طرح عیش و عشرت کی زندگی گذار سکتے تھے وہ بڑا سے بڑا عہدہ اور دنیاوی اعزاز حاصل کر سکتے تھے۔ مگر محمد علی کی نظر میں یہ چیزیں خزف ریزوں سے بھی کم تھیں۔ ان کو اگر لذت ملتی تھی تو قوم و ملت کے غم میں ملتی تھی ان کو سکون بے سکونی میں ملتا تھا۔ ان کے چہرے پر ہنسی اس وقت دکھائی دیتی تھی جب ملت کا کوئی کام کامیابی کی منزل میں داخل ہو جاتا تھا۔ انہوں نے اپنے لئے اور بال بچوں کے لئے کچھ نہیں کیا۔ بلکہ رام پور میں بھی جو کچھ تھا وہ بھی چھن گیا۔ مولانا کی نرینہ اولاد کوئی نہیں تھی۔ صرف چار لڑکیاں تھیں اور سب بڑی چہیتی تھیں۔ اور کیوں نہ ہوتیں جو دوسروں کے بچوں سے پیار و محبت کرتا تھا وہ اپنے جگر گوشوں سے کیوں نہ محبت کرتا۔ ان کی منجھلی صاحبزادی آمنہ تھیں جو انہیں بہت زیادہ عزیز تھیں ابھی ان کی شادی کو تین چار برس ہوئے تھے کہ مولانا ۱۹۲۳ء بیجاپور جیل میں بند ہو گئے اور صاحبزادی

سخت بیمار پڑیں ڈاکٹروں نے دق تجویز کیا۔ مولانا کو جیل میں خبر پہنچی تو دل مسوس کر اور کلیجہ تھام کر رہ گئے۔ باہر ہوتے تو کچھ دوا علاج کا بندوبست کرتے مگر ان کے بس میں تو اتنا بھی نہیں تھا کہ چہیتی بچی کو ایک نظر دیکھ سکتے۔ کتنی بڑی آزمائش تھی۔ کتنا سخت امتحان تھا۔ مگر مولانا نے اپنی مدقوق بیٹی کو مخاطب کر کے خدا کی بارگاہ میں شاعری کی زبان میں جو فریاد کی ہے اسے آج بھی پڑھتے وقت آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل جاتے ہیں۔ مگر اس سخت امتحان میں مولانا صبر و توکل کے جس اعلیٰ درجہ پر فائز نظر آتے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

میں ہوں مجبور پر اللہ تو مجبور نہیں ؛ تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں
امتحاں سخت سہی پر دل مومن ہی وہ کیا ؛ جو ہر ایک حال میں امید سے معمور نہیں
تری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو ؛ نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں
تیری قدرت سے خدایا تری رحمت نہیں کم ؛ آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں

مولانا محمد علی پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ انہوں نے قوم کو کوئی مثبت پروگرام نہیں دیا۔ مگر وہ لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ مولانا محمد علی نے جو زمانہ پایا وہ آج سے بالکل مختلف تھا۔ اس وقت ہمارا ملک ہی نہیں بلکہ پورا ایشیا اور افریقہ یوربین قوموں کا غلام تھا۔ پورا ہندوستان اور خاص طور پر مسلمان قوم ۱۸۵۷ء کی زخم خوردہ تھی۔ اس کے نہ جانے کتنے اسلامی اور تہذیبی نشانات مٹائے جا چکے تھے۔ اس کے ایک ایک قومی احساس کو کچلا جا رہا تھا۔ اقتصادی اور سیاسی حیثیت سے اسے پامال کر دیا گیا تھا۔ زوال پذیر قوم کے اندر جو معائب ہوتے ہیں وہ سب مسلمان قوم کے رگ و پے میں سرایت کر گئے تھے۔ ان کو نہ اپنی ماضی کی تاریخ کا خیال تھا اور نہ حال کی کوئی خبر تھی گویا عام طور پر ایک خواب غفلت طاری تھا۔ اس صورت حال میں سب سے بڑا کام یہ تھا کہ اس سوئی ہوئی قوم کو جگایا جائے۔ اس کی مایوسی کو دور کیا جائے۔ اس میں خود اعتمادی کے احساسات پیدا کئے جائیں اور اس کی ماضی کی عظمتوں کو یاد دلا کر مستقبل کو روشن بنانے کی تدبیریں سوچی جائیں مولانا محمد علی کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انہوں نے سوئی قوم کو جگایا۔ اس میں زندگی کی حرارت اور جرأت اور خود اعتمادی پیدا کی۔ جب کسی گھر میں آگ لگی ہو تو اس وقت کسی مثبت پروگرام

کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلکہ سب سے بڑا کام لوگوں کو بیدار کر کے آگ بجھانے کیلئے آمادہ کرتا ہے۔ مولانا محمد علی نے یہی کیا۔ انہی کی پیدا کی ہوئی بیداری جرأت، ہمت اور خود اعتمادی تھی جس نے کانگریس کو اپنی تحریک آزادی میں مدد ملی انہی کی ہموار کی ہوئی زمین پر بہت سے مسلمان لیڈروں نے اپنی بساط قیادت بچھائی اور پھر اس کے پھل بھی کھائے۔

یہ صحیح ہے کہ مولانا محمد علی ایک جذباتی انسان تھے، ان کے جذبات کبھی غلط رخ بھی اختیار کر لیتے تھے یا لوگ ان کے جذبات کا پورا ساتھ نہیں دے پاتے تھے اس لئے ان کا ساتھ چھوڑ دیتے تھے ان کے ساتھی ان کے پرستار رہتے اور وہ بھی ان کے غم گسار رہتے۔ مگر جب رائے کا اختلاف ہو جاتا تھا تو پھر وہ دوستی کی دھجیاں اڑا دیتے تھے۔ ڈاکٹر عبدالحق صاحب نے کسی حد تک صحیح لکھا ہے:" مولانا محمد علی کے دوست ان سے اسی طرح محبت کرتے تھے جس طرح آتش پرست آگ سے کرتا ہے مگر اس پرستش کے باوجود وہ اس آگ سے بچتے رہتے تھے:" یہی حال مولانا محمد علی اور ان کے دوستوں کا تھا۔ مگر اس کے باوجود ان کی غیر معمولی صلاحیت میں۔ ان کے خلوص اور ایمانی حرارت میں، ان کی دینی غیرت اور قومی و ملی حمیت میں بہت کم لوگ ان کے ثانی نظر آتے ہیں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

۷ر فروری ۱۹۸۲ء

امیرالمومنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس امت پر سب سے زیادہ اس عالم سے خائف ہوں جو زبان کا عالم ہو، مگر دل کا جاہل۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ فرماتے ہیں، علم عمل کو بلاتا ہے، اگر آ گیا تو بہتر۔ ورنہ خود چل دیتا ہے۔ (اخلاق سلف)

وفیات

مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی ندوی مرحوم

۲۴ اپریل ۱۹۸۲ء کے اخبار میں یہ افسوسناک خبر نظر سے گزری کہ لاہور میں مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی ندوی کا انتقال ہوگیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون

حضرت الاستاد مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے تھے کہ ہندوستان میں سلیمان نام کے چار آدمی ممتاز ہوئے۔ پہلے جسٹس سر سلیمان جنہوں نے نظریۂ اضافیت پر تنقید کی۔ دوسرے مولانا سلیمان اشرف صاحب جو مسلم یونیورسٹی میں دینیات کے ناظم رہے۔ تیسرے مولانا سلیمان منصورپوری صاحب رحمۃ للعالمین۔ اور چوتھے مولانا سلیمان پھلواروی ہندوستان کے ممتاز واعظ اور عالم۔ سید صاحب نے اس فہرست میں اپنا نام نہیں لیا مگر پانچویں وہ خود تھے۔ شاہ محمد جعفر صاحب مولانا سلیمان اشرف پھلواروی کے صاحبزادے تھے اور اپنے خاندان اور والد کی خصوصیات کے حامل تھے۔ ابتدائی تعلیم پھلواری اور مدرسہ عزیزیہ پٹنہ میں ہوئی اور ندوہ میں آکر تکمیل کی۔ اور ایک مدت تک یہاں وعظ و تبلیغ کا کام کرتے رہے۔ تقسیم ہند کے بعد وہ پاکستان منتقل ہوگئے۔ اور لاہور کے ادارہ ثقافت اسلامیہ سے وابستہ ہوگئے اور آخر تک اس سے وابستہ رہے۔ ادارۂ ثقافت سے وابستہ ہونے کے بعد انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں۔ جن میں "ریاض السنۃ" کے علاوہ ان کی بیشتر کتابیں شرعی نقطۂ نظر قابل اعتراض قرار پائیں ادارہ ثقافت چونکہ گورنمنٹ کے زیر اثر تھا اور موجودہ دور سے پہلے وہاں کے بیشتر حکمراں اسلام کو ایک تجدد پسند مذہب ثابت کرکے اس میں بہت سی تبدیلیاں کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے ادارہ ثقافت کے جن مصنفین نے ان کی تجدد پسندی کے لئے کتاب وسنت سے دلائل فراہم کرنے کی مہم چلا رکھی تھی ان میں مولانا بھی تھے۔

جن لوگوں نے ان کے خلاف مضامین لکھے ان میں راقم الحروف نے بھی ان کے جواب میں معارف اعظم گڈھ اور صدق جدید میں متعدد مضامین لکھے خاص طور پر ان حضرات کے اس نقطۂ نظر پر مفصل تنقید کی گئی کہ "کتاب وسنت کے صریح احکام حالات ومصلحت کے تحت اجتہاد سے بدلے جاسکتے ہیں،، اللہ تعالیٰ نے مولانا کو زبان وقلم دونوں کی صلاحیتیں دی تھیں اور ندوہ کی تعلیم وتربیت سے ان میں ایک توازن پیدا ہوگیا تھا۔ مگر ادارہ ثقافت سے وابستہ ہونے کے بعد یہ توازن تجدد پسندی سے بدل گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کے بدلے ان کی غلطیوں کو معاف فرمائے اور اپنی رحمت بے پایاں سے ان کی مغفرت فرمائے۔

نئی کتابیں

تنبیہ الحائرین یعنی شیعہ اور قرآن | از مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی رحمۃ اللہ علیہ۔ صفحات ۱۵۶۔ کتابت وطباعت عمدہ۔ مکتبہ فاروقیہ ۲۲۰/۵ دریائی ٹولہ لکھنؤ۔ قیمت بارہ روپے۔

مولانا عبدالعلیم فاروقی صاحب جن کے اہتمام سے یہ کتاب دوبارہ شائع ہوئی ہے انہوں نے اس کتاب کے تعارف کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے ان کے چند جملے نقل کردینا مناسب معلوم ہوتا ہے ان سے کتاب کا موضوع اور اہمیت کا اندازہ ہو جائے گا۔

"علمائے اسلاف نے شیعوں کے رد میں جو کچھ کام کیا ہے اس کا زیادہ تر حصہ دفاعی ہے اور شیعہ مذہب کی رد میں ان کا رویہ محض فروعی مسائل سے متجاوز نہ ہو سکا .... زیر نظر کتاب شیعہ اور قرآن جو پہلی مرتبہ ۱۳۴۲ھ میں "النجم" کے صفحات میں "تنبیہ الحائرین" کے نام سے جستہ جستہ شائع ہوئی اور بعد میں ۱۹۳۲ء/۱۳۵۲ء میں اس نام سے کتابی شکل میں شائع ہوئی" (ص)

مولانا عبدالشکور رحمۃ اللہ علیہ نے شیعہ حضرات کے رد میں یقیناً بڑا قیمتی کام کیا ہے اور ان کی اس سعی مشکور نے لکھنؤ کے سنیوں کو شیعی اثرات سے بڑی حد تک محفوظ کر دیا۔ مگر یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ اسلاف نے ان کے رد میں کوئی مثبت کام نہیں کیا اور ان کا کام فروعی مسائل کے رد تک محدود تھا۔ کیا امام ابن تیمیہ کی "منہاج السنہ" اور آخر میں شاہ عبدالعزیز کی "تحفہ اثنا عشریہ" صرف فروعی مسائل کے رد تک محدود ہیں؟ یہ دونوں کتابیں اس موضوع پر حرف آخر ہیں اور بعد میں جن لوگوں نے کام کیا وہ ان سے بے نیاز نہیں ہو سکے ہیں۔ یوں ہر بعد میں آنے والوں کے کام میں متقدمین کے مقابلہ میں جزئیات کی تفصیل ضرور زیادہ ہوتی ہے۔

بہرحال اس تحقیقی کتاب کے پڑھنے کے بعد قرآن کے سلسلہ میں شیعہ عقیدہ کی اچھی طرح پردہ دری ہو جاتی ہے۔

سہ ماہی تحقیقات اسلامی۔ علیگڑھ | نگراں مولانا صدرالدین صاحب اصلاحی۔ مدیر سید جلال الدین عمری۔ صفحات ۱۲۰۔ پتہ: پان والی کوٹھی۔ دودھ پور۔ علی گڑھ۔

جماعت اسلامی ہند نے ایک آزاد ادارہ "تحقیق وتصنیف اسلامی" کے نام سے قائم کیا ہے۔ جس کے پیش نظر

نوجوانوں کو تصنیف وتالیف کی تربیت دینا اور اسلامی مسائل پر تحقیقی مضامین اور کتابیں لکھنا ہے ۔ ادارہ کی طرف سے تصنیف وتالیف کی تربیت حاصل کرنے والوں کو دو سال تک تین سو روپے ماہوار وظائف دیئے جائیں گے۔

اس ادارہ نے ایک سہ ماہی پرچہ تحقیقات اسلامی کے نام سے نکالنا شروع کردیا ہے جس کا پہلا شمارہ پیش نظر ہے اور اس میں جتنے مضامین ہیں وہ سب سنجیدہ اور علمی و تحقیقی ہیں۔ اور لکھنے والوں میں ملک کے ممتاز حضرات شریک ہیں۔ امید ہے کہ رسالے کے ذمہ دار اپنی متوازن تحریروں سے بہت سی غلط فہمیاں دور کردیں گے جو جماعت اسلامی کے بارے میں پیدا کی جاتی ہیں۔

ادبی زاویے | از فخر الاسلام اعظمی ۔ صفحات ۱۴۴ - کتابت وطباعت عمدہ ۔ ملنے کا پتہ اسلامی کتاب گھر مین روڈ تکیہ اعظم گڈھ ۔ قیمت دس روپے پچاس پیسے

اس کتاب کے مرتب ایک اچھے عالم اور اورینٹل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڈھ میں پالیٹکل اور عربی کے لکچرر ہیں۔ ان کو شعر وسخن کا بھی ذوق ہے اور اردو نثر کے لکھنے پر بھی قدرت حاصل ہے۔ گو ان کی نظم ونثر میں ترقی پسندی کی کچھ جھلک ضرور دکھائی دیتی ہے مگر وہ کہیں غیر متوازن نہیں ہوتے۔ اس کتاب میں انہوں نے کچھ مستعار اور مروج ترقی پسندانہ ترکیبیں ضرور استعمال کی ہیں مگر ساتھ ہی شبلی طرز نگارش کی سادگی اور پرکاری کو بھی باقی رکھا ہے۔ اس میں انہوں نے بارہ ممتاز اور صاحب طرز شعراء کی شاعری کی خصوصیات پر اپنے اور دوسروں کے تاثرات پیش کئے ہیں ۔ یہ کتاب بی۔اے کے طالبعلموں کے معیار کے مطابق لکھی گئی ہے اور اس میں مرتب نے پوری کامیابی حاصل کی ہے۔ البتہ خواجہ میر درد کی مجازی شاعری کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے راقم الحروف کے لئے اتفاق کرنا دشوار ہے ۔ میر حسن کی مثنوی سحر البیان کے سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ میر حسن خواجہ میر درد کے شاگرد تھے اور ان کی مثنوی پر خواجہ صاحب کے علاوہ ان کے چھوٹے بھائی میر اثر کی مثنوی کی زبردست چھاپ ہے اس کا ذکر مرتب کو کرنا چاہئے تھا۔

موج صبا (دیوان) | از اختر مسلمی ۔ صفحات ۱۱۲ کتابت وطباعت عمدہ ۔ پتہ اختر مسلمی سرائے میر ۔ اعظم گڈھ ۔ قیمت دس روپے ۔

اختر مسلمی ضلع اعظم گڈھ کے ممتاز اور مشہور غزل گو شاعر ہیں۔ انہوں نے دوسرے اصناف

شاعری پر بھی لکھا ہے مگر ان کا اصل میدان غزل ہے۔ اس سے پہلے ان کا ایک مجموعہ ۱۹۶۱ء میں "موج نسیم" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور یہ ان کا دوسرا مجموعہ ہے جو "بہ قامت کہتر بہ قیمت بہتر" کا مصداق ہے۔ پورے مجموعہ میں ایسی کوئی غزل نہیں ہے جسے آدمی پڑھے اور غم و سرور کی ملی جلی کیفیت اس پر نہ طاری ہو جائے۔ ان کی غزلوں میں قدامت و جدت کا بہترین امتزاج ہے۔ اس وقت کے شعرا کے کلام کے جو مجموعے سامنے آتے ہیں۔ ان کی ایک دو غزلوں اور نظموں کا پڑھنا بھی ذوق سلیم پر بار ہوتا ہے۔ مگر اختر مسلمی کا پورا مجموعہ پڑھنے کے بعد بھی سیری نہیں ہوتی۔

یہ سطحیت اور نااہلوں کی قدردانی کا دور ہے۔ اس لئے اختر مسلمی اور ان کا کلام جس قدردانی اور توجہ و اعتنا کا مستحق تھا وہ اسے حاصل نہ ہو سکا۔ سنجیدہ ذوق رکھنے والوں کا فرض ہے کہ ان کے کلام کو ناقدری سے بچانے کی کوشش کریں۔ جامعۃ الرشاد میں ان کی حمد ہی سے بچوں کی دعا شروع ہوتی ہے۔

زرّین اقوال

ابوداؤد طیالسی رح فرماتے ہیں کہ عالم جب کوئی کتاب لکھے تو اسے مناسب ہے کہ نصرت اسلام کی نیت کرے۔ تالیف کی عمدگی پر اپنے ہمعصروں سے تعریف کی نیت ہرگز نہ کرے۔

عبداللہ بن مبارک رح فرماتے ہیں کہ آدمی اس وقت تک عالم رہتا ہے جبتک اسے یہ خیال ہو کہ شہر میں اس سے بھی زیادہ علم والے موجود ہیں۔ اور جب یہ خیال ہو کہ سب سے بڑا میں ہی ہوں تو وہ جاہل ہے۔

حسن بصری رح فرماتے ہیں۔ اہل علم زمانہ کے چراغ ہیں اور ہر عالم اپنے زمانہ کی روشنی ہے کہ اس کے علم سے اس کے اقران روشنی حاصل کرتے ہیں۔ اگر عالم نہ ہوتے تو لوگ کوتّے کرکٹ کی طرح ہوتے۔

ابراہیم ادہم رح فرماتے ہیں، جس کی یہ خواہش ہو کہ لوگ اسے اچھائی سے یاد کریں، وہ نہ متقی ہے اور نہ مخلص۔ (از اخلاق سلف)

خاکہ سامنے آجاتا ہے کہ اسکی روشنی میں صحیح اسلامی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دار المصنفین سے شائع ہوا تھا۔

اہل کتاب صحابہ و تابعین

مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی

اس کتاب میں ان صحابہ اور تابعین کا تذکرہ ہے، جو یہودی یا عیسائی تھے اور انھوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کتاب میں تقریباً سو صفحے کا ایک قیمتی مقدمہ بھی ہے جس سے عرب کے یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔

اس پر مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم کا دیباچہ بھی ہے اس موضوع پر دنیا کی کسی زبان میں کوئی مکمل کتاب موجود نہیں ہے۔

خطبۂ نکاح

نکاح کے موقع پر جو خطبہ دیا جاتا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور یہ ایک اہم معاشرتی ہدایت اور اصلاح معاشرہ کا پیغام ہے مگر عام طور پر اس کے الفاظ دہرا دئے جاتے ہیں اسکا پورا مفہوم لوگوں کے ذہن نشین نہیں ہو پاتا ہے، اس کتابچہ میں اسکے ایک ایک لفظ کی ایسی موثر تشریح کی گئی ہے کہ یہ ہر نکاح کے موقع پر تقسیم کرنے کے قابل ہے یہ تشریح مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی کے قلم سے ہے صفحات قیمت ۵۰ر

اہل دل کی باتیں

یہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتابگڈھی مدظلہ کے ان ملفوظات کا مجموعہ ہے جو وہ اپنی نجی مجلسوں میں اپنی پر اثر اور پرسوز زبان سے فرماتے رہے ہیں۔ اسے مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد نے مرتب کیا ہے۔ اس کا بہت سا حصہ ماہنامہ الفرقان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اب یہ جواہر پارے کتابی شکل میں دار التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد کی طرف سے شائع کئے جا رہے ہیں۔

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل

یہ محترم ناظم جامعۃ الرشاد کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو معارف اعظم گڈھ میں شائع ہو چکے ہیں یا مختلف سیناروں میں پڑھے گئے ہیں جس میں جدید مسائل کے حل کیلئے وہ بنیادیں فراہم کی گئی ہیں جنکی روشنی میں جدید سے جدید مسائل حل کئے جا سکتے ہیں۔ یہ کتاب جامعہ ملیہ نئی دلی سے شائع ہوئی ہے اور اس پر اردو اکیڈمی نے مصنف کو انعام بھی دیا ہے۔

ملنے کا پتہ: شکیل احمد منیجر مکتبہ جامعۃ الرشاد رشاد نگر شہر اعظم گڈھ۔ (یو۔ پی) قیمت ۱۶

ادارے کے شعبے

(۱) عربی درجات (۲) درجہ حفظ و قرأت (۳) ابتدائی تعلیم کے مکاتب و جونیر ہائی اسکول (۴) کتابت و جلد سازی (۵) اسلامی نرسری اسکول (۶) الجماعۃ الشرعیہ جس کے ذریعہ نکاح و طلاق کے مسائل کا فیصلہ کیا جاتا ہے (۷) شعبہ نشر و اشاعت جس کے تحت کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔

ان تمام شعبوں میں کئی سو طلبہ ابتدائی اور اعلیٰ دینی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ڈیڑھ درجن سے زیادہ لائق اساتذہ کام کر رہے ہیں۔

ادارے کا خرچ

ادارے کا سالانہ خرچ ایک لاکھ روپئے سے زیادہ ہے

ادارہ کی اہمیت اور خصوصیت

(۱) جامعۃ الرشاد میں اعلیٰ عربی تعلیم کے ساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم بھی پڑھائے جاتے ہیں۔ (۲) یہاں سے عالمیت پاس کرنے کے بعد بی اے میں براہ راست داخلہ مل جاتا ہے۔ (۳) سعودی عربیہ کی بعض یونیورسٹیوں نے ہر کلیہ میں اس کا معادلہ منظور کر لیا ہے۔ کئی طلبہ داخلہ لے کر فارغ ہوچکے ہیں اور اس سال بھی کئی طالب علموں کی درخواستیں بھیجی جا رہی ہیں (۴) اعلیٰ دینی تعلیم کے ساتھ بچوں کی بہتر دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے۔ جو لوگ بچوں کا داخلہ چاہتے ہیں ان کو [illegible] سے خط و کتابت کرنا چاہیے۔ مکتب کے بچوں کا داخلہ ۲۵ [illegible] کے بعد شروع ہوتا ہے۔

جون سنہ
جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان
ماہنامہ
جامعۃ الرشاد
مرتبہ
مجیب اللہ ندوی
دار التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ

سالانہ چندہ
ہندوستان سے 25/-
چندہ ششماہی 12/-
قیمت فی پرچہ 2/-

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان
ماہنامہ
الرشاد

سالانہ چندہ
ممالک غیر سے
بارہ ڈالر امریکی
کو 12/-

جلد (۲) | جون سنہ ۱۹۸۲ء | رمضان سنہ ۱۴۰۲ھ | شمارہ (۱۷)

فہرست مضامین

مجلس ادارت

رشحات

شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ

تاتاریوں کے حملے کے بعد جس طرح مسلمانوں کو علمی و دینی اور سیاسی اعتبار سے غیر معمولی نقصان پہنچا تھا۔ اور پورے عالم اسلام میں ایک جمود وسکوت بلکہ موت کا سناٹا طاری ہو گیا تھا مگر عین وقت پر اللہ تعالیٰ نے اس مایوسانہ فضا میں علمی و دینی اور سیاسی سطح پر کچھ ایسی قد آور شخصیتیں پیدا کر دیں کہ ان کے ذریعہ مسلمانوں میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی اور وہ تازہ دم ہو کر پھر رواں دواں ہو گئے بالکل اسی طرح ہندوستان میں جب عالمگیر کے بعد مسلمانوں کا سیاسی زوال شروع ہوا تو اس کا اثر زندگی کے دوسرے شعبوں پر بھی پڑنے لگا مگر اللہ تعالیٰ نے اسی دور میں سیاسی سطح پر حیدر علی، ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ جیسے باہمت لوگوں کو پیدا کر دیا جن کی وجہ سے مسلمانوں میں اور پورے ملک میں ایک نئی سیاسی حرکت پیدا ہوئی۔ اور علمی و دینی سطح پر شاہ ولی اللہ صاحب اور ان کے خانوادہ کو پیدا کر دیا۔ جنہوں نے مسلمانوں کی زوال پذیر دینی و علمی حالت کو قدرے سنبھالا دیا پھر اس کے بعد سید احمد شہید بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریک جہاد کے ذریعہ پورے ہندوستان کے مسلمانوں میں عملی طور پر دینی زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی اور ان کے اندر بڑی حد تک دینی و تہذیبی شعور کے ساتھ سیاسی شعور بھی بیدار ہوا مگر اب تک یہاں مسلمانوں کی ایک مرکزی سیاسی حیثیت باقی تھی جو ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد جاتی رہی۔ انیسویں صدی کا یہ انقلاب صرف ایک سیاسی انقلاب نہیں تھا بلکہ یہ انقلاب لانے والے اپنے ساتھ ایک نیا سیاسی نظام، ایک نئی تہذیب اور اسلام کیلئے ایک مشنری اسپرٹ کا نیا خطرہ لیکر آئے تھے۔ ہندوستان کی دوسری قوموں نے تو آسانی کے ساتھ اس نئے نظام سے مصالحت کر لی مگر مسلمان اس نئی تہذیب اور نئے نظام سے آسانی سے مصالحت نہیں کر سکتے تھے اس لئے کہ وہ ایسے دین کے ماننے

والے تھے جو اپنی علٰحدہ دینی حیثیت اور تہذیب رکھتا تھا. سیاسی و معاشرتی لحاظ سے بھی اس کے کچھ
امتیازات تھے۔ اس لیے ان کے اصحاب فکر کو یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ وہ اپنی دینی خصوصیات، تہذیبی
امتیازات کس طرح باقی رکھ سکیں۔ اس کیلئے کوئی اجتماعی مشورہ تو نہیں ہوا مگر ملت کے سوچنے والے افراد نے اپنی اجتماعی
احساس کے تحت انفرادی طور پر اپنے اپنے لئے ایک دائرہ مقرر کر کے کام شروع کر دیا۔ اور اللہ تعالیٰ
نے جس طرح ہر زوال کے موقع پر اپنے نام لیواؤں کی مدد کی تھی اس موقع پر بھی اس نے ہر شعبۂ زندگی
لئے کچھ غیر معمولی شخصیتیں پیدا کر دیں جن کی وجہ سے مسلمانوں کا دینی و ملی جذبہ، تہذیبی و معاشرتی امتیازات
سیاسی احساس زندہ رہا۔ دینی احساس پیدا کرنے والوں نے دینی مدارس کھول کر ملت کے دینی احساس
کو زندہ کرنے کی کوشش کی. کچھ مشائخ نے تزکیۂ نفس کے ذریعہ انہیں دینی روح پھونکنی شروع کر دی.
کچھ لوگوں نے جدید تعلیم کی ترویج میں اپنی قوت لگا دی. کہ مسلمان نوجوان اپنے ہم وطنوں سے مادی
سے پیچھے نہ رہ جائیں اور کچھ لوگوں نے سیاسی سطح پر مسلمانوں کیلئے جگہ بنانے میں اپنی توانائی صرف
ان سب کی سعی مشکور سے مسلمانوں کے اندر ایک نئی زندگی پیدا ہوئی. خاص طور پر شاہ ولی اللہ
ان کے خانوادہ اور سید صاحب کی تحریک کے بعد دینی مدارس کے ذریعہ ایک صدی کے اندر ایسی بڑی بڑی
شخصیتیں پیدا ہوئیں جنہوں نے متقدمین کے عہد سعادت کی یاد تازہ کر دی. انھیں میں ایک شخصیت شیخ الحدیث
مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بھی تھی. دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی مگر انھوں نے اپنے بزرگوں سے ورثہ میں
کی جو امانت پائی تھی اس کی حفاظت میں پوری زندگی لگا دی اور کسی دوسری طرف نگاہ اٹھا کر
نہیں دیکھا۔

تبع تابعین کے دور تک علماء کی ذات مدرسہ بھی ہوتی تھی اور خانقاہ بھی. مولانا زکریا صاحب
بھی یادگار سلف تھے کہ مدرسہ مظاہر علوم کو انھوں نے اپنی ذات سے مدرسہ و خانقاہ دونوں بنائے رکھا
مدرسہ مظاہر علوم کے طالب علم بھی رہے اور اس کے مدرس بھی ہوئے اور کچھ دنوں بعد اس کے
سب کچھ ہو گئے۔ مگر انھوں نے اپنی اس حیثیت سے کوئی ذاتی فائدہ نہیں اٹھایا ——

بقیہ صفحہ ۵۶ کا :- نے مذکورہ شرح کا بالکل تازہ اڈیشن خرید کر عزیزی محمد عامر، شادی کے
بھیج دیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

وہ تعلیم وتزکیہ کے کام میں زندگی بھر لگے رہے۔ یہ حقیقت ناقابل فراموش ہے کہ انکی ذاتی شخصیت اور تبلیغی جماعت کے معنوی سرپرست ہونے کی حیثیت سے مسلمانوں کو جتنا دینی فیض ان کے ذریعہ پہنچا اتنا اس دور میں کسی ایک شخصیت کا نہیں پہنچا۔ ہندوستان کے بڑے بڑے مدارس میں صرف مظاہر علوم ہی ایک ایسا مدرسہ رہ گیا ہے جو اپنی قدیم خصوصیات سے بالکل نہیں ہٹا ہے۔ ان کے پیش رو مولانا خلیل احمد اور ان کے والد محترم مولانا یحییٰ صاحب کے زمانہ میں نئی روشنی نے اتنی ہمہ گیری اختیار نہیں کی تھی اس لیے ان کا مدرسہ کو قدیم نہج پر چلانا آسان تھا۔ مگر اس زمانہ میں جب جدید تعلیم، نئی تہذیب اور نئی روشنی گھر گھر پہنچ گئی ہو اس کو اپنے قدیم روش پر باقی رکھنا ذرا آسان کام نہیں تھا۔ مولانا زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے درس وتدریس اور تزکیۂ نفس کے ساتھ تصنیف وتالیف کا شغل بھی زندگی بھر جاری رکھا۔ اور بے شمار عربی اور اردو کتابیں یادگار چھوڑ گئے ہیں۔ ان کی کتابیں زیادہ تر فن حدیث کے موضوع پر ہیں۔ ان کی کتابیں روایات کی جمع وترتیب اور تطبیق وتوجیہ کا بہترین نمونہ ہیں۔ مولانا کی ایک خصوصیت ان کا اعتدال بھی تھا وہ مختلف متضاد خیال رکھنے والوں سے تعلق رکھتے تھے اور اس کو نباہتے تھے۔ اسی بنا پر حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو تبلیغی جماعت کا معنوی سرپرست مقرر کر دیا تھا۔

مولانا کی وفات سے اس دور قحط الرجال میں ایک ایسا خلا پیدا ہوا ہے جس کے پورا ہونے کی بظاہر توقع نہیں معلوم ہوتی۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ہم سب کو ان کے طریقہ پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

یہاں اس بات کے ذکر میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ راقم الحروف کو اپنی طالب علمی کے دور میں کئی بار ان کی خدمت میں حاضری دینے کا موقع نصیب ہوا ہے۔ سہارنپور میں بھی اور تبلیغی جماعت کے مرکز میں بھی، ۱۹۴۳ء میں جب اسی آدمیوں کی جماعت لے کر مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ لکھنؤ تشریف لائے تھے اور ندوہ میں قیام تھا تو کھانا کھلانے اور برف میں پانی ملا کر ان کو پیش کرنے کی سعادت بھی اس حقیر کو حاصل ہوئی۔ راقم الحروف اس وقت طلبہ کی انجمن الاصلاح

کا ناظم تھا اس لئے ان کو طلبہ کی لائبریری کا تفصیلی معائنہ کرایا اور مولانا نے کتاب المعائنہ پر جو اپنے تاثرات لکھے از راہ شفقت اس کی ابتدا میں راقم الحروف کا جن الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ اس کو وہ اپنے لئے باعث سعادت سمجھتا ہے۔ پھر رحیم آباد کے اجتماع کے موقع پر میں نے اپنی زیر تالیف کتاب "اہل کتاب صحابہ وتابعین" کے بارے میں کچھ سوالات لئے تھے۔ جن کا انہوں نے از راہ عنایت جواب دیا۔ اور کچھ سوالات کے جواب کے لئے کتابوں کی نشان دہی کی۔

جامعۃ الرشاد کے قیام کے بعد مدرسہ کے ایک طالب علم مولوی عبید اللہ صاحب ان سے بیعت ہو گئے تھے۔ ان کے واسطے کبھی کبھی خط و کتابت بھی ہو جاتی تھی۔ سنہ ۱۹۷۰ء میں راقم الحروف کی ایک دواعی تقریر جو اس نے طلبہ کے سامنے کی تھی جو بعد میں "الفرقان" میں شائع ہوئی۔ شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ کی نگاہ جب اس پر پڑی تو از راہ شفقت انہوں نے رمضان میں اسے کئی سو کے مجمع میں پڑھوا کر سنوایا اور فرمایا کہ اسے تمام طلبہ اور اساتذہ کو پڑھنا چاہیئے۔ بغیر کسی خصوصی تعلق کے چھوٹوں کے ساتھ یہ شفقت انکی بلندی کی دلیل ہے۔

أُحِبُّ الصالحينَ ولستُ منهم
لعلَّ اللهَ يرزقني الصَّلاحا

بقیہ نئی کتابیں ۵۰ سے آگے۔

"علی شریعتی نے اس تقریر میں اقبال کی شاعری سے کچھ زیادہ بحث نہیں کی بلکہ اقبال کے اس پہلو پر انہوں نے زیادہ زور دیا جس کو ان کا مصلحانہ پہلو کہا جاسکتا ہے۔ تحریر و تقریر میں جو فرق ہوتا ہے اسے یہاں بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس ترجمہ کو اسی نقطۂ نظر سے پڑھنا چاہیئے"

علی شریعتی نے کئی جگہ اقبال کو "علی گونہ" اور علی ثانی وغیرہ لکھا ہے جس سے ذہن میں بہت سے سوالات ابھرے، بہرحال یہ تقریر اور اسکا ترجمہ قابل مطالعہ ہے۔

(مجیب اللہ ندوی)

دنیا میں بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کو کبھی نہ کبھی قرض اور ادھار لینے کی ضرورت نہ پیش آجاتی ہو ۔ یہ ضرورت صرف بے سہارا غریب و مجبور افراد ہی کو نہیں، بلکہ بڑے بڑے دولت مندوں اور بڑی بڑی حکومتوں کو بھی پیش آجاتی ہے ۔ ایک شخص گھر پر لاکھوں روپے کا مالک ہوتا ہے ۔ مگر سفر میں کبھی کبھار وہ چند پیسے کیلئے مجبور و محتاج ہو جاتا ہے، ایک آدمی ہزاروں روپے ماہوار کماتا ہے، اور اس کے بیوی بچے نہایت آرام و آسائش سے زندگی بسر کرتے ہیں، مگر ایسا اتفاق بھی ہوتا ہے کہ وہ یک بیک مر جاتا ہے اور اس کے بال بچے اپنی بنیادی ضرورتوں کے لئے بھی ہاتھ پھیلانے پر مجبور ہو جاتے ہیں ۔ بڑی بڑی حکومتیں جو دوسروں کو قرض دیتی ہیں جنگ کے زمانہ میں معمولی آمدنی رکھنے والے افراد تک سے قرضہ لیتی ہیں، غرض یہ کہ قرض ضرورتمندوں کے لئے ایک ایسا سہارا ہے جس سے وہ اپنی بہت سی انفرادی، اجتماعی، سیاسی اور معاشی ضروریات پوری کرتے ہیں، مگر یہ سہارا اسی وقت تلاش کرنا چاہئے، جب آدمی معاشی، معاشرتی یا سیاسی حیثیت سے بالکل محروم ہو جائے یا اس کی عزت و آبرو یا جان خطرہ میں پڑ جائے، یا کوئی شدید دینی ضرورت پیش آجائے ۔ ورنہ عام حالت میں قرض کو ایک بلا سمجھ کر اس سے جس قدر ہو سکے دور ہی رہنا چاہئے ۔ یہ بلا ایسی بلائے بے درماں ہے کہ ایک بار جس گھر کو دیکھ لیتی ہے یا جس شخص کا دامن تھام لیتی ہے تو مرنے کے بعد بھی اس کا دامن مشکل سے چھوڑتی ہے، دنیا میں بہت سے افراد ہی نہیں بلکہ بڑی بڑی حکومتیں اس کا شکار ہو چکی ہیں،

اور اب بھی آئے دن ہوتی رہتی ہیں۔

یوں تو قرض بذات خود ایک مصیبت ہے مگر اس کے دامن میں ایک اور چیز ہمیشہ لپٹی رہی ہے اور آج پہلے سے زیادہ اس سے لپٹی ہوئی ہے وہ ہے سود یا منفعت پرستی، یعنی جن لوگوں کو خدا نے آسودہ حال بنایا ہے وہ جب کسی پریشان حال آدمی کو قرض دیتے ہیں، تو یہ جذبہ ان میں بہت کم پیدا ہوتا ہے کہ قرض دینا ان کا ایک انسانی فریضہ تھا جسے انہوں نے ادا کیا، بلکہ خود غرضی اور منفعت پرستی ان کے دل میں یہ جذبہ پیدا کرتی ہے کہ قرض دار جب اس سے روپیہ لے کر اپنی ضرورت پوری کر رہا ہے، یا اس سے کوئی فائدہ اٹھا رہا ہے تو وہ بھی کیوں نہ اس کے بدلے میں کوئی مادی یا غیر مادی فائدہ حاصل کرے۔ جلبِ منفعت کا یہ جذبہ اس کو اس روپیہ کا سود لینے پر آمادہ کرتا ہے۔ چنانچہ اگر وہ اس سود میں کمی واقع ہوتے دیکھتا ہے، یا اس کے مارے جانے کا خطرہ ہوتا ہے تو اصل کی طرح اس کے بچانے کی بھی فکر کرتا ہے بلکہ اس کی وجہ سے کبھی کبھار وہ قرضدار کی عزت و آبرو سے بھی کھیلنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اور اگر کسی اخلاقی یا معاشرتی یا قانونی دباؤ کی وجہ سے وہ سود لینے سے باز رہا، اور اس کی عزت و آبرو سے نہ کھیلا تو پھر کم سے کم قرضدار کی طرف سے اس وقت تک ممنونیت کا اظہار چاہتا رہتا ہے جب تک وہ قرض ادا نہ کر دے، بلکہ بسا اوقات زندگی بھر قرضدار اسکی ممنونیت کے بارگراں سے سبکدوش نہیں ہوتا، وہ اپنی منفعت پرستی میں اتنا اندھا ہو جاتا ہے کہ وہ ایک لمحہ کیلئے بھی یہ بات نہیں سوچتا کہ جو شخص اصل رقم دینے کی قدرت نہ رکھتا ہو وہ سود کہاں سے دے گا، پھر یہ خیال بھی اس کو دامن گیر نہیں ہوتا کہ ممکن ہے کہ زندگی میں اس کے لئے بھی کوئی وقت آ جائے اور اسے بھی دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑ جائے، اور یہ مجرمانہ ذہنیت صرف اشخاص و افراد ہی کی نہیں بلکہ حکومتوں کی بھی ہوتی ہے، کوئی ملکی حکومت جب باشندگانِ ملک کو ان کی معاشی یا معاشرتی ترقی کے لئے کوئی قرضہ دیتی ہے تو دس بیس سال تک اصل رقم کے ساتھ اس رقم کا سود بھی وصول کرتی رہتی ہے اس طرح ایک قرض لینے والے کو اصل رقم کی ڈیڑھ گنا $1\frac{1}{2}$ یا کم از کم سوائی رقم $1\frac{1}{4}$ دینی پڑتی ہے۔ اسی طرح ایک حکومت جب کسی دوسری حکومت سے قرضہ لیتی ہے تو قرض لینے والی حکومت کو اصل روپیے کے ساتھ سود بھی دینا پڑتا ہے اور پھر سود کے ساتھ کچھ اور

سیاسی اور تجارتی حقوق بھی اس کو دینا پڑتے ہیں، جن کی وجہ سے قرضدار حکومت قرض خواہ حکومت کا ایک ضمیمہ بن کر رہ جاتی ہے، اس کی مثال تلاش کرنی ہو تو مشرق وسطی، ہندوستان اور خاص طور پر پاکستان میں روس وامریکہ کی مالی امداد اور قرضوں کی بھرمار پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ قرض کی بلانے ان ممالک کو کس قدر پابہ زنجیر کر دیا ہے، قرض کا معاملہ ایک اور حیثیت سے قابل غور ہے اور وہ یہ کہ یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ قرضدار قرض لے کر اس کو چکا بھی دے، اس لئے قرض خواہ کو اس کے بچاؤ کے لئے بہت سی تدبیریں اختیار کرنی پڑتی ہیں، مگر پھر بھی بسااوقات اس کا روپیہ مارا جاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں کچھ انسانی ہمدردی ہوتی ہے اور وہ سود لینے سے بھی گریز کرتے ہیں، وہ بھی اکثر قرض دینے سے اس لئے گھبراتے ہیں کہ کہیں ان کا روپیہ نہ مارا جائے۔

اسلامی شریعت کی ہدایات قرض چونکہ ایک ناگزیر انسانی ضرورت اور برے وقت کا ایک سہارا ہے اس لئے اسلامی شریعت نے آڑے وقت پر اس سہارے سے کام لینے کی اجازت تو دی ہے۔ مگر اسی کے ساتھ اس نے قرضدار اور قرض خواہ دونوں پر کچھ ایسی اخلاقی اور قانونی پابندیاں عاید کردی ہیں کہ ان کو اگر بروئے کار لایا جائے تو ضرورت مندوں کو آسانی سے قرض بھی مل جائے اور وہ سود کی لعنت اور قرض خواہ کی ممنونیت سے بھی نجات پا جائیں۔ اور قرضدار اور قرض خواہ دونوں ان تمام دوسرے مادی وغیر مادی نقصانات سے بچ جائیں، جو خود قرض دینے اور لینے کی صورت میں عام طور پر اٹھانے پڑتے ہیں۔

قرآن میں قرض کے بیان کے سلسلہ میں کہا گیا ہے کہ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (نہ تم کسی پر ظلم کرنے پاؤگے اور نہ تم پر کوئی ظلم کرنے پائے گا)

حدیث میں ہے لَا ضَرَرَ وَلَا ضِرَارَ (نہ خود نقصان اٹھاؤ اور نہ دوسروں کو نقصان پہنچاؤ) اسلامی شریعت نے آسودہ حال لوگوں کو اس بات کی ترغیب دی ہے کہ وہ ضرورتمندوں، غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی معاشی ضرورت وحاجت کا خود خیال رکھیں، اگر وہ سوال کریں تو بغیر کوئی معاوضہ لئے ان کی مدد کریں، اور اگر وہ شرم وحیا سے سوال نہ کرسکیں تو وہ خود ان کی ضرورت معلوم کرکے ان کی ضرورت پوری کریں، اگر وہ اس طرح کوئی مدد نہیں کرسکتے تو اگر کوئی اپنے کسی آڑے

وقت پر ان سے قرض طلب کرے تو اس کو کم از کم قرض تو دے ہی دیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

ما من مسلم یقرض مسلماً قرضاً مرتین الا کان کصدقتہا مرۃ	کوئی مسلمان جب کسی مسلمان کو دو بارہ قرض دے دیتا ہے تو اس کا ثواب وہی ہوتا ہے جو ایک بار صدقہ دینے کا ہوتا ہے۔

یعنی ایک آسودہ حال مسلمان کی ذمہ داری تو یہی ہے کہ وہ ضرورت مند کی ضرورت بغیر اس کی واپسی کی امید کے پوری کر دے (اسی کو صدقہ کہتے ہیں) لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو کم سے کم اس کو بغیر سود کے قرض ہی دے دے، اس سے بھی وہ کسی نہ کسی حد تک اپنی صدقہ والی ذمہ داری پوری کرے گا، اس لئے وہ اسی اعتبار سے اجر کا بھی مستحق ہوگا۔ اور جب وہ بار بار ایسا کرے گا تو اس کا یہ تھوڑا تھوڑا اجر اس اجر کا مستحق بنا دے گا جو اس کو ایک صدقہ کی صورت میں ہوتا ہے، مقصد یہ ہے کہ قرض دینے میں بھی ثواب ہے مگر صدقہ سے کم، قرض دے کر اس کی ادائگی کی مہلت دینا اگر غریب ہو تو معاف کر دینا ایسا غیر معمولی کام ہے کہ اس کا اثر آخرت میں مغفرت کی شکل میں نمودار ہوگا، قرآن میں ہے کہ:-

وَاِنْ کَانَ ذُوْ عُسْرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیْسَرَۃٍ وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ	اگر قرضدار تنگ دست ہے تو کشادگی تک مہلت دینا چاہئے اور اگر بالکل معاف (صدقہ) کر دو تو یہ بات زیادہ بہتر ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت سے پہلے کے ایک نیک آدمی کا واقعہ بیان فرمایا کہ

---

[1] یہاں مسلمان کے لفظ سے یہ دھوکہ نہ ہو کہ غیر مسلم کو قرض حسنہ دینا ثواب نہیں ہے، یا اسے قرض دینا جائز نہیں ہے۔ جس طرح مسلمان کو قرض دینا ثواب ہے اسی طرح غیر مسلم کو بھی قرض دینا ثواب ہے۔ جس طرح کسی مسلمان سے قرض لینا جائز ہے، اسی طرح غیر مسلم سے بھی لیا جا سکتا ہے۔ البتہ سودی قرض چاہے مسلمان سے لیا جائے یا غیر مسلم سے ناجائز ہے۔ دونوں کا حکم ایک ہے۔

ان رجلاً کان فیمن کان قبلکم اتاه الملك لیقبض روحه فقیل له هل عملت من خیر قال ما اعلم قیل له انظر قال ما اعلم غیر انی کنت ابایع الناس فی الدنیا واجازیهم فانظر الموسر واتجاوز عن المعسر فادخله الله الجنة

صحابہ کرام سے آپ نے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم سے پہلے جو لوگ گذرے ہیں ان میں ایک آدمی تھا۔ جب موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے آیا، تو اس سے پوچھا گیا کہ تم نے کوئی نیک کام کیا ہے؟ بولا مجھے تو اپنے نامۂ اعمال میں کوئی نیک کام نظر نہیں آتا پھر کہا گیا کہ غور کرو، غور کرنے کے بعد اس نے کہا کہ مجھے اس کے علاوہ اپنا کوئی نیک کام نظر نہیں آتا کہ میں لوگوں سے ادھار لین دین کرتا تھا اور ان کو معاف کرتا تھا۔ یعنی اگر کوئی ادھار مال لے گیا تو اگر وہ خوش حال ہے تو اس کو قیمت کی ادائیگی کی مہلت دیتا تھا اور اگر وہ تنگ حال ہوا تو اس کو معاف کر دیتا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس نیکی کے بدلہ میں اس کو جنت میں داخل کر دیا۔

ایک روایت میں ہے، آپ نے (صلی اللہ علیہ وسلم) فرمایا:-

من سرہ ان ینجیه الله من کرب یوم القیامة فلینفس عن معسر او یضع عنه

(مسلم)

جس شخص کو یہ بات پسند ہو کہ وہ قیامت کی الم ناک سختیوں سے نجات پا جائے تو اس کو چاہئے کہ تنگ دست مقروض کو زیادہ سے زیادہ مہلت دے یا پھر پورا قرضہ ہی معاف کر دے

بلا ضرورت قرض لینے کی مذمت

اسلامی شریعت نے شدید معاشی ضرورت یا اپنی عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے قرض لینے کی جو اجازت دی ہے، وہ اجازت ایسی ہی ہے جیسے کسی مجبور

آدمی کے لئے مردار کھانے کی اجازت کہ اگر کوئی شخص بغیر کسی مجبوری کے لذت کیلئے یا عادت کے طور پر مردار کھانے لگے، یا کھانے پر مجبور تو ہو مگر حد رمق سے زیادہ کھا جائے تو اسلام میں اس کا یہ فعل حرام ہوگا، اور قانوناً وہ سزا کا مستحق ہوگا، بالکل اسی طرح قرض کی اجازت مجبوری کی اجازت ہے۔ اب کوئی شخص فضول خرچی تعیش یا اپنی عرفی ساکھ اور مصنوعی معیار زندگی کو قائم رکھنے کیلئے قرض لے، یا قرض لے تو کسی مجبوری ہی سے مگر اس کی ادائیگی سے بے خبر ہو جائے یا استطاعت کے باوجود ٹال مٹول کرے تو وہ اخلاقاً بھی مجرم ہوگا اور قانوناً بھی۔ یعنی وہ آخرت میں بھی پکڑا جائے گا، اور دنیا میں بھی اس کو سزا ملنی چاہیئے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا وجہ قرض لینے اور پھر اس کی ادائیگی نہ کرنے کو انتہائی ناپسند فرمایا ہے، آپ کے پاس جب کوئی جنازہ لایا جاتا تھا تو آپ دریافت فرماتے کہ اس نے کوئی قرض تو نہیں چھوڑا ہے اگر وہ قرض چھوڑ کر مرا ہوتا اور ادائیگی کے لئے کوئی ترکہ بھی نہ چھوڑ گیا ہوتا آپ اس کی نماز جنازہ ادا نہیں فرماتے تھے۔ ایک بار ایک صحابی کا جنازہ لایا گیا، آپ نے لوگوں سے دریافت فرمایا کہ "هَلْ عَلَيْهِ دَيْنٌ"، ان پر کوئی قرض تو نہیں ہے؟ لوگوں نے کہا کہ ہاں دو دینار کے مقروض مرے ہیں، آپ نے فرمایا کہ ان کی نماز جنازہ تم لوگ پڑھ لو، حضرت ابو قتادہ صحابی بولے کہ یا رسول اللہ! ان کے دونوں دینار کی ادائیگی کا میں ذمہ دار ہوں، اس کے بعد آپ نے ان کی نماز جنازہ پڑھی۔

آپ قرض کو اتنی مذموم اور قابل نفرت چیز تصور فرماتے تھے کہ سوتے وقت اور پنج وقتہ نمازوں کے آخر میں گناہ کے ساتھ اس سے بھی پناہ مانگتے تھے "اَعُوْذُ مِنَ الْمَاْثَمِ وَالْمَغْرَمِ" میں گناہ اور قرض کے بار گراں سے پناہ مانگتا ہوں"!

ایک بار آپ نے کفر اور قرض دونوں سے پناہ مانگی، ایک صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ قرض کو کفر کے برابر قرار دیتے ہیں۔ فرمایا، ہاں۔ (نسائی، حاکم)

ایک مومن کو اسلام کسی حال میں بھی ذلیل دیکھنا نہیں چاہتا اور قرض ایسی بلا ہے کہ اس میں آدمی ذلیل ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب خدائے تعالیٰ کسی بندہ کو ذلیل کرنا

چاہتا ہے تو اس کی گردن پر قرض کا بار رکھ دیتا ہے۔ (حاکم)

قرضدار آدمی کی کیفیت وہی ہوتی ہے جو ایک قیدی کی ہوتی ہے۔ یعنی جس طرح قیدی میں بلندی، عزت اور آزادی کے بجائے احساس کمتری ذلت اور غلامی کا تصور پیدا ہو جاتا ہے، اسی طرح مقروض میں یہ باتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو کچھ نصیحت فرمائی جس میں یہ بھی فرمایا کہ قرض کم لیا کرو، آزاد ہو کر زندہ رہو گے (بیہقی)

آپ صحابہ کو قرض کی ادائیگی کی دعا کی تلقین فرمایا کرتے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ایک بار یہ دعا سکھائی۔

اللھم اکفنی بحلالک عن	اے اللہ! اپنے حلال رزق کے ذریعہ حرام
حرامک واغننی بفضلک	سے بچا اور اپنے فضل سے مجھ کو ان لوگوں
عمن سواک۔	سے بے نیاز کر دے جو تیرے سوا ہیں۔

آپ نے سونے جاگنے نماز پڑھنے اور دوسرے اوقات میں قرض سے پناہ مانگنے اور اس کی ادائیگی کی تعلیم کئی مقصد سے فرمائی، ایک یہ کہ مقروض آدمی کے ذہن میں ہر وقت یہ بات تازہ رہے کہ اس کو قرض ادا کرنا ہے ــــــــــــــ دوسرے یہ کہ وہ صرف اپنی قوت بازو ہی پر اعتماد نہ کرے بلکہ اس کو خدا سے توفیق بھی طلب کرتے رہنا چاہئے۔ ورنہ ممکن ہے کہ وہ ادا کرنے کی کوشش کرے اور کامیاب نہ ہو۔

قرض کے سلسلہ میں اسلامی حکومت کی ذمہ داری

قرض دینے کے سلسلہ میں اسلامی حکومت پر بھی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ضرورتمندوں کو بیت المال (سرکاری خزانہ) سے غیر سودی قرضے دے اور اگر وہ ادا نہ کر سکیں تو اصل رقم بھی معاف کر دے، ابتدائے اسلام میں جب تک مہاجرین وانصار تنگ دست تھے، اور اسلامی حکومت کا بیت المال خالی تھا، اس وقت تک آپ مردہ مقروض کے جنازہ میں اس لئے توقف فرماتے تھے کہ اعزا و اقارب یا معاشرہ کے خوش حال افراد سبقت کر کے اس کا قرض ادا کر دیں، لیکن جب بیت المال میں کچھ رقم جمع ہونے لگی تو پھر آپ نے تنگ دست مقروض کی ادائیگی حکومت کے ذمہ دار اور نبی

کی حیثیت سے اپنے ذمہ لی۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ابتدا میں تو آپ مقروض مردہ کی نماز جنازہ میں اس وقت تک توقف فرماتے تھے جب تک کوئی ادا نہ کردے مگر

فلما فتح اللہ علی رسولہ قال انا اولی بالمؤمنین من انفسہم فمن ترک دینا فعلی قضاءہ ومن ترک مالا فلورثتہ (بخاری مسلم)

جب اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح دی اور آپ کے پاس مال آنے لگا تو آپ نے فرمایا کہ میں (یعنی حکومت) ہر مومن کا ان کے اپنوں سے بھی زیادہ ذمہ دار اور ہمدرد ہوں، تو جو شخص قرض چھوڑ کر مرے اس کی ذمہ داری مجھ پر یعنی حکومت پر ہے اور جو کچھ وہ مال چھوڑ کر مرے وہ اس کے ورثہ کا حق ہے۔

حکومت کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ جو لوگ دوسروں سے قرض لے کر ادائیگی کی قدرت ہوتے ہوئے ٹال مٹول کرتے ہیں، ان سے بجبر قرض وصول کرائے۔

یعنی حکومت نہ تو خود کسی کا حق مارے گی اور نہ دوسروں کے حق کو حتی الامکان ضائع ہونے دے گی۔

حکومت کی یہ ذمہ داری صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی تک نہیں تھی، بلکہ عہد خلافت راشدہ اور بعد کے زمانوں میں بھی اس پر عمل کیا گیا ہے، اس تعلیم ہی کا یہ اثر ہے کہ آج بھی مسلم معاشرہ میں بلا سودی قرض دینے کا جتنا رواج ہے اتنا کسی معاشرہ میں نہیں ہے۔

قرض کے معنی اور اس کی تعریف قرض اور ادھار کے لئے عربی میں دو لفظ استعمال ہوتے ہیں، ایک قرض، دوسرے دین، دین کے لفظی معنی بدلہ کے ہیں یعنی اس لفظ میں یہ بات پوشیدہ ہے کہ قرض دے کر آدمی صرف اس کا پورا پورا بدل ہی لے سکتا ہے، زیادہ یا کم نہیں، قرض کے معنی کاٹ دینے کے ہیں، اسی لئے قینچی کو عربی میں مقراض کہتے ہیں، جو آدمی قرض یا ادھار کوئی چیز یا رقم دیتا ہے وہ اپنی آمدنی یا جمع شدہ رقم کا

ایک [illegible] کر اس کو دیتا ہے، اور غالباً اس لئے بھی اس کو قرض کہتے ہیں کہ اگر قرض خواہ اور قرضدار شرعی حدود کی پابندی نہ کریں تو پھر دونوں کے تعلقات کو یہ چیز کاٹ دینے کا سبب بھی ہوتی ہے، اس لئے یہ ضرب المثل بن گئی ہے کہ "القرض مقراض المحبة۔ قرض محبت کی قینچی ہے) دین کا لفظ ذرا عام ہے اور قرض کا خاص ہے۔ یعنی قرض محض اس نقد یا جنس کو کہیں گے جو کسی کو واپسی کیلئے دی جائے اور دین ہر طرح کے بقایا کو کہتے ہیں۔ مثلاً آپ نے کوئی چیز خریدی اور قیمت باقی ہے تو اس کو قرض نہیں کہیں گے، اسی طرح آپ نے قیمت لے لی، مگر مال ابھی نہیں دیا تو یہ مال آپ کے ذمہ دین ہوا اس کو قرض نہیں کہیں گے؟ غرض یہ کہ ہر قرض کو دین تو کہہ سکتے ہیں مگر ہر دین کو قرض نہیں کہہ سکتے، اوپر قرض خواہ اور قرضدار دونوں کی اخلاقی ذمہ داریوں اور ہدایتوں کا ذکر کیا گیا ہے، اب دونوں کی قانونی ذمہ داریوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

قرض اور ادھار کا معاملہ لکھ لینا چاہئے

قرآن و حدیث دونوں میں قرض و ادھار معاملہ کو لکھ لینے کی تاکید آئی ہے گو کہ نہ لکھنے میں کوئی گناہ نہیں ہے، کیونکہ یہ تاکید صرف اس لئے دی گئی ہے کہ دونوں کو اطمینان رہے، اگر بغیر لکھے ہوئے بھی یہ اطمینان حاصل ہو جائے تو اس کی ضرورت نہیں ہے۔

قرض دینے والے کو ہدایتیں

(۱) اوپر قرض دینے کی فضیلت اور اس سلسلہ میں اسلامی حکومت کی جس ذمہ داری کا ذکر کیا گیا ہے، اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ افراد کے لئے قرض دینا تو ان کی طرف سے ایک تبرع اور انعام ہے، اگر کوئی شخص استطاعت کے باوجود قرض نہ دے تو اخلاق و دیانت کے اعتبار سے وہ مجرم ضرور قرار پائے گا، مگر اس پر کوئی جبر نہیں کیا جا سکتا کہ وہ لامحالہ قرض دے ہی دے، مگر اجتماعی ذمہ داری جس کی نمایندگی حکومت کرتی ہے اس کا فرض ہے کہ وہ بہر حال بے سہارا افراد کی مدد کرے، خواہ صدقہ دیکر یا قرض دے کر۔

(۲) قرض خواہ چاہے حکومت ہو یا افراد، ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اس قرضہ پر سود نہ لیں سود سے مراد وہ متعین رقم ہے، جو آدمی کسی مال یا چیز کے بدلے میں بغیر کسی عوض کے دیتا یا لیتا ہے، سودخوار

قرض دینے کے عوض میں لیا جائے ، جیسے مہاجنی سود ، یا روپے سے منفعت اٹھانے کی وجہ سے کوئی شخص یا کوئی ادارہ یہ رقم دے جیسے تجارتی اور بینک وڈاک خانہ کا سود ، یہ سب ناجائز ہے اسلامی شریعت کا یہ اصول ہے ۔

کل قرض جرّ نفعا فهو ربا — جو قرض نفع کھینچ لادے وہ سود ہے

(۳) نفع اٹھانے کی کچھ صورتیں تو وہ ہیں جو اوپر بیان ہوئی ہیں ، اس کی اور بھی بے شمار قسمیں ہیں ، غرض قرض سے نفع اٹھانے میں ہر طرح کا مادی یا غیر مادی نفع سود میں داخل سمجھا جائے گا ۔ مثلاً قرض خواہ قرضدار سے اپنی نیاز مندی کرانا چاہے ، یا تحفہ تحائف کا طلبگار ہو ، تجارت اور دوسرے معاملات میں رعایت چاہے تو یہ تمام صورتیں ناجائز اور بعض حرام ہیں ۔ اوپر ذکر آچکا ہے کہ ایسی تجارت یا خرید و فروخت مکروہ یا باطل ہے ، جس میں مقروض سے فائدہ اٹھایا جائے ، قرآن میں قرض حسنہ کی تعریف بیان کی گئی ہے ، یعنی ایسا قرض جس میں نہ سود ہو اور نہ مدت کی تعیین ہو ، اور نہ اظہار احسان ہو ، اس طرح قرآن میں کسی کی مدد کرکے یا کسی کی ضرورت پوری کرکے احسان کرنے والوں کے مال کو چٹان کے اوپر کی مٹی سے تشبیہ دی گئی ہے ، کہ ایک ہلکی سی بارش سے وہ دھل جاتی ہے اسی طرح حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

اذا اقرض احدكم قرضا فاهدى اليه او حمله على الدابة فلا يركبه ولا يقبلها الا ان يكون جرى بينه وبينه قبل ذالك (ابن ماجہ ، بیہقی)	جب کوئی کسی کو قرض دے تو مقروض اگر اس کے پاس کوئی ہدیہ بھیجے یا اسے اپنی سواری پر سوار کرے تو اس کو نہ تو سواری استعمال کرنا چاہئے اور نہ اس کا ہدیہ قبول کرنا چاہئے ، البتہ اگر قرض دینے سے پہلے سے اس کے تعلقات ہوں اور تحفہ تحائف دینے کا معمول رہا ہو تو کوئی حرج نہیں ہے ۔

محدثین نے اس حدیث کو قرض کے بیان میں نہیں بلکہ سود کے بیان میں ذکر کیا ہے ، گویا مقروض کا ہدیہ بھی ایک طرح کا سود ہے ۔

(۴) قرض خواہ نے قرض ادا کرنے کی اگر کوئی مدت مقرر کر دی ہے تو مدت گزرنے سے پہلے بھی وہ تقاضا کرسکتا ہے، گو اخلاقاً ایسا نہ کرنا چاہئے مگر قانوناً اس کو اس کا حق ہے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ اس کو شدید ضرورت پیش آگئی ہو۔ قرض دار قرض ادا نہ کرسکے تو قرض خواہ اگر اس کو مزید مہلت دینا نہیں چاہتا تو اس کو یہ حق ہے کہ وہ سختی سے وصول کرے۔ گو اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ جو شخص ابھی دینے کے قابل نہ ہوا ہو اس کو مزید مہلت دے مگر قانوناً اس کو مجبور نہیں کیا جا سکتا، ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی سے کوئی جانور قرض لیا تھا، ادائیگی کی مدت گزر گئی تو اس نے ذرا سختی سے تقاضہ کیا، صحابہ کو اس کی یہ بدتمیزی بری معلوم ہوئی۔ مگر آپ نے فرمایا کہ:

دعوہ ان لصاحب الحق مقالا — صاحب حق کو سخت کلامی کا حق حاصل ہے

اس کے بعد آپ نے صحابہ سے کہا کہ ایک جانور اس سے اچھا خرید کر اس کو دے دو۔ چنانچہ دے دیا گیا۔ (بخاری و مسلم)

(۵) اگر مقروض قرض ادا کر دینے کی قدرت رکھتا ہے اور اس کے باوجود ادا نہیں کرتا ہے تو پھر اس کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ:

مَطلُ الغنيِ ظلمٌ — مالدار کی ٹال مٹول ظلم ہے۔

لَيُّ الواجدِ يحلّ عِرضَهٗ وَ عقوبَتَهٗ (ابوداؤد، نسائی) — روپے رکھتے ہوئے ٹال مٹول کرنے والے کی عزت اور سزا حلال ہو جاتی ہے۔

یعنی قرض خواہ ایسے شخص کو برا بھلا کہہ سکتا ہے، اس کے ساتھ سختی کر سکتا ہے، اس کو مشتہر کر سکتا ہے۔ اس کے خلاف دعویٰ کر کے سزا دلوا سکتا ہے۔

چنانچہ اسی بنا پر فقہاء نے لکھا ہے کہ جو شخص تنگدست یا مجبور ہو اس کو تو کوئی سزا نہیں دی جا سکتی، لیکن اگر قرض کی ادائیگی کی صلاحیت رکھتے ہوئے کوئی شخص ٹال مٹول کرے تو پھر اس کو قید بھی کیا جا سکتا ہے، اس بارے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ تو کہتے ہیں کہ خوشحال اور بدحال میں کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا، بلکہ دونوں حالت میں سزا دی جا سکتی ہے۔ مگر دوسرے ائمہ رحمۃ اللہ علیہم تنگدست اور بدحال کو قید کرنے کی اجازت نہیں دیتے، بلکہ یہ سزا انہوں نے

صاحب قدرت ہی کے لئے مقرر کی ہے، حدیث نبوی سے بظاہر ان ائمہ کرام ہی کی رائے زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے، بشرطیکہ کسی غریب نے قرض لے کر ہڑپ کر جانا ہی اپنا پیشہ نہ بنالیا ہو، اگر ایسا ہے تو اس کو امام صاحب کے قول کے مطابق بہر حال سزا دی جائے گی۔

قرض لینے والے کو ہدایتیں

(۱) قرض کسی ہنگامی یا انتہائی شدید معاشی ضرورت کے وقت لینا چاہئے، اگر کوئی شخص بغیر کسی شدید ضرورت یا فضول خرچی یا تعیش کے لئے قرض لینا چاہے، تو اس کو نہ تو معاشرہ کے افراد کو قرض دینا چاہئے اور نہ حکومت اس کو قرض دے گی، بلکہ ایسے شخص کو حکومت سزا بھی دے سکتی ہے، کیونکہ تعیش پسند اور فضول خرچ آدمی قرض لینے کے بعد اس کو مشکل ہی سے ادا کر سکتا ہے۔ اور اس طرح بہت سے لوگوں کا حق اور روپیہ مارا جائے گا۔

(۲) جوں ہی قرض ادا کر سکنے کے قابل ہو فوراً اسے ادا کر دینا چاہئے، اوپر حدیث آچکی ہے کہ جس کو مقدور ہو اور وہ ادا نہ کرے تو وہ ظالم ہے، اس کی بے عزتی و بے آبروئی بھی کی جا سکتی ہے

(۳) اگر قرض خواہ خود ضرورت مند ہو جائے تو قرضدار کو اپنی جائداد اور گھر کا اثاثہ بیچ کر بھی اس کا قرض ادا کرنا چاہئے۔ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ طبعاً بڑے سخی تھے، ان کے پاس کچھ رقم آئی، انھوں نے خرچ کر دیا، چنانچہ وہ بالکل قرض میں ڈوب گئے، ہر طرف سے قرض خواہوں نے مطالبہ شروع کیا۔ آپ نے ان لوگوں سے غالباً قرض چھوڑ دینے کے لئے کہا مگر وہ راضی نہیں ہوئے، چنانچہ معاملہ خدمت نبوی میں آیا ان کے پاس جو کچھ تھا آپ نے وہ سب فروخت کر کے قرض خواہوں کا قرض ادا کیا، اور حضرت معاذ کے پاس کچھ باقی نہ رہا۔ (منتقی)

(۴) اگر ضرورت ہو تو معاشرہ کے افراد سے چندہ کر کے بھی قرض خواہ کی رقم واپس کی جا سکتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ایک صحابی کا قرض صحابہ کی مدد سے ادا کرایا تھا (مسلم)

یہ اس وقت کا حکم ہے جب کوئی اجتماعی ادارہ یا حکومت اس کی ذمہ داری نہ لے، اور پھر ایسا کرنا اسی وقت صحیح ہوگا کہ جب قرضدار کے حالات ایسے ہوں کہ وہ دے نہ سکتا ہو اور

قرض خواہ کو شدید ضرورت ہو اور دوسرا کوئی ذریعہ نہ ہو۔

۵۔ معاشرہ کے آسودہ حال افراد کی ذمہ داری یہ بھی ہے کہ اگر کوئی تنگ دست قرض خواہ ہوں سے بچنے کے لیے ان کو ذمہ دار اور ضامن بنائے تو وہ ضامن بن جائیں۔

کون سی چیزیں قرض میں لی دی جاسکتی ہیں

قرض کے لینے یا دینے میں یہ شرط ہے کہ جیسی چیز لی جائے، حتی الامکان ویسی ہی واپس کی جائے، اس لئے ایسی تمام چیزیں جن کے مثل دوسری چیزیں گن کر یا تول کر یا ناپ کر آسانی سے واپس کی جاسکتی ہیں، ان کو قرض کے طور پر لیا دیا جاسکتا ہے، مثلاً آپ کسی سے چند روپے یا چند آنے قرض لیں، تو آپ اتنے روپے یا آنے آسانی سے واپس کرسکتے ہیں۔

یا مثلاً آپ کے گھر میں مہمان آگیا اور آپ نے اپنے پڑوس سے گھی، تیل، آٹا تول کر یا ناپ کر یا روٹی، انڈا یا اور کوئی چیز بطور قرض منگالی اور پھر بازار سے منگا کر دے دیا، تو یہ بھی جائز ہے، اور آپ نے اس کی قیمت ادا کردی تو یہ بھی جائز ہے، اسی طرح اگر آپ نے کسی سے ایک من گیہوں یا دس گز کپڑا ادھار لیا، تو آپ اسی طرح کا ایک من گیہوں بھی واپس کرسکتے ہیں اور دس گز کپڑا بھی۔ اور اگر آپ نے گیہوں یا کپڑا نہ ادا کیا تو قیمت بھی ادا کرسکتے ہیں لیکن اگر وہ کپڑا ایسا ہے کہ بازار میں اس کی طرح کا کپڑا ملنا مشکل ہے تو آپ وہ کپڑا قرض نہیں لے سکتے، مقصد یہ ہے کہ ایسی چیز جو بازار میں مل سکتی ہو اور اس کی قیمت آسانی سے لگائی جاسکتی ہے وہی قرض میں لی جاسکتی ہے۔

ضروری ہدایتیں

اس سلسلہ میں حسب ذیل باتیں ذہن نشیں رہنی چاہئیں

(۱) قرض میں لی ہوئی چیز اگر بازار میں گراں یا ارزاں ہو جائے تو اس کا اثر قرض پر نہیں پڑے گا، مثلاً کسی نے دو من گیہوں یا ایک من شکر یا گڑ قرض لیا، اور اس وقت گیہوں، شکر اور گڑ کا بھاؤ سستا تھا اس کے بعد پھر جب ادائیگی کا وقت آیا تو گراں ہوگیا، تو اس کا کوئی اثر ادائیگی پر نہیں پڑے گا۔ قرض دار کو اتنا ہی گیہوں، شکر، گڑ ادا کرنا ہوگا۔

اور اگر قرض خواہ راضی ہو جائے تو پھر قیمت بھی وہ لے سکتا ہے۔

(۲) اگر کسی نے ایک ایک روپے کے سَو نوٹ یا ریزگاری قرض میں لی تو یہ ضروری نہیں ہے کہ قرضدار ریزگاری یا ایک ایک کے نوٹ ہی دے، بلکہ اس کو روپے دینا چاہیئے، خواہ نوٹ دے یا دھات کے روپے یا سَو روپیہ کا نوٹ سب جائز ہے۔

(۳) جو چیز جہاں جس طرح بکتی یا دی جا سکتی ہو، اسی طرح لینی اور دینی چاہیئے، مثلاً اگر کوئی چیز کہیں گن کر بکتی ہے۔ مثلاً انڈے، سنترے وغیرہ تو یہ چیزیں گن ہی کر واپس کی جانی چاہئیں، اگر کوئی چیز تول کر بکتی ہے مثلاً گیہوں، تیل، مسالہ، میدہ وغیرہ تو تول ہی کر واپس کی جائیں۔ اسی طرح جو چیزیں جہاں ناپ کر بکتی ہیں، مثلاً کپڑا، سمینٹ، چونا وغیرہ تو وہ ناپ ہی کر واپس کی جائیں گی۔

(۴) اگر کوئی چیز دونوں طرح سے بکتی ہے تو جس طرح بکتی ہے اسی طرح سے واپس کی جائے گی، مثلاً کاغذ اگر دو چار دستے بکتے ہیں تو گن کر اور ریم کے اعتبار سے بکتے ہیں تو وزن کر کے تو جس طرح لیا ہے اسی طرح واپس کرنا چاہیئے یا آٹا اگر وزن کے بجائے ناپ کر قرض لیا تو ناپ ہی کر واپس کرنا چاہیئے۔

(۵) جس جگہ پر قرض لیا گیا ہے، قرض خواہ اپنا وہ قرض دوسری جگہ بھی لے سکتا ہے، مثلاً اگر کسی نے لکھنؤ میں قرض لیا اور قرض خواہ نے بمبئی میں اس سے مطالبہ کیا تو قرض دار یا تو وہیں قرض ادا کرے، یا پھر کوئی ضامن دے کہ میں لکھنؤ جا کر قرض دوں گا، یہ اس صورت میں ہے جب قرض روپے پیسے ہوں، لیکن اگر قرض نقد کے بجائے جنس ہے، مثلاً غلہ، کپڑا، اینٹ پتھر وغیرہ تو پھر قرض خواہ دوسری جگہ مثلاً بمبئی میں اگر مطالبہ کرتا ہے تو قرض دار کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ وہی جنس وہاں ادا کرے بلکہ وہاں وہ قیمت بھی دے سکتا ہے، قرض خواہ اگر لینا چاہے تو قیمت لے لے، کیونکہ کسی غیر جگہ پر کسی جنس کا ادا کرنا دشوار ہے، البتہ اگر قرض دار وہی جنس دینا چاہتا ہے، مگر لکھنؤ پہنچ کر تو اس کو ضامن دینا پڑے گا کہ وہاں جا کر ضرور دے دے گا، قیمت ادا کرنے کی صورت میں اس کو وہی قیمت دینی پڑے گی، جو اس چیز

کی لکھنؤ میں ہے، بمبئی کا اعتبار نہیں کیا جائے گا، مثلاً اگر ایک من غلہ اس نے لکھنؤ میں قرض لیا اور قرض خواہ نے اس کا مطالبہ بمبئی میں کیا، تو گیہوں کا جو بھاؤ لکھنؤ میں ہوگا اسی کا اعتبار کیا جائے گا، بمبئی کے بھاؤ کا نہیں۔

(۶) جو چیز قرض لی ہے اگر وہ بازار میں نہیں ملتی، تو اگر کچھ دن میں مل جانے کی امید ہے تو پھر قرض خواہ یا تو اس وقت کا انتظار کرے یا پھر اگر دونوں قیمت دینے اور لینے پر راضی ہو جائیں تو پھر قیمت ادا کر دی جائے۔

(۷) قرض دار جو چیز قرض میں لیتا ہے وہ اس کا مالک ہو جاتا ہے اس لیے قرض لی ہوئی چیز کو قرض خواہ یا کسی اور کے ہاتھ بیچنا چاہے تو وہ بیچ سکتا ہے، کیونکہ جو چیز وہ بیچ رہا ہے وہ اس کا مالک ہے لیکن اگر قرض خواہ وہ چیز بیچنا چاہے جو اس نے قرض میں دے دی تو وہ نہیں بیچ سکتا، کیونکہ وہ مالک نہیں ہے، اسی طرح قرض دار دوسرے تصرفات بھی کر سکتا ہے۔

(۸) قرض میں کوئی شرط لگانا گناہ ہے، یہ شرط بیکار سمجھی جائے گی، مثلاً کسی نے یہ شرط لگائی کہ میں اس شرط پر قرض دیتا ہوں کہ تم مجھ کو فلاں چیز دینا، یا میرے ہاتھ فلاں چیز فروخت کر دینا یا یہ قرض مجھے فلاں جگہ ادا کرنا، یہ سب شرطیں بے کار ہیں، قرض دار ان میں سے کسی کا پابند نہیں ہے۔

(۹) جو چیز قرض میں لی تھی اس سے بہتر یا کمتر چیز اگر قرض دار واپس کرتا ہے تو یہ قرض خواہ کی مرضی پر ہے کہ وہ اسے لے یا نہ لے۔

(۱۰) قرضدار اگر قدرت کے باوجود قرض نہیں ادا کرتا تو قرض خواہ اس کی اسی طرح کی کوئی چیز اگر چاہے تو اجازت کے بغیر بھی اپنے قرض میں لے سکتا ہے، مثلاً کسی نے گیہوں یا روپیہ قرض لیا ہے مگر ہوتے ہوئے ادا نہیں کر رہا ہے تو اگر کہیں اس کا گیہوں یا روپیہ ہاتھ لگ جائے تو لے سکتا ہے، لیکن اگر اس سے بہتر یا اس جنس کی چیز نہ ہو تو نہیں لے سکتا، مثلاً گیہوں کے بجائے کپڑا یا روپیہ کے بدلے گیہوں نہیں لے سکتا۔

اسلام میں بچوں کے حقوق

(۲)

مولانا جمیل احمد صاحب نذیری

پرورش و حفاظت بچے — بچے کی پرورش، دیکھ بھال اور دودھ پلانا ماں کے ذمہ ہے، نان نفقہ کی ذمہ داری باپ کی ہے، علاج و معالجہ بھی باپ ہی کے ذمہ ہے[۱]، باپ اپنے بچوں پر جو کچھ خرچ کرے گا، اسے اس کا ثواب ملیگا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس سے زیادہ کس کا اجر ہو سکتا ہے جو اپنے صغیر السن بچوں پر خرچ کرتا ہے اور انہیں دوسروں کی احتیاج سے بے نیاز کر دیتا ہے[۲]۔ دوسری حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو مال دے تو سب سے پہلے اپنی ذات اور اپنے اہل و عیال پر خرچ کرنا چاہئے[۳]

اگر شوہر اپنے بچوں کا پورا نفقہ نہ دے تو بیوی کو اس کے مال میں سے بغیر اس کی اجازت اور علم کے بقدر ضرورت لینا جائز ہے[۴] ماں اگر مجبور نہ ہو تو دودھ ماں پلائے ورنہ کسی دوسری عورت کا اجرت دے کر باپ انتظام کرے۔

قرآن کی اس آیت میں رضاعت اور بچے کی ماں کے نان نفقہ کا تفصیلی ذکر موجود ہے

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ	مائیں اپنے بچوں کو دو برس دودھ پلائیں
حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ	یہ حکم اس کے لئے ہے جو مدت رضاعت
يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ	پوری کرنا چاہے اور باپ ان دود

---

[۱] ہدایہ ج ۲ ص ۴۴۴ [۲] ترمذی ج ۲ ص ۱۸ [۳] مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۹۰ [۴] بخاری ج ۲ ص ۸۰۸

وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (بقرہ — ۲۳۳) — بچے کے باپ پر دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا اور کپڑا دستور کے مطابق واجب ہے۔

بچے کی پرورش کرتے وقت ماں باپ کے دل میں لڑکے اور لڑکی میں امتیاز اور فرق کا جذبہ نہیں ہونا چاہئے، دونوں کی ایک ہی طرح خبرگیری اور پرورش ہونی چاہئے، دونوں کے ساتھ یکساں سلوک ہونا چاہئے۔

عام طور سے لوگ لڑکے کی پیدائش پر بہت خوش ہوتے اور لڑکی کی خبر پاکر زمانہ جاہلیت کے عربوں کی طرح افسردہ ہو جاتے ہیں۔ بیٹی کے لئے ان کے دل میں وہ جذبات بھی نہیں ہوتے جو بیٹے کے لئے ہوتے ہیں، ان کے سلوک سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ لڑکے اور لڑکی میں فرق کرتے ہیں حالانکہ لڑکے کو لڑکی پر ترجیح نہ دینے اور دونوں میں فرق نہ کرنے والے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی خوشخبری سنائی ہے۔

من كانت له انثى فلم يئدها ولم يهنها ولم يؤثر ولده عليها يعني الذكور ادخله الله الجنة رواه ابوداؤد[1] — جس کے لڑکی ہو، اس نے اسے نہ زندہ دفن کیا نہ اس نے تذلیل وتوہین کی اور نہ ہی لڑکے کو لڑکی پر ترجیح دی تو اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو جنت میں داخل فرمائے گا۔

شفقت و پیار | بچے سب کو اچھے لگتے ہیں، سبھی ان سے پیار کرتے ہیں، بڑا بدنصیب ہے وہ شخص جس کے دل میں بچوں سے شفقت و پیار کے جذبات نہ ہوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ایسے لوگوں کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں جو بچوں پر شفقت نہ کریں۔

ليس منا من لم يرحم صغيرنا ولم يوقر كبيرنا[2] — وہ ہم میں سے نہیں جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی تعظیم نہ کرے۔

ایک بار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن کو پیار کر رہے تھے، اقرع بن حابس تمیمی بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے کہا کہ میرے دس بیٹے ہیں لیکن میں نے تو کبھی ان سے پیار نہیں کیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا۔

من لا یرحم لا یرحم ۱ — جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا، اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک دیہاتی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس نے کہا، آپ لوگ بچوں کو بوسہ دیتے ہیں، میں تو کبھی نہیں دیتا ـــــ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا۔

او املک لک ان نزع اللہ من قلبک الرحمۃ ۲ — اگر اللہ نے تمہارے دل سے رحم نکال دیا ہے تو میں کیا کروں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کو اپنی گود میں بٹھاتے تھے، بعض وقت بچے پیشاب بھی کر دیا کرتے تھے ۳ حضرات حسنین رضی اللہ عنہما کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت چاہتے تھے، ایک کو ایک ران پر، اور دوسرے کو دوسری ران پر بٹھاتے، دونوں کو اپنے سے چمٹاتے اور فرماتے۔

اللھم ارحمھما فانی ارحمھما ۴ — اے اللہ ان پر مہربان ہو کیونکہ میں بھی ان پر مہربان ہوں۔

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی نواسی امامہ بنت زینب کو کندھے پر لئے ہوئے گھر سے نکلے، نماز بھی اسی حالت میں پڑھی، جب رکوع کرتے تو اتار دیتے اور جب اٹھتے تو پھر بٹھا لیتے ۵

ایک صحابیہ اپنے بچپن کا واقعہ بیان کرتی ہیں کہ میں اپنے باپ کے ساتھ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، وہاں بیٹھے بیٹھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پشت پر جو مہر نبوت تھی اس سے کھیلنے لگی، میرے باپ نے مجھے ڈانٹا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کھیلنے دو

---

۱ بخاری ج ۲ ص ۸۸۰ ۲ ایضاً ۳ بخاری ج ۲ ص ۸۸۸ ۴ ایضاً ۵ بخاری ج ۱ ص ۸۰ ۶ [illegible]

ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لے گئے، حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق پوچھا کہ وہ بچہ کہاں ہے؟ اتنے میں حضرت حسن دوڑتے ہوئے آئے اور آپ کے گلے میں باہیں ڈال دیں، حضور نے بھی انہیں لپٹا لیا [1]۔

ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دے رہے تھے اتنے میں حسن اور حسین رضی اللہ عنہما گرتے پڑتے آئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فوراً منبر پر سے اترے اور انہیں لاکر اپنے سامنے بٹھا لیا۔ پھر فرمایا کہ اللہ نے سچ فرمایا کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولاد آزمائش کی چیزیں ہیں میں نے ان دونوں بچوں کو دیکھا کہ گرتے پڑتے آرہے ہیں تو مجھ سے دیکھا نہ جا سکا، میں اپنی بات بیچ سے روک کر اٹھا لایا [2]۔

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن رض کو اپنے کندھے پر بٹھائے ہوئے تھے، ایک شخص نے دیکھ کر کہا۔

نعم المرکب رکبت یا غلام	کتنی اچھی سواری پر سوار ہو اے لڑکے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

ونعم الراکب هو [3]	اور سوار بھی کتنا اچھا ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی ایک بار حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو بچوں میں کھیلتے ہوئے دیکھا تو اٹھا کر کندھے پر بٹھا لیا اور فرمایا۔

بابی شبیه بالنبی صلی اللہ علیہ وسلم لیس شبیها بعلی۔	میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں تم حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جتنے مشابہ ہو، اتنے علی سے بھی نہیں۔

حضرت علی بھی ساتھ تھے وہ یہ سن کر ہنسنے لگے [4]۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت محبت کرتے تھے،

---

[1] مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۶۹ [2] ترمذی ج ۲ ص ۲۲۰ [3] ترمذی ج ۲ ص ۲۲۱ امام ترمذی اس حدیث کے متعلق فرماتے ہیں ھذا حدیث غریب لا نعرفہ الا من ھذا الوجہ و زمعۃ بن صالح قد ضعفہ بعض اھل العلم من قبل حفظہ [4] مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۶۹

ان کے باپ کو بھی بہت چاہتے تھے اور خود ان کو بھی بچپن میں حضرت اسامہ کی ناک بہتی تو خود ہی صاف کرتے، حضرت عائشہ رضی اللہ کہتیں کہ لائیے میں صاف کر دوں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے۔

یا عائشہ احبیہ فانی احبہ[1] — ہاں اے عائشہ! اس سے محبت کرو کیونکہ میں بھی محبت کرتا ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بچوں کے ساتھ ہنسی کی باتیں بھی کیا کرتے، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہم میں گھلے ملے رہتے تھے، میرا ایک چھوٹا بھائی ابو عمیر تھا وہ نغیر چڑیا سے کھیلا کرتا تھا، وہ چڑیا مر گئی تو حضور اس سے فرماتے۔

یا ابا عمیر ما فعل النغیر[2] — اے ابو عمیر! تمہاری نغیر چڑیا کیا ہوئی؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رض مدینہ کے قریب ایک محلہ میں ایک دایہ کے پاس دودھ پیتے تھے، حضور وہاں پر جاتے اور جا کر انہیں بوسہ دیتے، پیار کرتے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتے تھے[3] صحابہ کرام بھی بچوں پر بہت شفقت و ملاطفت کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بچوں سے پیار کر رہے تھے ایک صاحب جو گورنر تھے وہاں موجود تھے، انہوں نے اس پر حیرت ظاہر کی اور کہا کہ میں تو بچوں سے پیار نہیں کرتا حضرت عمر رض نے یہ کہہ کر انہیں گورنری سے معزول کر دیا کہ جب تم بچوں سے پیار نہیں کر سکتے تو بڑوں پر کیا رحم کرو گے۔[4]

اسی طرح ایک مرتبہ اپنے گشت کے دوران ایک گھر سے بچوں کے رونے کی آواز سنی، معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ گھر والے فاقہ سے ہیں اور بچے بھوک کی وجہ سے رو رہے ہیں، حضرت

---

[1] ترمذی ج ۲ ص ۲۲۵ [2] ترمذی ج ۲ ص ۲ باب ما جاء فی المزاح [3] مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۲ [4] ماہنامہ التضامن الاسلامی مکہ مکرمہ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۹ھ عنایۃ الاسلام بالطفولیۃ مضمون ڈاکٹر محمود احمد خفاجی۔

عمر رضی اللہ عنہ واپس آکر بیت المال سے سامان خورد و نوش لے گئے، خود ہی پکایا، بچوں کو کھلایا اور اس وقت تک وہاں رہے جب تک بچے کھا پی کر ہنسنے کھیلنے نہیں لگے، اتنی دیر تک اپنے رکنے کی وجہ بھی یہی بیان کی کہ میں چاہتا تھا کہ جس طرح میں نے بچوں کو روتے ہوئے دیکھا تھا، ہنستے ہوئے بھی دیکھ لوں۔ [1]

اسلام میں بچوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کا جو حکم دیا گیا ہے اس کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ غلام نابالغ بچوں میں تفریق نہیں کی جا سکتی بشرطیکہ وہ ذی رحم محرم ہوں، اسی طرح ایک بچہ ہو اور دوسرا بڑا ہو اور دونوں ذی رحم محرم ہوں تو ان میں بھی تفریق جائز نہیں۔

اس مسئلہ کی پوری تفصیل ہدایہ میں ان الفاظ میں موجود ہے۔

ومن ملک مملوکین صغیرین احدھما ذوی رحم محرم من الاخر لم یفرق بینھما وکذ الک ان کان احدھما کبیرا والاصل فیہ قولہ علیہ السلام من فرق بین والدۃ وولدھا فرق اللہ بینہ وبین احبتہ یوم القیمۃ ووھب النبی صلی اللہ علیہ وسلم لعلی رضی اللہ عنہ غلامین اخوین صغیرین ثم قال لہ ما فعل الغلامان فقال بعت احدھما فقال علیہ السلام ادرک ادرک ویروی اردد اردد ولان

جو شخص دو ایسے نابالغ بچوں کا مالک ہو جو ایک دوسرے کے ذی رحم محرم ہوں تو ان کے درمیان تفریق نہ کرے، ایسے ہی اگر ان میں سے ایک نابالغ ہو تو بھی تفریق نہ کرے، اصل اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ جس نے ماں اور اس کے بچے کے درمیان تفریق کی تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے اور اس کے دوستوں کے درمیان جدائیگی کر دے گا۔ اس کے علاوہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو دو نابالغ غلام جو آپس میں حقیقی بھائی تھے، ہبہ کیا، کچھ دن کے بعد دریافت کیا کہ اے علی! وہ دونوں غلام کیا ہوئے

---

[1] الفاروق حصہ دوم ص۱۸۱

الصغير ليستانس بالصغير و بالكبير والكبير يتعاهده فكان في بيع احدهما قطع الاستيناس والمنع من التعاهد وفيه ترك الرحمة على الصغار وقد اوعد عليه [1]

حضرت علی نے جواب دیا میں نے ان میں سے ایک کو بیچ دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فوراً اسے واپس لے لو۔ نیز اس حکم کی عقلی وجہ یہ ہے کہ بچہ، بچے سے مانوس ہوتا ہے۔ اسی طرح بچہ بڑے ذوی رحم محرم سے بھی مانوس ہوتا ہے، اور بڑا اس کی نگہبانی ونگرانی کرتا ہے، لہٰذا ان میں سے کسی ایک کا فروخت کر دینا انسیت کو ختم کرنا اور نگہداشت سے روکنا ہے، اور اس میں ترک رحمت ہے حالانکہ بچوں پر رحمت وشفقت کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

بچوں پر شفقت اور پیار کرنے میں برابری ہونی چاہیے، ایسا نہ ہو کہ کسی کو بہت چاہنے لگیں اور کسی کو نظروں سے گرا دیں۔ یا کسی کو سب مکان وجائداد لکھدیں اور کسی کو بالکل ہی محروم کریں یا بالکل محروم نہ کریں تو دوسرے کے مقابلہ میں کم کر دیں۔ ایسا کرنا ظلم ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔

ایک صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور انھوں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میں اپنے فلاں لڑکے کو ایک غلام ہبہ کرنا چاہتا ہوں، آپ اس پر گواہ بن جائیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم نے ہر لڑکے کو اسی طرح ایک ایک غلام دیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا نہیں۔ حضور نے فرمایا کہ میں اس پر گواہ نہیں بنوں گا۔ [2]

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بالصراحت بھی اپنی اولاد کے درمیان عدل اور برابری کرنے کا

---

[1] ہدایہ ج ۳ ص ۵۱ فصل فیما یکرہ [2] ابوداؤد ج ۲ ص ۱۴۱

حکم دیا ہے۔

اعدلوا بین ابناءکم اعدلوا بین ابناءکم [1]	اپنی اولاد کے درمیان برابری کرو، اپنی اولاد کے درمیان برابری کرو

دوسری حدیث میں ہے۔

ان لھم علیک من الحق ان تعدل بینھم [2]	اولاد کا تمہارے اوپر یہ حق ہے کہ تم ان کے درمیان عدل کرو [3]۔

تعلیم و تربیت

تعلیم و تربیت کا اصل زمانہ بچپن کا ہی ہوتا ہے، بچپن میں جس کی اچھی تعلیم و تربیت ہوگئی وہ سدھر گیا اور جس کی نہیں ہوئی مشاہدہ یہی ہے کہ وہ بگڑ گیا، غلط راہ پر لگ گیا، بچوں کا ذہن اور دل و دماغ سادہ ورق کی طرح ہوتا ہے، بڑے اس پر جو نقش بنوانا چاہیں بنوالیں۔ اگر بڑوں نے اس کی صحیح ڈھنگ سے تربیت کی تو خیر و فلاح کے نقوش بنیں گے اور اگر تعلیم و تربیت میں کوتاہی ہوئی تو فساد و بگاڑ کو راہ ملے گی۔

پرورش کے ساتھ تعلیم و تربیت ماں باپ اور سرپرستوں کی ذمہ داری ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا (تحریم-۶)	اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو جہنم کی آگ سے بچاؤ

ظاہر ہے کہ عیال و اولاد کو جہنم سے بچانے کی صورت یہ ہے کہ ان کی صحیح تعلیم و تربیت ہو تاکہ وہ اچھے اور برے کو سمجھ سکیں، حق اور باطل عقاید میں فرق اور صحیح اور غلط بات میں امتیاز و حد فاصل قائم کر سکیں۔

اس لئے حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے پہلی بات یہی کہی تھی، شرک سے بچنا کیونکہ شرک سب سے بڑا ظلم اور سب سے بڑا گناہ ہے۔

---

[1] ابو داؤد ج ۲ ص ۱۵۱ [2] ایضاً [3] اس کے برعکس اسرائیلی، رومی اور ہندوؤں اور دیگر پرانی قوموں کا قانون یہ تھا کہ بڑا لڑکا جائداد کا مالک بنے یا اسے کوئی ترجیحی حق حاصل ہونا چاہئے۔ اسلام نے اس کی اصلاح کر دی۔ سیرۃ النبی ج ۶ ص ۱۶۱

اِذْ قَالَ لُقْمٰنُ لِابْنِهٖ وَهُوَ يَعِظُهٗ يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ○ (لقمان ـــ ۱۳)

اس وقت کو یاد کرو جب لقمان نے اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا اے میرے پیارے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا، بلاشبہ شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔

بچوں کی جب صحیح تعلیم و تربیت ہوتی ہے تو وہ ماں باپ اور سرپرستوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن جاتے ہیں، جس کی ہر مسلمان کو تمنا کرنی چاہیئے۔

رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ (فرقان ـــ ۷۴)

اے ہمارے رب! ہماری بیویوں اور ہماری اولاد کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا

بچوں کو بہترین عطیہ ان کو ادب سکھانا ہے۔

ما نحل والد ولدًا من نحل افضل من ادب حسن [۱]

کسی باپ نے اپنے بیٹے کو اچھے ادب سے زیادہ بہتر عطیہ نہیں دیا

ایک حدیث میں ہے کہ اولاد کا باپ پر تین حق ہے، ایک یہ کہ اسکا اچھا نام رکھے، دوسرے یہ کہ جب وہ سمجھدار ہو جائے تو اسے پڑھائے لکھائے، تیسرے یہ کہ بالغ ہو جائے تو شادی کر دے۔

دوسری حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

لان یؤدب الرجل ولدہ خیرٌ من ان یتصدق بصاع [۲]

باپ کا اپنی اولاد کو ادب سکھانا ایک صاع صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

احادیث میں بچوں کی تربیت اور اصلاح کے مختلف انداز و طریقے ملتے ہیں، ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بچے جب سات سال کے ہو جائیں تو انہیں نماز پڑھنے کی تلقین کرو، اور دس سال کے ہو جائیں تو نماز نہ پڑھنے پر مارو [۳] ایک حدیث میں یہ بھی ہو

---

[۱] ترمذی ج ۲ ص ۱۷ [۲] ایضاً [۳] ترمذی ج ۱ ص ۵۴

کر دس سال کے بعد ان کا بستر علیحدہ کر دو (مشکوٰۃ ج ۱ ص ۵۸)

بچوں سے اچھے کام کرانا چاہیے تاکہ انہیں بھی عادت پڑے، مثلاً نماز پڑھانے کے علاوہ روزہ رکھوانا اور فقیروں کو انھیں کے ہاتھ سے پیسے دلوانا اور غریبوں کی مدد کرانا، اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ بچوں کو شروع سے ان کاموں کی عادت پڑے گی اور بڑے ہو کر وہ ایک بھلے اور اچھے انسان بنیں گے۔

صحابہ کرام بچوں کو روزہ رکھنے کی عادت ڈالتے تھے۔ ربیع بنت معوذ فرماتی ہیں۔

نصوم صبياننا ونجعل لهم اللعبة من العهن فاذا بكى احدهم على الطعام اعطيناه ذالك حتى يكون عند الافطار قال ابو عبد الله العهن الصوف[1]

ہم اپنے بچوں کو روزہ رکھواتے تھے اور ان کے لئے اون کا کھلونا بنا دیتے جب ان میں سے کوئی کھانے کیلئے روتا تو ہم وہی اسے کھیلنے کے لئے دیتے۔ افطار تک یہی ہوتا رہتا تھا۔

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں ایک شخص رمضان المبارک میں شراب پیتے ہوئے پکڑا گیا حضرت عمرؓ نے اس کی پٹائی کی اور فرمایا

ويلك وصبياننا صيام[2]

تمہارا برا ہو ہمارے تو بچے بھی روزہ دار ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم جب بچوں کے پاس سے گزرتے تو انہیں سلام کرتے۔ حضرت انسؓ نے اس قسم کے کئی واقعات بیان کئے ہیں اور خود بھی ان کا یہی طریقہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا طرزِ عمل بچوں کی خاموش تربیت تھی کہ وہ بھی دوسروں کو سلام کرنے کے عادی بنیں۔

بعض ماؤں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے بچوں کو بلانے کے لئے جھوٹ موٹ کسی چیز کے دینے کا بہانہ کرتی ہیں۔ ایسا کرنے کی ممانعت ہے کیونکہ اس سے بچوں میں جھوٹ بولنے کی عادت پڑتی ہے۔ جب وہ اپنے بڑوں کو جھوٹ بولتے دیکھیں گے تو خود بھی ضرور بولیں گے۔ (باقی)

---

[1] بخاری ج ۱ ص ۲۶۳ [2] ایضاً [3] بخاری ج ۲ ص ۹۲۳، ابوداؤد ج ۲ ص ۲۹۳

روزہ

مجیب اللہ ندوی

روزہ کو عربی میں صَوْم کہتے ہیں۔ صوم کے معنی بات چیت یا کھانے پینے سے رک جانے کے ہیں، اور شریعت میں صبح صادق سے سورج ڈوبنے تک کھانا پینا چھوڑنے، عورتوں سے الگ رہنے اور بری باتوں سے بچنے کو صوم یا روزہ کہتے ہیں۔

روزہ کی اہمیت رمضان المبارک کے پورے مہینے کا روزہ دین کے پانچ ارکان میں ایک رکن ہے۔ قرآن و حدیث میں پورے رمضان کے مہینے میں روزہ رکھنے کی اہمیت و فضیلت بار بار آئی ہے۔ قرآن میں ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ٥

(سورہ بقرہ)

مسلمانو! تمہارے اوپر روزے اسی طرح فرض کئے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے دوسری امتوں پر فرض کئے گئے تھے، یہ روزہ اسلئے فرض کیا گیا ہے کہ اس سے تمہارے اندر پرہیزگاری پیدا ہونے کی توقع ہے۔

اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ نماز کی طرح روزہ کا حکم بھی خدا نے دوسری امتوں کو بھی دیا تھا، اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جتنے نبی اور رسول دنیا میں گذرے ہیں ان سب نے اس کی تاکید کی ہے۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ تقویٰ اور پرہیزگاری پیدا کرنے کیلئے روزہ

رکھنا ضروری ہے۔ پھر آگے حکم دیکر کہا گیا ہے کہ فَمَنْ شَهِدَ مِنكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ جو اس مہینے کو پائے اس کو چاہئے کہ پورے مہینے روزہ رکھے۔

سورہ بقرہ کے دو رکوع میں مسلسل روزہ کی اہمیت اور اس کے احکام بیان کئے گئے ہیں قرآن مجید جو اس دنیا میں خدا کی سب سے بڑی نعمت اور دولت ہے، اس کا نزول اسی مبارک مہینے سے شروع ہوا۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن نازل ہوا۔

قرآن مجید میں ہے کہ اس کے ذریعہ آدمی میں شکر اور پرہیزگاری پیدا ہوتی ہے۔ حدیث میں اس کی بے شمار فضیلت اور اہمیت بیان کی گئی ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "ہر نیکی کا ثواب بندوں کے اعمالنامے میں دس گنے سے سات سو گنے تک لکھا جاتا ہے۔ لیکن روزہ خاص میرے لئے ہے اور میں خود ہی اس کا بدلہ دوں گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اجر کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "روزہ دار کے منہ کی بو خدا کو مشک سے بھی زیادہ پسند ہے" ایک حدیث میں ہے کہ "ہر گھر کا ایک دروازہ ہوتا ہے اور عبادت کا دروازہ روزہ ہے" آپ نے فرمایا کہ "روزہ گناہوں سے بچنے کے لئے ایک ڈھال ہے" آپ نے فرمایا کہ "جن روزہ داروں کے روزے مقبول ہو جائیں گے ان کیلئے قیامت کے دن ایک دروازہ ہوگا جس سے وہ جنت میں داخل ہوں گے اس دروازہ کا نام رَیَّانْ یعنی سیراب کرنے والا ہوگا" آپ نے فرمایا کہ "جب روزہ شروع ہوتا ہے تو شیطان مقید کر دیئے جاتے ہیں، جہنم کا دروازہ بند کر دیا جاتا ہے اور جنت کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے" آپ نے فرمایا کہ "روزہ قیامت کے دن خدا سے سفارش کرے گا۔ وہ کہے گا کہ اے پروردگار اس نے میری وجہ سے کھانا پینا اور اپنی خواہش نفس کو چھوڑ دیا تھا تو اس کی مغفرت فرما۔"

لیکن یہ اجر و ثواب اس وقت ملے گا، جب روزہ مقبول ہوا اور کسی عبادت کے مقبول

ہونے کے لئے سب سے ضروری چیز خلوص ہے۔ یعنی وہ عبادت صرف خدا کے لئے کی گئی ہو۔ روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس میں خلوص دوسری عبادتوں کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے۔ ایک آدمی اگر چاہے تو چھپ کر کھاپی سکتا ہے یا اپنی خواہش نفس پوری کر سکتا ہے اور یہ سب کرتے ہوئے خدا کے علاوہ اسے کوئی دیکھ نہیں سکتا۔ مگر اس کے باوجود نہ تو وہ کھاتا پیتا ہے اور نہ اپنی خواہش نفس پوری کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ خدا ہی کے لئے روزہ رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے خدا نے کہا ہے کہ "روزہ کا بدلہ میں خود دوں گا"۔

لیکن اس خلوص کے باوجود بعض اعمال ایسے ہیں جو روزہ کے خلوص کو خراب کر دیتے ہیں اور روزہ دار اس کے ثواب سے محروم رہ جاتا ہے، مثلاً روزہ میں لڑائی جھگڑا کرنا، گالی گفتہ بکنا۔ پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا، چغلی کرنا، حرام مال کھانا۔ جو لوگ ان باتوں سے نہیں بچتے ان کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ۔

مَن لم یدع قول الزور والعمل به فلیس لله حاجة ان یدع طعامه وشرابه	جو شخص غلط جھوٹ اور گناہ کی بات اور غلط اور گناہ کا کام نہ چھوڑے تو اللہ کو اسکی ضرورت نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔

غلط بات اور غلط عمل میں زبان اور جسم کا ہر برا اور غلط عمل شامل ہے۔

آپ نے ایک دوسرے موقع پر فرمایا۔

کم من صائم لیس له من صیامه الا الظمأ	کتنے روزہ دار ہیں جن کو پیاسا رہنے کے سوا کچھ حاصل نہیں ہے۔

اسی بنا پر آپ نے فرمایا ہے کہ روزے سے گناہ ضرور معاف ہوتے ہیں، مگر اس کے لئے دو شرطیں ہیں ایک ایمان اور دوسرے احتساب۔ مَن صام ایماناً واحتساباً غفر له ما تقدم من ذنبه - ایمان تو یہ ہے کہ اس کو خدا، آخرت رسالت وغیرہ پر یقین ہو اور احتساب یہ ہے کہ روزہ خدا ہی کے لئے رکھا گیا ہو اور اس کو تمام برائیوں سے محفوظ رکھا گیا ہو۔

ایمان واحتساب کی قید سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو لوگ ایمان اور احتساب کے بغیر

بھوکے پیاسے رہتے ہیں انکا بھوکا پیاسا رہنا۔ روزہ نہیں ہے۔ اسی بنا پر برت اور بھوک ہڑتال وغیرہ کو اسلامی شریعت میں روزہ نہیں کہا جائے گا۔ اگر ان تمام باتوں کا خیال کرکے آدمی روزہ رکھے تو جیساکہ قرآن میں کہا گیا ہے۔ واقعی آدمی پرہیزگار اور متقی بن سکتا ہے۔ اور اس کا نفس اسکے قابو میں آسکتا ہے۔

اسی اہمیت کی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان کا مہینہ شروع ہونے سے پہلے ہی اور رمضان کے درمیان برابر صحابہ کو روزہ مقبول بنانے کی تاکید فرمایا کرتے تھے۔ آپنے بار بار فرمایا ہے کہ۔ "جو شخص ایمان و احتساب کے ساتھ روزہ رکھے گا اس کے پچھلے گناہ معاف کردیئے جائیں گے"۔ مشہور صحابی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپنے شعبان کے آخری دنوں میں صحابہ کے مجمع میں ایک تقریر فرمائی۔ جس میں فرمایا کہ "ایک بہت ہی مبارک مہینہ تمہارے اوپر سایہ کیئے ہوئے ہے۔ اس مہینہ میں ایک رات ہزار مہینے سے زیادہ بہتر ہے۔ دن میں اس کے روزے فرض ہیں اور رات کی عبادت میں ثواب ہے۔ اسمیں نفل کا ثواب فرض کے برابر، اور فرض کا ثواب ستر فرضوں کے برابر ملتا ہے۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا اجر جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور سلوک کا مہینہ ہے اسمیں مومن کی روزی زیادہ ہوتی ہے۔ جو شخص روزہ دار کو افطار کرادے اس کو ایک روزہ کا ثواب ملے گا۔ اس پر صحابہ نے دریافت فرمایا۔ یا رسول اللہ ہم میں سے ہر شخص کے پاس اتنا وافر کھانا تو نہیں ہوتا کہ خود بھی کھائیں اور کسی کو افطار بھی کرائیں۔ آپنے فرمایا کہ اگر کچھ نہ ہو تو ایک کھجور یا ایک گھونٹ پانی ہی سے افطار کرادو۔ غور کیجئے کہ کتنے صحابہ کے پاس اتنا زیادہ کھانا بھی نہ ہوتا تھا کہ وہ کسی دوسرے کو افطار کراسکیں، مگر اس کے باوجود وہ روزہ رکھتے تھے۔ خود آپ کا حال بھی یہی رہتا کہ آپ کو کبھی کبھی روزہ پر روزہ رکھنا پڑتا تھا یعنی مشکل سے پیٹ بھر کھانا میسر ہوتا تھا۔

روزہ سے بے پرواہی افسوس ہے کہ اس زمانہ میں دوسرے احکام شریعت کیطرح روزہ کی طرف سے بھی بڑی بے پرواہی پیدا ہوگئی ہے۔ چند سال پہلے گناہ گار سے گناہ گار مسلمان بھی رمضان میں روزہ رکھکر پاکیزہ زندگی گذارنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور عورتیں تو سو فیصد روزہ رکھتی تھیں، مگر اب یہ حالت باقی نہیں رہ گئی ہے بلکہ بعض بے حیا تو روزہ

کے دنوں میں کھلے بندکھاتے پیتے اور سگریٹ بیڑی پیتے نظر آتے ہیں، ان کے دل میں ذرا بھی خدا کا خوف دکھائی نہیں دیتا۔ جس طرح روزہ رکھنے کا بے حد ثواب ہے اسی طرح اس کے چھوڑنے کا گناہ بھی زیادہ ہے اور روزہ میں بے حیائی سے کھانے پینے والوں کو دہرا عذاب ہوگا۔

روزہ کی نیت روزہ کے صحیح ہونے کیلئے نیت ضروری ہے۔ اگر بغیر نیت کے رکھا جائے تو روزہ نہ ہوگا۔ مثلاً کسی نے دن بھر کھایا پیا نہیں مگر روزہ کی نیت نہیں کی تو روزہ نہیں ہوگا لیکن زبان سے نیت کرنا ضروری نہیں ہے، بلکہ اس کے لئے دل میں ارادہ کر لینا کافی ہے۔ مثلاً روزہ رکھنے کیلئے سحری کھائی یا سحری کے وقت کچھ کھایا پیا تو نہیں، مگر روزہ کی نیت سے کلی کی، پانی پیا تو یہ بھی نیت سمجھی جائے گی نیت کے لئے یہ ضروری نہیں کہ عربی میں کریں، بلکہ وہ جس زبان کو جانتا ہو اسی زبان میں کرلے۔

رمضان کے روزوں کی نیت یا تو رات ہی میں کر لی جائے یا دوپہر سے پہلے پہلے کرلینی چاہئے۔ نیت میں اتنا ارادہ کرلینا یا زبان سے کہہ دینا کافی ہے کہ آج میں رمضان کا روزہ رکھوں گا۔ اگر رمضان کا ذکر نہ کیا بلکہ صرف روزہ کہا تب بھی روزہ ہو جائیگا۔ عربی کی نیت یہ ہے، نَوَيْتُ بِصَوْمِ الْيَوْمِ۔

سحری روزہ رکھنے کی نیت سے جو کھانا پانی صبح صادق سے پہلے کھایا پیا جاتا ہے، اسے سحری کہتے ہیں۔ سحری کھانا سنت ہے۔ اور اس کھانے میں ثواب ہے۔ اگر کھانے کی خواہش کم ہو تو تھوڑا سا کوئی میٹھا کھالے، یا دودھ وغیرہ پی لے، اگر بالکل خواہش نہ ہو تو دو چار گھونٹ پانی ہی پی لے مگر سحری کی نیت سے ضرور کچھ کھا پی لینا چاہئے۔

بعض لوگ احتیاط کے خیال سے تین چار گھنٹہ رات رہتی ہے جب ہی سحری کھا لیتے ہیں، ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہے بلکہ سحری دیر کرکے کھانا سنّت ہے۔

سحری کے سلسلہ میں چند باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔

(۱) اگر رات کو سو جانے کی وجہ سے سحری نہ کھا سکے تب بھی روزہ رکھنا چاہئے، اگر سحری نہ کھانے کی وجہ سے کسی نے روزہ نہ رکھا تو بہت بڑا گناہ ہوگا۔

(۲) کسی کی آنکھ دیر میں کھلی اور سحری کھالی اسکے بعد معلوم ہوا کہ سحری کا وقت نہیں تھا تو یہ روزہ اسکا

بے کار گیا۔ اب رمضان کے بعد اس کی قضا رکھنی پڑے گی، لیکن اس دن بھی اس کو روزہ داروں کی طرح رہنا چاہیئے۔ یعنی روزہ کے احترام میں کچھ کھانا پینا نہ چاہیئے۔

(۲) اگر یہ شک ہو جائے کہ اب وقت ہے یا نہیں تو ایسی حالت میں سحری نہ کھانا چاہیئے۔

افطار | سورج ڈوبنے کے بعد روزہ ختم کرنے کے خیال سے جو کچھ کھایا پیا جاتا ہے، اس کو شریعت میں افطار کہتے ہیں، جس طرح سحری میں دیر کرنا ثواب ہے اسی طرح افطار میں جلدی کرنا ثواب ہے۔ جلدی کا مطلب یہ ہے کہ جوں ہی اس بات کا یقین ہو جائے کہ سورج غروب ہو گیا فوراً روزہ افطار کر لینا چاہیئے۔ یہ انتظار نہ کرنا چاہیئے کہ ذرا اندھیرا ہو جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری امت اس وقت تک بھلائی پر رہے گی جب تک افطار میں جلدی کرتی رہے گی۔ دیر کرنا مکروہ ہے۔ چھوہارے یا کھجور، یا پانی سے افطار کرنا بہتر ہے۔ افطار کرنے سے پہلے یہ دعا پڑھنی چاہیئے۔

اَللّٰهُمَّ لَكَ صُمْتُ وَعَلٰى رِزْقِكَ اَفْطَرْتُ	اے اللہ میں نے تیرے لئے روزہ رکھا اور تیری دی ہوئی روزی سے افطار کیا۔

افطار کے بعد یہ دعا پڑھنی چاہیئے۔

ذَهَبَ الظَّمَأُ وَابْتَلَّتِ الْعُرُوْقُ وَثَبَتَ الْاَجْرُ اِنْ شَاءَ اللّٰهُ۔	پیاس جاتی رہی اور رگیں تر ہو گئیں اور اللہ نے چاہا تو اس کا اجر بھی ملا۔

روزہ افطار کرنے کے بعد فوراً مغرب کی نماز پڑھنی چاہیئے۔

گیارہ مہینوں میں اذان کے بعد فوراً مغرب کی نماز پڑھنی بہتر ہے۔ لیکن رمضان میں افطار کی وجہ سے اگر نماز میں کچھ دیر ہو جائے تو کچھ حرج نہیں ہے مگر اتنی دیر نہ کرنی چاہئے کہ بالکل اندھیرا ہو جائے۔

(۱) بدلی کے دنوں میں ذرا دیر کرکے روزہ کھولنا چاہیئے۔ جبتک پورا یقین نہ ہو جائے کہ سورج ڈوب گیا ہے اس وقت تک روزہ نہ کھولنا چاہیئے چاہے گھڑی کے اعتبار سے وقت ہو ہی کیوں نہ گیا ہو۔

(۲) اگر یقین ہو گیا کہ سورج ڈوب گیا اور افطار کر لیا۔ اس کے بعد معلوم ہوا کہ ابھی سورج ڈوبا نہیں تھا تو اس روزہ کی قضا رکھنی پڑے گی۔

(۳) اگر بعد میں صرف شبہ ہو کہ سورج غروب ہوا تھا یا نہیں ہوا تھا تو اس شک و شبہ کا کچھ

اعتبار نہیں ہے۔ یقین ہونا چاہیئے۔

روزہ میں کرنے کا کام | روزہ میں اپنا کوئی وقت بے کار کاموں اور فضول باتوں میں نہ گنوانا چاہیئے بلکہ جو وقت روزی کمانے سے بچے اسے قرآن کی تلاوت، نفل نماز یا کسی اور نیک کام میں صرف کرنا چاہیئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے تو شدید گرمی کے زمانہ میں روزہ رکھے ہوئے خدا کی راہ میں جہاد کیا ہے اور تبلیغ کی ہے۔ اگر تلاوت قرآن یا کوئی اور نیک کام نہ کرے تو فضول باتوں میں لگے رہنے سے بہتر ہے کہ سو جائے تاکہ گناہ سے تو بچا رہے۔

روزہ کے مکروہات | روزہ میں کھانا پینا اور مباشرت ترک کرنا تو فرض ہے، ان کے ارتکاب سے روزہ ٹوٹ ہی نہیں جاتا بلکہ ایک روزہ کے بدلے اس کو دو مہینے مسلسل روزے رکھنے پڑیں گے لیکن بعض چیزیں ایسی ہیں جن سے روزہ ٹوٹتا تو نہیں مگر مکروہ ہو جاتا ہے اور ثواب کم ہو جاتا ہے۔ وہ یہ ہیں:۔ (۱) پیٹھ پیچھے کسی کی برائی کرنا اور چغلی کھانا، گالی گفتہ بکنا، سخت کلامی کرنا، چیخنا چلانا، فضول باتیں کرنا، لڑائی جھگڑا کرنا (۲) بھوک پیاس کی وجہ سے گھبراہٹ اور بے چینی ظاہر کرنا (۳) کسی چیز کا منہ میں ڈالے رکھنا یا چبانا خواہ وہ کھانے کی چیز ہو یا نہ ہو (۴) کوئی کھانے کی چیز چکھنا۔ اگر کسی عورت کا شوہر یا کسی ملازم کا مالک چڑچڑا اور بدمزاج ہو تو ان کو زبان کی نوک سے نمک چکھ لینے کی اجازت ہے تاکہ تو تو۔ میں میں نہ ہو (۵) روزہ کی حالت میں کلی کرنے اور ناک میں پانی ڈالنے میں اتنا زیادہ مبالغہ کرنا کہ حلق تک پانی چلا جائے یا ناک کے ذریعہ حلق میں پانی آ جائے (۶) نہانے کی ضرورت ہو مگر صبح صادق کے بعد تک نہ نہانا، صبح ہونے اور دن نکلنے کے بعد نہانا تو اور زیادہ برا ہے (۷) کوئلہ چبا کر یا منجن وغیرہ سے دانت صاف کرنا۔ یہی حکم ٹوتھ پیسٹ وغیرہ کا بھی ہے (۸) منہ میں بہت سا تھوک جمع کرکے نگل جانا یا دانت میں سے چنے سے کم کوئی چیز اٹکی ہو تو اس کو نگل جانا (۹) اگر یہ خیال ہو کہ اپنے اوپر قابو نہیں رہے گا تو عورت کا بوسہ لینا اور اس سے بغل گیر ہونا مکروہ ہے لیکن اگر یہ خدشہ نہ ہو تو کوئی حرج نہیں ہے مگر جوان آدمی کو ہر حال میں اس سے بچنا چاہیئے[1] اور عورت کا ہونٹ منہ میں لینا ہر حال میں مکروہ ہے (۱۰) اپنے منہ

---

[1] ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے ایک بوڑھے آدمی کو اس کی اجازت دی اور ایک نوجوان کو منع فرمایا۔

سے چبا کر بچے کو کوئی چیز کھلانا۔

جن باتوں سے روزہ مکروہ و فاسد نہیں ہوتا

(۱) سر پر تیل ڈالنا (۲) بدن پر تیل ملنا (۳) سرمہ لگانا (۴) مسواک کرنا، مسواک خواہ سوکھی ہو یا گیلی۔ دوپہر کے بعد کی جائے یا دوپہر سے پہلے (۵) خوشبو لگانا یا سونگھنا (۶) بھولے سے کھا لینا یا پی لینا، یا عورت کے ساتھ صرف لیٹنا، اگر دوسرا آدمی کسی کو روزہ میں بھول کر کھاتے پیتے دیکھے تو اس کو فوراً بتانا چاہیئے کہ روزہ ہے، اگر یہ معلوم ہو کہ بہت بھوکا پیاسا ہے تو پھر نہ بتانا چاہیئے (۷) خود بخود قے ہو جانا خواہ زیادہ ہو یا کم (۸) منھ میں جو ذرا سا تھوک آجاتا ہے اس کو نگل جانا (۹) بغیر ارادہ مکھی یا دھواں وغیرہ کا حلق سے اتر جانا (۱۰) گرمی کی شدت سے بار بار کلی کرنا یا بدن پر پانی ڈالنا یا کپڑا تر کر کے بدن پر رکھنا[1] (۱۱) سوتے میں احتلام ہو جانا (۱۲) روزہ کا خیال نہیں تھا اور وہ عورت کے ساتھ ہمبستر ہونے کا ارادہ کیا یا کھانے پینے لگا مگر اس کو فوراً ہی اپنی غلطی کا علم ہوا اور وہ عورت سے علحدہ ہو گیا، یا کھانا پینا چھوڑ دیا تو اس کا روزہ فاسد نہیں ہو بلکہ اسے اپنا روزہ پورا کرنا چاہیئے۔

کن باتوں سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے

جن باتوں سے روزہ فاسد ہو جاتا ہے، وہ دو قسم کی ہیں (۱) ایک وہ جن سے صرف قضا لازم آتی ہے (۲) دوسری وہ جن سے قضا اور کفارہ دونوں لازم آتے ہیں۔

قضا کی صورتیں

قضا کے معنیٰ پورا کرنے کے ہیں، روزہ قضا کرنے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اگر اسکا ایک یا کئی روزے چھوٹ گئے تو اس کو صرف ایک یا جتنے روزے چھوٹ گئے ہیں رمضان کے بعد اتنے ہی پورے کر لینے چاہئیں۔ ان صورتوں میں قضا ضروری ہے۔

(۱) کسی نے زبردستی روزہ دار کے منھ میں کچھ ڈال دیا اور وہ حلق سے اتر گیا (۲) روزہ یاد تھا مگر کلی کے وقت ارادہ کے بغیر بے احتیاطی میں حلق کے نیچے پانی اتر گیا (۳) قصداً منھ بھر قے کرنا یا منھ میں ذرا سی قے آئی اور اس کو نگل جانا (۴) جو چیزیں کھائی نہیں جاتیں۔ مثلاً کاغذ، کنکری، مٹی، کوئلہ وغیرہ ان کو قصداً نگل جانا (۵) دانتوں میں روٹی کا ٹکڑا یا گوشت کا ریشہ رہ گیا اور صبح کے بعد اس نے خلال کیا اور وہ حلق سے نیچے چلا گیا تو اگر یہ ٹکڑا چنے سے چھوٹا ہو

[1] درمختار میں ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس کو مکروہ لکھا ہے لیکن ان کے قول پر فتوی نہیں ہے (ردالمختار)

تو کوئی حرج نہیں لیکن اگر یہ چنے کے برابر یا اس سے بڑا ہے تو روزہ قضا کرنا چاہئے۔ اور یہ حکم اس صورت میں ہے جب منھ کے اندر ہی سے نگل جائے۔ لیکن اگر منھ کے باہر نکال کر پھر اس کو نگل لیا تو وہ ٹکڑا چھوٹا ہو یا بڑا قضا ضروری ہے (۶) کان میں تیل ڈالنا (۷) ناک سے کوئی چیز سُڑک لینا اور وہ حلق کے نیچے اُتر جائے (۸) دانت سے نکلے ہوئے خون کو اگر وہ تھوک سے زیادہ ہو نگل جانا (۹) بھولے سے کچھ کھا پی گیا اس کے بعد یہ سوچ کر کہ روزہ تو ٹوٹ گیا پھر دوبارہ کچھ کھا پی لیا (۱۰) صبح صادق کے بعد یہ خیال کر کے سحری کھالی کہ ابھی وقت باقی ہے (۱۱) غروب آفتاب سے پہلے اس خیال سے روزہ افطار کر لینا کہ سورج ڈوب چکا ہے (۱۲) رمضان شریف کے روزوں کے علاوہ کسی نفل یا واجب روزے کو قصداً توڑ دینا (۱۳) دوپہر کے بعد روزے کی نیت کرنا۔ ان تمام صورتوں میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور اس کے بدلے میں ایک روزہ رکھنا پڑے گا[۱]

روزہ قضا کرنے کا وقت روزہ قضا ہو جائے تو سال کے گیارہ مہینے میں جب چاہے اس کی قضا کر لے، مگر رمضان کے بعد فوراً رکھ لینا بہتر ہے۔ قضا روزوں کا مسلسل رکھنا ضروری نہیں ہے۔ مثلاً اگر کسی کے تین چار روزے قضا ہو گئے ہوں تو اس کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ سب کی ایک ساتھ قضا کرے، ایک یا دو دن کو ناغہ دے دے کر قضا کرے تو بھی صحیح ہے۔

کسی پر گزشتہ رمضان کے روزے باقی تھے کہ دوسرا رمضان آگیا تو پہلے اس رمضان کے روزے رکھ لے، پھر رمضان کے بعد قضا روزے پورے کرلے۔ رمضان میں کسی دوسرے روزے کی نیت کرنا صحیح نہیں ہے۔ اگر کریگا تب بھی وہ رمضان ہی کا روزہ شمار کیا جائے گا۔

قضا اور کفارہ دونوں لازم ہونا کفارہ کے معنی چھپانے کے ہیں اور شریعت میں کسی گناہ کو چھپانے یا مٹانے کے لئے جو چیز دی جاتی ہے اس کو کفارہ کہتے ہیں۔ جن صورتوں میں کفارہ واجب ہوتا ہے وہ یہ ہیں۔

(۱) رمضان کا روزہ رکھ کر قصداً کوئی ایسا کام کرنا جس کا کرنا روزہ میں منع ہے۔ مثلاً

---

[۱] شرح وقایہ ج ۱ فصل ۳۱۱ و شرح النقایہ۔

کھانا پینا یا عورت کے ساتھ اپنی خواہش پوری کرنا۔ کھانے میں یہ بھی شامل ہے کہ منھ کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے قصداً معدہ یا دماغ میں کوئی غذا پہنچا دی جائے تو کفارہ واجب[1] ہوگا، اسی طرح پینے میں پانی، دوا یا اور کوئی پتلی چیز کے علاوہ حقہ، سگریٹ، بیڑی وغیرہ بھی شامل ہے۔ اگر ان چیزوں کا استعمال کوئی کرے گا تو کفارہ دینا ہوگا۔

(۲) روزہ میں کوئی ایسا کام کیا جس کا کرنا جائز ہے۔ شلاً سر پر تیل ملا، خوشبو سونگھی یا عورت کا بوسہ لیا اور پھر یہ خیال کرکے کہ میرا روزہ ٹوٹ گیا قصداً کھا پی لیا تو اس پر کفارہ لازم ہوگا یہاں دو باتیں یاد رکھنی چاہئیں۔

الف۔ ایک یہ کہ اگر اسکو کسی عالم نے غلط فتویٰ بتا دیا اور اس نے روزہ توڑ ڈالا تو پھر کفارہ لازم نہیں آئے گا۔

ب۔ دوسرے یہ کہ یہ کام اگر ایسا تھا جسمیں بظاہر یہ شبہ ہو سکتا تھا کہ اس سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے مثلاً اس نے بھول کر پیٹ بھر کھا لیا، یا عورت سے بغلگیر ہوا اور منی نکل آئی، اب یہ خیال کرکے کہ میرا روزہ ٹوٹ گیا پھر دوبارہ تو اس صورت میں بھی کفارہ لازم نہیں آئے گا۔ لیکن اگر یہ کام قصداً کرے گا تو جیسا کہ اوپر ذکر آیا قضا و کفارہ دونوں ادا کرنا پڑے گا[2]

روزہ توڑ دینے کا کفارہ رمضان کے روزے کو قصداً توڑ دینے کا کفارہ ادا کرنے کی صورتیں یہ ہیں:۔ (۱) ایک روزہ کے بدلے مسلسل دو مہینہ تک روزہ رکھنا فرض ہے، اگر دو مہینے کے درمیان میں ایک روزہ بھی چھوٹ گیا تو پھر سے روزہ رکھنا ہوگا۔ اس لئے کفارہ کا روزہ ایسے وقت شروع کرنا چاہیئے جب آدمی خوب تندرست ہو اور آگے کوئی ایسا دن نہ آنے والا ہو جن میں روزہ حرام ہے۔ مثلاً عیدالضحیٰ کے تین دنوں میں۔

(۲) کفارہ کے روزے رکھنے کے درمیان میں اگر عورت کو حیض آجائے تو حیض کی مدت

---

[1] دور جدید میں اس کی بہت سی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں جو اس سے پہلے نہیں تھیں۔ اس لئے فقہانے صرف دو صورتوں کا ذکر کیا ہے۔ [2] علم الفقہ حصہ سوم

بیہوشی طاری ہوجانے گی یا (۴) کوئی اور مرض پیدا ہوجائے گا، یا (۵) مرض بہت زیادہ بڑھ جائے گا، تو اس حالت میں روزہ توڑ دینا جائز ہے۔ مثلاً (الف) کسی کو تیز بخار آگیا، پیٹ میں یا گردہ میں یا کان میں شدید درد ہو، اب اگر وہ دوا نہیں پیتا ہے تو اس کا بخار یا درد اچھا نہیں ہوگا تو اس کو دوا پی کر روزہ توڑ دینا چاہیے، یا (ب) مثلاً کسان نے دھوپ میں ہل یا پانی چلایا، یا مزدور نے اپنی اور اپنے بچوں کی پرورش کے لئے دھوپ میں محنت مزدوری کی اور اس کو اتنی پیاس لگ گئی کہ وہ روزہ نہیں توڑتا تو بیہوش ہو جائیگا تو اسکو روزہ توڑ دینے کی اجازت ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص مزدوری پر چلوا سکتا تھا یا بغیر دھوپ میں گئے ہوئے اپنے بچوں کی پرورش کر سکتا تھا اور اس نے صرف پیسے کی لالچ میں ایسا کیا تھا تو اسکو روزہ توڑ دینے کی اجازت تو ہے مگر گنہگار ہوگا۔

(۲) اسی طرح اوپر جو صورتیں روزہ نہ رکھنے کی بیان کی گئی ہیں، ان کے علاوہ بھی کوئی ایسی اچانک بات پیش آجائے تو روزہ توڑ دینا جائز ہے۔ مثلاً کوئی اچانک بیمار پڑ جائے یا اچانک سفر پیش آجائے اور اسمیں روزہ پورا کرنا ممکن نہ ہو، یا حاملہ یا دودھ پلانے والی عورت نے روزہ رکھ لیا مگر اس کو یا بچہ کو شدید تکلیف ہوگئی۔ اسی طرح کوئی بے ہوش ہوگیا یا پاگل ہوگیا، ان سب صورتوں میں روزہ رکھکر توڑ دینا جائز ہے۔ اس روزہ کے بدلے صرف ایک قضا روزہ رکھنا ہوگا کفارہ ادا نہ کرنا ہوگا۔

بڑھاپے اور طویل بیماری کا حکم اگر کوئی اتنا بوڑھا ہو جائے کہ وہ روزہ نہیں رکھ سکتا یا اس کو کوئی ایسی مہلک یا طویل بیماری ہو کہ اس سے صحت پانے کی بظاہر کوئی امید نہ ہو اور روزہ رکھنے سے اس کو کوئی نقصان پہنچتا ہو تو ایسے آدمی کو اپنے ہر روزہ کے بدلے فدیہ دینے کی اجازت ہے۔

فِدْیَہ فدیہ کے معنیٰ بدلہ دینے کے ہیں اور شریعت میں نماز قضا ہو جانے یا روزہ نہ رکھ سکنے کے بدلے میں جو خیرات کی جاتی ہے اس کو فدیہ کہتے ہیں۔

ایک روزہ کے بدلے ایک محتاج کو اتنا غلہ دے جتنا غلہ صدقۂ فطر میں دیا جاتا ہے یعنی پونے دو سیر گیہوں یا ساڑھے تین سیر جَو یا ان میں سے کسی ایک کی قیمت دے دینی چاہیئے مگر قیمت دینے میں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ جس چیز کی قیمت لگانے میں غریبوں کا فائدہ ہو اسی چیز کی قیمت لگائی جائے۔ اگر جَو اور گیہوں کے علاوہ کوئی اور غلہ دے تو پونے دو سیر گیہوں یا ساڑھے

تین سیر جو کی جتنی قیمت ہو اتنی ہی قیمت کا وہ غلہ دے۔

(۱) فدیہ میں اگر غلہ نہ دے بلکہ ایک محتاج کو دونوں وقت پیٹ بھر کھلائے تو اس سے بھی فدیہ ادا ہو جائیگا۔ اگر وہی کھانا کھلائے جو خود کھاتا ہے (۲) فدیہ کا غلہ یا قیمت کسی محتاج کو بھی دیا جا سکتا ہے۔

فدیہ ادا کرنے کے بعد کسی بوڑھے میں روزہ رکھنے کی طاقت آ گئی یا کوئی بیمار تندرست ہو گیا تو اس کے چھوٹے ہوئے تمام روزوں کی قضا کرنی واجب ہے، اس نے جو فدیہ ادا کیا ہے اس کا ثواب اس کو الگ ملے گا۔

جو لوگ بڑھاپے سے کمزور ہو گئے ہوں، یا کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہوں ان کو چاہیئے کہ اپنے روزوں کا فدیہ رمضان ہی میں ادا کر دیں، اس انتظار میں نہ رہیں کہ ممکن ہے طاقت آ جائے یا تندرست ہو جائیں۔ پھر قضا رکھ لیں گے۔ ایسا کرنا گناہ ہے۔ موت کا وقت معلوم نہیں۔ کیا معلوم کس وقت آ جائے اور وہ ادا نہ کر سکیں۔

مرنے والوں کا حکم | اگر کوئی شخص مر گیا اور اس کے ذمہ رمضان کے روزے باقی رہ گئے تھے تو اس کی دو صورتیں ہیں، ایک کہ اس نے فدیہ ادا کر دینے کی وصیت کر دی ہے یا وصیت نہیں کی ہے۔

(۱) اگر اس نے وصیت کر دی ہے تو اس کے وارثوں کو چاہیئے کہ اسکے ایک تہائی مال سے اس روزہ یا نماز کا فدیہ ادا کر دیں، اس کے بعد دو تہائی مال وارث تقسیم کر لیں۔ ہر نماز کے بدلے ایک فدیہ ہے اگر اس کے روزے یا نماز کے فدیہ میں ایک تہائی سے زیادہ مال نکل جاتا ہو تو اتنا ہی فدیہ ادا کرنا ضروری ہے جتنا کہ ایک تہائی مال میں پورا ہو جاتا ہو۔ بقیہ فدیہ کا ادا کرنا وارثوں پر ضروری نہیں ہے، اگر وہ خوشی سے ادا کر دیں تو یہ ان کو اختیار ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ مردہ کے دفن اور کفن میں جو کچھ خرچ ہو یا اس کے ذمہ اگر کوئی قرض ہو تو اس کو ادا کرنے کے بعد پھر فدیہ ادا کیا جائے۔

(۲) دوسری صورت یہ ہے کہ اس نے وصیت نہیں کی ہے تو ایسی صورت میں یہ وارثوں کی مرضی پر ہے چاہے وہ ادا کریں یا نہ کریں مگر ادا کر دینا بہتر ہے، اس لئے کہ وہ اسکے چھوڑے ہوئے مال سے دنیا میں فائدہ اٹھا رہے ہیں تو اس احسان کے بدلے میں اگر وہ فدیہ ادا کر دیں گے تو اس کو بھی آخرت میں فائدہ ہو گا۔ اور ان کو بھی ثواب ہو گا، ممکن ہے کہ اس کے دل میں وصیت کرنے کی نیت رہی ہو اور وہ نہ کر سکا ہو لیکن جو وارث نابالغ ہوں اگر وہ کہیں تو بھی ان کے حصہ سے فدیہ نہ ادا کرنا چاہیئے۔

ختم کر کے فوراً روزہ شروع کر دینا چاہئے، چونکہ یہ قدرتی اور دائمی عذر ہے۔ اس لئے ان کو اتنی اجازت دی گئی ہے، البتہ نفاس کی وجہ سے روزے چھوٹ جائیں تو کفارہ نہیں ہو اسے پھر سے روزہ رکھنا ہوگا، کیونکہ یہ عذر ہر مہینہ پیش نہیں آتا۔

(۳) اگر کسی میں لگاتار دو مہینے کے روزے رکھنے کی طاقت نہ ہو تو پھر ساٹھ مسکینوں کو دونوں وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلائے یا پھر صدقۂ فطر میں جتنا غلہ دیا جاتا ہے اتنا غلہ یا اس کی قیمت ان کو دیدے۔ غلام آزاد کرنے کی صورت باقی نہیں رہی اس لئے اس کا ذکر نہیں کیا گیا۔

اگر اکٹھا ساٹھ مسکینوں کو کھانا نہ کھلا سکے یا وہ نہ مل سکیں تو ایک کو ساٹھ دن تک کھانا کھلائے یا ساٹھ دنوں تک روزانہ ایک دن کا غلہ دیدے تب بھی جائز ہے۔ مگر ایک آدمی کو ساٹھ دنوں کا اکٹھا غلہ یا اکٹھی قیمت ایک ہی دن دیدی تو کفارہ ادا نہیں ہوا۔ اگر ایک ہی رمضان کے تین چار روزے چھوٹ گئے، تب بھی ایک ہی کفارہ واجب ہے لیکن اگر یہ روزے دو رمضان کے ہوں تو دو کفارے دینے ہوں گے۔ رمضان کے علاوہ اگر کوئی نفل روزہ توڑ دے تو کفارہ واجب نہیں ہے۔ اس کی قضا کر لینی کافی ہے۔

روزہ نہ رکھنے کی اجازت | جن عذروں کی بنا پر ایک مسلمان کو رمضان کے روزے نہ رکھنے یا توڑ دینے کی اجازت ہے وہ یہ ہیں۔[1]

(۱) **سفر** | یعنی اگر کوئی شخص ۴۸ میل (۸۰ کلومیٹر) سے زیادہ کا سفر کرنے کا ارادہ رکھتا ہو خواہ سفر پیدل کا ہو یا ریل اور ہوائی جہاز کا اس کو روزہ چھوڑ دینے کی اجازت ہے لیکن اگر سفر میں تکلیف نہ ہو تو روزہ رکھنا زیادہ بہتر ہے۔

اگر کوئی شخص روزہ کی نیت کرنے کے بعد پھر سفر شروع کرے تو اس کو اس دن کا روزہ رکھ لینا ضروری ہے۔[2]

(۲) **مرض** | اگر کوئی شخص ایسا مریض ہو کہ وہ روزہ رکھے گا تو اس کا مرض بڑھ جائے گا، یا

[1] شرح التنویر ج ۲ ص ۱۵۸ [2] فتاوی ہندیہ ج ۱ ص ۱۳۳۔

کوئی نیا مرض پیدا ہو جائے گا۔ یا اس کے اچھے ہونے میں دیر لگے گی تو اس کو روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے، یا مرض تو نہیں ہے لیکن کمزوری اتنی ہے کہ روزہ رکھے گا تو بیمار ہو جائے گا تو اس کو بھی روزہ چھوڑنے کی اجازت ہے۔

لیکن مرض کی صورت میں اسی وقت روزہ چھوڑنا چاہئے جب کوئی نیک محتاط مسلمان ڈاکٹر یا حکیم اس کو روزہ چھوڑنے کا مشورہ دے۔ یا خود آدمی کو پورا یقین ہو یا تجربہ ہو کہ روزے سے اس کو نقصان پہنچے گا۔

(۳) **حاملہ اور مرضعہ** | جو عورت حاملہ ہو یا دودھ پلاتی ہو اس کو اگر اپنی جان یا بچے کی جان کا خطرہ ہو یا اس کو یا بچہ کو سخت تکلیف میں پڑ جانے کا یقین ہو تو اس کو روزہ چھوڑ دینا جائز ہے۔ مثلاً روزہ دار حاملہ عورت کو بیہوشی کی کیفیت ہو جاتی ہو یا اس کا دودھ خشک ہو جاتا ہو اور بچہ بھوک سے تڑپتا ہو۔

لیکن اگر کوئی شخص مالدار ہو اور اپنے بچہ کو کسی دوسری عورت سے معاوضہ دیکر دودھ پلوانے کا انتظام کرسکتا ہو، یا بچہ اوپر کا دودھ پی لیتا ہو اور اس کی صحت کو کوئی نقصان نہ ہوتا ہو تو ان صورتوں میں عورت کو روزہ رکھنا فرض ہے[1]

(۴) **حیض و نفاس** | حیض و نفاس کی حالت میں بھی عورت کو روزہ چھوڑ دینا چاہئے[2] لیکن جوں ہی پاک ہو جائے اس کو روزہ شروع کر دینا چاہئے اور جو روزے چھوٹ جائیں ان کو رمضان بعد پورا کر لینا چاہیے۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ حیض و نفاس میں چھوٹی ہوئی نماز تو معاف ہے مگر روزہ معاف نہیں۔

یہ بات بھی اچھی طرح یاد رہنی چاہیے کہ ان تمام صورتوں میں رمضان کے بعد جب بھی عذر دور ہو جائے اس کی قضا کرنی ضروری ہے۔ اگر قضا نہ کی جائے تو سخت گناہ ہوگا۔

روزہ رکھ کر توڑ دینے کی اجازت | اگر کسی کو روزہ رکھ لینے کے بعد (۱) اتنی شدید پیاس لگی یا (۲) اتنی بھوک لگی۔ اگر روزہ نہ توڑے تو اس کی جان چلی جائے گی یا (۳) اس پر

---

[1] رد المحتار ج ۲ ص ۱۴۶ ؛ [2] رد المحتار ج ۲ ص ۱۹۶

ہو چکا ہوتا تھا۔ رمضان المبارک میں حضرت جبریل علیہ السلام سے اسکا دور فرمایا کرتے تھے۔ جس سال آپ کی وفات ہوئی اس سال آپ نے دو بار پورے قرآن کا دور فرمایا (بخاری)

قرآن پاک کا حفظ | قرآن پاک کی تلاوت کے ساتھ اس کو زیادہ سے زیادہ زبانی یاد کرنا اور پھر اس کو نمازوں میں اور نمازوں سے باہر پڑھنا سب سے بڑی عبادت اور کسی مسلمان کیلئے سب سے بڑی سعادت ہے۔ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ یہ تھا کہ قرآن کا جو حصہ حضرت جبریل لے کر نازل ہوتے تھے آپ اسے اپنے سینے میں فوراً محفوظ کر لیتے تھے اور کاتبین وحی کو بلا کر اسے لکھوا دیا کرتے تھے۔ قرآن کو جلد سے جلد محفوظ کرنے میں کبھی کبھی زبان سے سبقت اس لئے ہو جاتی تھی کہ وحی کا کوئی حصہ چھوٹ نہ جائے اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسکین کے انداز میں ہدایت فرمائی کہ آپ اسمیں جلدی نہ کریں جس طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک آپ پر نازل کیا ہے اسی طرح وہ اسے محفوظ بھی کر دے گا۔ جب قرآن کا کوئی حصہ نازل ہوتا اور آپ اسے لکھ لینے کا حکم فرماتے تو عام صحابہ بھی اسے جلد سے جلد حفظ کر لینے کی کوشش کرتے اور دیکھتے دیکھتے وہ حصہ سیکڑوں صحابہ کو یاد ہو جاتا تھا۔ اور جو لوگ اس وقت یاد نہیں کر پاتے وہ فرض نمازوں میں آپ سے سن کر یاد کر لیتے تھے۔ اس طرح قرآن کا ایک ایک حرف سیکڑوں صحابہ کو یاد ہو جاتا تھا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے حفظ کا اتنا اہتمام فرماتے تھے کہ ہر سال رمضان مبارک میں جتنا قرآن سال بھر میں نازل ہو چکا ہوتا تھا اسے آپ حضرت جبریل کو سنا دیا کرتے تھے اور جس سال آپ کا وصال ہوا اس سال رمضان مبارک میں آپ نے دو بار پورا قرآن حضرت جبریل کو سنایا اگر کسی مومن کو قرآن کا کوئی حصہ یاد نہ ہو تو اس کے بارے میں آپ نے فرمایا ہے کہ وہ ایک ویران گھر کیطرح ہے

(لا تحرک) بہ لسانک لتعجل بہ ان علینا جمعہ وقرآنہ

اِنَّ الَّذِیْ لَیْسَ فِیْ جَوْفِہٖ شَیْءٌ مِنَ الْقُرْآنِ کَالْبَیْتِ الْخَرِبِ (ترمذی) — وہ شخص جس کے سینے میں قرآن کا کچھ حصہ محفوظ نہ ہو وہ ویران گھر کیطرح ہے۔

حفظ قرآن اور اس کے مطابق عمل کی فضیلت بیان فرماتے ہوئے آپ نے فرمایا کہ

من قرء القرآن فاستظھرہ فاحل حلالہ وحرم حرامہ ادخلہ اللہ الجنۃ — جس نے قرآن پڑھا اور پھر اسے یاد کر لیا اور اس کے حلال کو حلال اور حرام کو حرام جانا تو

وشفعہ فی عشرۃ من اھل بیتہ کلھم قد وجبت لہ النار۔ (احمد، ترمذی، دارمی)

اسے اللہ تعالیٰ جنت میں داخل کرے گا اور اس کے گھر کے دس ایسے آدمیوں کی شفاعت قبول کریگا جس پر دوزخ واجب ہوگئی تھی۔

خدا کا شکر ہے کہ آپ کے اسوۂ حسنہ اور اس ارشاد گرامی کو امت مسلمہ نے ہمیشہ حرز جان بنائے رکھا اور ہر زمانہ اور ہر دور میں ہزاروں، لاکھوں آدمیوں نے قرآن کو حفظ کیا اور پھر زندگی بھر اسے اپنے سینوں سے لگائے رہے۔ آج بھی بحمداللہ کروڑوں کی تعداد میں بچے، جوان اور بوڑھے قرآن کی تلاوت کرتے ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں اس کے ایک ایک حرف اور زبر زیر کو اپنے سینوں میں محفوظ کئے ہوئے ہیں۔ دنیا میں موجود کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس کے پڑھنے والے اتنی تعداد میں موجود ہوں اور نہ کوئی کتاب ایسی ہے جو اتنی تعداد میں چھپتی ہو جتنی تعداد میں قرآن چھپتا ہے۔ یہ قرآن کا اتنا بڑا معجزہ ہے کہ اس سے کوئی عقل وشعور رکھنے والا انسان انکار نہیں کرسکتا۔

قرآن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کریں گے" وانا لہ لحافظون"، ظاہر ہے کہ قرآن پاک تو لوح محفوظ میں محفوظ ہی ہے مگر دنیا میں اس کی حفاظت کی یہی شکل ہے کہ اسکو زیادہ سے زیادہ پڑھا جائے اور اس کے معانی ومفہوم کو سمجھا جائے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ جبتک قرآن اس دنیا میں موجود ہے، مسلمان بھی دنیا میں موجود رہیں گے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ رہتی دنیا تک قرآن کی حفاظت کا وعدہ انہی کے ذریعہ پورا کرائے گا۔

قرآن کی تلاوت کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کی کیفیت اور اس کا شوق

قرآن کی تلاوت کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کیا کیفیت ہوتی تھی اسکا اندازہ دو چار واقعات سے لگایا جاسکتا ہے۔

عبداللہ ابن مسعودؓ کی روایت ہے کہ ایک بار آپؐ منبر پر تشریف فرما تھے۔ آپؐ نے ان سے فرمایا کہ کچھ قرآن سناؤ، عرض کیا یا رسول اللہ! آپ پر قرآن کا نزول ہوتا ہے اور میں آپکو قرآن سناؤں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے دوسروں سے قرآن سننا بہت زیادہ پسند ہے۔ انہوں نے سورۂ نساء کی تلاوت شروع کی جب اس آیت:۔

قرآن پاک کی تلاوت و حفظ

مجیب اللہ ندوی

اس عالم آب وگل میں پروردگار عالم نے انسانوں کو جو بیشمار نعمتیں دی ہیں ان میں سب سے عظیم نعمت قرآن پاک ہے۔ یہ عظیم نعمت بھی ہے اور عظیم بار امانت بھی اس بار امانت کا امین اس نے ارض و سما اور دشت و جبل کو نہیں بلکہ قلب مومن کو بنایا ہے۔ اگر اس بار امانت کو ہمالیہ کی چوٹی پر بھی اتار دیا جاتا تو اس کی گرانباری سے اس کا جگر شق ہو جاتا۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ

اگر اس قرآن کو ہم کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم دیکھتے کہ وہ خشیت الٰہی سے دب کر پھٹ جاتا۔

اس نعمت خداوندی اور امانت الٰہی کے بیشمار تقاضے ہیں جس میں ایک تقاضہ یہ ہے کہ اسے اپنی آنکھوں اور سینہ، جسم و دل سے لگایا جائے، اس کی روزانہ تلاوت کی جائے اس کے حفظ و تلاوت کا پورا لطف و فائدہ اور لذت و حلاوت تو سمجھ کر پڑھنے ہی سے حاصل ہوتی ہے لیکن اگر ہدایت و برکت کی نیت سے بے سمجھے بوجھے بھی اس کی تلاوت کیجائے تو اس سے بھی خدا سے تعلق اور دین سے لگاؤ پیدا ہوتا ہے، ہدایت بھی ملتی ہے اور ثواب بھی۔ استقامت کی دولت بھی نصیب ہوتی ہے اور نیک عمل کی توفیق بھی۔

قرآن کے فضائل اور خصوصیات یہ کتاب الٰہی شفاء و رحمت، ذکر و نصیحت اور ہدایت و سکینت معنوی اعتبار سے بھی ہے اور لفظی اعتبار سے بھی خود اس نے اپنے ان اوصاف کا ذکر کیا ہے اور ایک حدیث میں بھی اس کی تمام حیثیتوں کا بڑے جامع الفاظ میں ذکر آیا ہے۔

هُوَ الْفَصْلُ لَيْسَ بِالْهَزْلِ وَهُوَ حَبْلُ اللّٰهِ الْمَتِيْنُ وَهُوَ الذِّكْرُ الْحَكِيْمُ وَهُوَ الصِّرَاطُ الْمُسْتَقِيْمُ (مشکوٰۃ ص ۱۸۶)

یہ ہزل نہیں ہے بلکہ حق و باطل کے درمیان فیصلہ کرنیوالی کتاب ہے۔ یہ اللہ کی مضبوط رسی ہے یہ نصیحت اور حکمت سکھاتی ہے یہ صراط مستقیم ہے

قرآن کی تلاوت کا ایک بڑا فائدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق یہ ہے کہ اس سے قلب کا زنگ دور ہوتا ہے

ان القلوب تصدأ کما یصدأ الحدید	جس طرح پانی پڑجانے سے لوہا زنگ آلود ہو جاتا
اذا اصابه الماء قیل یارسول	ہے اسیطرح دل بھی رگنا ہوں سے، زنگ آلود ہو جاتا
الله وما جلاؤها قال تلاوۃ	ہے صحابہ نے پوچھا یا رسول اللہ اسکی صفائی کیسے ہوگی
القرآن وکثرۃ ذکر الموت (بیہقی)	فرمایا: تلاوت قرآن اور زیادہ سے زیادہ موت کی یاد۔

دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جسکو ایک دو بار پڑھنے کے بعد اس سے طبیعت بھر نہ جاتی ہو مگر صرف قرآن کا یہ امتیاز ہے کہ جتنا زیادہ پڑھیئے اس کے پڑھنے سے نہ صرف یہ کہ طبیعت اکتاتی نہیں بلکہ اس کی لذت و حلاوت میں برابر اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس ارشاد نبوی میں کتنی صداقت ہے۔

لا یشبع منه العلماء ولا یخلق	اس کے جاننے والے اس سے کبھی سیر نہیں ہوتے اور
بکثرۃ الرد	یہ ایسی کتاب ہے جو بار بار پڑھنے سے پرانی نہیں ہوتی۔

یہ تو اس کی ظاہری خوبی ہے اور معنوی خوبیوں کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

لا تنقضی عجائبه ـــــ اس کے معنوی عجائب و غرائب اور نئے نئے پہلو ہمیشہ نکلتے رہیں گے

ایک حدیث میں ہے کہ قرآن کی تلاوت سے سکینت اور طمانیت کا نزول ہوتا ہے ایک اور حدیث میں ہے کہ قرآن کی تلاوت خدا سے تعلق کو بڑھاتی ہے۔ یہ خدا کی مضبوط رسی ہے اور حکمت سے بھرا ہوا ذکر ہے خود اسوۂ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم یہ تھا کہ اٹھتے، بیٹھتے، چلتے پھرتے، رنج کی حالت ہو یا خوشی کی، سفر میں ہوں یا حضر میں دوسرے اذکار و اوراد کے ساتھ قرآن کے خاص خاص حصے بھی آپ تلاوت فرمایا کرتے تھے، مثلاً سوتے وقت آپ معوذتین، آیۃ الکرسی اور بعض دوسری سورتیں تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ تہجد کے لئے اٹھتے تھے تو خاص طور پر سورہ آل عمران کا آخری رکوع تلاوت فرماتے تھے۔ آپ کی تلاوت کا خاص موقع و محل نماز تہجد اور دوسری نفل نمازیں ہوتی تھیں۔ آپ نفل نمازوں میں دو چار رکوع نہیں بلکہ کئی کئی پارے تلاوت فرماڈالتے تھے۔ قرآن کا جتنا حصہ نازل ہوتا جاتا تھا آپ اسے جلد سے جلد سفینوں کے ساتھ سینۂ مبارک میں بھی محفوظ کر لیتے تھے پھر سال بھر میں قرآن مبارک کا جتنا حصہ نازل

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَىٰ هَٰؤُلَاءِ شَهِيدًا (نساء) اس وقت کیا ہوگا جب ہم ہر امت سے ایک گواہ لائیں گے اور ان سب پر آپ کو گواہ بنائینگے۔

پر پہنچے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب بس کرو۔

فالتفت الیہ فاذا عیناہ تذرفان (مشکوٰۃ المصابیح) میں نے آپ کے چہرۂ مبارک کیطرف دیکھا تو آپ کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک بار آپ نے رات کو نماز پڑھنی شروع کی اور پوری رات ایک ہی آیت کی تکرار میں ختم کردی اور وہ آیت یہ تھی :۔

إِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (مائدہ) اے اللہ! اگر تو عذاب دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انکو معاف کردے تو تو غالب اور حکمت والا ہے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی بڑے اہتمام اور ادب سے تلاوت قرآن فرماتے تھے۔ ایک روز صحابہ کرام بیٹھے ہوئے تلاوت کر رہے تھے۔ آپ نے دیکھا تو فرمایا "خدا کا شکر ہے کہ خدا کی کتاب ایک ہے اور تم میں (یعنی اس کے پڑھنے والوں میں) سیاہ، سرخ، سفید اور ہر قسم کے لوگ ہیں (ابوداؤد)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کو تلاوت قرآن کا بے حد شوق تھا۔ آپ نے ان کا شوق دیکھکر فرمایا کہ پورے مہینے میں قرآن ختم کرلیا کرو۔ حضرت ابن العاص نے عرض کیا مجھ میں اس سے بھی زیادہ طاقت ہے۔ آپ نے فرمایا۔ اچھا پندرہ دن میں ختم کیا کرو۔ انھوں نے پھر اصرار کیا تو آپ نے دس دن میں ختم کرنے کی اجازت دی، پھر مزید اصرار کیا تو سات دن میں قرآن ختم کرنے کا حکم دیا، فرمایا کہ اب اس سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے۔ (ابوداؤد کتاب الصوم)

تلاوت قرآن کے ذوق وشوق کا یہ عالم تھا کہ سخت سے سخت مصیبت میں بھی اس میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت ہوئی تو آپ کلام الہی کی تلاوت ہی میں مصروف تھے۔ چنانچہ ان کے خون شہادت کے چند چھینٹے اس آیت پر پڑے تھے فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

حضرت موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جب خدمت فاروقی میں حاضر ہوتے تو آپ فرماتے کہ قرآن سنا

کہ ہم کو خدا کا شوق دلاؤ۔

ایک صحابی ایک بار یہ آیت رات بھر پڑھتے رہے اور دہراتے رہے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا	جو لوگ برائیاں کرتے جارہے ہیں کیا ان لوگوں
السَّیِّئَاتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِیْنَ	کو گمان ہے کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر
آمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ	رکھیں گے جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک کام کئے۔

حضرت عبدالرحمٰن بن سائبؓ کہتے ہیں کہ ایک دن میرے پاس حضرت سعد بن وقاصؓ آئے اور بولے کہ سنا ہے کہ تم قرآن بہت اچھا پڑھتے ہو، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ قرآن غم کیلئے نازل ہوا ہے اس لئے جب پڑھو تو روؤ اگر روتے نہیں تو رونی صورت بناؤ اور اس کو خوش الحانی کے ساتھ پڑھو۔[1]

مصعب بن سعد کا بیان ہے کہ ایک بار میں نے قرآن لئے ہوئے بدن کھجلایا تو حضرت سعد بن وقاصؓ نے فرمایا کہ شاید تم نے اپنی شرمگاہ کو مس کیا، میں نے کہا ہاں۔ بولے کہ جاؤ وضو کرو۔[2]

حضرت عبداللہ بن عمر تلاوت فرماتے تھے تو جب تک فارغ نہیں ہو جاتے تھے اسوقت تک کسی سے بات نہیں کرتے تھے۔ (بخاری)

حفظ قرآن کا بھی صحابہ کرام کو بہت شوق تھا۔ اس شوق کا اندازہ اس سے ملاحظہ فرمائیں کہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں یمامہ کی ایک جنگ میں ستر صحابہؓ شہید ہوئے تھے اس حادثہ کے بعد حضرت عمرؓ کو جمع قرآن کا خیال پیدا ہوا اور انھوں نے حضرت صدیقؓ کو اس پر آمادہ کیا۔

تلاوت قرآن کے آداب | قرآن کی تلاوت خواہ نماز میں کی جائے یا نماز سے باہر۔ اس کے کچھ ضروری آداب ہیں۔ چند باتیں لکھی جاتی ہیں۔

(۱) جب قرآن پڑھے باوضو پڑھے اور اس بات کا دل میں خیال رہے کہ یہ باعظمت کلام اس باعظمت ہستی کا ہے جس کے قبضۂ قدرت میں اس دنیا کا ہر ذرہ ہے۔ قرآن کی عظمت کا ذکر خود قرآن میں بھی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس عظمت کا ذکر فرمایا ہے۔

---

[1] ابن ماجہ کتاب الصلوٰۃ [2] موطا، نہایت احتیاط اور ادب کی بنا پر ایسا فرمایا۔

(۲) اس کی عظمت کا تقاضہ ہے کہ اس کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھا جائے اور اس کے معانی پر غور کیا جائے۔ قرآن نے سوچ سمجھ کر پڑھنے کی بار بار تاکید کی ہے۔ حدیث میں بھی اس کی تاکید آئی ہے قرآن کے نازل کئے جانے کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ لوگ اس کو سمجھیں اور سمجھ کر اس پر عمل کریں ظاہر ہے کہ جب تک کوئی سمجھے گا نہیں عمل کیسے کرے گا۔ امام غزالی نے اپنی کتاب احیاء العلوم میں توراۃ کی یہ عبارت نقل کی ہے کہ:۔

"خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ بندے تجھے شرم نہیں آتی کہ جب تیرے بھائی کا خط سفر میں بھی مل جاتا ہے تو ٹھہر جاتا ہے اور راستہ سے الگ ہو کر اس کو پڑھنے کیلئے بیٹھ جاتا ہے اور اس کے حرف حرف کو غور سے پڑھتا ہے۔ یہ کتاب توراۃ میرا ایک فرمان ہے جو میں نے تجھے لکھ کر دیا ہے اور حکم کیا ہے کہ اس میں اپنی طاقت بھر غور و تامل کرو، اس کے قوانین پر عمل کرو۔ تو اس سے انکار کرتا ہے اور عمل کرنے سے جی چراتا ہے، اور پڑھتا ہے تو جی لگا کر غور و تامل سے نہیں پڑھتا۔"

لیکن جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بغیر سمجھے بوجھے قرآن کی تلاوت کرنا بے فائدہ ہے، وہ سخت غلطی پر ہیں۔ اوپر جو حدیث گزری ہے اسمیں بھی تلاوت کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بہت سی حدیثوں میں غور و فکر کے بغیر تلاوت کی ترغیب دی گئی ہے۔ مثلاً:۔

مَنْ قَرَءَ حَرْفًا مِنْ کِتَابِ اللّٰهِ فَلَهٗ حَسَنَةٌ وَالْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا لَا اَقُوْلُ الٓمّٓ حَرْفٌ وَلٰکِنْ اَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَمِیْمٌ حَرْفٌ۔	جس نے قرآن کا ایک حرف پڑھا اس کیلئے ایک نیکی ہے اور نیکی دس نیکی تک بڑھتی ہے۔ میں نہیں کہتا کہ الٓمّٓ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔

ترمذی کی دوسری حدیث میں ہے جو قرآن پوری روانی سے پڑھتا ہے وہ فرشتوں کیساتھ ہوگا اور

وَمَنْ یَتَتَعْتَعُ فِیْهِ وَهُوَ عَلَیْهِ شَاقٌّ فَلَهٗ اَجْرَانِ (مسلم)	جو قرآن اٹک اٹک کر دقت سے پڑھتا ہے اس کو دو اجر ملیں گے ایک تلاوت کا دوسرا مشقت سے پڑھنے کا

اسی بنا پر قرآن کو حسن صوت کے ساتھ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے کہ قلب پر اس کا بھی اثر پڑتا ہے

خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم خوش آواز صحابہؓ سے قرآن پڑھوا کر سنا کرتے تھے اور دوسروں کے بارے میں فرمایا کہ :-

حسنوا القرآن باصواتکم فان — قرآن خوش الحانی کے ساتھ پڑھا کرو اسلئے

الصوت الحسن یزید القرآن حسنا (دارمی) کہ اچھی آواز سے قرآن کا حسن بڑھتا ہے۔

(۳) قرآن اونچی جگہ رکھ کر خوش آوازی کے ساتھ پڑھنا چاہیئے اور ہر ہر لفظ کو صحیح صحیح پڑھنا چاہیئے۔ اور ہر آیت پر جہاں ٹھہرنا ضروری ہو ٹھہر جانا چاہیئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام باتوں کا حکم دیا ہے اور خود قرآن میں بھی قرآن کو ترتیل سے یعنی ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کا حکم آیا ہے۔

(۴) قرآن کی کوئی آیت یاد کرکے بھلا دینے کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت برا فرمایا ہے۔ جب ایک آیت کو بھلا دینے کو آپؐ نے برا فرمایا تو جو لوگ قرآن حفظ کرکے بھلا دیتے ہیں انکو کتنا گناہ ہوگا۔

(۵) جب تک قرآن پڑھنے میں دل لگے اس وقت تک پڑھتا جائے اور جب دل نہ لگے تو بند کردے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بے دلی کے ساتھ قرآن پڑھنے سے منع فرمایا ہے لیکن کسی کا دل قرآن پڑھنے میں لگتا ہی نہ ہو تو اس کا جی لگے یا نہ لگے پڑھنا ضروری ہے جیسے چھوٹے بچے

(۶) دن میں کسی نہ کسی وقت روزانہ تھوڑا سا قرآن تلاوت کرنا ضروری ہے۔ سب سے اچھا وقت نماز فجر کے بعد ہے۔

(۷) بعض لوگ نماز کے بعد مختلف قسم کے اذکار اور وظیفے تو گھنٹے آدھ گھنٹے پڑھتے رہتے ہیں لیکن قرآن کی تلاوت میں دو چار منٹ بھی صرف نہیں کرتے۔ ایسا کرنا سخت برا ہے خدا کے کلام سے بڑھ کر کونسا ذکر اور کون سا وظیفہ بہتر اور بڑا ہے جو اس کو چھوڑ کر دوسرا ذکر و وظیفہ کیا جائے اس سے بھی بڑھ کر یہ بات تشویش کی ہے کہ بعض اہل اصلاح اپنے متوسلین کو قرآن کی تلاوت سے روک دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پہلے ان وظیفوں سے دل کی صفائی ہو جائے گی تو پھر قرآن کی تلاوت کرنا۔ غور کیجئے کہ قرآن سے بڑھ کر اور کس کلام یا ذکر سے دل کی صفائی ہو سکتی ہے کہ یہ لوگ ایسا حکم دیتے ہیں۔ خدائے تعالیٰ ان باتوں سے محفوظ رکھے۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

قراءۃ القرآن فی الصلوٰۃ افضل من قراءۃ القرآن فی غیر الصلوٰۃ وقراءۃ القرآن فی غیر الصلوٰۃ افضل من التسبیح والتکبیر (مشکوٰۃ) — نماز کے اندر قرآن کی قرأت نماز سے باہر کی قرأت سے افضل ہے اور نماز کے باہر کی قرأت تسبیح اور تکبیر سے بہتر ہے۔ ●●

عرب علمائے کے کچھ اہم فتوے

(۱) سعودی حکومت کیطرف سے ایک مجلس "اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیۃ والافتاء" قائم ہے۔ جس میں پورے ملک علما وصلحا شریک ہیں۔ جس کے تحت مختلف مسائل پر وہ بحث کرکے اپنا آخری فیصلہ دیتے ہیں۔ اس سلسلہ میں انھوں نے ایک مجلس میں دی ہوئی تین طلاقوں کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر کیاہے کہ ایک مجلس میں دی گئی تین طلاقیں عہد نبوی میں تین ہی سمجھی جاتی رہی ہیں اور اس پر عمل ہوتا رہاہے۔ اور اسی کے مطابق حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے باقاعدہ قانونی شکل دے دی اور پھر پوری امت اس پر عمل کرتی رہی ہے۔ تمام روایتوں کو نقل کرنے کے بعد مجلس اس نتیجہ پر پہونچی ہے کہ "القول بوقوع الطلاق الثلاث بلفظ واحد ثلاثا"۔

(۲) دوسرا فتوی شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ بن باز جو اس مجلس کے صدر ہیں انہوں نے دیاہے جو اخبار العالم الاسلامی مورخہ ۱ر شعبان ۱۴۰۲ھ میں شائع ہو چکاہے۔ وہ یہ ہے کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب کا ترجمہ قرآن پاک اور اس پر مولانا نعیم مرادآبادی کا حاشیہ ملیئۃ بالشرک والبدع والآراء الباطلۃ یہ شرک، بدعت اور باطل خیالات سے بھرا ہواہے۔ جیسے انبیا واولیا سے انکی وفات کے بعد استعانت، اور یہ کہ ان کو علم غیب تھا یا وہ بشر نہیں تھے وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے آخر میں لکھاہے کہ کلام اللہ کو تحریف سے بچانے کیلئے ضروری ہے کہ اسکے سارے نسخے جلا دئیے جائیں۔

(۳) اسیطرح انہوں نے توراۃ وانجیل پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کو حرام لکھاہے اسلئے کہ یہ کتابیں محرف ہیں۔

(۴) کسی کا نطفہ لے کر اسے نلکیوں کے ذریعہ رحم مادر میں پہنچایا جائے اور اس سے جو اولاد حاصل ہو تو ..... اس کے بارے میں وہ حضرات تحقیق کررہے ہیں کہ اس پر کیا حکم لگایا جائے۔

نوٹ! اس بارے میں ہندوستان کے علما کو بھی غور کرنا چاہئے۔

نئی کتابیں

البلاغت | مرتبہ مولانا سید غیاث الدین صاحب مظاہری صفحات ۱۶۰۔ قیمت دس روپئے
ناشر:۔ مکتبہ عزیزیہ ۴۰۰ بخشی بازار - الہ آباد)

علم معانی و بیان پر مدارس میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ متقدمین کے بجائے عموماً متاخرین کی پڑھائی جاتی ہیں جن کے پڑھنے کے بعد اصل مسئلہ تو طلبہ کے ذہن نشین کم ہوتا ہے البتہ دوسرے مباحث سے واقفیت ہوجاتی ہے اور اس سے ان کو علمی فائدہ بھی ہوتا ہے مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ فن بلاغت سے مناسبت نہیں ہو پاتی۔

زیر تبصرہ کتاب اس لحاظ سے مفید ہے کہ اس میں فن کے اصل مسائل کو زیادہ سے زیادہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کیلئے عربی کے ساتھ اردو اشعار و محاورات سے بھی مثالیں دی گئی ہیں۔ جن سے ابتدائی طلبہ کو کافی فائدہ پہنچے گا۔ یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسے ابتدائی عربی درجات میں داخل کرلیا جائے۔ مگر ساتھ ہی مرتب کو یہ مشورہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جہاں انھوں نے معرب اردو عبارت لکھی ہے اسے آسان کردیں اس سے اسکی افادیت اور بڑھ جائے گی۔

الانور | مرتب:۔ جناب عبدالرحمن صاحب کوندو۔ صفحات ۲۸۷۔ قیمت چالیس روپئے
ناشر:۔ ندوۃ المصنفین۔ دہلی۔

علامہ شاہ محمد انور رحمۃ اللہ علیہ اس صدی کے ممتاز ترین علماء میں گزرے ہیں۔ یوں تو سارے علوم دینیہ پر ان کی نگاہ تھی مگر فن حدیث میں تو وہ بیہقی وقت تھے۔ پھر ان کا یہ علم انھی کی ذات تک محدود نہیں رہا بلکہ ان کا علم پورے طور پر علم نافع ہوا۔ جو حضرات ایک طویل مدت تک ان کے ساتھ رہے وہ سب لوگ اپنے اپنے وقت کے ممتاز علماء میں شمار ہوئے مگر جو لوگ کہ مہینے دو مہینے ان کے درس میں شریک ہوگئے ان کے اندر ایک علمی شان پیدا ہوگئی۔ یہ خصوصیت مولانا عبدالحئی فرنگی محلی اور علامہ شبلی کے بعد مولانا انور شاہ میں نظر میں آتی ہے۔

اپنے ذوق کی بنا پر شاہ صاحب کی علمی نکتہ سنجیوں اور تحقیقات کو متوسط ذہن کے طلبہ
نہیں سمجھ پاتے تھے مگر شاہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ایسے لائق تلامذہ عطا کر دیئے کہ انہوں نے
ان کی ساری علمی تحقیقات اور نکتہ سنجیوں کو متعدد کتابوں میں جمع کر کے اس کو آسان بنا دیا ہے۔
جس سے متوسط لوگ بھی مستفیض ہو سکتے ہیں۔ اس سے پہلے شاہ محمد انور صاحب کی زندگی کے بارے
کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ مگر عبدالرحمٰن صاحب کوندوی کی زیر تبصرہ کتاب ان سب کی جامع ہے
جس سے شاہ صاحب کی زندگی کے ہر گوشہ پر روشنی پڑ جاتی ہے۔ عبدالرحمٰن صاحب کی یہ کتاب اس
حیثیت سے بھی قابل قدر ہے کہ وہ نہ تو باقاعدہ عالم ہیں اور نہ شاہ صاحب کے براہ راست شاگرد
مگر کتاب پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تحریر ایک ایسے شخص کی ہے جو طویل مدت تک
ان کی خدمت میں رہا ہو یا کوئی خاص شاگرد ہو۔ غالباً اسی وجہ سے یہ کتاب کافی مقبول ہوئی۔
اور ۶-۷ برس کے اندر اس کے چار ایڈیشن نکل گئے یہ کتاب کا چوتھا ایڈیشن ہے۔

علامہ اقبال (مصلح قرن آخر) | از ڈاکٹر علی شریعتی ترجمہ کبیر احمد جائسی۔ صفحات ۱۰۴۔ قیمت بارہ روپئے
ناشر:۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

ڈاکٹر علی شریعتی مرحوم ایران کے ایک ممتاز عالم ہیں جن کا انتقال ایران کے نئے انقلاب
کے ایک سال پہلے لندن میں ہوا۔ شاہ ایران کے خلاف وہاں جو بغاوت ہوئی تھی اسمیں انکا بڑا ہاتھ
تھا اور اسی وجہ سے وہ کئی بار جیل گئے اور آخری بار انہیں ملک چھوڑ کر لندن میں قیام کرنا پڑا۔ انکی موت
اچانک ہوئی اس لئے انکے ماننے والوں کو شبہ ہے کہ انکو شاہ ایران کی خفیہ ایجنسی ساواک نے قتل کرایا۔
علی شریعتی کو علامہ اقبال سے بڑی گرویدگی تھی اور وہ انہیں جمال الدین افغانی وغیرہ کی صف
میں شمار کرتے تھے۔ علامہ اقبال کی شاعری پر تو نہیں مگر انکی شخصیت اور فکر و خیال پر انہوں نے دو
تقریریں کی تھی۔ یہ ان میں سے ایک تقریر کا ترجمہ ہے جسے کبیر احمد جائسی نے کیا ہے۔ کبیر احمد صاحب کے
مقدمہ سے پہلے میں نے کتاب پڑھنا شروع کی تو احساس ہوا کہ اسمیں کوئی تصنیفی ترتیب نہیں نظر آتی
اس سے کچھ الجھن محسوس ہوئی مگر کبیر احمد صاحب کا مقدمہ پڑھنے سے قدرے الجھن دور ہوئی۔ انہوں نے
خود لکھا ہے:۔

باقی صفحہ ۵ پر

کوائف جامعۃ الرشاد

(۱) جامعۃ الرشاد میں مختلف درجوں کے امتحانات اور چھٹیاں مختلف اوقات میں ہوتی ہیں مکتب کا امتحان ۱۸ر مئی سے ۲۴ر مئی تک ہوا اور ۲۵ کو نتیجہ سنا کر ایک ماہ کی چھٹی ہوگئی۔ اب مکتب ۲۵ر جون کو کھلے گا۔ عربی درجات کے امتحانات ۱۶ر شعبان سے شروع ہوکر ۲۴ر شعبان کو ختم ہوں گے۔ اور اس کے بعد ڈیڑھ ماہ کی چھٹی ہو جائے گی۔ اور حفظ کے امتحان کا طریقہ یہ ہے کہ بچوں نے جتنا قرآن حفظ کرلیا ہے وہ سب پہلے نفل نماز دن میں تین تین یا چار چار گروپ بنا کر سنا دیتے ہیں۔ پھر ۱۸، ۱۹ر رمضان کو امتحان لے کر صرف بیس دن کی چھٹی کردی جاتی ہے۔ مکتب کا نتیجہ بحمداللہ ۸۰ فیصد رہا۔ اس میں جو لڑکے اول دوم اور سوم آئے ان کو انعامات دیئے گئے اور جو لڑکے اپنے درجہ میں اول آئے ان کو بھی انعامات دیئے گئے۔

اس سال درجہ حفظ میں ۳۵-۴۰ کے درمیان لڑکے داخل ہوئے۔ جن میں پانچ لڑکوں نے قرآن پاک ختم کرلیا ہے اور امید ہے کہ ان میں تین لڑکے تراویح میں پورا قرآن سنا لیں گے۔ دو لڑکے اپنی کم عمری کی وجہ سے نہیں سنا سکیں گے۔

(۲) ترکی حکومت نے سوا صدی پہلے اپنی عدالتوں کیلئے ممتاز علما کی نگرانی میں ایک مجموعہ قانون المجلہ جسے الاحکام العدلیہ بھی کہتے ہیں کے نام سے تیار کرایا تھا۔ اسمیں قانون کی کتابوں کیطرح دفعہ وار وہ مسائل درج ہیں جنکا تعلق معاملات سے ہے۔ ترکی کے علاوہ شام و مصر کی عدالتوں میں بھی یہ مجموعہ متداول رہا ہے۔ اسکی ترکی اور عربی میں کئی شرحیں لکھی گئیں۔ جنمیں سب سے جامع شرح شیخ سلیم رستم باز اللبنانی کی تھی۔ عرب ملکوں میں فقہ اسلامی پر کام کرنے والے جتنے علما ہیں وہ سب "المجلہ" اور اسکی شرح کا حوالہ دیتے ہیں۔ خاص طور پر شیخ محمد مصطفیٰ زرقا نے "المدخل" میں بار بار اسکا ذکر کیا ہے۔ راقم الحروف کو ۲۵ برس سے اسکی شرح کی تلاش تھی اس کیلئے میں نے بہت سے دوستوں کو لکھا اور [illegible] میں جب حج میں جانے کی سعادت نصیب ہوئی تو حرمین کے کتب خانوں میں بھی تلاش کیا۔ مگر نہ مل سکی۔ معلوم ہوا کہ نایاب ہے۔ میں مولانا عنایت اللہ سبحانی صاحب کا مشکور ہوں کہ انہوں

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان
ماہنامہ
الرشاد
مرتبہ
مجیب اللہ ندوی

دار التالیف و الترجمہ کی تصانیف

عبادت و خدمت

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہٗ

اس رسالہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور عام انسانوں کی خدمت بھی عبادت ہے اور اس پر اسی طرح اجر و ثواب ملتا ہے جس طرح فرض عبادات کے اہتمام کے ساتھ ہمارے اندر عام انسانوں کی خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہو جائے تو نفرت و حقارت کے بہت دبیز پردے ہٹ جائیں گے۔ اور اسلام سے عام انسانوں کے دلوں میں ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ سائز ۲۰×۳۰ صفحات ۵۶ قیمت ۲۵ پیسے

دینی مدارس اور انکی ذمہ داریاں

یہ محترم مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد کی انکی تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو وہ طلب اساتذہ، منتظمین مدارس اور عربی مدارس کے ذمہ داروں کے سامنے کرتے رہے ہیں یہ تقریریں اور تحریریں ورد و اشک میں ڈوبی ہوتی ہیں۔ ان میں بعض تقریروں کو محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہٗ نے اپنے تائیدی نوٹ کے ساتھ الفرقان میں شائع فرمایا اور شیخ الحدیث حضرت مولانا ذکریا صاحب مدظلہ العالی نے ایک بڑے مجمع میں پڑھوا کر سنوایا اور فرمایا کہ اسے ہر استاذ اور طالب علم کو پڑھنا چاہیئے۔ سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۱۰۰ قیمت ۵۰ پیسے

اسلامی تعلیم

حصہ اول، دوم، سوم، چہارم

بچوں کو اسلامی مسائل ذہن نشین کرانے کیلئے اردو زبان میں درجنوں رسالے لکھے گئے ہیں۔ مگر اس رسالہ کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے اور مسائل ایسے آسان طریقہ سے سمجھایا گیا ہے کہ بچے اسے قصہ کہانی کی کتاب کیطرح دلچسپی و شوق سے پڑھتے ہیں۔ چار حصوں میں تمام ضروری مسائل آگئے ہیں۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶

قیمت حصہ اول ۸؍ دوم ۱۲؍ سوم ۲۵ پیسے چہارم ۲۵ پیسے

تبع تابعین حصہ اول

مرتب مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہٗ

کتاب میں ۱۹ اکابر تابعین کا مفصل تذکرہ ہے، شروع میں مصنف کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا ہے جس سے اسلام کی ابتدائی دو صدی کے دینی تہذیبی اور سیاسی تاریخ کا ایسا خاکہ سامنے آجاتا ہے کہ اسی کی روشنی میں صحیح اسلامی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دار المصنفین سے شائع ہوا تھا

مولانا مجیب اللہ ندوی پرنٹر و پبلشر و ایڈیٹر نے نشاط پریس ٹانڈہ میں چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد رشاد ۔ اعظم گڑھ سے شائع کیا

سالانہ چندہ	جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان ماہنامہ الرشاد	سالانہ چندہ
ہندوستان 24/=		ممالک غیر
چندہ ششماہی 12/=		بارہ ڈالر امریکی
قیمت فی پرچہ 2/50		12/=

جلد (۲) جولائی ۱۹۸۲ء و اگست ۱۹۸۲ء مطابق شوال و ذوالقعدہ ۱۴۰۲ھ شمارہ (۱۸، ۱۹)

فہرست مضامین

مجلس ادارت

(شفا پریس اعظم گڈھ)

رشحات

(مجیب اللہ ندوی)

۴ رجون ۱۹۸۲ء کو لبنان میں فلسطینی مجاہدین کے خلاف اسرائیلی حکومت نے اپنے جن سیاسی مقاصد کے لئے جو جارحانہ قدم اٹھایا تھا امریکہ کی مدد سے اس نے اس کا زیادہ حصہ پورا کرلیا یعنی فلسطینی مجاہدین کی مرکزی قوت کو اس نے ختم کرکے ان کو ملک بدری پر مجبور کردیا۔ اب شامی فوج کو لبنان سے نکال کر وہاں اپنی مرضی کی حکومت بنانے کا کام باقی ہے جس کی طرف اس نے قدم بڑھانا شروع کردیا ہے، موجودہ صدر کا انتخاب اس کی ایک کڑی ہے۔ یہ تو اس کے فوری مقاصد ہیں جن کو وہ پورا کرنا چاہتا ہے۔ اس کے وہ طویل مقاصد جس کی زد میں نہ صرف تمام اسلامی ممالک بلکہ حرمین شریفین کی مبارک سرزمین بھی ہے۔ دیکھئے وہ کب بروئے کار لاتا ہے۔

۱۹۱۱ء میں جب انگریزوں نے کئی اسلامی ملکوں پر قبضہ کرنے کے بعد بلقان میں جنگ چھیڑی تھی تو علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ایک بڑا دردناک اور طویل مرثیہ لکھا جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

یہ طوفان بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

اب پہلے شعر میں بلقان کی جگہ لبنان کو رکھ دیجئے اور اسرائیل کے جارحانہ سیاسی عزائم اور جارحانہ

اقدامات کو سامنے رکھئے تو یہ محسوس ہوگا کہ لبنان میں ظالم اسرائیلی حکومت مظلوم فلسطینیوں کے خون سے جس طرح ہولی کھیلی ہے اور جس طرح تباہی و بربادی مچائی ہے اس پر ہر صاحب ضمیر انسان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے ہیں اور ان کے دل رنج و غم سے بھر گئے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ امریکہ و روس کے ایوان حکومت میں اس سے یہی نہیں کہ کوئی ارتعاش پیدا نہیں ہوا بلکہ روس کی حکومت نے اپنی خاموشی سے اور امریکہ نے اپنے ویٹو کی طاقت اور اسلحہ کی مدد سے اسے پورا موقع دیا کہ وہ شرافت و انسانیت کی دھجیاں بکھیر کر ان کے سیاسی مفاد کے لئے راہ ہموار کرے۔

دنیا کی یہ بڑی طاقتیں مسلمانوں میں انتشار پیدا کرنے اور ان میں اتحاد نہ پیدا ہونے دینے کی جو کوششیں کرتی رہتی ہیں وہ تو اتنی تعجب خیز نہیں ہیں اس لئے کہ الکفر ملۃ واحدۃ۔ لیکن سب سے تعجب و افسوس کی بات یہ ہے کہ کسی بھی اسلامی ملک کے ذمہ داروں میں اتنے بڑے حادثہ پر نہ کوئی غیرت وحمیت پیدا ہوئی اور نہ انہوں نے ان مظلوموں کی کوئی عملی مدد کی، بلکہ یہ سب اپنے اپنے آقاؤں کی نظر دیکھتے ہوئے صرف زبانی بیان دیتے رہے۔ ان کو نہ تو روس کی خاموشی سے کوئی سبق ملا اور نہ مظلوموں کے خون بہنے کا کوئی حقیقی غم ہوا۔ اور نہ امریکہ کے ویٹو اور اسلحہ کی مدد اور سیاسی بازی گری پر ان کو شرم آئی۔ ان سب سے باغیرت تو ہندوستان کی حکومت تھی جس نے ملک کے اندر اور ملک کے باہر کھل کر فلسطینیوں کی حمایت کی اور اسرائیل کے اقدام کی مذمت کی۔ یہ شام جو اس وقت براہ راست اسرائیل کی زد پر ہے اس نے اپنے آقا روس کے مشورے سے پہلے ہی دہلی میں گھٹنے ٹیک دیئے۔

قرآن پاک نے یہودیوں کے بارے میں کہا ہے " ضربت علیہم الذلۃ اینما ثقفوا الا بحبل من اللہ وحبل من الناس (ترجمہ) ان پر بے قدری جمادی گئی ہے وہ جہاں کہیں پائے جائیں گے مگر ایک تو ایسے ذریعہ کے سبب جو اللہ کی طرف سے ہے اور ایک ذریعہ سے جو آدمیوں کی طرف سے ہے" یہودی قوم کئی ہزار برس سے اپنی بدکرداری، سازشی ذہنیت اور قومی غرور و نفس کی وجہ سے ذلیل و خوار ہوتی رہی ہے اور ہر ملک سے وہ نکالی گئی ہے۔ اور یہ نتیجہ تھا اللہ کی رسی کو چھوڑنے کا وہ

کئی ہزار برس سے صرف حبل من الناس کے سہارے زندہ رہی ہے اور آج بھی اسی کے سہارے زندہ ہے۔ مگر اسے اپنی پچھلی تاریخ سے کوئی سبق نہیں ملا۔ مگر یہودیوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ ان مظلوموں کا خون ایک نہ ایک دن رنگ لائے گا۔ اور پھر اسے نہ امریکہ فوجی مدد بچا سکے گی اور نہ روس کی منافقانہ پالیسی بچا سکے گی

فلسطینیوں سے انتہائی ہمدردی کے باوجود اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ فلسطینیوں کی جدوجہد میں بھی ہمیں ہر جگہ حبل من اللہ کے بجائے حبل من الناس ہی کا سہارا نظر آتا ہے۔ کبھی یہ خبر پڑھنے میں نہیں آئی کہ ان کے کسی چھوٹے یا بڑے ذہنی لیڈر نے اپنی تقریر یا تحریر میں خدا سے مدد یا اس سے استعانت کا کوئی جملہ کہا ہو بلکہ اس عالم نزع میں یاسر عرفات کا جو بیان آیا ہے اس میں انہوں نے عربوں کو خطاب کرتے ہوئے یہ ملحدانہ جملہ بھی کہا ہے کہ "ہم کو آپ کی دعاؤں کی ضرورت نہیں ہے، ہم آپ کی تلواروں کے منتظر ہیں،، ایک مومن اگر اس بات کو کہتا تو یوں کہتا کہ ہمیں آپ کی دعاؤں کے ساتھ آپ کی تلواروں کی بھی ضرورت ہے۔ فلسطینیوں کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ دین سے دوری ہی کی وجہ سے انہیں یہ دن دیکھنے پڑے ہیں۔ اور دین سے تعلق ہی ان کو اس وادی تیہ سے نکال سکتا ہے۔ فلسطینیوں کے ساتھ انتہائی ہمدردی کے باوجود بھی ہم یہ تلخ بات اس لئے لکھنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ہمیں عربوں اور فلسطینیوں سے زیادہ اللہ کی ذات اور اللہ کا دین عزیز ہے۔

راقم الحروف بار بار اس حقیقت کا اظہار کر چکا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ان میں تعمیری ذہن پیدا کیا جائے اور تعلیمی محاذ پر مسلمان نسل میں زیادہ سے زیادہ قوت مقابلہ پیدا کی جائے اور اعلیٰ جدید تعلیم کے ساتھ ابتدائی دینی تعلیم کے نظام کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنایا جائے، اور عربی، دینی مدارس جن کے ذریعہ اس ملک میں اسلامی علوم اور اسلامی تہذیب کا سب سے زیادہ تحفظ ہوا ہے اور جن کے خدوخال ہر جگہ نظر آتے ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ معیاری اور ملت کے لئے کارآمد بنایا جائے۔

ادارہ ہمدرد صحت کے بانی جناب حکیم عبدالحمید صاحب مدظلہ نے کئی سال ہوئے ایک ہمدرد

ایجوکیشنل سوسائٹی بنائی ہے جس نے ابتک متعدد تعلیمی وتعمیری کام انجام دیئے ہیں۔ اس سوسائٹی کی طرف سے اس وقت پورے ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی حالت کا ایک سروے کیا جارہا ہے تاکہ ان کی تعلیم و معاشی ترقی کے سلسلہ میں کچھ عملی اقدامات کئے جائیں۔ جدید تعلیم کا سروے یہ سوسائٹی مکمل کرچکی ہے، اب اس نے عربی دینی مدارس کے جائزہ کا کام شروع کیا ہے، اور اس کے لئے ایک طویل سوالنامہ مرتب کرکے ملک کے مختلف اداروں کو بھیجا ہے۔ امید ہے کہ معیاری عربی درسگاہیں اس سوال نامہ کا جواب دینے اور اس سلسلہ میں اپنی تجاویز پیش کرنے کی کوشش کریں گی۔ حکیم صاحب موصوف جس خاموش تعمیری ذہن کے آدمی ہیں ان سے ہمیں توقع ہے کہ وہ ضرور کوئی ایسا مفید لائحہ عمل مرتب کریں گے، جس سے ہندوستان کے مسلمانوں کو دینی و دنیاوی دونوں طرح کی تعلیمات کے سلسلہ میں ایک نئی زندگی ملے گی۔

ایک ضروری گزارش

ابتک الرشاد کے سالانہ چندے میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا، مگر کاغذ اور کتابت و طباعت کی مسلسل گرانی کی وجہ سے پرچہ کو ہر ماہ تقریباً آٹھ سو روپے ماہوار خسارہ برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ اس لئے الرشاد کی سالانہ خریداری اب ۲۰ بیس کے بجائے ۲۴ چوبیس روپئے کی جارہی ہے، ناظرین الرشاد کی قدردانی سے ہمیں امید ہے کہ اس اضافہ کو ضرور منظور کرلیں گے۔

خریداران الرشاد کی خدمت میں دوسری گزارش یہ ہے کہ جن حضرات کا سالانہ چندہ ختم ہوگیا ہے وہ "سرخ نشان" لگائے بغیر اپنا چندہ روانہ فرمادیں۔ ہم اسکیلئے مشکور ہوں گے ——————— ادارہ

مُضَارَبت

یعنی ایک کا سرمایہ، دوسرے کی محنت

(مجیب اللہ ندوی)

دنیا میں سب لوگ برابر نہیں ہوتے اور نہ آئندہ کبھی برابر ہوں گے۔ فطری صلاحیتوں میں کمی اور زیادتی کے ساتھ ذرائع معاش کے لحاظ سے بھی سب لوگ یکساں نہیں ہوتے، کتنے لوگ ہوتے ہیں جن کے پاس پیسہ تو ہوتا ہے، مگر ان میں محنت کر کے روزی کمانے کی صلاحیت کم ہوتی ہے، یا وہ دوسرے اہم کاموں کی وجہ سے اس کا موقع نہیں پاتے کہ اپنا پیسہ کسی کام میں لگائیں اور اس سے فائدہ اٹھائیں، اس بنا پر اسلامی شریعت نے انفرادی کاروبار کے علاوہ دوسرے ایسے ذرائع بھی انسان کے لئے مہیا کیے ہیں کہ ایک غریب آدمی جس کے پاس پیسہ نہ ہو وہ گھر بار چھوڑ کر کسی مل مالک یا کسی کارخانہ دار کا دروازہ کھٹکھٹانے پر ہی مجبور نہ ہو، بلکہ وہ آزاد رہ کر بھی اپنی روزی کا سامان مہیا کر سکے۔ اسی لئے اسلام نے اس بات کی اجازت اور ترغیب دی ہے کہ لوگ اپنا پیسہ غریبوں کو دے کر ان سے محنت مزدوری کرائیں اور وہ بھی فائدہ اٹھائیں اور یہ بھی، اور اسی طریقہ کا نام مضاربت اور شرکت وغیرہ ہے۔

پہلے زمانہ میں ساہوکار انفرادی طور پر جو سودی کاروبار کرتے تھے، موجودہ دور میں بینکنگ سسٹم نے اس کی جگہ لے لی ہے، یعنی جس طرح ساہوکار سود پر لوگوں کو کاروبار اور دوسری ضروریات کے لئے قرض دیتے تھے اب وہی کام بینک انجام دیتے ہیں مگر قرض لینے پر سود کا بار اتنا پڑتا ہے کہ وہ اگر صحیح طور پر کاروبار کرنے تو اس کا کاروبار فیل ہو جائے اس لئے کاروباری وہ طریقہ اختیار

کرتا ہے کہ وہ بینک کا سود بھی ادا کر سکے اور اپنا گھر بھی بھر سکے، ملک کا پورا کاروباری طبقہ اسی انداز پر کام کرتا ہے اور ساری کاروباری مصیبت اسی کی لائی ہوئی ہے۔ اگر اس کے بجائے مضاربت کی بنیاد پر بینک قائم کیے جائیں تو سارے مصائب دور ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کے مضامین قابل مطالعہ ہیں۔

مضاربت کے معنی

مضاربت کا لفظ ضرب سے نکلا ہے، ضرب کا معنی مارنے اور اگر صلہ کے ساتھ آئے تو چلنے پھرنے کے ہوتے ہیں، اس کے ایک معنی رزق کے لئے زمین میں چلنے پھرنے اور دوڑ دھوپ کرنے کے ہیں۔ چونکہ اس میں ایک آدمی پیسہ دیتا ہے اور دوسرا آدمی اپنی محنت اور دوڑ دھوپ سے مزید پیسہ پیدا کرنے اور فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے اس معاملہ کو مضاربت کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں ہے۔

يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ — زمین میں دوڑ دھوپ کرکے اپنی روزی حاصل کرتے ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا روپیہ لے کر اسی طریقہ سے تجارت کی تھی، اور عام صحابہ رضی اللہ عنہم لوگوں سے روپیہ لے کر یا دوسروں کو روپیہ دے کر خود فائدہ حاصل کرتے اور دوسروں کو فائدہ پہنچاتے تھے۔ (ہدایہ)

بعض ضروری اصطلاحیں

روپیہ دینے والے کو ربّ المال اور محنت کرنے والے کو مضارب کہتے ہیں اور جو روپیہ کام کے لیے دیا جاتا ہے اس کو راس المال کہتے ہیں کسی زمانہ میں مسلمان اس طریقہ پر بڑی سے بڑی تجارت کرتے تھے۔ اور ان کا کاروبار پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا۔

مضاربت کی تعریف

تجارت کی طرح مضاربت بھی دو آدمیوں کے درمیان ایک معاہدہ کا نام ہے جس میں ایک شخص اپنا روپیہ دیتا ہے اور دوسرا محنت کرنے کا اقرار کرتا ہے اور پھر یہ دونوں معاہدہ کرتے ہیں کہ ایک کے روپیہ اور دوسرے کی محنت سے اس میں جو کچھ فائدہ ہوگا اس میں آدھا یا ⅓ یا ¼ حصہ روپیہ لگانے والا پائے گا اور ⅔ یعنی تہائی یا آدھا یا ¾ محنت کرنے والے کو ملے گا۔

مضاربت کی قسمیں مضاربت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک مقید دوسرے مطلق۔ مقید اس مضاربت کو کہتے ہیں جسمیں روپے دینے والا کسی خاص جگہ کی یا کسی خاص مدت کی یا کسی خاص کاروبار کی قید لگا دے، یعنی وہ یہ کہہ دے کہ اس روپئے سے تم صرف لکھنؤ یا لاہور ہی میں کام کرسکتے ہو۔ دوسری جگہ نہیں، یا صرف یہ کہدے کہ ایک سال کے لئے میں مضاربت پر دے رہا ہوں یا یہ کہدے کہ یہ روپے صرف بساتے یا کپڑے ہی کے کام میں لگائے جائیں دوسرا کام نہ کیا جائے، اور مطلق مضاربت وہ ہے جس میں ان میں سے کوئی قید نہ لگی ہو، بلکہ مضارب یعنی محنت کرنے والے کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا ہو۔

معاہدہ توڑنے کا اختیار اگر مضاربت کا معاہدہ طے ہوگیا اور مضارب نے اپنا کام ابھی شروع نہیں کیا تو تمام ائمہ متفقہ طور پر کہتے ہیں کہ دونوں میں سے ہر ایک کو اس معاہدہ کے توڑنے کا اختیار ہے، لیکن اگر اس نے کام شروع کردیا ہے تو پھر معاہدہ فسخ کرنے کا اختیار ہے یا نہیں، اس بارے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اب کسی کو معاہدہ فسخ کرنے کا حق نہیں ہے، اگر مضارب یعنی محنت کرنے والا مر بھی جائے تو اس کے لڑکوں کو اختیار ہوگا کہ وہ اس روپئے سے کام کریں اور فائدہ اٹھائیں اور جی چاہے تو فسخ کردیں، کیونکہ کام شروع کرنے کے بعد معاملہ کو فسخ کردینے میں مضارب کو تکلیف ہوگی۔ اور اس کی محنت اور وقت ضائع ہوگا مگر امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما فرماتے ہیں کہ ان دونوں کو ہر وقت یہ اختیار ہے کہ جب چاہیں وہ معاملہ فسخ کردیں، معاملہ کے ختم ہو جانے کی صورت میں مضارب نے جتنا کام کیا ہے دستور کے مطابق اس کو اتنی اجرت ملے گی، دستور کے مطابق کا مطلب ہے کہ عام طور پر اتنے کام کی جتنی اجرت ملتی ہے وہ ملے گی۔ ان دونوں اماموں کے نزدیک ان میں سے کسی ایک کی موت سے بھی یہ معاہدہ فسخ ہو جائے گا مگر فسخ کی اطلاع دینی ضروری ہے، اسی طرح وقت کی تعیین کی صورت میں اس مدت کے ختم ہوتے ہی دونوں میں سے ہر ایک کو معاملہ ختم کردینے کا اختیار ہے

مضاربت کے صحیح ہونے کی شرطیں مضاربت کے صحیح ہونے کے لئے ان باتوں کا پایا جانا ضروری ہے

۱۔ ایک یہ کہ روپیہ لگانے والے اور روپیہ دینے والے دونوں کا عاقل ہونا ضروری ہے بالغ ہونا نہیں، عاقل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دونوں معاملات

اور ان کے نفع و نقصان کو سمجھتے ہوں۔

۲۔ جو کچھ رقم مضاربت کے لئے مقرر کی جائے وہ فوراً مضارب یعنی محنت کرنے والے کے حوالے کردی جائے۔ مثلاً رب المال نے مضارب سے کہا کہ پانچسو روپے ہم دیتے ہیں، اس میں تجارت یا اور کوئی کام کرو تو پانچسو روپے کام کرنے والے کے قبضہ میں دے دینا چاہئے، صرف وعدہ سے مضاربت نہیں ہوتی۔

۳۔ تیسرے یہ کہ جتنی رقم سے کام شروع کرنے کا ارادہ ہو وہ اسی وقت بتا دی جائے، اگر مجمل رکھا تو مضاربت صحیح نہ ہوگی، یعنی یہ واضح کردیا جائے کہ سو، دوسو یا پانچ ہزار یا دس ہزار سے کام شروع ہوگا۔

۴۔ چوتھے یہ کہ منافع طے ہو جانا چاہئے۔ یعنی یہ کہ کتنا سرمایہ لگانے والے کو ملے گا اور کتنا مضارب کو۔ اگر رب المال نے صرف یہ کہا کہ ہم دونوں فائدہ میں شریک رہیں گے تو اس سے یہ سمجھا جائے کہ آدھا نفع رب المال کا اور نصف مضارب کا۔ اگر صرف یہ کہا کہ اچھا جو ہوگا اس میں مناسب طور پر تقسیم کرلیا جائے گا تو مضاربت فاسد ہو جائے گی، کیونکہ اس میں اختلاف کا خدشہ ہے بلکہ حصہ کے اعتبار سے منافعہ کی تقسیم طے ہو جانی چاہئے۔

۵۔ دونوں تحریری طور پر معاملہ کے شرائط لکھ کر اپنے اپنے پاس رکھ لیں تو بہتر ہے تاکہ بعد میں اختلاف نہ ہو۔ اگر بغیر تحریر کے بھی اطمینان کی کوئی صورت ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔

۶۔ مطلق مضاربت میں دونوں یہ بھی طے کرلیں کہ کتنے دنوں کے بعد حساب کتاب کرکے منافع تقسیم ہوگا ایک سال دو سال یا دو ماہ ایک ماہ بعد

کن چیزوں سے مضاربت فاسد ہو جاتی ہے

(۱) اگر رب المال یا مضارب نے یہ شرط لگائی کہ نفع میں سو یا دوسو یا ہزار دو ہزار میرے ہوں گے باقی جو کچھ بچے گا وہ تمہارا ہوگا، یا یہ طے کیا کہ سو یا دوسو روپے پہلے میں لوں گا باقی جو بچے گا اس میں دونوں برابر کے شریک ہوں گے۔ تو ان دونوں صورتوں میں مضاربت فاسد ہوگی غرض یہ کہ کوئی فریق نفع کی کوئی رقم اپنے لئے متعین و مخصوص نہ کرے، بلکہ یوں طے کرلینا چاہئے کہ آدھا آدھا نفع دونوں کا ہوگا یا رب المال کو ⅓ ملے گا اور مضارب کو ⅔ یا ⅔ ملے گا اور رب المال کو ⅓ ملیگا

ضروری ہدایت اس قید کے لگا دینے سے کہ مضارب یا مالک فائدہ کا کوئی حصہ اپنے لئے مخصوص نہ کریں، ان کارخانہ داروں کا کاروبار ناجائز ہوگا جو دوسروں کا روپیہ لے کر مضاربت کے طور پر کوئی کارخانہ قائم کرتے ہیں اور اپنے لئے حق محنت کے طور پر انتظامی دیکھ بھال کے نام سے کچھ منافع حاصل کر لیتے ہیں پھر بقیہ منافع اپنے اور حصہ داروں کے درمیان تقسیم کر دیتے ہیں۔ اگر مضارب کارخانہ دار نے کوئی با تنخواہ منیجر یا کلرک رکھا تو اس کی تنخواہ وہ نفع سے لے سکتا ہے۔ یہ تو اس صورت کا حکم ہے جب کارخانہ دار نے اپنا روپیہ نہ لگایا ہو۔ اگر اس نے اپنا روپیہ بھی اس میں لگایا ہے تو یہ مضاربت نہیں شراکت ہوگی (اس کا بیان آگے آتا ہے)

۲۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ صرف روپئے پیسے میں مضاربت صحیح سمجھتے ہیں، مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سامان میں بھی مضاربت صحیح ہے۔ یعنی کسی نے سامان دیا اور یہ کہا کہ اسکو بیچو جو فائدہ ہوگا ہم لوگ نصف نصف بانٹ لیں گے۔ تو امام ابوحنیفہ رح اس کو صحیح نہیں سمجھتے مگر امام مالک رح صحیح سمجھتے ہیں، لیکن اگر یہ کہا کہ اس سامان کو بیچ کر جو روپیہ ہو اس سے مضاربت کرو تو اس صورت میں امام صاحب کے یہاں بھی مضاربت جائز ہو جائے گی۔ مقصود یہ ہے کہ سامان دینے کی صورت میں اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے اس لئے امام صاحب رح کے یہاں ناجائز ہے، اگر اختلاف کی گنجائش نہیں ہے تو پھر ان کے نزدیک بھی جائز ہے جیسا کہ امام مالک رح نے فرمایا ہے۔

۳۔ رب المال نے روپیہ نقد نہیں دیا بلکہ یہ کہا کہ ہمارا اتنا روپیہ فلاں کے پاس ہے اس سے وصول کر کے کاروبار کرو۔ نفع میں دونوں شریک ہوں گے تو یہ مضاربت صحیح ہوگی لیکن اگر یہ کہا کہ تمہارے ذمہ جو روپیہ ہے اس سے تجارت کرو تو یہ جائز نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ قرض سے فائدہ اٹھانا ہوا اور قرض سے فائدہ اٹھانا ناجائز ہے، اسی طرح اگر مضارب نے پورا روپیہ وصول کرنے سے پہلے ہی کام شروع کر دیا تو یہ بھی ناجائز ہے۔

۴۔ مضاربت میں روپیہ لگانے والا روپیہ لگا کر علیحدہ ہو جائے گا، کام میں اس کی شرکت کی شرط صحیح نہیں ہے، یعنی اگر اس نے مضارب سے کہا کہ میں خود یا میرا کوئی آدمی تمہارے ساتھ کام میں شریک کار رہے گا تو یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ اس کی مداخلت سے کام میں خرابی آئے گی۔

اور بلا وجہ ایک آدمی کے حق محنت کا بار اس پر پڑے گا اگر مضارب خود چاہے تو کسی کو رکھ سکتا ہے۔

رب المال اور مضارب کے حقوق واختیارات جس نے سرمایہ لگایا ہے یعنی رب المال اور جو محنت کر رہا ہے یعنی مضارب دونوں کے کچھ حقوق و اختیارات ہیں، ان کو ذہن نشیں رکھنا ضروری ہے۔

رب المال یعنی سرمایہ لگانیوالے کے حقوق واختیارات (۱) سرمایہ لگانے والے کو یہ حق ہے کہ وہ یہ شرط لگائے کہ فلاں کاروبار میں روپیہ لگایا جائے، اگر مضارب اسکے خلاف کرے گا اور اس میں نقصان ہوگا تو اس کی ذمہ داری مضارب پر ہوگی۔

۲۔ وہ یہ شرط بھی لگا سکتا ہے کہ فلاں جگہ پر کاروبار کیا جائے، یعنی لکھنؤ، دلی، بمبئی یا جہاں کا وہ باشندہ ہے۔

۳۔ وہ یہ بھی شرط لگا سکتا ہے کہ فلاں وقت تک کے لئے کاروبار کرنے کے لئے روپیہ دیتا ہوں، مثلاً ایک ماہ، چھ مہینے یا ایک سال۔

۴۔ اگر مضارب نے اصل سرمایہ میں سے کچھ خرچ کر دیا ہے، تو جو کچھ نفع ہوگا اسمیں اصل سرمایہ کی رقم نکال کر پھر بقیہ نفع تقسیم ہوگا، مثلاً کسی نے ایک ہزار روپیہ دیا مضارب نے اس میں سے سو روپئے کھانے پینے یا کاروبار کے انتظام میں خرچ کر دیئے اور پھر ایک سال یا چھ مہینہ میں دو سو روپئے کمائے، تو ایک سو روپیہ تو اصل سرمایہ میں سے نکل جائے گا اور بقیہ رقم ایک سو روپئے اصل نفع سمجھی جائے گی اور دونوں کے درمیان معاہدہ کے مطابق تقسیم ہوگی۔

۵۔ سرمایہ کی تقسیم کے وقت مالک اور مضارب دونوں کا رہنا ضروری ہے۔

۶۔ اگر رب المال یہ شرط لگادے کہ خسارہ دونوں میں مشترک رہے گا، تو یہ مضاربت فاسد ہوگی، اس کو اس کا حق نہیں ہے۔

مضارب کے حقوق واختیارات مضارب نے جو سرمایہ لیا ہے اس کا وہ امین بھی ہے اور وہ وکیل یعنی نمائندہ بھی، امین اس حیثیت سے کہ جس طرح ایک امین امانت کی حفاظت کرتا ہے اسی طرح اس کو اس سرمایہ کی حفاظت کرنی چاہئے، لیکن اگر اتفاق سے اس سرمایہ میں کوئی نقصان آجائے، یا وہ ضائع ہو جائے تو اس کے اوپر اس کی ذمہ داری

عاید نہیں ہوتی ۔ یعنی اس کا تاوان اس سے نہیں لیا جا سکتا۔ لیکن اگر یہ ثبوت مل جائے کہ اس نے قصداً مال کو ضائع کیا ہے تو اس پر ذمہ داری ہوگی اگر اس نے سرمایہ لگانے والے کے شرائط کے خلاف کام کیا ہے اور گھاٹا ہوا ہے تو بھی اس پر ذمہ داری ہوگی۔

۲ ۔ یہ تو اس کے امین ہونے کی حیثیت تھی وکیل ہونے کی حیثیت سے اس کو پورا اختیار ہے کہ طے شدہ شرائط کے تحت جو کاروبار چاہے اور جس طرح چاہے کرے ، البتہ اگر اس نے کسی مخصوص کاروبار کی شرط لگا دی ہے ، یا کسی خاص جگہ پر کاروبار کرنے کا اختیار دیا ہے ، تو پھر اس سے تجاوز نہ کرنا چاہئے ۔ مثلاً اس نے کہہ دیا کہ لکھنؤ میں رہ کر کپڑا خریدیئے اور بیچئے — تو اب مضارب کے اوپر اس کی پابندی ضروری ہوگی۔

۳ ۔ اگر سرمایہ لگانے والے نے روپیہ دے کر کسی خاص اور محدود کاروبار کی قید نہیں لگائی ہے ، تو اس کو نقد یا ادھار مال خریدنے بیچنے ، کسی اور کو مدد کیلئے تنخواہ یا روزانہ اجرت دے کر رکھ لینے کا بھی حق ہے ۔ اس میں مالک کوئی مداخلت نہیں کر سکتا ، مثلاً کسی نے کہا کہ میں یہ روپے دیتا ہوں ، اس کو لے جائیے اپنی صواب دید سے جہاں جی چاہے اور جو جی چاہے کاروبار کیجئے تو اب مضارب کو یہ حق ہوگا کہ جو کاروبار چاہے اور جہاں چاہے کرے ۔ لیکن اگر اس نے خرید و فروخت میں غیر معمولی دھوکہ کھایا تو اسکی ذمہ داری اس کے اوپر ہوگی ۔ اسی طرح اجازت کی صورت میں اسے مضاربت کے مال کو قرض دینے یا ہبہ کرنے کا حق نہیں ہوگا ، اس کے لئے روپیہ لگانے والے کی اجازت کی ضرورت ہوگی۔ اگر اس نے اجازت کے بغیر مضاربت کا روپیہ قرض دے دیا اور وہ مارا گیا یا اس سے نقصان ہوا تو اس کی ذمہ داری اس کے اوپر ہوگی۔

۴ ۔ اس کو کسی مال کے رہن رکھنے یا امانت رکھنے حوالہ کرنے یعنی رقم کی ادائیگی ایک جگہ کی بجائے دوسری جگہ کرنے کا اختیار ہوگا ۔ یعنی اگر رہن رکھنے یا امانت رکھنے یا حوالہ کرنے میں کوئی نقصان ہوگا تو اس کا تاوان مضارب پر نہیں ہوگا ۔

۵ ۔ مضارب اگر اپنے وطن میں کاروبار کرے تو کھانا کپڑا مضاربت کے مال سے نہیں لے سکتا ۔ البتہ سواری کا خرچ اس صورت میں لے سکتا ہے جب بڑا شہر ہو اور ایک حصے سے دوسرے حصے کے آنے جانے میں کچھ خرچ ہو یا اسٹیشن دور ہو اور مال چھڑانا ہو یا مال کو سواری پر لانا ہو

تو یہ سب خرچ اس کو ملے گا، اگر اس کو کہیں باہر جا کر کسی مال کے خریدنے یا بیچنے کی ضرورت پیش آ جائے تو وہ کھانے پینے، سواری، کپڑے کی دھلائی کا خرچ لے سکتا ہے، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ دوا کا خرچ بھی وہ لے سکتا ہے، کیونکہ دوا سے اس کی صحت برقرار رہے گی اور صحت ہی پر کاروبار کا دارو مدار ہے۔ اگر وہ کام تنہا نہ کر سکتا ہو تو اجرت پر کوئی دوسرا آدمی بھی رکھ سکتا ہے، لیکن اخراجات کے لینے میں اس کو اس کا لحاظ کرنا پڑے گا کہ جس حیثیت کا وہ خود ہے اس سے زیادہ خرچ نہ کرے۔ مثلاً وہ ذاتی سفر میں جتنا خرچ کرتا ہے، یا عموماً تاجر جتنا خرچ کرتے ہیں اتنا ہی لینے کا حق ہے، یہ نہیں ہو سکتا کہ اپنا ذاتی سفر تو وہ سکنڈ کلاس میں کرے اور مضارب کی حیثیت سے سفر کرے تو فرسٹ کلاس میں یا گھر پر وہ دال روٹی کھاتا ہو تو سفر میں اس کو گوشت روٹی کھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ اسی حیثیت کا کھانا کھانا چاہیے جس حیثیت کا وہ عموماً کھاتا ہے (المجلہ)

۱۔ مضاربت کے مال کو جو نقصان ہوگا وہ نفع سے محسوب ہوگا۔ مثلاً ایک ہزار روپیہ سے مال خریدا اور اس میں دو سو روپے کا نفع ہوا اور اسی اثنا میں ایک سو روپیہ کا مال چوری ہوگیا یا کسی طرح کا نقصان ہوگیا تو ایک سو روپیہ تو اصل سرمایہ میں لیا جائے گا اور بقیہ ایک سو میں دونوں تقسیم کرلیں گے۔ اگر یہ نقصان فائدہ سے زیادہ ہو تو پھر مضارب پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ وہ نقصان اب رب المال برداشت کرے گا، فرض کیجئے کہ اوپر والی صورت میں پانچ سو روپیہ کا نقصان ہوگیا تو نفع والے دو سو روپے تو اصل سرمایہ میں ملا دیئے جائیں گے، اب اس کے بعد بھی ایک ہزار روپیہ پورا نہ ہوتا ہو تو پھر مضارب سے اس کا تاوان نہیں لیا جا سکتا بشرطیکہ اس کی غفلت سے ایسا نہ ہوا ہو، اگر اس نے غفلت برتی اور نقصان ہوا تو وہ ذمہ دار ہوگا، یا اس نے مال کے خریدنے میں کوئی بڑا دھوکہ کھایا تو اس کی ذمہ داری اس پر ہوگی، یعنی یہ خسارہ کسی اچانک حادثہ یا کاروبار کے اتار چڑھاؤ کی وجہ سے ہوا ہو، مثلاً ایک مال اس نے پچاس روپئے من کے حساب سے خریدا اور عام بازار میں اس کا بھاؤ یہی تھا اور دوسرے دن یک بیک بھاؤ گر گیا تو اس صورت میں جو نقصان ہوگا اس کی ذمہ داری مضارب پر نہیں ہوگی، لیکن اگر عام طور پر اس چیز کا بھاؤ چالیس روپئے من تھا اور اس نے بے جانے بوجھے ۵۰ یا ۵۰ میں

خریدلیا تو اس نقصان کا وہ ذمہ دار ہوگا یا اس نے اس مال کی حفاظت نہیں کی اور خراب ہوگیا تو اس صورت میں بھی وہ ذمہ دار ہوگا یا اس نے رب المال کی ہدایت کے خلاف عمل کیا اور نقصان ہوا تو اس کی ذمہ داری بھی مضارب پر ہوگی۔

ذمہ دار ہونے کا مطلب ذمہ دار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا تاوان مضارب کو دینا ہوگا خواہ وہ نفع سے دے یا اپنے گھر سے، تاوان کا اندازہ اس شعبہ کے افراد کریں گے جس میں یہ کاروبار کیا گیا ہے۔

۷۔ اسی طرح اخراجات وضع کر کے پھر نفع تقسیم کیا جائے گا۔ مثلاً ایک ہزار روپیہ اصل سرمایہ ہے جس میں اس نے دوسو روپئے سفر میں اور دوسری کاروباری ضروریات میں خرچ کیا، اور اس کے بعد اس کو کل چارسو روپئے فائدہ ہوا تو دوسو روپئے جو اس نے اصل سرمایہ سے خرچ کئے ہیں وہ وضع کرکے پھر دوسو روپئے معاہدہ کے مطابق دونوں تقسیم کرلیں گے۔ مقصد یہ ہے کہ فائدہ کی صورت میں اصل سرمایہ محفوظ رکھا جائے گا اور نقصان کی صورت مضارب پر کوئی ذمہ داری نہیں، بشرطیکہ اس نے غفلت نہ برتی ہو۔ یا معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کی ہو۔ یا اس نے غیر معمولی دھوکہ نہ کھایا ہو۔

۸۔ اگر یہ معاملہ کسی وجہ سے فسخ ہو جائے تو مضارب نے جتنا کام کیا ہے اس کی اجرت اس کو ملے گی۔ لیکن یہ اجرت اس منافع کی مقدار سے زیادہ نہ ہوگی جو کسی وجہ سے اس نے اب تک کمایا ہے یہ اس صورت میں ہے جب کچھ فائدہ ہوا ہو، اگر فائدہ ہونے سے پہلے یہ معاملہ ختم ہو جائے تو اس کو کچھ بھی نہ ملے گا۔ مثلاً اگر کسی نے ایک ہزار روپئے سے کاروبار شروع کیا اور دوسو فائدہ ہوا کہ معاملہ فسخ ہوگیا تو اس نے جتنا دن کام کیا ہے جوڑ کر اس کی اجرت ملیگی لیکن ابھی کوئی فائدہ نہ ہوا، اور یہ معاملہ ختم ہوگیا تو مضارب کو کچھ بھی نہیں ملے گا اور اگر فائدہ ہوا ہے مگر اتنا کم کہ اس کی اجرت اس فائدہ سے زیادہ ہو جائے تو پھر اس کو نفع سے زیادہ اجرت نہیں دی جائے گی۔

مضاربت کے تحت بینکنگ مضاربت کی شرائط پر روپیہ فراہم کرکے بینک قائم کئے جاسکتے ہیں۔ اگر مضاربت کے اصول پر بینک قائم کئے جائیں تو دنیا سود کے عذاب سے بھی بچ سکتی ہے اور اسکا فائدہ روپیہ لگانے والے کو زیادہ

شراکت مضاربت کی طرح اسلامی شریعت نے کاروبار کی بعض اور صورتیں بھی پیدا کی ہیں جن سے صنعتی و تجارتی کاروبار میں زیادہ سے زیادہ ترقی بھی ہو، اور جو لوگ کم پیسے یا بالکل پیسے نہ رکھتے ہوں وہ بھی آزادی اور اپنی عزت و آبرو کو باقی رکھتے ہوئے اپنی روزی کا سامان کر سکیں، انہی میں ایک شراکتی کاروبار بھی ہے، شرکت کا کام تجارت و صنعت میں بھی ہو سکتا ہے اور زراعت اور دوسرے پیشوں میں بھی اور علمی کاموں میں بھی، اس میں دو آدمی سے لے کر جتنے آدمی چاہیں شرکت کر سکتے ہیں، موجودہ دور میں شراکتی کاروبار کا بہت کافی رواج ہے اور اس کے ذریعہ بڑے سے بڑے تجارتی اور صنعتی کاروبار چل رہے ہیں، لیکن اس دور کی شرکت زیادہ پیسہ رکھنے والوں کی ترقی کا سبب ہوتی ہے، کم پیسہ لگانے والوں کو کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوتا، زیادہ سے زیادہ ان کو سال بھر میں سو دو سو روپئے مل جاتے ہیں اور اس کا بیشتر نفع اس کے منتظموں، ڈائرکٹروں اور منیجروں کی جیب میں چلا جاتا ہے، یا ان کی جیب میں جاتا ہے جن کا زیادہ پیسہ کاروبار میں لگا ہوتا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ شراکتی کاروبار کرنیوالے لاکھوں آدمیوں کو حصہ دار بناتے اور ان سے روپیہ حاصل کرتے ہیں، اس کے بعد اپنی تنخواہ مقرر کرتے ہیں پھر کچھ رقم انتظامی امور کے لئے وضع کرتے ہیں۔ کچھ کارخانہ کی عمارت اور مشینوں کی خریداری پر صرف کرتے ہیں، پھر جب کاروبار چل نکلتا ہے تو عام حصہ داروں کو منافع میں وہ چند روپئے ہاتھ لگتے ہیں جو ان تمام اخراجات اور مراحل کے بعد بچتے ہیں اور جب کوئی حصہ دار فائدہ نہ دیکھ کر علیحدہ ہونا چاہتا ہے تو اس کے ہاتھ میں وہی چند روپے آتے ہیں جو اس نے بحیثیت حصہ دار کے دیئے تھے۔ اس کے علاوہ اور کسی چیز کا وہ حق دار نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض کاروباری تو حصے کے روپے بھی واپس نہیں کرتے، بلکہ یہ شرط لگاتے ہیں کہ اپنا حصہ کسی کو بیچ دیجئے۔ اسطرح سارے کاروبار پر آہستہ آہستہ وہ لوگ قابض ہو جاتے ہیں جنہوں نے اس کو شروع کیا تھا۔

لیکن اسلامی شریعت نے شراکتی کاروبار کے لئے جو شرائط مقرر کئے ہیں، ان کو ملحوظ رکھا جائے تو بڑے سے بڑا شراکتی کاروبار چلایا جا سکتا ہے اور سارے حصہ دار اس سے متمتع بھی ہو سکتے ہیں، اور ملک کی صنعت و تجارت کو فروغ بھی ہو سکتا ہے اور اس کے ذریعہ ہزاروں بے وسیلہ لوگوں کی روزی لگ سکتی ہے۔ ان شرائط کی وجہ سے وہ ساری بے انصافی، زیادتی اور بددیانتی ختم

ہو جائے گی جو اس طرح کے کاروبار کالازمہ بن گئی ہیں، اگر کوئی خود غرض بد دیانتی اور ناانصافی کرنا بھی چاہے گا تو اخلاق اور شریعت دونوں کی نگاہ میں مجرم قرار پائے گا، حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ "جب دو شریک مل کر کوئی کام کرتے ہیں تو جب تک وہ آپس میں خیانت و بد دیانتی نہیں کرتے ہیں، میں ان کے ساتھ ہوتا ہوں، یعنی میں ان کی مدد کرتا رہتا ہوں، اور برکت دیتا ہوں، لیکن جب وہ بد دیانتی شروع کر دیتے ہیں تو پھر میں ان کی مدد کرنا چھوڑ دیتا ہوں" (مشکوٰۃ)

شرکار کی حیثیت

عموماً لوگ اشتراک محض مادی فائدہ اور خود غرضی ہی کے لئے کرتے ہیں۔ ان میں کوئی اخلاقی قدر مشترک نہیں ہوتی، اس لئے ہر شریک اپنی غرض اور مادی فائدہ پیش نظر رکھتا ہے، لیکن اسلامی شریعت نے مادی فائدہ کے ساتھ شرکار کی اصل حیثیت یہ قرار دی ہے کہ ان میں سے ہر ایک شرکت کے مال اور کاروبار کا امین بھی ہے اور وکیل بھی امین اس حیثیت سے کہ جس طرح امانت کی حفاظت کی جاتی ہے اسی طرح ہر شریک شراکت کے مال کی حفاظت کرے اور غلطی سے کوئی نقصان ہو جائے تو پھر اس پر تاوان نہ عائد کیا جائے۔ اور وکیل اس حیثیت سے کہ کوئی شریک اس مال کو یا مشترکہ کاروبار کو اپنے فائدہ کے لئے نہ استعمال کرے۔ بلکہ منفعت میں ہر ایک کے حقوق کا خیال رکھے۔ کسی کو یہ شکایت نہ ہو کہ فلاں نے سارا فائدہ سمیٹ لیا، اور بقیہ سب لوگ نقصان میں رہے۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ارشاد نبوی کی روشنی میں جب شرکت کا کوئی کاروبار کیا تو مسلمان تو مسلمان غیر مسلموں تک سے ایسا انصاف کیا ہے کہ وہ تاریخ میں یادگار رہ گیا ہے۔ خیبر کے یہودیوں سے طے تھا کہ وہ مسلمانوں کی زمین میں کاشت کریں، جو کچھ پیدا ہوگا اس میں نصف نصف دونوں فریق بانٹ لیں گے۔ چنانچہ عبداللہ بن رواحؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نمایندہ کی حیثیت سے غلہ کی وصولی کے لیے گئے تو انہوں نے محنت والوں سے کہا کہ یا تو تم لوگ خود بانٹ کر دے دو یا کہو تو میں بانٹ دوں انہوں نے ان ہی سے بانٹنے کو کہا، عبداللہ بن رواحہ نے پیداوار کے دو الگ الگ حصے کر دیئے اور کہا کہ ان میں سے جو چاہو لے لو یہ انصاف دیکھ کر یہودی پکار اٹھے

بہٰذا قامت السماءُ والارض — اسی انصاف کی وجہ سے زمین و آسمان

قائم ہیں (ورنہ قیامت آجاتی)

شرکت کی قسمیں شرکت دو طرح کی ہوتی ہے۔ (۱) ایک شرکت املاک (۲) دوسری شرکت عقود۔

شرکت املاک شرکت املاک یعنی ملکیت کی شرکت یہ اس طرح ہوتی ہے کہ چند آدمیوں کو وراثت میں یا بطور ہبہ ایک جائداد یا نقد روپیہ ملا، یا دو آدمیوں نے مل کر کوئی چیز خریدی تو یہ تمام صورتیں شرکت املاک کی ہیں، یعنی اس چیز کی ملکیت میں دونوں شریک سمجھے جائیں گے۔

شرکت املاک کا حکم شرکت املاک کا حکم یہ ہے کہ جتنے لوگ شریک ہوں ان میں سے کسی شریک کو اس مشترک جائداد یا روپیہ میں بغیر تمام شرکاء کی اجازت کے تصرف کا حق نہیں ہے۔ مثلاً کسی نے ایک ہزار روپیہ یا چار مکان ترکہ میں چھوڑے تو اس میں جتنے حصہ دار ہیں۔ خواہ اس میں کسی کا کم حصہ ہو یا زیادہ بغیر سب کی مرضی کے نہ تو ان روپیوں کو کام میں لانے یا مکانوں کے بیچنے یا ان کو کرایہ پر دینے کا کسی کو حق ہے اور نہ سب کی موجودگی کے بغیر تقسیم کرنیکا، اسی طرح دو آدمیوں یا کئی آدمیوں نے مل کر غلہ، کپڑا یا باغ یا پھل یا اور کوئی چیز خریدی تو اس کی دو صورتیں ہیں

(۱) ایک یہ کہ وہ چیزیں ایسی ہیں جن میں عام طور پر کوئی فرق نہیں ہوتا، مثلاً جو، گیہوں یا کوئی اور غلہ خریدا، یا کسی ایک ہی کپڑے کے بہت سے تھان خریدے تو دوسرے شرکاء کی موجودگی کے بغیر بھی اس کی تقسیم کی جا سکتی ہے، یعنی ایک شریک اپنا حصہ لے لے اور اس کا حصہ الگ کر کے رکھ دے تو کوئی حرج نہیں لیکن دوسرے شریک کے پہنچنے سے پہلے اگر اس کا حصہ ضائع ہو گیا تو اس کو دوسرے شریک کے حصہ میں سے آدھا لینے کا حق ہے۔

(۲) دوسری یہ کہ اگر وہ چیزیں ایسی ہیں جن میں کچھ فرق ہوتا ہے، مثلاً مختلف قسم کے دس بیس تھان کپڑے دو آدمیوں نے خریدے یا پھل یا جانور خریدے تو ان چیزوں میں فرق ہوتا ہے کوئی اچھا ہوگا، کوئی خراب، کوئی پھل بڑا ہوگا کوئی چھوٹا، کوئی جانور تیز ہوگا کوئی سست اس لئے دونوں کی موجودگی کے بغیر تقسیم کرنے میں اختلاف کی گنجائش ہے، اس بنا پر دوسرے شریک کی موجودگی کے بغیر اس کو تقسیم نہ کرنا چاہیئے اور نہ کام میں لانا چاہیئے۔

شرکت عقود عقود عقد کی جمع ہے، جس کے معنی بندھنے یا باندھنے کے ہیں، اس شرکت کو شرکت عقود اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں شرکا آپس میں ایک معاہدہ کے ذریعہ ایک دوسرے سے بندھ جاتے اور اس کے شرائط کے وہ پابند ہو جاتے ہیں۔

شرکت عقود کی تعریف مضاربت اور تجارت کی طرح شرکت میں باہم معاہدہ اور اقرار ضروری ہے، یعنی شرکت عقود اس طرح ہوتی ہے کہ دو یا دو سے زیادہ آدمی تھوڑا تھوڑا سرمایہ فراہم کرکے آپس میں یہ طے کریں کہ ہم سب مل کر اس روپئے سے فلاں کام کریں گے اور جو نفع ہوگا آپس میں اتنے فی صدی تقسیم کر لیں گے، یا کسی کام کے بارے میں یہ طے کریں کہ آپس میں مل کر سب اس کو کریں اس میں جو فائدہ ہوگا بانٹ لیں گے، یہ اقرار زبانی بھی ہو سکتا اور تحریری بھی، امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ جو حنفی فقہ کے امام سمجھے جاتے ہیں انہوں نے تحریر پر بہت زیادہ زور دیا ہے (مبسوط ج ۱۲ ص ۱۵۱)

معاہدہ کب فسخ ہو سکتا ہے اس معاہدہ کے شرکاء میں سے ہر فرد کو یہ اختیار ہوگا کہ جب چاہے اپنے معاہدہ کو فسخ کر دے اور اس سے علیحدہ ہو جائے، لیکن اس معاہدہ کو فسخ کرنے کا اثر دوسرے شرکاء پر نہیں پڑے گا، شرکاء میں سے اگر کوئی مر جائے تو معاہدہ خود بخود فسخ ہو جائے گا لیکن اگر ورثہ چاہیں تو اس کی تجدید کر سکتے ہیں۔

شرکت عقود کی قسمیں شرکت عقود کی کئی قسمیں ہیں، اور ان سب کے احکام جدا ہیں، مگر ان سب میں چند باتیں مشترک ہیں۔

۱۔ ایک تو باقاعدہ شرکت کا قول و قرار ہونا چاہئے خواہ زبانی ہو یا تحریری۔

۲۔ منافع کی تقسیم کی مقدار بھی صاف صاف بیان کر دی جائے کہ کتنا کس کو ملے گا اور کتنا کس کو۔ اس کی تفصیل مضاربت کے بیان میں آچکی ہے۔

۳۔ ان میں سے ہر ایک شریک مشترک مال کا امین بھی ہوگا اور وکیل بھی۔ امین کی حیثیت سے مال کی حفاظت اس پر ضروری ہوگی، اور وکیل کی حیثیت سے ہر ایک کو برابر کاروبار کے نظم اور تصرف میں اختیار حاصل ہوگا۔

۴۔ کام اور سرمایہ برابر ہونے کی صورت میں بھی آپس کی رضامندی سے یہ طے ہو جائے

کہ ایک آدمی کو زیادہ اور ایک آدمی کو کم نفع ملے گا تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۵۔ ہر ایک کے لئے اس کام میں خود یا اپنے کسی نمایندہ کے ذریعہ حصہ لینا ضروری ہے، لیکن اگر وہ کسی وجہ سے شریک نہ بھی ہو، تب بھی نفع میں شریک رہے گا۔ کیونکہ اگر گھاٹا ہوگا تو اس کو بھی نقصان برداشت کرنا پڑے گا، خلاصہ یہ کہ کام یا مال اور ضمان سے کوئی چیز بھی پائی جائیگی تو وہ نفع کا مستحق ہوگا۔

۶۔ لیکن اگر معاملہ کرتے وقت کسی شریک نے یہ کہدیا کہ میں کام میں شریک نہیں رہوں گا، تو یہ شرکت اس کے حق میں فاسد ہوگی۔

مجلس انتظام شرکت کا کاروبار بڑے پیمانے پر چلانے کے لئے اور اس کے نظم ونسق کو برقرار رکھنے کے لئے اگر ضرورت ہو تو وہ اپنے میں سے ایک یا چند آدمیوں کو یا شرکا کے علاوہ کسی اور آدمی کو وہ اس کی ذمہ داری سپرد کر سکتے ہیں، لیکن شرکا میں سے جن لوگوں سے یہ کام لیا جائے گا، تو چونکہ ان کا وقت زیادہ خرچ ہوگا، یا وہ زیادہ صلاحیت رکھتے ہوں گے اس لئے ان کو منافع سے کچھ زیادہ حصہ دیا جاسکتا ہے۔ مگر یہ جائز نہیں کہ وہ متعین تنخواہ بھی لیں اور منافع میں بھی شریک ہوں۔ اسی طرح اگر شرکا کے علاوہ کوئی باہر کا آدمی کاروبار چلانے کے لئے رکھا جائے تو اس کی دو حیثیتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کام کرے اور منافع کا کچھ حصہ اس کا بھی مقرر کردیا جائے، تو یہ اس وقت مضارب ہوگا اس لئے اس کو صرف نفع ہی پانے کا حق ہوگا۔ اور دوسری حیثیت یہ ہے کہ اس کو تنخواہ دی جائے تو اس صورت میں وہ اجیر ہوگا۔ یعنی وہ صرف تنخواہ پائے گا، منافع میں شریک نہیں ہوسکتا، مقصد یہ ہے کہ شرکت اور مضاربت وغیرہ میں کوئی شریک یا مضارب تعیین کے ساتھ نفع کیساتھ دوسرا فائدہ حاصل نہیں کرسکتا، یعنی اس کو ایک طرف متعین رقم بھی ملے، اور دوسری طرف غیر متعین فائدہ میں بھی شریک رہے۔

اب ہم شرکت کی تمام قسمیں اور اس کے احکام و شرائط بیان کرتے ہیں۔

۱۔ شرکت مفاوضہ مفاوضہ کے معنی ایک دوسرے کے سپرد کرنے کے ہیں۔ اس شرکت کو مفاوضہ اس لئے کہتے ہیں کہ ایک شریک دوسرے کو اپنا مال سپرد کردیتا ہے، اس میں سرمایہ کا ہونا بھی ضروری ہے۔ اور نفع میں بھی برابری شرط ہے۔ امام شافعیؒ کے علاوہ دیگر ائمہ شرکت مفاوضہ کو صحیح نہیں سمجھتے۔ اس شرکت کے لئے حسب ذیل باتیں ضروری ہیں۔

۱ ۔ ایک یہ کہ اس میں شروع سے آخر تک دونوں کا سرمایہ برابر ہوگا۔
۲ ۔ دونوں نفع میں بھی برابر کے حصہ دار ہوں گے۔
۳ ۔ ہر ایک شریک کو مال کے خریدنے، بیچنے اور تصرف کرنے اور قرض دینے کا اختیار ہوگا۔
۴ ۔ اگر کوئی شریک اپنی ذاتی ضرورت کے لئے کوئی چیز خریدے تو اس میں دوسرے شریک کو کچھ کہنے کا حق نہیں ہے، لیکن اگر یہ چیزیں اس نے ادھار لی ہیں تو دوکاندار کو دوسرے شریک سے بھی تقاضے کا حق ہے۔
۵ ۔ یہ شرکت صرف مسلمان بالغوں ہی کے درمیان ہوسکتی ہے، کیونکہ غیر مسلم ان باتوں کی پابندی نہیں کرسکتا، جو اس کے لئے ضروری ہیں۔

۲۔ شرکت عنان شرکت عقود کی سب سے مشہور قسم شرکت عنان ہے، عام طور پر اسی طریقہ شرکت کا کاروبار دنیا میں رائج ہے۔ اس میں نہ تو سرمایہ کا برابر ہونا ضروری ہے اور نہ نفع میں برابری شرط ہے۔

اس کے شرائط حسب ذیل ہیں

۱ ۔ شرکت عنان میں ہر شخص شریک ہوسکتا ہے، خواہ مسلمان ہو یا غیر مسلم۔
۲ ۔ جس طرح مفاوضہ میں سرمایہ اور نفع کا برابر ہونا ضروری ہے، اسی طرح عنان میں یہ ضروری نہیں ہے، بلکہ دونوں کا سرمایہ کم یا زیادہ بھی ہوسکتا ہے، اور جس طرح سرمایہ کم یا زیادہ ہوسکتا ہے، اسی طرح نفع میں بھی کمی بیشی ہوسکتی ہے۔ مثلاً کسی نے ایک ہزار روپئے لگائے اور دوسرے نے پانچسو اور دونوں نے خوشی سے یہ طے کیا کہ منافع میں دونوں برابر رہیں گے تو وہ ایسا کرسکتے ہیں، کیونکہ منافع کا تعلق محض سرمایہ سے نہیں ہوتا، بلکہ محنت، دوڑ دھوپ کے علاوہ اس میں ذہنی صلاحیت اور سوجھ بوجھ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کا سرمایہ زیادہ ہو مگر اس میں عملی و ذہنی صلاحیت کم ہو، اور دوسرا کم سرمایہ رکھتا ہو مگر عملی اور ذہنی صلاحیتوں میں زیادہ سرمایہ والے سے بڑھا ہوا ہو، تو ایسا شخص سرمایہ کی کمی کی تلافی اپنی دوسری صلاحیتوں سے کرسکتا ہے، کیونکہ کاروبار کی کامیابی کا زیادہ تر دارومدار سوجھ بوجھ اور دوڑ دھوپ ہی پر ہوتا ہے اور پھر زیادہ سرمایہ رکھنے والے میں اگر صلاحیت کم ہے تو اس کیلئے بھی روپیہ بیکار پڑا رکھنے سے

بہتر یہی ہے کہ وہ ایک باصلاحیت آدمی کو سرمایہ کی نسبت سے زیادہ نفع دے کر اس سے فائدہ حاصل کرے، لیکن بہرحال اس کا تعلق آپس کی رضامندی ہی سے ہے۔ کسی کے اوپر کوئی دباؤ نہیں ڈالا جا سکتا۔

۳۔ تمام شرکاء کا سرمایہ تو برابر ہو لیکن نفع میں کمی زیادتی طے ہوئی ہو اور عام شرکاء کام میں شریک ہونے کے لئے تیار نہ ہوں، بلکہ وہ کاروبار کی پوری ذمہ داری کسی ایک یا دو آدمی کے سپرد کر دیں، تو جس کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے، اگر یہ وہ شخص ہے جس کا نفع زیادہ مقرر ہوا ہے پھر یہ شرط لگائی جا سکتی ہے، لیکن اگر یہ شرط اس شخص کے ساتھ لگائی گئی ہے جس کا نفع کم رکھا گیا ہے تو یہ شرط جائز نہیں ہے، بلکہ اس کو سرمایہ کے مطابق منافع ملے گا، کیونکہ جس کا منافع زیادہ تھا وہ تو اپنے سرمایہ اور محنت کا بدلہ پا گیا، لیکن جس کا منافع کم تھا وہ بے چارہ تو نقصان میں رہے گا، کیونکہ سرمایہ بھی اس نے برابر لگایا، محنت بھی کی، اور منافع بھی اس کو کم ملا، اسی طرح اگر کسی کا سرمایہ زیادہ لگا ہے اور نفع کم مقرر ہے اور تنہا اس کے ذمہ کاروبار کی نگرانی اور انتظام ہے تو اس صورت میں منافع کی کمی کی شرط بے کار سمجھی جائے گی اور اس کو سرمایہ کے مطابق حصہ ملے گا، کیونکہ اس صورت میں اس نے دوہری محنت کی، اور سرمایہ بھی لگایا، پھر بھی نفع کم ملا، یہ زیادتی ہے جسے اسلامی شریعت نے کسی وقت بھی روا نہیں رکھا ہے۔

۴۔ نفع کی تقسیم کی مقدار طے ہو جانی چاہئے، یعنی اس طرح کہ ½ یا ⅓ یا ¼ یا دس فی صدی فلاں کو اور بیس فی صدی فلاں کو یا سب کو برابر حصہ ملے گا۔ اگر اس طرح یہ طے کیا گیا کہ ایک ہزار روپئے تو فلاں کے متعین رہیں گے، باقی جو بچے گا وہ شرکاء کار کا تو یہ صحیح نہیں ہے۔ (ہدایہ)

۵۔ جو نقصان ہوگا وہ اصل سرمایہ سے پورا کیا جائے گا۔ نفع پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑے گا، لیکن یہ اس صورت میں ہے جب نقصان قصداً نہ کیا گیا ہو بلکہ اچانک ہو گیا ہو۔ اگر کسی شریک نے جان بوجھ کر نقصان اٹھایا یا نقصان کیا تو پھر اس کی ذمہ داری اس کے سر ہوگی، یعنی وہ اس کے نفع یا اصل سے پورا کیا جائے گا۔ (اس کی تفصیل مضاربت کے بیان میں آ چکی ہے)

۶۔ نفع نقصان دونوں میں تمام شرکاء شریک سمجھے جائیں گے، اگر کسی نے یہ شرط لگائی کہ

نقصان ہمارے ذمہ اور نفع میں سب الگ شریک رہیں گے تو یہ شرکت ناجائز ہوگی ۔

۷ ۔ اگر شرکت کسی وجہ سے فاسد ہوگئی یا معاہدہ خود ہی فسخ کر دیا گیا تو منافع سرمایہ کے مطابق تقسیم ہوگا ، مثلاً کسی نے ایک ہزار روپیہ لگایا تھا اور کسی نے دو ہزار ، تو ایک ہزار روپے والے کو ⅓ اور دو ہزار روپے والے ⅔ ملے گا ، اگرچہ شرکت کرتے وقت منافع کے زیادہ و کم لینے ہی کی شرط کیوں نہ لگا دی گئی ہو وہ شرط شرکت کے فاسد و منسوخ ہونے کی صورت میں کالعدم سمجھی جائے گی ۔

۸ ۔ جس غرض کے لئے شرکت کی گئی ہے اس میں شرکت کے مال کو خرچ کرنے اور تصرف کرنے کا ہر شریک کو برابر حق ہے ۔ مثلاً اگر دو آدمیوں نے مل کر دو ہزار کی تجارت کی تو دونوں کو کسی مال کے منگانے ، چھوڑانے ، ادھار مال بیچنے یا ادھار لگانے کا حق ہے ۔ اگر دونوں میں سے کسی سے نقصان ہوگا تو دونوں کی ذمہ داری سمجھی جائے گی ، البتہ اگر دوسرے ساتھی نے کسی چیز کے خریدنے سے اس کو منع کیا اور اس نے پھر بھی خریدا اور اس میں نقصان ہوا تو اس کی ذمہ داری تنہا اس کے اوپر ہوگی ، اسی طرح اگر اس نے کسی چیز کے خریدنے یا بیچنے میں بہت شدید قسم کا دھوکہ کھایا ہے تو اسکی ذمہ داری بھی اسی پر ہوگی دوسرے شریک کا سرمایہ محفوظ سمجھا جائے گا ۔

۹ ۔ اپنے ذاتی مال کے ساتھ شریک کا مال ملانا ، یا دونوں کاروبار ملا جلا رکھنا جائز ہے اگر دوسرا شریک اس کی اجازت دے دے تو پھر کوئی حرج نہیں ہے ، اسی طرح تمام شرکاء کی اجازت کے بغیر کسی نئے آدمی کو اس میں شریک نہیں کیا جا سکتا ۔

۱۰ ۔ جس مشترک کاروبار میں یہ مشترک سرمایہ لگا ہے اگر اسی زمانہ میں اسی طرح کا کوئی کاروبار کوئی شریک اپنے ذاتی روپئے سے الگ کرنے لگے تو اس کا یہ ذاتی کاروبار بھی مشترک ہی سمجھا جائے گا ، اگرچہ وہ باقاعدہ اس بات کا ثبوت ہی کیوں نہ فراہم کر دے کہ یہ اس کا ذاتی کاروبار ہے ، مثلاً کچھ لوگوں نے مشترک سرمایہ سے کپڑے کی دوکان کھولی ، یا شیشہ کا برتن یا کوئی اور سامان بنانے کا کارخانہ کھولا تو اب کسی شریک کو اپنے ذاتی روپئے سے دوسری کوئی کپڑے کی دکان یا شیشہ و برتن کا کارخانہ کھولنے کی اجازت نہ دی جائے گی چاہے وہ ثابت ہی کیوں نہ کر دے کہ وہ اس کا ذاتی کاروبار ہے ، البتہ اگر وہ اپنے ذاتی روپئے سے دوسرا

کوئی کاروبار کرے تو اس کی اجازت ہے، مثلاً اگر کپڑے کے بجائے جوتے کی دوکان کھولے تو اس کو اس کی اجازت ہوگی۔ یہ قید اس لئے بڑھائی گئی ہے کہ وہ مشترک سرمایہ کے کاروبار کو اپنی ذاتی کاروبار سے نقصان نہ پہنچاوے، یا مشترک سرمایہ کو غلط طور اپنی منفعت کے لئے استعمال کر سکے۔

۱۱۔ تمام شرکار کی اجازت کے بغیر کوئی شریک کسی دوسرے آدمی کو مشترک سرمایہ سے قرض نہیں دے سکتا۔

۱۲۔ اگر سرمایہ قرض لے کر دو یا بہت سے آدمی کوئی مشترک کاروبار کریں، تو یہ جائز ہے مگر یہ قرض سودی نہ ہو۔

۱۳۔ مشترک کاروبار کے سلسلہ میں سفر میں مزدوری یا دکان کے کرایہ وغیرہ میں یا کارخانہ کے بنانے یا مشین کے بنانے میں جو کچھ خرچ ہوگا وہ مشترک سرمایہ سے لے لیا جائے گا۔

۱۴۔ اگر کسی ایک شریک نے دوسرے شریک کو یا چند شرکار نے ایک شریک کو مشترک سرمایہ سپرد کرکے کہا کہ تم تجارت یا صنعت کا جو کام چاہو کرو تو پھر اس کو اختیار ہے کہ وہ جو کاروبار چاہے کرے اور جس طرح چاہے کرے، لیکن اگر وہ قصداً سرمایہ برباد کرے گا یا فضول کاموں یا اپنے تعیشات میں خرچ کرے گا تو اس کی ذمہ داری اس کے اوپر ہوگی یعنی تمام شرکار اس کا تاوان اس کے سرمایہ سے وصول کریں گے۔

۱۵۔ اگر کسی شریک نے دوسرے شریک سے یا چند شرکار نے کسی ایک شریک سے یا ایک شریک نے چند شرکار سے یہ کہا کہ یہ کاروبار اس شہر میں کرنا بہتر ہوگا۔ لیکن دوسرے شرکار نے کسی دوسری جگہ یہ سرمایہ لگا دیا تو اگر اس میں نقصان ہوا تو اس کی ذمہ داری صرف ان ہی لوگوں پر ہوگی، جنہوں نے اپنی رائے سے ایسا کیا ہے، اور نفع میں وہ شخص اسی طرح شریک ہوگا، جس طرح معاہدہ ہوا ہے، غرض یہ کہ ہر شریک کی رضامندی ضروری ہے۔

۳۔ شرکت اعمال، یا شرکت صنائع

شرکت عقود کی تیسری قسم شرکت اعمال یا شرکت صنائع ہے، یعنی وہ شرکت جس میں سرمایہ کے بغیر دو ہم پیشہ یا دو مزدور اس بات کا معاہدہ کریں کہ فلاں کام ہم مل کر کریں گے، جو کچھ اس سے پیسہ ملیگا، وہ دونوں

بانٹ لیں گے، مثلاً دو مزدور اسٹیشن پر سامان ڈھونے کے لئے یہ طے کریں کہ دونوں کے کام سے جو پیسہ ملے گا، اس کو برابر یا کم و بیش بانٹ لیں گے یا ایک دیوار کے بنانے کا ٹھیکہ لیں، اور یہ شرط ٹھہرائیں کہ جو پیسہ ملے گا بانٹ لیں گے، اسی طرح دو سناروں نے یا دو موچیوں نے یہ طے کیا کہ جس کے پاس بھی کام یا آرڈر آئے گا وہ اسے قبول کرے گا اس کو دونوں مل کر یا علیحدہ علیحدہ کریں گے اور دونوں کے کام سے جو فائدہ ہوگا اس فائدہ میں دونوں شریک ہوں گے، یہ تمام صورتیں جائز ہیں۔

اس کو شرکت اعمال یا شرکت صنائع اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں نقد سرمایہ مشترک نہیں ہوتا، بلکہ عمل اور پیشہ (صنعت) مشترک ہوتا ہے، اس کا نام شرکت تقبّل بھی ہے، یعنی دو آدمی مشترک طور پر ایک کام کو قبول کر لیتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اسی طرح کی شرکت کرتے تھے۔ حدیث میں ہے کہ حضرت ابو عبیدہ، حضرت سعد اور حضرت عمار نے غزوہ بدر میں یہ معاہدہ کیا تھا کہ جو کچھ مال غنیمت ملے گا وہ سب کا مشترک حصہ ہوگا، خواہ ایک ہی آدمی کیوں نہ پائے۔ اس شرکت کے صحیح یا غیر صحیح ہونے کیلئے چند ضروری شرطیں ہیں۔

۱۔ شرکت عنان کی طرح اس میں بھی یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص کام برابر کرے اور مزدوری کی رقم میں برابر کا شریک ہو، بلکہ اس میں کمی بیشی ہو سکتی ہے، مثلاً چند مزدوروں نے مشترک طور پر ایک نہر کھودنے کا کام کیا تو اب ضروری نہیں کہ ہر مزدور برابر کام کرے اور برابر نفع پائے۔ اس لئے کہ ہر انسان کی صلاحیت اور طاقت جدا جدا ہوتی ہے، ایک جوان آدمی بوڑھے آدمی سے زیادہ کام کرے گا تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی محنت کے مطابق مزدوری بھی پانے کا حقدار ہوگا، کیونکہ اس شرکت میں اصل سرمایہ محنت اور صلاحیت ہی ہے، اسی طرح دو درزی مل کر یہ معاہدہ کرتے ہیں، جو کپڑے دونوں کے پاس سینے کے لئے آئیں گے وہ دونوں کے مشترک ہوں گے اور مزدوری دونوں تقسیم کر لیں گے، تو یہ ضروری نہیں ہے کہ دونوں کے پاس کام برابر آویں یا دونوں کام برابر کریں، اور نفع بھی برابر لیں، کیونکہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک اگر سلائی میں زیادہ محنت کرتا ہے تو دوسرا کپڑے کترنے میں زیادہ ماہر ہے، اور اسی کی وجہ سے کپڑے زیادہ سلنے کے لئے آتے ہیں، یا دونوں میں سے ایک کا ہاتھ زیادہ صاف اور باریک سے باریک کام کر لیتا ہے اور دوسرا موٹا ہی کر سکتا ہے تو ظاہر ہے کہ دونوں کی مزدوری میں بھی تفاوت ہو سکتا ہے، لیکن یہ ضروری ہے کہ دونوں کی رضامندی سے ایسا ہو۔

۲۔ جو شخص کام دے گا اس کو ان میں سے ہر ایک شریک سے تقاضے کا حق حاصل ہوگا، خواہ کسی کی مزدوری کم ہو یا زیادہ۔

۳۔ شرکاء میں سے جو بھی کوئی کام یا کام کا آرڈر لے گا وہ تمام شرکاء کی طرف سے سمجھا جائے گا۔ اس کی ذمہ داری سب پر ہوگی، شریک سناروں میں سے کسی ایک نے زیور بنانے کا آرڈر لیا تو وہ آرڈر دوسرے شرکاء کی طرف سے بھی سمجھا جائے گا۔

۴۔ ان میں سے ہر ایک شریک کام یا کام کا آرڈر دینے والے سے پوری مزدوری مانگ سکتا ہے۔ اور جس نے کام دیا ہے اگر اس نے کسی ایک کو بھی مزدوری دے دی تو دوسرے کو اب اس سے کچھ کہنے سننے کا حق نہیں ہے۔ مثلاً اوپر والی مثال میں معاہدہ کرنے والے مزدوروں میں سے کسی مزدور کو نہر کھودنے کی مزدوری دے دی گئی ہے تو وہ ادا ہو جائے گی، البتہ اگر مزدوروں نے یہ کہدیا ہو کہ فلاں آدمی ہی کو مزدوری دے دی جائے تو پھر مالک کو دوسرے مزدور کو مزدوری نہ دینی چاہیئے۔

۵۔ اگر کسی شریک نے کام کیا اور کسی نے نہیں کیا تو کام دینے والے کو اس پر اعتراض کا حق نہیں ہے، البتہ اگر اس نے شرط لگا دی ہو کہ تم ہی کرو تو پھر اس کو کرنا ضروری ہوگا۔ مثلاً دو کاریگروں نے ایک مکان کی تعمیر کا ٹھیکہ لیا تو دونوں میں سے اگر ایک ہی کام کرے تو بھی تعمیر کرانے والے کو اس میں اعتراض کا حق نہیں ہے، اگر اس نے ٹھیکہ دیتے وقت یہ کہدیا ہو کہ دونوں آدمی کام میں عملاً شریک رہیں گے تو پھر پابندی ضروری ہے۔

۶۔ اگر شرکاء میں سے کسی نے کسی مجبوری کی وجہ سے کوئی کام نہیں کیا مثلاً بیمار پڑ گیا یا کسی اور وجہ سے نہ کر سکا تو بھی وہ فائدہ اور اجرت میں شریک رہے گا۔

۷۔ اگر کوئی نقصان ہوگا تو اس کے ذمہ دار تمام شرکاء ہوں گے، مثلاً چند آدمیوں نے ایک پل بنانے کا ٹھیکہ لیا، اور اس میں نقصان ہو گیا تو تمام شرکاء اپنے حصہ کے مطابق اس کو برداشت کریں گے، مثلاً جس کو فائدہ میں ½ حصہ تھا وہ ½ خسارہ برداشت کرے گا اور جو ⅓ کا مستحق تھا وہ اتنا برداشت کرے گا۔

۸۔ اگر دو پیشہ ور اس طرح شرکت کریں کہ دوکان تو ایک آدمی کی ہوگی، اور اوزار یا کام دوسرے کا ہوگا، تو یہ شرکت بھی جائز ہوگی۔

۹۔ اگر دو آدمیوں کے پاس دو ٹرک ہوں اور وہ یہ معاہدہ کریں کہ جو مال لادنے کے لئے ملیگا اس کو دونوں میں سے کوئی پہنچا دے گا اور جو کرایہ ملے گا دونوں تقسیم کرلیں گے تو یہ جائز ہے، دونوں برابر منافع تقسیم کریں، لیکن یہ شرکت اس طرح ہو کہ دونوں جو کچھ کمائیں گے اس میں بانٹ لیں گے، تو جائز نہیں ہے، یعنی معاہدہ شرکت کام اور اجرت دونوں کے لئے ہونا چاہیئے۔ محض اجرت میں نہیں۔

۱۰۔ اگر گھر کے مالک نے کوئی کام کیا اور اس میں گھر کے بچے عورتیں بھی شریک ہوں تو یہ قانونی شریک نہیں سمجھے جائیں گے، بلکہ یہ اس کے مددگار شمار ہوں گے، ان کو الگ سے کوئی حصہ نہیں دیا جائیگا مثلاً کسی شریک نے سینے کے لئے کپڑا لیا اور اس کی سلائی میں گھر کی عورتوں اور بچوں نے بھی ہاتھ بٹایا تو ان کو الگ سے کوئی اجرت نہیں دی جائے گی۔

۴۔ شرکتُ الوجوہ

شرکت عقود کا چوتھا طریقہ شرکت الوجوہ ہے یعنی دو یا اس سے زیادہ آدمی نہ تو کاروبار میں سرمایہ لگائیں اور نہ دونوں کسی کام یا پیشہ میں شریک ہوں بلکہ اپنی ساکھ اور وجاہت کی بنا پر یہ معاہدہ کریں کہ تاجروں سے ادھار مال لے کر ہم فروخت کریں گے اور جو کچھ فائدہ ہوگا مال کی قیمت ادا کرنے کے بعد بانٹ لیں گے۔

اس شرکت کے لئے بھی وہی شرائط ہیں جو شرکت الصنائع کے ہیں یعنی اس میں دونوں جو منافع طے کریں گے وہ ملے گا۔ اور جو گھاٹا ہوگا وہ منافع کے لحاظ سے دونوں برداشت کریں گے۔ البتہ ایک شرط اس میں زیادہ ہے کہ جو اپنی ساکھ اور وجاہت سے جتنا زیادہ حاصل کرے گا اور جتنے مال کی ذمہ داری یعنی ضمانت لے گا وہ اتنا ہی زیادہ نفع پانے کا حقدار ہوگا، اور اگر یہ شرط کی گئی کہ مال دونوں برابر حاصل کریں یا کم یا زیادہ حاصل کریں، مگر ہر صورت میں فائدہ میں برابر ہوں گے تو یہ شرط لغو سمجھی جائے گی، جس نے جتنا مال زیادہ حاصل کیا ہے اسی اعتبار اس کو نفع میں حصہ ملے گا۔ یا کوئی فریق یہ شرط کرے کہ ہم نصف مال کے ذمہ دار ہیں مگر فائدہ زیادہ لیں گے تو شرط لغو ہے، دونوں میں آدھا آدھا نفع تقسیم ہوگا۔

۲۔ جو نقصان ہوگا اس کا خسارہ دونوں کو نفع کے اعتبار سے برداشت کرنا پڑے گا۔ یا یوں کہیے کہ جتنا انہوں نے مال حاصل کیا ہے، یا جتنے کی ذمہ داری لی ہے اسی تناسب سے ان کو گھاٹا برداشت

باقی صفحہ ۲۸ پر

اسقاطِ حمل بلا قیدِ مدت ناجائز و حرام ہے

(ڈاکٹر ایم۔ اے رشادی (علیگ))

جب تک کسی چیز کا جواز و عدم جواز دلائل واضحہ اور براہین کاشفہ سے ثابت نہ ہو، اپنی طرف سے کوئی رائے پیش کرنا عموماً فتنہ کا باعث ہوتا ہے، اور قوی امکان ہے کہ انسان حلال کی سرحد سے گذر کر حرام میں جا پڑے،

الرشاد بابت مارچ و اپریل ۱۹۸۲ء کے صفحہ ۵ پر مولوی جمیل احمد نذیری صاحب نے جنین کے حقوق کے سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ

"جو بچہ رحم مادر میں ہو اس کو جنین کہتے ہیں، حمل کی دو حالتیں ہیں جان پڑنے سے قبل اور جان پڑنے کے بعد۔ جان پڑنے کا عمل حمل کے ایک سو بیس دن کے بعد شروع ہوتا ہے، جان پڑنے کے قبل اسقاط حمل بالکراہت جائز ہے اور جان پڑنے کے بعد حرام ہے۔"

مولانا جمیل احمد صاحب نذیری کے اس فتوے سے مادہ پرست ڈاکٹروں اور غلط کار لوگوں کے دلوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ ایک مسلمان مریض میرے مطب میں آیا اور کہا کہ ڈاکٹر صاحب تین ماہ کا حمل ہے کوئی ایسی دوا دیجئے کہ ساقط ہو جائے۔ میں نے کہا آپ مسلمان ہیں آپ کیلئے قتل اولاد جائز نہیں، لیکن وہ مصر رہے اور مجھ ہی کو دلائل سے سمجھانے لگے کہ ڈاکٹر صاحب آپ کو کوئی گناہ نہیں ہوگا ابھی بچے میں جان نہیں پڑی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں آپ کو دوا دے کر گناہ کا ارتکاب نہیں کرنا چاہتا خواہ آپ مجھ کو کتنا ہی روپیہ دیں جب وہ میری طرف سے مایوس ہو گئے تو دوسرا حربہ استعمال کیا، کہنے لگے کوئی دوا نہ دیجئے میں نذیری

ہال سے خرید لوں گا ، میں نے جواب دیا قلم بھی خدا کی امانت ہے ، میں آپ کے لئے کوئی دوا بھی لکھنے کے لئے تیار نہیں ہوں ، بہرکیف وہ میرے مطب سے ناکام واپس لوٹ گئے۔

مجھے معاً خیال آیا ، ممکن ہے کہ مسلمان مریض نے مولانا جمیل احمد صاحب نذیری کا فتوی پڑھا یا سنا ہو۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر اس فتوی کو عام کر دیا جائے تو بہت سے مسلمان اپنے عیب کو چھپانے کے لئے نہ جانے کتنے معصوم بچوں کی جان لینے سے دریغ نہیں کریں گے ۔ اور اگر حکومت ہند کے پاس یہ فتوی بھیج دیا جائے تو یقیناً مصنف کو گرانقدر انعام سے بھی نوازا جائے گا۔ کیونکہ حکومت بھی چاہتی ہے کہ مسلمانوں کے کندھوں پر بندوق رکھکر ان کو نشانہ بنایا جائے۔

اس لئے مجھے امید ہے کہ مصنف موصوف اپنی غلط رائے سے رجوع کریں گے اور دوبارہ الرشاد کے صفحات پر دلائل سے واضح کریں گے کہ اسقاط حمل بالاتفاق بلا قید مدت ناجائز و حرام ہے ، جیسا کہ حاشیہ میں محترم مدیر الرشاد واستاد گرامی مولانا مجیب اللہ صاحب زید مجدہٗ نے اشارہ بھی فرما دیا ہے۔

میں موصوف سے درخواست کروں گا کہ مندرجہ ذیل چند اشارات پر غور فرمائیں تاکہ مسئلے کی نوعیت کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

۱۔ بچہ ، وَلد یا جنین | آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ جو بچہ رحم مادر میں ہو اس کو جنین کہتے ہیں "

اس عبارت سے خود ہی یہ ثابت ہو رہا ہے کہ جنین کو آپ بچہ یا ولد تسلیم کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ استقرار حمل ہی کے دن سے نطفہ ، جنین کی تعریف میں آتا ہے اور جنین پر بچہ یا ولد کی تعریف صادق آتی ہے ۔ لہذا کسی بچے یا ولد کا قتل جائز نہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے

لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۔ اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے ڈر سے قتل نہ کرو

اس آیت کریمہ سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ چار مہینے کی مدت گذر جانے کے بعد ہی جنین ولد کی تعریف آتا ہے ۔ بلکہ اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ وہ اولاد خواہ رحم مادر میں ہو یا خارج میں ہو ، اس کو قتل نہ کیا جائے ۔ آج ضبط تولید اور اسقاط حمل کی تحریک اسی

بنیاد پر چل رہی ہے کہ ایسی ترکیب استعمال کی جائے جس سے تقلیل اولاد ہو اور افزائش نسل نہ ہو سکے۔

نطفہ | جب تک کسی کو علم الجنین (embryology) کا صحیح علم نہ ہو اس کو جنین نطفہ اور استقرار حمل کے سلسلہ میں کچھ کہنا مناسب نہیں۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے تو یہاں تک کہا ہے کہ

من لم یعرف التشریح فھو عنین فی معرفۃ اللہ تعالٰی یعنی جو علم تشریح الاعضاء (Anatomy) نہ جانتا ہو وہ اللہ تعالٰی کی معرفت میں عنین ہے۔

اگر نطفہ کی حقیقت کو آدمی سمجھ لے تو اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ نطفہ جسے ماء مہین کہا جاتا ہے اس میں ذی روح بچہ موجود رہتا ہے۔ جو رحم مادر میں پہنچ کر آہستہ آہستہ بہت سے مدارج و اطوار طے کر کے ایک معتدل القامت اور حسین مرکب کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔ جس کو انسان کہتے ہیں۔

جدید تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ مرد کے خصیوں (Testes) کے اندر بنے ہوئے نطفہ (منی) کو اگر خورد بین کے ذریعہ مشاہدہ کیا جائے تو اس کے اندر سینکڑوں (cell) یا خلیہ کی جسامت والے جرثومے نظر آتے ہیں جن کو (Spermatozoa) کہتے ہیں۔ اسی طرح عورت کی بیضہ دانی (Ovary) کے اندر چھوٹے چھوٹے انڈے نظر آتے ہیں جن کو (ova) کہتے ہیں ——— ہر (Spermatozoon سپرمیٹوزوا) میں ایک نوکدار سر، گردن، درمیانی حصہ اور ایک دم ہوتی ہے۔ دم کو ہلا ہلا کر اسپرمیٹوزوا منی کے رقیق مادے میں حرکت کرتے ہیں اور اپنی جسامت کے لحاظ سے ان کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے یعنی وہ ایک گھنٹہ میں تقریباً ۲ سینٹی میٹر کا فاصلہ طے کرتے ہیں۔

مواصلت کے بعد مرد کی منی جھٹکے سے خارج ہوتی ہے تو یہی بے شمار جرثومے اسپرمیٹوزوا اپنی دموں سے حرکت کر کے عورت کے رحم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جہاں عورت کے مادہ تولید کے اندر اس کی بیضہ دانی سے خارج کیا ہوا ایک انڈا (Ovum) بھی موجود رہتا ہے

اس انڈے میں کچھ ایسا مادہ ہوتا ہے کہ اسپر میٹوزوا (Spermatozoa) اس کی طرف کھنچ کر اس کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں اور اس کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر جب ان میں سے ایک اسپر میٹوزون انڈے کے اندر اپنے نوکدار سر اور گردن کو داخل کر دیتا ہے تو دونوں خلیے مل جاتے ہیں اور اس انڈے کی جھلی ایسی سخت ہو جاتی ہے کہ اس کے اندر دوسرے اسپر میٹوزون داخل نہیں ہو سکتے

اسی ملاپ یعنی بیضہ دانی کے انڈے اور مرد کے اسپر میٹوزون کے اتحاد کا نام (Fertilization) ہے، جس کے نتیجہ میں مردانہ خلیہ زنانہ خلیہ سے مل کر ایک نیا خلیہ بناتا ہے جس کے تیار ہونے کا دوسرا نام استقرار حمل یا Conception ہے

اب مندرجہ بالا تفصیلات کی روشنی میں ہر صاحب نظر بآسانی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ بچہ میں جان، استقرار حمل کے پہلے ہی سے موجود ہوتی ہے۔ اگر جان موجود نہ ہوتی تو وہ حرکت کرکے عورت کے نطفے کے انڈے میں داخل نہ ہو پاتا۔

لہذا اسقاط حمل شرعی وطبی ہر دو نقطۂ نظر سے بلا قید مدت ناجائز وحرام ہے۔

(بقیہ مضاربت صفحہ ۲۹۶ سے آگے) کرنا پڑے گا، مثلاً اگر کسی نے دو حصہ مال حاصل کیا ہے اور وہ اس کا ذمہ دار ہے اور کسی نے ایک حصہ مال حاصل کیا اور وہ اس کا ذمہ دار ہے تو خسارہ کی صورت میں اسی اعتبار سے دونوں خسارہ برداشت کریں گے۔ (المجلہ)

ہدایت ذمہ دار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اتنے مال کا ضامن ہے اگر وہ ضائع ہو گیا یا اس میں گھاٹا آ گیا تو اسی اعتبار سے اس کو تاوان دینا پڑے گا اور اس ضمانت و ذمہ داری کے اعتبار سے منافع تقسیم کیا جائے گا۔

اسلام میں بچوں کے حقوق

(۳)

مولانا جمیل احمد صاحب نذیری قاسمی

ایک صحابیہ رضؓ نے اپنے بچے کو اسی طرح ایک چیز دینے کا بہانہ کرکے بلایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم وہاں موجود تھے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ واقعی کچھ دینا ہے یا یونہی کہہ رہی ہو۔ انہوں نے جواب دیا اسی بہانے سے بلا رہی ہوں، دینا کچھ نہیں ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: ایسا نہ کیا کرو[1]

یتیم بچے

باپ کی شفقت سے محروم بچوں کی خبر گیری کرنے کی تعلیمات اگرچہ دیگر مذاہب میں بھی ملتی ہیں مگر وہ تفصیل اور وہ اہمیت کہیں بھی نظر نہیں آتی جو اسلام کی تعلیمات میں ہے عربوں کا دور جاہلیت قتل و غارت گری اور فتنہ و فساد میں اپنی نظیر آپ تھا، قتل و قتال کے نتیجے میں یتیموں کی کثرت ایک لازمی امر تھا، چنانچہ عرب میں یتیموں کی بہتات تھی، دوسری طرف عربوں کا یہ خیال تھا کہ میراث اس کو ملنی چاہئے جو مرنے والے کی زندگی میں اس کی مدد کر سکتا ہے۔ چونکہ نابالغ اولاد اپنے باپ کی اس کی زندگی میں کوئی مدد نہیں کر سکتی تھی، لہذا وہ باپ کی میراث کی بھی مستحق نہیں۔ اسی ذہنیت کے پیش نظر اہل عرب چھوٹے بچوں کو باپ کی میراث نہیں دیا کرتے تھے[2]

---

[1] یہ حدیث نظر سے نہیں گذری اور نہ مضمون نگار صاحب نے حوالہ دیا ہے۔ اس کے بجائے ابوداؤد اور بیہقی کی یہ روایت صاحب مشکوٰۃ نے نقل فرمائی ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ کیا دینے کیلئے بلا رہی ہو وہ بولیں ایک کھجور دینا چاہتی ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اما انک لو لم تعطیہ شیئاً کتبت علیک کذبۃ اگر تم کچھ نہ دیتی تو تمہارے نامۂ اعمال میں ایک جھوٹ لکھ دیا جاتا (مشکوٰۃ باب الوعد) [2] تفسیر ابن جریر طبری ص ۱۷۰ ج ۴

(ادارہ)

اس ذہنیت کی بھرپور اصلاح اس وقت ہوئی جب نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے آپ خود بھی یتیم تھے، اس لئے یتیموں کے دکھ درد سے اچھی طرح واقف تھے۔ قرآن نے بھی حضورؐ کو ان کی یتیمی کی یاد دلائی ہے۔

اَلَمْ يَجِدْكَ يَتِيْمًا فَآوٰى وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَاَغْنٰى فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ

(سورۃ الضحیٰ ۶ — ۱۰)

کیا آپ کو خدا نے یتیم نہیں پایا پس آپ کو پناہ دی، اور آپ کو ناواقف پایا تو سیدھا راستہ دکھایا، اور آپ کو مفلس پایا تو غنی کر دیا۔ پس یتیم پر ظلم نہ کرنا اور سائل کو نہ جھڑکنا۔

عرب میں یتیموں کے ساتھ جو بدسلوکی ہوتی تھی اس کا نقشہ اس آیت میں یوں کھینچا گیا ہے۔

اَرَاَيْتَ الَّذِيْ يُكَذِّبُ بِالدِّيْنِ فَذٰلِكَ الَّذِيْ يَدُعُّ الْيَتِيْمَ

(ماعون ۱ — ۲)

اے نبی! کیا آپ نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو روز جزا کو جھٹلاتا ہے۔ یہی وہ ہے کہ وہ یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

دوسری آیت میں یتیموں کے سرپرستوں کی یوں خبر لی جا رہی ہے۔

كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا ۝

(فجر ۱۷ تا ۲۰)

ہرگز نہیں، بلکہ تم لوگ یتیموں کی عزت نہیں کرتے، نہ ایک دوسرے کو مسکین کو کھلانے کی ترغیب دیتے، تم لوگ مردوں کا مال (یتیم کے باپ کا مال) پورا سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور دنیاوی مال و متاع پر پوری طرح فریفتہ ہو۔

یہ تو عرب کے دور جاہلیت کا حال تھا۔ مسلمانوں کو یتیموں کے ساتھ کسی قسم کا سلوک کرنا چاہئے۔ اس کے متعلق قرآن کہتا ہے۔

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي

اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین اور یتیموں

وَالْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسَاکِیْنِ — اور مسکینوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو

(نساء - ۳۶)

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسَاکِیْنِ (بقرہ - ۸۳)

اور اس وقت کو یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور والدین اور رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا۔

نیک بندوں کی علامت یہ ہے کہ وہ یتیموں کو کھانا کھلاتے ہیں اور کھلانے کے بعد نہ کوئی احسان رکھتے ہیں، نہ بدلہ چاہتے ہیں۔

وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّہٖ مِسْکِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُکُمْ لِوَجْہِ اللّٰہِ لَا نُرِیْدُ مِنْکُمْ جَزَآءً وَّلَا شُکُوْرًا ۝

(دہر ۸، ۹)

وہ خدا کی محبت میں محتاج، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور یہ بھی ظاہر کر دیتے ہیں) کہ ہم تم کو خدا کی خوشنودی کے لئے کھلاتے نہ کوئی بدلہ چاہتے ہیں نہ احسان مندی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مسلمان کو یتیم کے حق میں ایک شفیق باپ کی طرح ہونا چاہیے۔

کُنْ لِلْیَتِیْمِ کَالْاَبِ الرَّحِیْمِ[1] — یتیم کے لئے شفیق باپ کی طرح بنو۔

یتیم کی پرورش کرنے والے کے اجر و ثواب اور بلندی درجہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم یوں بیان فرماتے ہیں۔

انا وکافل الیتیم فی الجنۃ ھکذا وقال باصبعیہ السبابۃ والوسطی[2]

میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں ان دو انگلیوں (کلمہ کی انگلی اور بیچ کی انگلی) کی طرح قریب ہوں گے۔

---

[1] فضل اللہ الصمد فی توضیح الادب المفرد ۱۔ ۲۳۲ [2] بخاری ۲۔ ۸۸۸

دوسری حدیث میں ارشاد نبوی ہے

مَنْ قَبَضَ یَتِیْماً مِنْ بَیْنِ الْمُسْلِمِیْنَ اِلٰی طَعَامِہٖ وَشَرَابِہٖ اَدْخَلَہُ اللّٰہُ الْجَنَّۃَ اَلْبَتَّۃَ اِلَّا اَنْ یَّعْمَلَ ذَنْبًا لَا یُغْفَرُ[1]

جو شخص کسی مسلمان یتیم کو اپنے گھر میں رکھکر کھلائے پلائے اللہ تعالیٰ اسے جنت میں داخل فرمائے گا، بشرطیکہ کوئی ایسا گناہ نہ کیا ہو جس کی بخشش نہ ہو سکے (مثلاً شرک)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کا سب سے بہتر گھر وہ ہے جس میں یتیم ہو اور گھر والے اس سے اچھا سلوک کرتے ہوں اور سب سے برا گھر وہ ہے جس میں یتیم ہو اور وہ لوگ اس سے برا برتاؤ کرتے ہوں[2]

جو شخص کسی یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرے تو سر کے جتنے حصہ پر ہاتھ پڑا ہوگا اس کے ہر بال کے بدلے میں نیکیاں ملیں گی[3]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے سخت دل ہونے کی شکایت کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرو اور مسکین کو کھانا کھلاؤ تمہارا دل نرم ہو جائے گا[4]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی فرمانبردار، اور سعادت مند امتی ہونے کا خوب خوب حق ادا کیا اور حضور کے ارشادات پر پورے طور پر عمل کیا۔ کہاں عرب کا وہ ماحول کہ یتیموں کو کوئی پوچھتا نہیں تھا، اور در بدر مارے مارے پھرتے تھے، ان کے باپ کی جائداد بھی ان کو نہیں ملتی تھی، کہاں یہ مزاج کہ یتیم کی پرورش کرنے کے لئے صحابہ کرام ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کوشش کرتے تھے۔

حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کی شرائط کے مطابق جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں تین دن قیام فرما کر واپس جانے لگے تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی یتیم بچی حضور کی طرف چچا جان، چچا جان کہتی ہوئی دوڑی، جلدی سے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اسے لے لیا

---

[1] ترمذی شریف ج ۲ ص ۱۴ [2] فضل اللہ الصمد فی توضیح الادب المفرد ج ۱ ص ۲۳۱ [3] مشکوٰۃ ج ۲ ص ۴۲۳ [4] مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۲۵۔

وہاں پر حضرت زید اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہما بھی موجود تھے۔ تینوں میں بچی کی کفالت کے سلسلے میں جھگڑا شروع ہوا، حضرت علی نے فرمایا کہ اس کی کفالت میں کروں گا کیونکہ یہ میری بہن ہے۔ حضرت جعفر نے کہا کہ اسے میں لے جاؤں گا کیونکہ یہ میری بھی بہن ہے اور اس کی خالہ میری بیوی ہے۔ حضرت زید نے فرمایا کہ میں کفالت کروں گا کیونکہ یہ میری بھتیجی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نزاع کا فیصلہ کرتے ہوئے فرمایا اسے اس کی خالہ کے پاس بھیجدو (یعنی اسے حضرت جعفرؓ کو دیدیا، اور فرمایا

الخالۃ بمنزلۃ الام[1] — خالہ ماں کے درجے میں ہوتی ہے

حضرت عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا معمول یہ تھا

کان لا یاکل الطعام والا علی خوانہ یتیم[2] — جب وہ کھانا کھاتے تو ان کے دسترخوان پر یتیم ضرور ہوتا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی اپنے خاندان نیز انصار کے یتیم بچوں کو اپنے گھر لاکر پرورش کیا کرتی تھیں[3]

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نہ صرف یہ کہ یتیم بچوں کی پرورش کیا کرتے تھے بلکہ ان کی ہر طرح مدد اور خبر گیری بھی کرتے، چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ ایک یتیم نے ایک نخلستان کے سلسلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں ایک شخص پر دعویٰ کیا۔ لیکن وہ ثبوت نہ پیش کرسکا اس لئے آپ نے مقدمہ کا فیصلہ یتیم کے خلاف مدعیٰ علیہ کے حق میں کردیا، یتیم رونے لگا، حضورؐ کو رحم آگیا۔ آپ نے مدعیٰ علیہ سے فرمایا کہ نخلستان اسی کو دیدو، اس کے بدلہ میں خدا تم کو جنت دے گا، اس شخص نے دینے سے انکار کردیا۔ ایک صحابی ابوالدحداحؓ وہاں موجود تھے، انہوں نے اس شخص سے کہا کہ تم اپنے نخلستان کو اپنے نخلستان سے بدل سکتے ہو؟ اس نے آمادگی ظاہر کی، چنانچہ فوراً تبادلہ ہوگیا۔ اس کے بعد حضرت ابوالدحداحؓ نے وہ نخلستان اس یتیم کو ہبہ کردیا[4]

---

[1] مشکوٰۃ شریف ج ۲ ص ۲۸۴ ۔ [2] فضل اللہ الصمد فی توضیح الادب المفرد ج ۱ ص ۲۳۰ ۔ [3] مسند احمد بن حنبل ج ۶ ص ۲۶۹ ۔ [4] استیعاب تذکرہ ابوالدحداح ج ۲ ص ۲۶۳ ۔

انفرادی تعلیمات کے علاوہ مال غنیمت اور مال فئے میں بھی اسلام نے یتیموں کا حق رکھا ہے، سورۂ انفال اور سورۂ حشر میں اس کی تفصیل موجود ہے

یہ بھی اسلام اور مسلمانوں کی ہی خصوصیت ہے کہ مسلم حکمرانوں نے باقاعدہ یتیم خانے قائم کر رکھے تھے [۱] جن میں یتیم بچوں کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا پورا انتظام تھا۔ سب سے پہلا یتیم خانہ ولید بن عبدالملک نے قائم کیا تھا [۲] یتیم بچوں کی سرپرستی اور ان کے مال و متاع کی نگہداشت قاضیوں کے فرائض میں شامل تھی۔

یتیم بچوں کی جائداد

سب سے اہم مسئلہ یتیم بچوں کی جائداد کا ہوتا ہے، اس سلسلے میں بہتوں کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں، اسلام نے جائداد و اموال کے متعلق بہت واضح ہدایات دی ہیں اور اس کا بھرپور بندوبست کیا ہے کہ ان کا مال ضائع اور برباد نہ ہونے پائے۔ شریعت کا حکم یہ ہے کہ سرپرست حضرات یتیم کے مال کی اس وقت تک حفاظت کریں جب تک وہ بڑے نہ ہو جائیں اور ان میں بھلے برے کی تمیز نہ پیدا ہو جائے۔ اس کے بعد پورا مال امانت کی طرح ان کے حوالے کر دیں۔ یتیموں کے مال میں بے جا تصرف اور اس کو بے دردی سے خرچ کرنے کی سختی کے ساتھ ممانعت ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَیَصْلَوْنَ سَعِیْرًا ؕ (نساء ۔ ۱۰)	جو لوگ یتیموں کا مال ظلماً کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھر رہے ہیں۔ اور وہ عنقریب دوزخ میں جائیں گے

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْیَتِیْمِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ حَتّٰی یَبْلُغَ اَشُدَّهٗ (انعام ۔ ۱۵۳)	تم لوگ یتیم کے مال کے قریب بھی نہ جاؤ مگر اچھے طریقے سے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہونچ جائیں۔

اس ڈر سے کہ یتیم بڑا ہو کر اپنے مال کا مطالبہ کرے گا، اس کو جلدی جلدی اڑا نہیں دینا

[۱] اس کے علاوہ اہل ثروت نے خود بھی یتیم خانے بنوا رکھے تھے۔ [۲] تاریخ الخلفاء ص ۲۲۳

چاہئے۔ سرپرست صاحب حیثیت ہو تو اسے یتیم کے مال میں سے کچھ بھی نہیں لینا چاہئے لیکن اگر غریب ہو تو بقدر کفاف لینے کی اجازت ہے۔

وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَنْ يَكْبَرُوا وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ وَمَنْ كَانَ فَقِيرًا... فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ وَكَفَى بِاللَّهِ حَسِيبًا ۝

(نساء — ۶)

اس ڈر سے کہ یتیم بڑے ہو جائیں گے ان کا مال فضول خرچی کے ساتھ جلدی جلدی نہ کھا جاؤ جو سرپرست مالدار ہو اسے یتیم کے مال سے بچنا چاہئے اور جو تنگدست ہو وہ دستور کے مطابق کھا سکتا ہے۔ اور جب تم ان کا مال ان کے حوالہ کرو تو اس حوالگی پر گواہ بنالو اور حساب لینے کے لئے کافی ہے۔

یتیموں کے مال کے سلسلے میں مزید ہدایت یہ ہے۔

وَآتُوا الْيَتَامَىٰ أَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيثَ بِالطَّيِّبِ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَهُمْ إِلَىٰ أَمْوَالِكُمْ إِنَّهُ كَانَ حُوبًا كَبِيرًا ۝

یتیموں کے مال انھیں واپس کر دو اور اچھے مال کو برے مال سے نہ بدلو اور ان کے مال کو اپنے مال میں ملا کر نہ کھا جاؤ۔ بلا شبہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔

اس آیت اور اس سے قبل والی آیت میں یتیموں کا مال ان کے حوالہ کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے لیکن یہ حوالگی کب ہوگی؟ اس سلسلہ میں بتایا جا رہا ہے کہ سن شعور کو پہونچنے کے بعد ان کا مال ان کے حوالے کیا جائے ورنہ ناسمجھی کی وجہ سے سب کا سب فضولیات میں اڑا دیں گے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُمْ

اپنے اس مال کو جسے اللہ نے تمہارے قیام کا سہارا بنایا ہے کم عقل یتیموں کو نہ دو اور اس سے ان کے خورد و نوش اور لباس کا انتظام کرتے رہو اور انھیں اچھے طریقے سے سمجھاتے رہو اور جانچتے رہو، جب

مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ (نساء - ۶،۵)

وہ نکاح کی عمر کو پہونچ جائیں اور ان میں صلاحیت دیکھو تو انہیں ان کا مال واپس کر دو۔

اسی طرح سورۂ نساء میں سرپرستوں کو یتیم دولت مند لڑکیوں کی دولت حاصل کرنے کے لئے نا انصافی کے ساتھ ان سے شادی کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ عرب میں یہ طریقہ تھا کہ ولی اور سرپرست دولتمند یتیم لڑکیوں سے شادی کر لیتے اور ان کے ساتھ بدسلوکی سے پیش آتے۔ اور ان کی دولت کو الٹے تلے اڑا یا کرتے۔ سورۂ نساء میں ایسا کرنے سے سختی سے ممانعت کر دی گئی ہے۔

لقیط کا حکم لقیط اس بچے کو کہتے ہیں جو کہیں پڑا ہوا ملا ہو۔ مثلاً زنا کی تہمت کے خوف سے کوئی ڈال گیا ہو۔ ایسا بچہ آزاد مانا جائے گا۔ اگر کوئی شخص اس کے غلام ہونے کا دعویٰ کرے تو بغیر ثبوت اس کو تسلیم نہیں کیا جائے گا۔

لقیط کا نفقہ بیت المال سے ادا کیا جائے گا، اگر وہ شخص جس نے اسے پایا ہے، خود پالنا چاہے تو اسی کو دے دیا جائے گا۔ دوسرے کو اس سے لینے کا حق نہیں۔ لیکن اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ یہ میرا بیٹا ہے تو اس کی بات مان کر اسی کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ بشرطیکہ پانے والا اس کے نسب کا دعویدار نہ ہو۔

دو آدمی اگر لقیط کے متعلق دعویٰ کریں تو جو علامات بتائے وہی اس کا مستحق ہوگا۔

مسلمانوں کے علاقہ میں پایا جانے والا بچہ مسلمان مانا جائے گا، اگر کوئی غیر مسلم اس کے متعلق اپنا بیٹا ہونے کا دعویٰ کرے تو اس کا نسب اس سے ثابت ہو جائے گا مگر بچہ مسلمان ہی مانا جائے گا۔ ہاں اگر گرجا گھر یا غیر مسلموں کی بستی میں پڑا ہوا ملا ہے تو وہ غیر مسلم ہی مانا جائیگا۔

اگر کوئی غلام یہ دعویٰ کرے کہ لقیط میرا بیٹا ہے تو اس کا نسب اس سے ثابت ہو جائے گا مگر بچہ آزاد مانا جائے گا۔ غلام اور آزاد دونوں لقیط کے بارے میں دعویٰ کریں تو آزاد کو ترجیح حاصل ہوگی۔ اور مسلمان اور ذمی دعویٰ کریں تو مسلمان کو ترجیح ہوگی کیونکہ اسی صورت میں اس بچہ کا فائدہ ہے۔

بچہ کے ساتھ اگر بندھا ہوا مال بھی ملے تو اسی بچہ کا مانا جائے گا۔[۱]

---

[۱] یہ ساری تفصیلات ہدایہ ج ۲ ص ۵۹۱ تا ص ۵۹۳ سے ماخوذ ہیں۔

اختتامیہ

بچوں کے حقوق کے سلسلے میں پچھلے اوراق میں اسلامی تعلیمات کا جو خلاصہ پیش کیا گیا ہے، اس سے ہر صاحب بصیرت سمجھ سکتا ہے کہ اسلام نے بچوں کو کس قدر اہمیت دی ہے، اور ہر ہر مرحلہ پر بچوں کے مفاد کو کس طرح پیش نظر رکھا ہے اور ان تمام صورتوں پر پابندی عائد کر دی ہے جس سے ان کو کسی طرح کا نقصان پہونچ سکے، اس بات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ، بچے مستقبل کی امانت ہوتے ہیں، بچے مستقبل کے معمار ہوتے ہیں، بچوں کے مستقبل کے ساتھ ہی قوموں کا مستقبل وابستہ ہوتا ہے، بچوں کے متعلق اسلامی تعلیمات کی اہمیت اور افادیت کو ہر باشعور اور صاحب فہم و بصیرت تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ بچے اسی وقت اچھے اور سچے رہنمائے ملک و قوم بن سکتے ہیں جب ان کی تعلیم و تربیت اسلامی اصولوں کے مطابق ہو، ان کی پرورش و پرداخت میں ان تعلیمات کو پیش نظر رکھا گیا ہو جو اسلام نے دی ہیں۔

ایک حدیث میں ہے

عَلِّمُوا اَوْلادکم فانھم مخلوقون	اپنی اولاد کو تعلیم سے آراستہ کرو کیونکہ
لِزَمَانٍ غیر زمانکم[1]	یہ زمانہ مستقبل کی مخلوق ہیں۔

جو ملک و قوم اپنے مستقبل کو بنانا اور سنوارنا چاہے اس کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کا سب سے زیادہ خیال رکھے، بچوں کی بے راہ روی قوموں کی تباہی کا پیش خیمہ ہے مستقبل میں قوم کی معماری اور رہنمائی انہیں کے ہاتھ میں آنے والی ہے، جو اس وقت بچے کہلاتے ہیں۔ کوئی قوم اپنا مستقبل کیسا بنا رہی ہے اس کا اندازہ اس کے اس رویہ سے چل سکتا ہے جو اس نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں اپنا رکھا ہے، اس کلیہ سے مسلمان بھی مستثنیٰ نہیں ہیں۔

---

[1] الامۃ التضامن الاسلامی۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۹ھ۔ عنایۃ الاسلام بالطفولیۃ مضمون ڈاکٹر محمود احمد خفاجی۔

علامہ شبلی اور اصلاح امت

(جناب ڈاکٹر سید احتشام احمد صاحب ندوی۔ پروفیسر و صدر شعبۂ عربی۔ کالی کٹ یونیورسٹی کیرالا)

انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستانی علماء کی صف میں ایک ایسی شخصیت منصۂ شہود پر آئی جس کا دماغ علم و حکمت سے روشن تھا جس کی نگاہیں دور رس تھیں۔ جس کا دل دردمند تھا اور اسلام کے لئے خلوص و محبت سے منور اور معمور تھا۔ جس کے سینہ میں علوم اسلامیہ کا خزینہ تھا اور اس کی زندگی کھلی ہوئی کتاب تھی۔ اس کا مقصد حیات اصلاح امت تھا۔ اس کی محبت کا مرکز ہر صاحب ایمان تھا۔ اسلام کا رشتۂ اتحاد اس کی جد و جہد کا محور تھا اس نے سیاست کو اسلامی انداز نظر عطا کیا۔ اس نے عالمی سیاست میں اتحاد اسلام کا نعرہ لگایا۔ ملکی اور ہندوستانی سیاست میں انگریز دشمنی کا رول کھلکر ادا کیا مگر ذاتی زندگی کو عملی سیاست کی آلائشوں سے پاک رکھا۔ اور اپنا وقت علم و اسلام کی خدمت میں صرف کیا۔ اس عظیم شخصیت سے میری مراد علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ جنہوں نے ہندوستان میں دفاع اسلام کے لئے ایک نئی راہ دکھائی۔ انہوں نے دشمن پر مئے اسلحوں سے حملہ کرنے کی دعوت دی۔

جدید دور میں شبلی ان عظیم علماء میں سے ہیں جنہوں نے مدافعت اسلام کی کوشش مقتضیات عصر کے مطابق کی۔ انہوں نے دراصل جدید علم کلام کا آغاز کیا۔ نہ صرف الکلام اور علم الکلام لکھ کر بلکہ مستشرقین کے بہت سے گمراہ کن نظریات کی تردید کرکے انہوں نے اسلام کے بارے میں شک و شبہہ سے ذہنوں کو پاک کیا۔ مشہور عیسائی مصنف جرجی زیدان کی

ریشہ دوانیوں اور غلط بیانیوں کا مدلل جواب لکھا جو اس نے اپنی معروف کتاب "التمدن الاسلامی" میں واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے کی کوشش کی تھی۔ علامہ شبلی نے یہ رسالہ عربی زبان میں تصنیف فرمایا اور ان کے معاصر علامہ سید رشید رضا نے اس کو قاہرہ سے شائع کرکے سارے عالم اسلام میں پھیلا دیا۔

علامہ شبلی اسلام کی مدافعت جس انداز سے کر رہے تھے اس کا تقاضا تھا کہ ہندوستان کے حالات کے پیش نظر وہ راہ اختیار کریں جو ان کے لئے مفید ہو۔ یہ عجیب بات ہے۔ ہر جگہ اس امر کا چرچا ہے کہ علمائے دیوبند نے انگریزوں کی مخالفت کی اور آزادی کے لئے جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مگر اس سلسلہ میں علامہ شبلی کے ساتھ مورخین نے انصاف سے کام نہیں لیا۔ حق یہ ہے کہ علامہ شبلی نے حریت پسندی اور انگریز دشمنی میں سب سے پہلے علمی انداز سے جہاد کیا۔ انہوں نے نیا فکر پیش کیا۔ ان کے اس فکر کی ترجمانی ان کے شاگردوں اور ان کے حلقے کے خوشہ چینوں نے کی۔ ان میں سب سے زیادہ اہمیت مولانا ابوالکلام آزاد کی ہے۔ جنہوں نے دراصل علامہ شبلی کے سیاسی نظریات کی ترجمانی کی ہے۔

علامہ شبلی اردو میں پہلے شاعر ہیں جنہوں نے مسلم لیگ کے خلاف نظمیں لکھیں۔ اردو میں سیاسی شاعری کا آغاز دراصل ان کی سلیس طنزیہ اور دلچسپ نظموں سے ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے دور میں مسلم لیگ کو اپنی شاعری کا نشانہ بنایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں مسلم لیگ سرکاری ملازمین اور انگریزوں کے خوشامدیوں کی ایک تحریک تھی جس سے علامہ شبلی سخت ناراض تھے۔ وہ انگریزوں کی خوشامد کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ ان کے سیاسی نظریات کا مطالعہ بہت دلچسپ ہے۔

علامہ شبلی ۱۶ برس علی گڑھ میں رہے۔ سر سید کے مکان میں رہنے کے باعث ان کا تعلق سر سید سے بہت گہرا تھا۔ سر سید کانگریس کے مخالف تھے۔ کانگریس کے تعلق کو مسلمانوں کے لئے مضر تصور کرتے تھے۔ اس لئے کہ مسلمان تعلیم میں پیچھے رہ گئے تھے۔ اس کمی کو سر سید انگریزوں کی سرپرستی کے ذریعہ اور مسلمانوں کو جدید تعلیم دلا کر پورا کرنا چاہتے تھے۔ کانگریس انگریز دشمنی تحریک تھی اس لئے سر سید کا خیال تھا کہ اگر مسلمان اس تحریک میں شرکت کریں گے

تو وہ ملازمتوں سے محروم رہ جائیں گے اور انگریز ان کو کوئی مدد نہ دیں گے۔

علامہ شبلی نے جس طرح دوسرے مسائل میں اپنی منفرد شخصیت کا اظہار کیا بالکل اسی طرح اس مسئلہ میں بھی انہوں نے سرسید کی راہ اختیار نہیں کی وہ کانگریس میں تو شریک نہیں ہوئے مگر مسلم لیگ کی مخالفت زوروں سے کی۔ جس کا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ وہ کانگریس کے ساتھ تھے۔ مگر اسلام کی مدافعت کے لئے جس دن کانگریس مسلمانوں کی مخالفت کرتی اس دن وہ اس کے مخالف بن جاتے۔ جیساکہ مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی نے کیا تھا۔

علامہ شبلی کی سیاست حق وحریت کی ترجمان تھی۔ انہوں نے انگریزوں کی مخالفت کی ترکوں سے ہمدردی کی۔ انگریز دشمنی کا تعلق نظریہ سے ہے وہ کبھی کھل کر دشمنی کرتے اور کبھی ندوہ کی ضرورتوں سے حکومت سے استعانت چاہتے۔ چنانچہ ایک بار ندوہ کے سلسلہ میں انہوں نے گورنر سے ملاقات کی اور اس موقع پر گورنر نے کہاکہ آپ نے مسجد کانپور پر نظم لکھی اور مسلمانوں کو حکومت کے خلاف اکسایا۔ علامہ نے فرمایا: جی ہاں صاحب! ساری قوم میں جوش وخروش تھا تو میں اپنے آپ کو قوم سے الگ نہیں کر سکتا تھا۔ مگر عام حالات میں انہوں نے انگریزوں کو اپنی خیرخواہی کا یقین دلایا۔ عملی زندگی میں ایسے مواقع آتے ہیں۔ ندوہ جس سے ان کو عشق تھا اس کے لئے وہ سب کچھ کرنے کو تیار رہتے۔ اگر حکومت سے وہ کشیدگی دور نہ کر لیتے تو ندوہ کو یونیورسٹی کے قریب اپنی عمارت بنانے کا پلاٹ نہ ملتا۔ مگر نظریاتی نقطۂ نظر سے وہ مسلسل اور پیہم مسلم لیگ کی مخالفت کرتے رہے جو درا صل انگریزوں کی دوست تھی۔ انہوں نے اس کی کبھی پرواہ نہ کی انگریز ان کے اس فعل سے برگشتہ ہوں گے۔ انہوں نے مسلم لیگ کی مخالفت میں جو نظمیں لکھی ہیں وہ نظمیں طنزیہ ہیں انہیں سادگی اور پرکاری کا حسین امتزاج ہے

چونکہ علامہ شبلی دیدہ ور مورخ تھے لہذا انہوں نے تاریخ اسلام سے موثر واقعات کا انتخاب کرکے ان پر بڑی دلکش نظمیں لکھی ہیں۔ انہوں نے اسلامی فکر کو بیدار کرنے اور ان کے اندر جذبۂ عمل کو ابھارنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ انہوں نے مسلمانوں کے دور عروج کے دلکش واقعات کے ذریعہ ہندوستان کے شکستہ خاطر مسلمانوں کے اندر حوصلہ اور قوت عمل پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان نظموں میں کہیں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ کے ایثار اور گھریلو زندگی کی

قربانی اور جد وجہد کو پیش کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ملازم عطا نہ کیا۔ اسی طرح انہوں نے ہندوستان کی عالمی تاریخ سے جہانگیر کے اس انصاف کو پیش کیا جبکہ اس نے نورجہاں کے خلاف قتل کا فیصلہ کیا تھا جو آخر میں فدیہ پر بدل گیا تھا۔ ان نظموں کے اندر جو اصلاحی اور معلمانہ انداز نظر ہے وہ ان کی پرجوش اسلامی شخصیت کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ لطف تو یہ ہے کہ ان کی نظموں میں تشبیہ واستعارہ کا جادو بھی نہیں ہوتا۔ الفاظ کی رنگینی بھی کمتر ہوتی ہے مگر جذبہ کی صداقت اور روح اسلام پوری قوت سے کارفرما نظر آتی ہے، ان کی نظمیں درحقیقت سہل ممتنع کی عمدہ مثالیں ہیں۔ اگرچہ انہوں نے شاعری پر زیادہ توجہ نہیں کی مگر جو کچھ بھی لکھا ہے وہ مقصد کی بلندی اور اصلاح امت کے جذبہ سے سرشاری میں امتیاز کا حامل ہے۔

علامہ شبلی کی عظمت تجدید واصلاح امت کی تاریخ میں روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ انہوں نے ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی شکست اور اسلامی تمدن پر فرنگی تہذیب کا غلبہ علی گڑھ میں رہ کر بڑی گہرائی سے مطالعہ کیا۔ انہوں نے اسلامی تہذیب کی روح اس عظیم ذخیرہ میں دیکھی جو تاریخ عالم کا جزء ہے یعنی اسلامی تاریخ کا عہد زریں اور پھر ان عظیم علماء میں ان کو تحریک اسلامی کی شمع جلتی نظر آئی جن کو انہوں نے ہیروز آف اسلام کے سلسلہ میں پیش کیا ہے۔ علامہ شبلی کے علمی کام دراصل ایک مقصد کے مطابق ہیں اور خاص کیفیت کے حامل ہیں۔ انہوں نے "المامون" کا انتخاب عصر عباسی کے خلفاء میں کیا اس لئے کہ اس کا دور عصر عباسی کے تمدن کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ سائنس میں اس دور عظیم ترقیاں ہوئیں اور پورے عالم میں اسلام کے عظمت کا طوطی بول رہا تھا۔ مولانا شبلی کا مقصد امت اسلامیہ کے سامنے وہ عہد زریں لانا تھا جس میں اسلام مادی اور علمی طور پر اعلیٰ تمدن کی مثال بن گیا تھا، تاکہ مسلمانوں کے ذہن سے وہ مرعوبیت ختم ہو جائے جو انگریزی تہذیب لائی تھی۔ مگر علامہ شبلی نے پھر دوسرے خلفاء کے حالات نہیں لکھے بلکہ اصلاح امت کے لئے دوسرے جاندار موضوعات کا انتخاب کیا۔

خلفائے راشدین میں انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا اس کی وجہ بھی یہی

ہے کہ حضرت عمر کا جاہ و جلال ان کی عظمت و شان اور ان کے دور میں فتوحات کی کثرت اسلام کی عظمت کو نمایاں کرتی ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کو وقت کم ملا، حضرت عثمانؓ کے دور میں فتنے اٹھے، حضرت علیؓ کو سارا وقت جنگ و جدال میں لگانا پڑا۔ اسلئے علامہ شبلی نے حضرت عمر کا انتخاب کیا اور کتاب بھی اس شان سے لکھی کہ اس کے لئے مصر و قسطنطنیہ کے کتب خانے چھان ڈالے اور ان مخطوطات و نوادر سے ایسا عمدہ مواد "الفاروق" میں جمع کر دیا کہ ہندوستان کے علمی دنیا میں اس کی دھوم مچ گئی۔ حق تو یہ ہے کہ آج بھی اس کتاب کا جواب اردو میں موجود نہیں۔ علامہ شبلی نے جس ترتیب، علمی انداز نظر اور جامعیت کے ساتھ خلافت فاروقی کے ایک ایک گوشہ کو نمایاں کیا ہے وہ انہیں کا حق ہے۔ خصوصاً حضرت عمر کے نظم و نسق اور مجالس شوری کا ذکر نہایت مؤثر ہے۔ بنیادی مقصد مولانا کا صرف یہ تھا کہ ان ولولہ انگیز کارناموں سے روح میں بالیدگی اور علمی نشاط پیدا کیا جائے۔

اسی تصور کے پیش نظر انہوں نے "سیرۃ النعمان" لکھی اس لئے کہ حضرت امام ابوحنیفہ کی زندگی سراپا عمل تھی۔ انہوں نے عملی زندگی میں ابوجعفر جیسے ظالم خلیفہ سے ٹکر لی اور سرکاری قاضی القضاۃ کی جگہ بار بار رد کی۔ اپنی زندگی کے لئے تجارت کا شغل اختیار کیا۔ اور جب حضرت زید نے خروج کیا تو ان کی مالی امداد کی۔ ان کی ذاتی زندگی کا ایک واقعہ علامہ شبلی نے نقل کیا۔ ان کے گھر کے پاس ایک یہودی رہتا تھا۔ وہ رات کو خوب شراب پیتا اور مست ہو کر گاتا کہ "اضاعونی وای فتی اضاعوا" (لوگوں نے مجھے ضائع کر دیا، کیسے نوجوان کو انہوں نے ضائع کیا) ایک دن امام صاحب نے ان کی آواز نہ سنی۔ دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ وہ شراب نوشی کے الزام میں جیل میں بند کر دیا گیا ہے۔ صبح ہوئی تو امام صاحب گورنر کے دربار میں پہنچے۔ سب کو تعجب ہوا کہ امام صاحب نے حکومت کا مقاطعہ کر رکھا تھا اور وہ کسی سرکاری دفتر یا آفیسر سے ملتے نہ تھے۔ گورنر نے ان کی آمد کا سبب پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ آپ کی پولس ہمارے پڑوسی کو پکڑ لائی ہے میں اس لئے آیا ہوں کہ اس کو ابھی چھوڑ دیا جائے۔ وہ لایا گیا اور چھوڑ دیا گیا تب امام صاحب نے فرمایا کہ دیکھو ہم نے تم کو ضائع تو نہیں کیا امام صاحب کے اس حسن معاملت کا اثر یہ ہوا کہ وہ مسلمان ہو گیا۔

علامہ شبلی کی سیاست کا دوسرا رخ پان اسلام ازم تھا۔ اتحاد عالم اسلامی ان کی آرزوؤں کا محور اور دلی تمناؤں کا مرکز تھا۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکوں نے یہودی اثرات سے پر تحریک اتحاد و ترقی کے زیر اثر جرمنی کا ساتھ دیا۔ جب جرمنوں کو شکست ہوئی تو اتحادیوں نے صدیوں کے بعد موقع پایا کہ ترکی خلافت کے حصے بخرے کر ڈالیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے زبردست اضطراب اس وقت محسوس کیا جبکہ ترکی پر اتحادیوں کا قبضہ ہو گیا۔ مولانا محمد علی نے تحریک خلافت چلائی سارے ہندوستان میں جنگل کی آگ کی طرح یہ تحریک پھیل گئی اور خاص بات یہ بھی ہوئی کہ ہندو زعمار نے دل کھول کر اس تحریک کا ساتھ دیا جس سے ہندو اتحاد بھی مستحکم ہوا اس وقت مسلمانوں نے ایک وفد لندن بھیجنا طے کیا تاکہ وہ حکومت برطانیہ سے گفتگو کر کے ترکوں کے بارے میں باعزت فیصلہ اور تصفیہ کرا سکے۔ اس وفد کے لیڈر مولانا سید سلیمان ندوی رح منتخب ہوئے جس پر اکبر الٰہ آبادی نے بطور مزاح یہ شعر کہا تھا ؎

سلیماں کی بات کیسی بنی   کہ ندوی سے ہو گئے لندنی

اسی خلافت تحریک کے زیر اثر ایک طبی وفد ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سرکردگی میں جنگ کے مجروحین کی اعانت کے لئے روانہ ہوا۔ جب یہ وفد واپس بمبئی آیا اور علامہ شبلی اس کے استقبال کے لئے گئے تو انہوں نے وفد کے صدر ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے قدموں کا بوسہ لیا کہ یہ قدم خدا کی راہ میں چلے ہیں اور انہوں نے مجاہدین اسلام کی خدمت کی ہے۔ اس موقع پر انہوں نے ایک جاندار نظم لکھی۔ ظاہر ہے کہ جذبات کے اظہار کا ذریعہ نثر کے مقابلہ میں نظم زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے۔

تمہیں نے غازیوں کے زخم پر ٹانکے لگائے ہیں
شہیدان وطن کے جامۂ پرخوں بھی دیکھے ہیں

نگار آرائیاں دیکھی ہیں چشم گوہر افشاں کی
شہیدان وفا کے عارض گلگوں بھی دیکھے ہیں

عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر اچھل جائے
کہ ہم نے انقلاب چرخ گرداں یوں بھی دیکھے ہیں

بلقانی ریاستوں نے ترکی پر جب حملہ کیا تو علامہ شبلی کی رگ حمیت اسلام سے بھڑک اٹھی اور انہوں نے ایک نہایت غم انگیز نظم لکھی جس کے چند اشعار یہ ہیں ؎

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیئے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک

مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریض سخت جاں کب تک

حق تو یہ ہے کہ ہندوستان میں بڑے بڑے صاحب نظر علما پیدا ہوئے مگر جو عظمت علامہ شبلی کو نصیب ہوئی اور امت کی دو درس خدمت جو انہوں نے کی اس کے اثرات لامتناہی ہیں۔ ان کی تحریک کا ایک ایک حرف موتی ہے جس کی چمک دمک زمانہ کے ساتھ بڑھتی جائے گی۔ اگر ان کتابوں کا انگریزی اور عربی میں ترجمہ ہو جائے تو یقیناً ان کتابوں کو عربوں کا علمی طبقہ سرمۂ چشم بصیرت تصور کرے گا۔ مقالات شبلی کی ہر جلد علم و حکمت کا خزانہ اور اسلام کی روح سے سرشار ہے۔

انہوں نے اصلاح امت کے سلسلہ میں ایک کام یہ بھی کیا ہے کہ ایک ایسی جماعت تیار کر دی جس نے انکے مشن کو جاری رکھا مثلاً علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی وغیرہ

دارالمصنفین کی علمی مساعی درحقیقت ان کی اسلامی کاوشوں اور اصلاح امت کا ایک ایسا روشن کارنامہ ہے جو ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

یک چراغ است دریں خانہ کہ از پرتو آں
ہر کجا می نگری انجمنے ساختہ اند

مجلس

بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتابگڈھی مدظلہٗ

فرمایا۔ اس عالم میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کو آدمی دیکھتا نہیں مگر ان کے وجود کا یقین رکھتا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ وہ چیزیں نظر نہیں آتیں مگر ان کے آثار اس طرح ہویدا و عیاں ہیں کہ آدمی ان کے وجود کے ماننے پر مضطر و مجبور رہے۔ مثلاً ہوا ہے کہ آدمی ہوا کو دیکھتا نہیں مگر اس کے اثرات دکھائی پڑتے ہیں۔ پتے ہلتے ہیں، ٹہنیاں ہلتی ہیں تو آدمی کہتا ہے کہ ہوا چل رہی ہے۔ نیز بدن کو لگتی ہے۔ جیسی ہوا ہوتی ہے گرم یا سرد، اس کا احساس ہوتا ہے تو آدمی کہتا ہے کہ گرم ہوا چل رہی ہے یا ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔

اسی طرح سردی کو آدمی دیکھتا نہیں مگر اس کا اثر آدمی کے بدن پر ہوتا ہے تو کمبل لحاف اوڑھتا ہے۔ اسی طرح جب گرمی کا احساس ہوتا ہے تو پنکھا جھلنے لگتا ہے، کپڑے اتار دیتا ہے وغیرہ

اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کا یقیناً وجود ہے بلکہ جملہ مخلوقات کا وجود انھیں کے وجود کا پرتو و ظل ہے۔ اور تمام اشیاء انہیں کے موجود کرنے سے موجود ہوئی ہیں اور وہ اپنے آثار سے بالکل ہویدا اور ظاہر ہے۔ تاہم ان کو کوئی یہاں ان آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا ہے، اس لئے کہ یہ دار دنیا اس کا محل نہیں ہے، آخرت میں مومن کو اس ذات عالی کا دیدار ہوگا اور اس سے بڑھکر کسی نعمت میں حظ و لطف نہ ہوگا۔ وُجُوہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّہَا نَاظِرَۃٌ ۝

آخرت میں مومن ان آنکھوں سے دیکھے گا مگر یہاں نہیں دیکھ سکتا بلکہ اس کے ذات وصفات کی کامل معرفت کبھی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ جتنا ہم سمجھ سکتے ہیں اس کے وہ وراء ہے بلکہ اللہ تعالیٰ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔ وہ ذات وہم و تصور سے بالاتر ہے۔ ہاں اس کے آثار البتہ

ظاہر و باہر ہیں، جملہ مخلوقات ان کے وجود پر دال ہیں۔ اس مضمون کو ایک اعرابی نے نہایت عمدہ طریقہ سے بیان کیا ہے کہ

البعرۃ تدل علی البعیر و آثار	مینگنی اونٹ پر دلالت کرتی ہے، نشانات
القدم تدل علی المسیر فالسماء	قدم چلنے والے پر دلالت کرتے ہیں تو یہ
ذات الابراج والارض ذات	برجوں والا آسمان اور یہ کشادہ زمین
الفجاج کیف لا تدل علی	اپنے صانع لطیف و خبیر پر کیوں نہ دلالت
اللطیف الخبیر۔	کریں گے۔

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ٭ ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

خود انسان کے اندر بہت سی چیزیں مستور ہیں اور ہم اس کے وجود کا یقین کرتے ہیں مثلاً بھوک، پیاس، غم، خوشی وغیرہ یہ سب چیزیں اس کے اندر موجود رہتی ہیں، ہم ان کو دیکھتے تو نہیں مگر ان کے وجود کا یقین کرتے ہیں۔ پس جب ہم اپنے اندر کی چیزوں کو نہیں دیکھ سکتے تو پھر اس ذات لطیف و خبیر کو کیسے دیکھ سکتے ہیں؟ اور جیسے ان چیزوں کو نہ دیکھنے کے باعث، ان کے آثار سے وجود کا یقین کرتے ہیں، اسی طرح آثار و آیات سے اللہ تعالیٰ کے وجود کا یقین رکھتے ہیں۔

اسی طرح آدمی کے اندر اچھے بُرے اخلاق بھی مستور ہیں مگر ان کو دیکھا نہیں جا سکتا البتہ آثار سے پتہ چل جاتا ہے کہ اس کے اندر یہ خلق موجود ہے انہیں علامات و آثار کو دیکھ کر اس کی جڑ اور منشا کو آدمی سمجھ لیتا ہے۔ چنانچہ مشائخ محققین اس معاملہ میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔

مثلاً کسی کے اندر تکبر کا مرض ہے یعنی اپنے کو بڑا سمجھنا، خواہ اپنے علم پر ہو، یا اپنے عمل پر یا حسب و نسب پر ہو یا عبادت و ریاضت پر یا مال و دولت پر ناز و غرور ہو کوئی دوسرا آدمی نہیں سمجھ سکتا اس لئے کہ یہ قلب کا فعل ہے اور قلب کے فعل پر دوسرا آدمی کیسے مطلع ہو سکتا ہے مگر جب اس کے آثار ظاہر ہوں گے تو ہر عاقل و بصیر دیکھ کر یہ کہیگا کہ یہ شخص متکبر ہے۔ مثلاً یہ کہ ترفع و بڑائی کی باتیں کرتا ہے یا اپنے اخوان و احباب پر تقدم اختیار کرتا ہے اور ہر مجلس میں مقام صدارت پر ہی بیٹھتا ہے۔ اپنے قول و عمل سے اس کی خواہش کا اظہار کرتا ہے تو ہر شخص

اس کی باتوں کو سن کر اور اس کے افعال کو دیکھ کر یہ کہے گا کہ یہ متکبر شخص ہے اور مرض کبر میں مبتلا ہے۔

اسی طرح غصہ کا مرض ہے کہ کسی سے طبیعت کے خلاف بات ہو گئی تو دل میں انتقامی جذبہ ابھرتا ہے، ہیجانی کیفیت ہوتی ہے، مگر یہ دل ہی دل میں ہے تو کچھ نہیں لیکن جب اس کا اثر باہر آجائے، رگیں پھول جائیں، چہرہ اور آنکھیں سرخ ہو جائیں اور زبان سے اناپ شناپ باتیں نکلنے لگیں، گالی گلوچ بکنے لگے تو ہر آدمی کہے گا کہ اس کا غصہ کی بیماری ہے۔

اسی طرح کینہ و حسد بغض کی بیماریاں ہیں۔ یہ سب امراض قلب ہیں جو قلب میں مستور ہیں، یوں آدمی ذرا غور کرے تو اپنے امراض کو سمجھ سکتا ہے مگر غفلت کی وجہ سے اس کی طرف توجہ ہی نہیں ہوتی۔ البتہ جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو اس کی طرف متوجہ فرمادیتے ہیں اور اس کو عیوب نفس اور رزائل کا بصیر بنا دیتے ہیں اور جب بصیرت حاصل ہو جاتی ہے تو اصلاح آسان ہو جاتی ہے اور خودی اور انانیت فنا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ میرا ہی ایک شعر ہے ؎

کھل گئی جب سے چشم بصیرت
اپنی نظروں سے خود گر گئے ہم

رذائل کا ہونا کچھ بعید نہیں۔ انسان خطا و نسیان سے تو مرکب ہی ہے۔ فضائل و رذائل کا مجموعہ ہے اور رذائل کے ہونے میں بھی بڑے مصالح ہیں ورنہ مجاہدہ کس چیز کا ہوتا۔ پھر تعجب کی بات کیا ہے۔ مگر یہ کہ آدمی اصلاح کرنے کا مکلف ہے، لہٰذا اس کی سعی کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ یہ رذائل اگر باقی رہے اور اسی میں آدمی مرا تو جہنم تک پہونچا دیں گے۔

مثلاً بدنظری کا مرض ہے تو باوجود خواہش کے آنکھ کو نامشروع شے کے دیکھنے سے روکے مزا ہی چاہے مگر نظر نہ اٹھائے۔ مجاہدہ کرے کچھ دنوں کے بعد یہ مرض ختم ہو جائے گا۔ بدنظری ایسی بری بلا ہے کہ زنا تک پہونچا دیتی ہے۔ اسی بنا پر خود اس کو زنا کہا گیا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں ایک شخص آیا تو فرمایا کہ کیا حال ہے ان لوگوں کا

جو ہماری مجلسوں میں آتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے زنا کا اثر ٹپکتا ہے تو اس نے کہا کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی وحی کا سلسلہ جاری ہے؟ فرمایا نہیں مگر مومن کو نور فراست دیا جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے۔

ایسے ہی تکبر کا مرض ہے۔ غصہ کا مرض، اسمیں اپنی زبان کو روکے اور کوئی فعل ایسا سرزد نہ ہو جو دوسرے کے لئے مضر ہو، یعنی ان امراض کے آثار سے آدمی اگر اپنے کو بچائے گا تو جڑ اور منشا جو قلب ونفس میں مستور ہے وہ مضمحل ہو جائے گا۔

آج کل عجب حال ہے، ان باتوں کیطرف ذرا التفات نہیں، بدگمانی، تجسس، غیبت عام ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان سب سے منع فرمایا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا	اے ایمان والو! بہت گمان کرنے سے بچو
كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ	یقیناً بعض گمان گناہ ہوتا ہے، اور تجسس
إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَب	نہ کرو اور نہ تمہارا ایک دوسرے
بَّعْضُكُم بَعْضًا ؕ	کی غیبت کرے۔

مگر دیکھ لیجئے کہ آج اس آیت پر کتنا عمل ہو رہا ہے، ہر مقام پر غیبت کا بازار گرم ہے اور اب تو یہ مرض شغل مجلس ہو گیا ہے اور بدگمانی اور تجسس تو غیبت کے مقدمات ہیں ان کا شائع ہونا بھی مخفی نہیں ہے۔ چنانچہ بدگمانی کا واقعہ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے۔

ایک آدمی چلا جارہا تھا ایک دوسرے آدمی نے اسے دیکھ کر سمجھا کہ ہمارا دوست جارہا ہے بعض دفعہ ایسی غلط فہمی ہو جاتی ہے۔ جب قریب گیا اور چہرہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہمارا دوست نہیں ہے تو اپنی اس غلط فہمی پر اس کی زبان سے لاحول ولاقوۃ نکل گیا اور کہا کہ میں نے سمجھا تھا کہ ہمارا فلاں دوست ہے۔ بتلائیے یہ کون سی خفگی کی بات تھی ہ مگر کیا ہوا سنئیے، اس آدمی نے اس کو پکڑ لیا اور کہا کہ تم نے مجھ کو شیطان سمجھ کر لاحول پڑھا اور تیز باتیں کرنے لگا گھنٹے ہی عذر کیا مگر ایک نہ مانا اور یہی کہتا رہا کہ تم نے ہم کو شیطان سمجھا جب ہی تو لاحول پڑھا جب بات بہت بڑھنے لگی تو وہ کسی طرح جان بچا کر بھاگا۔

دیکھئے، یہ ہے بدگمانی کا کرشمہ آج کل اوہام و خیالات پر احکام کا ترتب ہو جاتا ہے، اور اس کی وجہ سے بہت نقصانات ہو رہے ہیں مگر اس کو کم کرنے والے بہت کم ہیں۔ قلوب کو باہم جوڑنے والوں کی کمی ہو گئی ہے حالانکہ اس کے لئے جھوٹ بولنا بھی جائز ہے تاکہ تعلقات ٹھیک ہو جائیں اور باہمی نزاع و فساد ختم ہو جائے۔ مگر اب زیادہ لوگ ایسے ہیں، اِدھر کی اُدھر اور اُدھر کی اِدھر کر کے فسادات میں اضافہ کر دیتے ہیں اور دور تک پھیلا دیتے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن ٥ ہونا تو یہ چاہئے کہ آپس کے نزاعات و فسادات کو ختم کریں، تعلقات کو توڑنے کے بجائے جوڑیں۔ ہمارا ہی ایک شعر ہے ؎

رحمت کا ابر بن کے جہاں بھر میں چھایئے
عالم یہ جل رہا ہے برس کر بجھایئے

فساد کے ختم ہونے کی بہتر صورت یہ ہے کہ اپنے اندر تواضع پیدا کی جائے۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی لکھا ہے کہ قلوب میں تواضع پیدا ہو جائے تو نزاعات و فسادات ختم ہو جائیں۔ اس لئے کہ جب ہر آدمی دوسرے کو اپنے سے برتر سمجھے گا تو اگر اس سے کوئی ناگوار بات ہو جائے گی تو درگذر کرے گا۔ اور اپنے کو اس سے زیادہ کا مستحق سمجھے گا اور اس سے معافی مانگے گا۔ تو پھر فساد کیسے بڑھے گا بلکہ ہو گا ہی نہیں اور ہو گا تو حد کے اندر رہے گا۔

الحمد للہ! میرے اندر یہ بات ہے کہ اگر کسی کو مجھ سے اذیت پہنچ جائے بلکہ اذیت کا مجھے خیال ہو جائے کہ شاید میری اس بات سے تکلیف پہونچی ہو تو جب تک اس سے معافی مانگ نہیں لیتا چین نہیں ملتا۔ مجھے الحمد للہ معافی مانگنے میں ذرا عار نہیں خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے باوجود نبی ہونے کے صحابہ کے ساتھ تواضع کا معاملہ فرمایا ہے تو ہم شما کا اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا حال ہونا چاہئے۔ ہم کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنی چاہیے۔ نبی پر ایمان و محبت کا یہی تقاضا ہے۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ٥ تو یہ اتباع ہر شان و شعبہ میں ہونا چاہئے، ظاہر میں، باطن میں اخلاق میں، معاملات میں۔ اخلاق میں ہم آزاد نہیں ہیں کہ جو چاہیں کریں بلکہ اس میں اور زیادہ اتباع کا اہتمام کرنا چاہئے اس لئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اسی غرض کیلئے

ہوتی ہے۔ حدیث پاک میں ہے۔ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ یعنی مکارم اخلاق کی تکمیل و تتمیم کے لئے میں بھیجا گیا ہوں۔ مگر آج کل اصلی اخلاق تو کیا رسمی اخلاق بھی نہیں۔ زبان سے بھی ہمدردی و غمخواری کی باتیں عنقا ہوگئی ہیں۔ اخلاق کی حقیقت تو کیا اس کی صورت بھی باقی نہ رہی۔ مثلاً یہ کہ کسی پر کوئی مصیبت پڑی ہو تو اس کے سامنے رنج و غم کا اظہار ہی کر دیں، مگر اب دن بدن یہ چیزیں بھی کم ہوتی جا رہی ہیں جس کی وجہ سے باہمی الفت و محبت بھی ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اور جب دل میں کسی کا پاس و لحاظ نہ رہے گا، تو خوشی غمی میں کسی سے کوئی تعلق اور رشتہ نہ رہے گا تو ظاہر ہے کہ فساد سارے عالم میں عام ہو جائے گا جو رو کے نہ رکے گا۔ جیسا کہ ہمارے زمانہ میں مشاہدہ ہے۔

ہاں تو میں نے پہلے یہ بیان کیا تھا کہ اگر تواضع کی صفت و عادت اپنے اندر پیدا کر لی جائے تو باہم اتفاق اتحاد کا ہو جانا آسان ہے اور یہ تواضع بھی قلب کا فعل ہے۔ ظاہر میں اس کے آثار جب نمودار ہوتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص متواضع ہے۔ مثلاً اپنے بھائیوں کے سامنے جھک کر معاملہ کرنا، نرم بات کرنا عفو و درگذر کرنا وغیرہ۔

چنانچہ اکابر کے عفو و درگذر کے بہت سے واقعات کتابوں میں درج ہیں، ان کا مطالعہ کیا جائے۔ مثال کے طور پر عرض ہے کہ

حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بہت ہی خشوع و خضوع سے نماز پڑھا کرتے تھے۔ یہاں تک لوگ ان کو ریاکار کہتے تھے، ایک مرتبہ وہ سجدہ میں تھے کہ کچھ لوگوں نے ان کے سر پر کھولتا ہوا پانی ڈال دیا جس کی وجہ سے چہرہ بری طرح سے جل گیا مگر ان کو کچھ پتہ نہ چلا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو اس کا احساس ہوا پوچھا یہ کیا ہوا تو لوگوں نے خبر دی کہ فلاں فلاں نے یہ ناشائستہ حرکت کی ہے تو آپ نے یہ سن کر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ اس سے زیادہ کچھ نہ فرمایا، حالانکہ اس جلنے کی تکلیف عرصہ تک رہی۔

سبحان اللہ! یہ حال تھا ہمارے اکابر کا، نماز حق تھا اس کا کیسا حق ادا کیا اس طرح سے اللہ تعالیٰ سے مناجات کر رہے تھے کہ سر و چہرے کے جلنے کا احساس نہ ہوا اور پھر مخلوق کے ساتھ کیسا معاملہ فرمایا کہ ان لوگوں کو معاف فرما دیا۔ یہ اس سے بھی بڑا کمال ہے۔

اسی طرح حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مریدین کے ساتھ کہیں جارہے تھے، اوپر سے کسی نے راکھ ڈالی اور سب راکھ حضرت شیخ کے سر پر پڑی، سب کپڑے خراب ہوگئے تو فرمانے لگے الحمد للہ، مریدین نے کہا کہ آپ الحمد للہ کس بات پر فرمارہے ہیں ان پر بددعا فرمادیجئے تو فرمایا کہ جو سر آگ برسائے جانے کا مستحق تھا اس سے راکھ پر اکتفا کرلیا جائے تو شکر کا مقام نہیں ہے؟

سبحان اللہ! یہ تھا مقام تواضع ہمارے سلف کا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان کے طریق پر عمل کرنے کی توفیق دے۔

حضرت شاہ غلام علی مجددی رح مولانا خالد رومی رح کو لکھتے ہیں کہ "کسی سے انتقام لینا ہمارے آپ کے لئے مناسب نہیں ہے۔ صبر وعفو صوفیہ کی ایک ادنیٰ عادت وخصلت ہے، اللہ تعالیٰ اس آیت پر عمل کی توفیق عطا فرمائے اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ یعنی برائی کی مدافعت عمدہ خصلت اور اچھائی کے ذریعہ کرو۔"

ہمارے اکابر نے اس پر عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو دین و دنیا کی عزت وعافیت سے نوازا، اور دنیا اب تک ان کو یاد کرتی ہے۔ چنانچہ سید نا رفاعی رحمۃ اللہ علیہ جو امت محمدیہ کے بہت بڑے آدمی سمجھے گئے ہیں، اپنے وقت کے قطب تھے، ان کا واقعہ لکھا ہوا ہے۔

ایک بار ایک گروہ فقراء سے ملاقات ہوئی، ان سب نے آپ کو گالی دی اور کہا کہ اے اعور (کانے)، اے دجال، اے حرام چیزوں کے حلال کرنے والے، اے قرآن میں تبدیل کرنیوالے، اے ملحد، اے کتے۔ آپ نے اسی وقت اپنا سر کھول کر زمین بوسی کی اور کہا کہ اے میرے سردارو! مجھ سے راضی ہو جاؤ، مجھے تمہارے حلم سے یہی امید ہے، اور ان کی دست بوسی فرمائی۔ جب آپ نے اس خوشامد سماجت سے ان کو مجبور کردیا تو ان سب نے کہا کہ ہم نے تم سے زیادہ کسی فقیر کو متحمل نہیں دیکھا کہ اتنا کچھ ہم نے کہہ سنایا مگر تم متغیر تک نہ ہوئے۔ آپ نے کہا یہ سب تمہاری برکت اور عنایت ہے۔ پھر اپنے احباب سے فرمایا کہ اس واقعہ سے ہم کو راحت ہوئی انہوں نے اپنے جی کی بھڑاس ہم پر اتاری، دوسروں کے مقابلہ میں ہم ہی اس کے زیادہ مناسب تھے ممکن تھا کہ یہ باتیں وہ کسی اور سے کہتے اور وہ متحمل نہ ہوتا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا مطالعہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کتنے عفو، درگزر، تواضع وانکسار کے واقعات ہیں، آج اگر ہم لوگوں کو وہ واقعات مستحضر ہوں تو بڑی عبرت ونصیحت ہو۔ چنانچہ کتابوں میں یہ واقعہ درج ہے کہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک یہودی مہمان ہوا، آپ نے کھلایا پلایا اور سونے کا انتظام فرمایا تو جس حجرے میں انتظام فرمایا تھا باہر سے اس کی کنڈی لگا دی کہ صبح کو آکر کھول دیں گے۔ باہر سے کنڈی بند تھی اس لئے حجرے ہی میں بستر پر پاخانہ کر دیا۔ جب صبح ہوئی کنڈی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کھولی تو وہاں سے کھسک گیا اور رخصت ہوگیا۔ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا تو خود بنفس نفیس بستر اٹھایا اور دھونے لگے۔ صحابہؓ بڑھے اور اس خدمت کو انجام دینے کی درخواست کی تو فرمایا، نہیں بھائی وہ میرا مہمان تھا اس لئے بستر میں ہی دھوؤں گا۔ بہت اصرار کے بعد فرمایا کہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہو کہ پانی ڈال دو۔ چنانچہ وہ پانی ڈال رہے تھے اور حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم بستر کو صاف فرما رہے تھے۔

ادھر جب مہمان کچھ دور گیا تو اپنی تلوار یاد آئی جس کا دستہ سونے کا تھا اب سوچنے لگا کہ کیا کرنا چاہئے، شرم وندامت سے طبیعت رکتی تھی کہ ایسی حرکت کرکے آیا ہوں لوگ کیا کہیں گے اور حرص اور حب مال کا یہ تقاضا تھا کہ چلنا چاہئے ورنہ بہت بڑا نقصان ہو جائے گا۔ بہرحال یہی غالب آیا اور گیا تو دیکھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنفس پاک خود اس کے پاخانہ کو دھو رہے ہیں وہ دیکھ کر بہت متاثر ہوا اور کلمہ پڑھ لیا۔

اب دیکھئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوسرے سے بھی دھلا سکتے تھے، مگر خود دھویا۔ سبحان اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اخلاق تھے۔ اللہ اکبر۔

دوسرا واقعہ سنئے، کہ کسی موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک صحابی کو لکڑی سے آہستہ سے کونچ دیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ اعلان فرمایا کہ کسی کا کچھ حق میرے ذمہ ہو تو یہاں ہی لے لے اور اگر کوئی تکلیف پہونچی ہو تو یہاں ہی بدلہ لے لے۔ چنانچہ وہ صحابی اٹھے اور کہا کہ فلاں موقع پر آپ نے چھڑی سے میرے بدن میں کونچ دیا تھا لہذا اس سے مجھے تکلیف ہوئی تھی، اس کا بدلہ لوں گا تو فرمایا کہ خوشی تم کو اجازت ہے تم بدلہ لے لو۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت میرے بدن پر کرتا نہیں تھا

اور آپ کرتا پہنے ہوئے ہیں، اس لئے آپ بھی اپنا کرتا اتاریئے تب بدلہ لوں گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فوراً کرتا اتار دیا اور فرمایا کہ تم کو اختیار ہے۔ انہوں نے بڑھ کر مہر نبوت کو چوم لیا اور کہا کہ میری کیا مجال تھی کہ بدلہ لیتا مگر میری بہت دنوں سے دلی خواہش تھی کہ مہر نبوت کو بوسہ دوں اس لئے ایسا کیا۔

اب ذرا غور فرمائیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کیسی شان تھی کہ ایک امتی سے اس طرح جھک کر معاملہ فرما رہے تھے۔ بیشک نبی کی یہی شان ہوتی ہے۔ ان کے خوف آخرت کا یہی حال ہوتا ہے۔ آپ یہی اسوۂ حسنہ چھوڑ کر ہم سے جدا ہوئے۔ ہم اس پر جب تک عمل پیرا ہوں گے عافیت میں رہیں گے اور جب اس کو چھوڑ دیں گے تو فساد و نزاع کے شکار ہو جائیں گے۔ جیسا کہ آج مشاہدہ ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ بحرمۃ سید النبی الاکرم صلی اللہ علیہ وسلم وعلیٰ آلہ اجمعین۔

اب تیسرا واقعہ سنئے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ابن سعنہ یہودی کا قرض دینا تھا، وہ تقاضا کے لئے آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کندھے کی چادر اتار لی اور کرتا پکڑ کر سختی سے بولا عبدالمطلب کی اولاد بڑی نادہند ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے جھڑکا اور سختی سے جواب دیا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم تبسم فرماتے رہے اس کے بعد عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ عمر! تم کو مجھ سے اور اس سے دوسری طرح سے برتاؤ کرنا چاہئے تھا۔ تم مجھ سے کہتے کہ ادائیگی ہونی چاہئے اور اس سے کہتے کہ تقاضا اچھے لفظوں میں کرنا چاہئے۔ پھر زید کو مخاطب کر کے فرمایا کہ ابھی تو وعدہ میں تین دن باقی ہیں۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ جاؤ اس کا قرض ادا کرو اور بیس صاع زیادہ بھی دینا کیونکہ تم نے اسے جھڑکا ہے۔

سبحان اللہ، کیسی تعلیم تھی اپنے اصحاب کو۔ جس کی وجہ سے حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اخلاق کے اعلیٰ مراتب پر پہونچے اور ان کے نفوس کا کامل تزکیہ ہوا۔

ان واقعات میں ہمارے لئے بہت ہی عبرت و نصیحت ہے کہ ہم کو بھی ایسے مواقع پر ایسا ہی معاملہ کرنا چاہئے اور اپنے لوگوں کو اسی قسم کی تعلیم کرنی چاہئے، اگر آج ان باتوں پر عمل ہو تو پھر اصلاح عالم ہو جائے اور دنیا جنت کا نمونہ بن جائے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق دے۔

سلف صالحین کے عادات و اخلاق

اسلاف اپنی ابتدائی اور انتہائی دونوں حالتوں میں نہایت خوف کھاتے رہتے تھے۔ ابتدائی حالت میں اپنے گناہ اور عذاب الہٰی کے خیال سے، اور انتہائی حالت میں اللہ تعالیٰ کے جلال اور تعظیم کے خیال سے، ان کے خوف کو ندامت دونوں حالتوں میں لازم تھی۔

حدیث میں آیا ہے، جناب رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پھوپھی صفیہ اور بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کرکے فرمایا

یا صفیة عمة رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) و یا فاطمة بنت محمد انقذا انفسکما من النار فانی لا اغنی عنکما من اللہ شیئاً

اے صفیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی اور اے فاطمہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی! تم دونوں اپنے آپ کو دوزخ سے بچاؤ۔ میں اللہ کے عذاب سے تم کو بچا نہیں سکتا۔

نیز حدیث میں وارد ہے کہ نیکی پرانی نہیں ہوتی اور گناہ ذہن سے نہیں اترتا اور منعم فنا نہیں ہوتا۔ تو جیسا چاہے کر، جیسا کرے گا بھرے گا۔

ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، چار چیزیں ہیں کہ آدمی جب ان میں زیادتی کرتا ہے تو اسے ہلاک کرتی ہیں۔ جماع، شکار، جوا، اور دیگر گناہ۔ ابو تراب بخشی فرماتے ہیں، جب انسان ترک معصیت کا مصمم ارادہ کرلے تو اللہ تعالیٰ کی امداد اسے ہر طرف سے پہنچتی ہے دل کے سیاہی کی علامت تین چیزیں ہیں، اول گناہ سے دل نہ گھبرائے۔ دوم اطاعت کی طرف رغبت

مائل نہ ہو۔ سوم وعظ کا اثر دل میں نہ ہو۔

ابو محمد مروزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، ابلیس پانچ خصائل کی وجہ سے بدبخت ہوا، اول اس نے اپنے گناہ کا اقرار نہ کیا۔ دوم وہ گناہ پر نادم بھی نہ ہوا۔ سوم نہ اس نے اپنے نفس کو ملامت کی۔ چہارم اور نہ استغفار کیا نہ توبہ کی۔ پنجم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمت سے مایوس ہو گیا۔ نیز فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے اس کے برعکس کیا اور پانچ خصائل کے باعث سعید ہو گئے۔ اول انہوں نے اپنے گناہ کا اقرار کیا، دوم گناہ پر ندامت اٹھائی، سوم اپنے نفس کو ملامت کیا، چہارم فی الفور توبہ کی، پنجم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہوئے۔

حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، جب تم کوئی قصور کرو تو جلد توبہ کر لو۔ اور لوگوں کے سامنے معذرت پیش نہ کرو، کیونکہ لوگوں کے سامنے معذرت گناہ سے بدتر ہے۔

احمد بن حرب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، کیا ابھی تک گنہگار کے لئے توبہ کا موقع نہیں آیا حالانکہ گناہ اعمال نامہ میں مرقوم ہے اور کل وہ قبر میں مصیبت زدہ ہوگا اور فرشتے آگ کی طرف لے جا رہے ہوں گے۔ حضرت جعفر بن محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، جس کو اللہ نے گناہ کی ذلت سے نکال لیا گویا اسے بغیر مال کے غنی کر دیا اور بغیر خاندان کے معزز گردانا اور بغیر آدمی کے اسے مانوس کر دیا۔

یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، دلوں کی صفائی گناہ سے پرہیز کے موافق ہوتی ہے۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، گناہ میں غرق ہونے کی علامت روزہ اور شب بیداری پر دل کا خوش نہ ہونا ہے۔ محمد واسع رحمۃ اللہ علیہ اپنے دوستوں کو فرمایا کرتے، ہم گناہ میں ڈوب چکے ہیں اگر تم گناہ کی بدبو معلوم کر سکو تو کوئی بھی میرے پاس نہ بیٹھے۔

کعب بن احبار رحمۃ اللہ علیہ ان ابراھیم لاواہ حلیم (ابراہیم نرم دل اور حلیم تھے) کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کہا کرتے، آگ میں گرنے سے پہلے بھی گریہ وزاری کرتا ہوں اور جس وقت نالہ مفید نہ ہوگا اس وقت سے پہلے بھی نالاں ہوں۔

حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے مجرموں کو دنیا اور آخرت میں ذلیل کرنے کا عہد کر لیا ہے۔ انسان رات میں کوئی گناہ بھی کرے صبح کو اس کے چہرے پر ذلت ہوتی ہے

عوام بن حوشب رح فرماتے ہیں، گناہ کے بعد چار چیزیں ایسی ہیں جو بری ہیں۔ اول ترک معصیت کے عزم کے بغیر توبہ کرنا، دوم اللہ سبحانہ و تعالے کے حکم پر مغرور ہونا، سوم گناہ کو بار بار کرنا، چہارم گناہ کے بعد نیک کام کرنے سے گناہ کی معافی پر خوش ہونا، حالانکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالے نیکی کے باعث گناہ معاف نہیں کرتا۔

سفیان بن عیینہ رحمۃ اللہ علیہ سے کسی نے دریافت کیا کہ فرشتے انسان کے خیال اور ارادے کو کیونکر لکھتے ہیں جو کہ ابھی عمل میں نہیں آتے؟ آپ نے فرمایا کہ کراماً کاتبین غیب نہیں جانتے لیکن انسان جب نیکی کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے منہ سے کستوری کی خوشبو آتی ہے تو وہ جانتے ہیں کہ اس نے نیکی کا قصد کیا ہے اور اگر برائی کا قصد کیا ہے تو اس سے بدبو آتی ہے تو جان لیتے ہیں کہ اس نے برا قصد کیا۔

میں کہتا ہوں، قصد سے اس جگہ مصمم ارادہ مراد ہے کہ حدیث اور قواعد شرعیہ کے مطابق ہو جاویں۔ واللہ اعلم۔

بشر حافی رح فرماتے ہیں، ہمنے ایسے لوگ دیکھے ہیں جن کے عمل پہاڑ جیسے تھے مگر پھر بھی وہ لوگ مغرور نہ تھے، اور تم ایسے ہو کہ تمہارے عمل کچھ بھی نہیں ہیں مگر پھر بھی تم مغرور ہو۔ اور تمہارے اقوال تو زاہدوں جیسے ہیں اور اعمال منافقوں جیسے۔ حاتم اصم رح فرماتے ہیں، اگر تم اللہ سبحانہ وتعالے کی نافرمانی کرو اور دیکھو کہ اس کے انعام برابر آرہے ہیں تو اس سے ڈرو کیونکہ یہ استدراج ہے، ہم نے اسلاف کو دیکھا ہے کہ صغائر کو اتنا بڑا جانتے تھے جتنا تم کبائر کو نہیں جانتے۔

ربیع بن خیثم رح عید الضحٰی میں جب قربانی کرتے تو فرماتے، تیری عزت اور جلال کی قسم اگر مجھے معلوم ہو کہ تیری خوشنودی اپنے کو ذبح کرنے میں ہے تو میں خود قربان ہو جاؤں۔

مروی ہے کہ کہمس بن حسن [illegible] چالیس سال تک متواتر روتے رہے [illegible] ایک بھائی نے اپنے ہمسایہ کی [illegible] [illegible] کئے تھے۔ [illegible] جب تم میں سے کسی شخص کا گناہ پرانا ہو جاتا ہے تو خیال کرتا ہے کہ گناہ معاف ہو گیا، یہ [illegible]

مروی ہے کہ داؤد علیہ [illegible] السلام کی طرف اللہ سبحانہ وتعالے [illegible] کہ

بنی اسرائیل کو کہدو کہ تمہیں کہاں سے معلوم ہوا کہ میں نے تمہارے گناہ معاف کر دیئے ہیں جو تم نے ندامت بھی چھوڑ دی۔ میری عزت اور جلال کی قسم میں ہر ایک کو قیامت کے دن گناہ دکھلاؤں گا۔

میں کہتا ہوں، گناہ دکھلانے سے شاید یہ مراد ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اسے گناہ پر مطلع کرے تاکہ اسے اپنا فضل دکھلائے، اس سے عدم مغفرت لازم نہیں آتی۔ واللہ اعلم۔

یزید بن میسری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں، میں نے ایک راہب سے کہا، تم نے سیاہ لباس کو سفید کے مقابلہ میں کیوں ترجیح دی؟ اس نے جواب دیا، کیونکہ یہ اہل مصیبت کا نشان ہے، اور ہم گناہ گار ہیں، اس سے بڑھ کر کوئی مصیبت نہیں۔

ایک دفعہ عتبہ غلام ایک مکان کے پاس سے گذرے تو کانپنے لگے، اور پسینہ آگیا، لوگوں نے اس کا باعث پوچھا تو آپ نے جواب دیا، یہ وہ جگہ ہے جہاں میں نے چھوٹی عمر میں گناہ کیا تھا۔ مالک بن دینار رح بصرہ سے پیدل چل کر حج کیا تو کسی نے آپ سے سوار ہونے کو کہا، آپ فرمانے لگے، کیا بھاگا ہوا نافرمان غلام آقا کے پاس پیدل آنا پسند نہیں کرتا۔ واللہ اگر میں انگاروں پر چل کر آتا تو بھی کم تھا۔ اے دوست! اگر گناہ دیرینہ ہو جائے تو استغفار سے غافل نہ ہو۔ گناہ کا تو مجھے یقین ہے لیکن مغفرت کا یقین نہیں، دن رات کثرت سے استغفار کرو۔ والحمد للہ رب العلمین۔

(ماخوذ از اخلاف سلف)

غزل

اوپر آپ نثر کی زبان میں بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاپگڈھی مدظلہ العالی کے ارشادات ملاحظہ فرما چکے ہیں، اب نظم کی زبان میں ان کے کچھ واردات دل کی کیفیت سے تھوڑی دیر کے لئے لذت اندوز ہوں۔

پنہاں تری فرقت میں قیامت کا اثر ہے — قربت میں منور مری ہر شام سحر ہے
صد شکر مجھ عاصی پہ تری خاص نظر ہے — اب شام مری شام، سحر میری سحر ہے
فرقت تری ہر وقت جسے پیش نظر ہے — بس اس کی زبان پر نہ اگر ہے نہ مگر ہے
کچھ اور نہیں، صرف یہ فیضان نظر ہے — جو ذرہ ناچیز تھا وہ رشک قمر ہے
تسلیم، کہ حاصل تجھے ہر علم و ہنر ہے — لیکن یہ بتا کچھ تجھے اپنی بھی خبر ہے
ساقی نے جسے جام محبت سے نوازا — دل اس کا ہے دل اور نظر اس کی نظر ہے
ہم خوف سے لرزاں ہیں، اور امید سے رقصاں — قرباں، یہ سب ان کی محبت کا اثر ہے
فیضان محبت ہے یہ فیضان محبت — اب میں ہوں، تری یاد ہے، اور دیدۂ تر ہے
میں ان کے سوا کس پہ فدا ہوں یہ بتا دے — لا مجھ کو دکھا، ان کی طرح کوئی اگر ہے

احمد کو ملے کیوں نہ غم عشق کی دولت
قسمت سے وہ محبوب کا منظور نظر ہے

غزل

بدل جائیں نہ کیوں آخر محبت کے اب افسانے — جو دیوانے تھے احمد ہوش میں وہ بھی لگے آنے
کرم سے ان کے جو شمع محبت کے تھے پروانے — پتہ ملتا نہیں ان کا کہاں ہیں اب خدا جانے
سنانے ہم لگے جس وقت جانبازوں کے افسانے — سر محفل لگے آخر سخن سازوں کو غش آنے

نہیں معلوم کیا انجام ہو اسکو خدا جانے — غضب ہے آج محفل میں نہ شمعیں ہیں نہ پروانے
سنائیں ہم کسے آخر محبت کے اب افسانے — الٰہی خیر ہو اپنے ہوئے جاتے ہیں بیگانے
جو محروم محبت ہیں غضب ہے کیا قیامت ہے — تری محفل سے اٹھ کر جا رہے ہیں دل کو بہلانے
محبت کی کسوٹی پر حقیقت ہو گئی عریاں — جو کہلاتے تھے دیوانے وہ نکلے ہائے فرزانے

نظر رکھتے ہوئے بھی جو ہیں محروم نظر احمد
وہ چاہے اور کچھ بھی ہوں، نہیں ہیں ترے دیوانے

(از جناب ڈاکٹر طفیل احمد مدنی لکچرر الٰہ آباد یونیورسٹی ۸۷ رمنہاجپور الٰہ آباد)

حسن کو مورد الزام نہ ہونے دیں گے — آبروئے عشق کی نیلام نہ ہونے دیں گے
حاصل زیست یہ شائستگی غم ہی تو ہے — اس کو ہم نذر مے و جام نہ ہونے دینگے
حرف آتا ہو کہیں عظمت غم پر جس سے — اہل غم ایسا کوئی کام نہ ہونے دیں گے
ہم وہ غیور ہیں جو جان تو دے دینگے ضرور — پر ترے نام کو بدنام نہ ہونے دیں گے
چھین لے جائے کوئی دولت ایمان و یقین — یہ تو اے گردش ایام نہ ہونے دیں گے
دل تو ہے جلوہ گہ حسن و جمال ازلی — اس کو ہم مسکن اصنام نہ ہونے دیں گے
جس کا پیغام محبت ہو چلو طے کر لیں — ایسی تحریک کو ناکام نہ ہونے دیں گے
آؤ اے دوستو اے ہم نفسو عہد کریں — ہم تشدد کو سر انجام نہ ہونے دیں گے
اے مری اردو زباں تجھ کو مٹا دے کوئی — یہ تو ہرگز ترے خدام نہ ہونے دیں گے

ان کی آنکھوں سے جو چھلکتی ہے مئے ناب طفیل
اس کو ہم دُرد تہ جام نہ ہونے دیں گے

نئی کتابیں

امام ابو حنیفہ اور مسئلہ قیاس مرتبہ: مولانا ابوبکر صاحب غازی پوری۔ صفحات ۹۰۔ کتابت و طباعت بہتر۔ پتہ:۔ المکتبۃ الاشرفیہ قاسمی منزل سید واڑہ غازی پور یوپی، قیمت درج نہیں۔

نئے مسائل میں اجتہاد و قیاس کے استعمال کے بارے میں چند افراد کو چھوڑ کر یہ اجماعی مسئلہ میں پوری امت کے درمیان کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا ہے۔ عام محدثین اور فقہاء کے علاوہ ائمہ اربعہ کا بھی اس پر اتفاق ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ تعالیٰ نے جو تفقہ فی الدین اور مومنانہ فراست عطا کی تھی اس کی بنا پر انہوں نے ائمہ میں سب سے زیادہ اجتہاد و استنباط سے کام لیا اور ان کے بعد ان کے شاگردوں کے اجتہاد و استنباط سے تمام فقہاء نے روشنی حاصل کی جس سے امت کے لئے زندگی کے تمام شعبوں کے مسائل میں شرعی حکم معلوم کرنے میں آسانی ہوئی۔ مگر بعض کوتاہ نظر اجتہاد و قیاس کی شرعی افادیت سے ناواقف ہیں، انہوں نے امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں کو اصحاب الرائے کہہ کر ہدف ملامت بنانے کی کوشش کی۔ مولانا ابوبکر صاحب غازی پوری ہو ماشاء اللہ کئی کتابوں کے مصنف ہیں، انہوں نے یہ رسالہ لکھ کر ان تمام غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کی کوشش کی ہے جو قیاس کے سلسلہ میں امام صاحب اور ان کے شاگردوں کے بارے میں پھیلائی جاتی ہیں۔ ہر صاحب علم کو اس رسالہ کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ البتہ اجتہاد اور رائے کی شرعی حیثیت کے بارے میں احادیث نبوی سے مزید استشہاد کی ضرورت تھی، اور یہ بھی واضح کرنے کی ضرورت تھی کہ اجتہاد و قیاس کا دارومدار رائے ہی پر ہے، اور اصحاب الرائے ہونا ان ائمہ کا کوئی عیب نہیں بلکہ ہنر ہے۔ نیز مصالح مرسلہ اور استصلاح کی مختصر وضاحت ہو گئی ہوتی تو قیاس و استحسان سے اس کی مماثلت کا بھی پتہ چل جاتا۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ قیاس میں امام صاحب کے ساتھ تمام

ائمہ شریک ہیں صرف اصطلاحات کا فرق ہے، نیز قیاس و استحسان سے اجتہاد کی نسبت پر بھی گفتگو کی ضرورت تھی۔ امام بزدوی نے کشف الاسرار میں لکھا ہے کہ ماخذ شریعت قیاس نہیں اجتہاد ہے۔ قیاس تو اجتہاد کا ایک وسیلہ [illegible] ہے [illegible] استحسان اور مصالح مرسلہ وغیرہ اس کا ذریعہ ہیں۔

دفع الہفوات برفع الایدی فی الدعوات | از مولانا ظفر احمد صاحب صدیقی۔ صفحات ۱۰۴۔ کتابت و طباعت بہتر۔

پتہ:- ملاٹولہ شہر جونپور (یوپی)۔ قیمت درج نہیں۔

مولانا ظفر احمد صاحب جونپوری مولانا کرامت علی جونپوری رحمۃ اللہ علیہ کے احفاد میں ہیں۔ مولانا کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ اس سے پہلے مولانا مفتاح الجنۃ پر تحقیقی حواشی لکھ کر اہل علم سے تحسین وصول کر چکے ہیں۔ یہ کتاب جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے لکھی گئی ہے کہ فرض و سنت نمازوں کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا کرنا سنت ہے۔ جو لوگ اس کو خلاف سنت بدعت کہتے ہیں انہوں نے اس سلسلہ کی تمام حدیثوں پر غور نہیں کیا ہے۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے اس سلسلہ میں اتنی دیدہ ریزی اور تحقیق کے ساتھ اس مسئلہ کے ہر پہلو پر جامع بحث کی ہے کہ اب اس سے زیادہ ممکن نہیں ہے۔ اگر مسئلہ کو غور سے ملاحظہ کیا جائے تو پھر نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا [illegible] کو خلاف سنت کہنا صحیح نہ ہوگا بلکہ دعا میں تاثیر پیدا کرنے کے لئے یہ انتہائی ضروری ہے۔ یہ کتاب ہر صاحب علم کے مطالعہ کے لائق ہے۔ اس کا خلاصہ اگر عربی زبان میں آ جاتا تو بہت اچھا ہوتا۔ عرب ان میں عام طور پر نماز کے بعد ہاتھ نہ اٹھانے کا رواج ہے اور وہ اسی کو سنت سمجھنے لگے ہیں۔ ممکن ہے کہ اس سے ان کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

[illegible] | از جناب محمد سلیمان صاحب عرف ابن عبد الشکور۔ صفحات ۱۴۰۔ کتابت و طباعت بہتر۔ پتہ:- عارف پبلشرز ۹۵ اردو ہال روڈ بنگلور۔ کرناٹک۔ قیمت [illegible]

ابن عبد الشکور [illegible] کتاب [illegible] مدارس کے حالات [illegible] لکھے ہیں۔ حضرت [illegible] اس کتاب کی افادیت [illegible] ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب [illegible] جائے گی۔

کوائف جامعۃ الرشاد

جامعۃ الرشاد نے اپنی عمر کے بیس سال طے کر لئے اور بحمد اللہ اب اس نے بڑی کامیابی کیساتھ اکیسویں سال میں قدم رکھدیا ہے۔ اتنی مختصر مدت میں کسی ظاہری سہارے اور کسی جماعت یا کسی برادری کی عصبیت کے بغیر ملک کے اندر اور ملک کے باہر خدائے قدوس نے اس کو جو مقام عطا کیا ہے وہ ہمارے لئے لائق صد شکر ہے۔ اس سے پہلے ذکر آچکا ہے کہ "ندوۃ الشباب الاسلامی" کیطرف سے کتابوں کے کئی بنڈل مدرسہ کو موصول ہو چکے ہیں۔ بحمد اللہ رمضان المبارک میں "دار الافتاء والدعوۃ والارشاد" ریاض کیطرف سے چھ بنڈل بہت قیمتی کتابیں مدرسہ کو موصول ہوئیں۔ جن میں مبارک بن محمد ابن اثیر الجزری متوفی ۶۰۶ھ کی نایاب کتاب "جامع الاصول" کی گیارہ جلدیں۔ شیخ احمد بن قدامہ متوفی ۶۲۰ھ کی "المغنی" نو جلدیں۔ امام ابن تیمیہ متوفی ۷۲۸ھ کے مکمل فتاویٰ ۳۷ جلدیں۔ شیخ ابن حجر عسقلانی متوفی ۸۵۲ھ کی فتح الباری کی ۱۳ جلدیں، صحیح مسلم نووی کی شرح کے ساتھ ۹ جلدیں، ابن خزیمہ متوفی ۳۱۱ھ کی صحیح ابن خزیمہ کی ۴ جلدیں ان کے علاوہ دو درجن اور کتابیں شامل ہیں جن کی مجموعی تعداد سو سے زیادہ ہے۔ ہم اس کے لئے محترم شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ بن باز کے مشکور ہیں کہ جامعۃ الرشاد کے ایک طالب علم جو اس وقت مدینہ یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں، کے کہنے پر انہوں نے یہ کتابیں بھیج دیں۔ اسی کے ساتھ ہم برادر محترم تقی الدین صاحب ندوی مظاہری کے بھی مشکور ہیں کہ ان کی کوششوں سے مدد کیلئے اللہ تعالیٰ نے کچھ اچھی صورتیں پیدا کردی ہیں، اللہ تعالیٰ نے اگر دستگیری فرمائی تو امید ہے کہ اب اردو کے ساتھ الرشاد کا عربی شمارہ بھی دو ماہ کے اندر نکل آئے گا۔ فی الحال عربی پرچہ سہ ماہی نکلے گا۔

اس سال بھی دو طالبعلموں کی درخواستیں مدینہ یونیورسٹی بھیجی گئی ہیں، انکی منظوری کا انتظار ہے۔

اہل کتاب صحابہ و تابعین
مرتبہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی

اس کتاب میں ان صحابہ اور تابعین کا تذکرہ ہے، جو یہودی یا عیسائی تھے اور انہوں نے اسلام قبول کیا۔ اس کتاب میں تقریباً سو صفحے کا ایک قیمتی مقدمہ بھی ہے جس سے عرب کے یہود و نصاریٰ کی پوری تاریخ سامنے آجاتی ہے۔

اس پر مولانا عبدالماجد دریا بادی مرحوم کا دیباچہ بھی ہے اس موضوع پر دنیا کی کسی زبان میں کوئی مکمل کتاب موجود نہیں ہے۔

خطبۂ نکاح
نکاح کے موقع پر جو خطبہ دیا جاتا ہے وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے اور وہ ایک اہم معاشرتی ہدایت اور اصلاح معاشرہ کا پیغام ہے۔ مگر عام طور پر اس کے الفاظ دہرا دیے جاتے ہیں اس کا پورا مفہوم لوگوں کے ذہن نشین نہیں ہو پاتا ہے، اس کتابچہ میں اس کے ایک ایک لفظ کی ایسی موثر تشریح کی گئی ہے کہ یہ ہر نکاح کے موقع پر تقسیم کرنے کے قابل ہے۔ یہ تشریح مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی کے قلم سے ہے صفحات قیمت ۱۰/

اہل دل کی باتیں
یہ بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی مدظلہ کے ان ملفوظات کا مجموعہ ہے جو وہ اپنی نجی مجلسوں میں اپنی پر اثر اور پرسوز زبان سے فرماتے رہے ہیں۔ اسے مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد نے مرتب کیا ہے اس کا بہت سا حصہ ماہنامہ الفرقان میں بھی شائع ہو چکا ہے۔ اب یہ جواہر پارے کتابی شکل میں دار التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد کی طرف سے شائع کیے جا رہے ہیں،

فقہ اسلامی اور دور جدید کے مسائل
یہ محترم ناظم جامعۃ الرشاد کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو معارف اعظم گڈھ میں شائع ہو چکے ہیں یا مختلف سیمناروں میں پڑھے گئے ہیں جس میں جدید مسائل کے حل کیلئے وہ بنیادیں فراہم کی گئی ہیں جنکی روشنی میں جدید سے جدید مسائل حل کئے جا سکتے ہیں، یہ کتاب جامعہ ملیہ نئی دلی سے شائع ہوئی ہے اور اس پر اردو اکیڈمی میں مصنف کو انعام بھی دیا ہے۔ قیمت ۔۔/

ملنے کا پتہ

شکیل احمد منیجر مکتبہ جامعۃ الرشاد سرشاد نگر اعظم گڈھ (یوپی)۔

Reg. No 3393/81 U.P.RI Phone 461
MONTHLY- JAMEATUR RASHAD
Agamgarh U.P.

ماہنامہ
اعظم گڑھ
الرشاد

دارالتالیف والترجمہ کی تصانیف

عبادت و خدمت

مرتبہ مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

اس رسالہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اسلام میں عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے اور عام انسانوں کی خدمت بھی عبادت ہے اور اس پر اسی طرح اجر و ثواب ملتا ہے جس طرح فرض عبادات کے اہتمام کے ساتھ ہمارے اندر عام انسانوں کی خدمت کا جذبہ بھی پیدا ہو جائے تو نفرت و حقارت کے بہت دبیز پردے ہٹ جائیں گے۔ اور اسلام سے عام انسانوں کے دلوں میں ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ سائز ۲۰×۱۸ صفحات ۵۰ قیمت پچاس پیسے

دینی مدارس اور انکی ذمہ داریاں

یہ محترم مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی ناظم جامعۃ الرشاد کی انکی تقریروں اور تحریروں کا مجموعہ ہے جو وہ طلب اساتذہ، منتظمین مدارس اور عربی مدارس کے ذمہ داروں کے سامنے کرتے رہے ہیں یہ تقریریں اور تحریریں درد و اثر میں ڈوبی ہوتی ہیں۔ ان میں بعض تقریروں کو محترم مولانا محمد منظور صاحب نعمانی مدظلہ نے اپنے تائیدی نوٹ کے ساتھ الفرقان میں شائع فرمایا اور شیخ الحدیث حضرت مولانا ذکریا صاحب مدظلہ العالی نے ایک بڑے مجمع میں پڑھوا کر سنوایا اور فرمایا کہ اسے ہر استاذ اور طالب علم کو پڑھنا چاہیئے۔ سائز ۲۲×۱۸ صفحات ۱۰۰ قیمت بلعہ

اسلامی تعلیم

حصہ اول، دوم، سوم، چہارم

بچوں کو اسلامی مسائل ذہن نشین کرانے کیلئے اردو زبان میں درجنوں رسالے لکھے گئے ہیں۔ مگر اس رسالہ کا انداز بیان اتنا دلچسپ ہے اور مسائل ایسے آسان طریقہ سے سمجھایا گیا ہے کہ بچے اسے قصہ کہانی کی کتاب کیطرح دلچسپی و شوق سے پڑھتے ہیں۔ چار حصوں میں تمام ضروری مسائل آگئے ہیں۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶

قیمت حصہ اول ۲؍ دوم ۵؍ سوم ۲؍ چہارم ۲؍

تبع تابعین حصہ اول

مرتب مولانا حافظ مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ

کتاب میں ۱۹ اکابر تابعین کا مفصل تذکرہ ہے، شروع میں مصنف کے قلم سے ایک فاضلانہ مقدمہ بھی ہے جس سے اسلام کی ابتدائی دو صدی کے دینی تہذیبی اور سیاسی تاریخ کا ایسا خاکہ سامنے آجاتا ہے کہ اس کی روشنی میں صحیح اسلامی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے اس کتاب کا پہلا ایڈیشن دارالمصنفین سے شائع ہوا تھا۔ ملنے کا پتہ:۔ **تشکیل احمد منیجر جامعۃ الرشاد۔ رشاد نگر اعظم گڈھ یوپی**

مولوی مجیب اللہ ندوی پرنٹر پبلشر وایڈیٹر نے نشاط پریس ٹانڈہ میں چھپوا کر دفتر جامعۃ الرشاد۔ رشاد نگر اعظم گڈھ سے شائع کیا

جلد (۲) | ستمبر ۱۹۸۲ء مطابق ذوالحجہ ۱۴۰۲ھ | شمارہ (۳)

فہرست مضامین

مجلس ادارت

مطبوعہ ناظر پریس ٹانڈہ فیض آباد

ہندوستان کے مسلمانوں کے اندر دینی حمیت وغیرت کا جو بے پایاں جذبہ ہمارے بزرگوں نے پیدا کردیا ہے، اسی کا اثر ہے کہ وہ دین اور علم دین کے تحفظ و بقا کیلئے جتنی جد و جہد کرتے ہیں اور اپنی غربت کے باوجود اس کے لئے جتنا پیسہ خرچ کرتے ہیں، اس کی مثال دنیا کے کسی اسلامی ملک کے مسلمان پیش نہیں کر سکتے، مشکل سے کوئی مسلمان بستی ایسی ہوگی جہاں انھوں نے بچوں کی ابتدائی دینی تعلیم کے لئے کوئی نہ کوئی مکتب نہ کھول رکھا ہو، اور کوئی قصبہ، شہر اور بڑی آبادی ایسی نہیں ہوگی جہاں انہوں نے متوسط یا اعلیٰ دینی تعلیم کے لئے مدارس نہ کھول رکھے ہوں۔ اور ان ہزاروں مکاتب اور سیکڑوں مدارس کا پورا خرچ یہاں کے مسلمان برداشت کرتے ہیں۔ پھر ان مدارس اور مکاتب کے علاوہ ان کے سیکڑوں تصنیفی اور اشاعتی ادارے ہیں جو دین اور علم دین کی ترویج و ترقی کا اتنا وسیع کام کر رہے ہیں کہ دوسرے اسلامی ملکوں میں روپیہ پیسہ کی ریل پیل کے باوجود اتنا کام نہیں ہو رہا ہے۔ خاص کر قرآن و حدیث اور سیرت نبوی وغیرہ پر جتنا ذخیرہ ہندوستان نے فراہم کیا ہے اتنا کسی اسلامی ملک نے نہیں کیا ہے۔

۱۹۵۹ء میں جب یوپی میں جبری تعلیم کا غلغلہ بلند ہوا اور دینی تعلیمی کونسل کا وجود عمل میں آیا اور اس نے آزاد، خودکفیل اور معیاری مکاتب کے کھولنے کی اسکیم پیش کی تو "قومی آواز" کے اس وقت کے ایڈیٹر حیات اللہ انصاری صاحب نے اپنے کمرے میں بیٹھ کر حساب کتاب لگا کر لکھا کہ "اس اسکیم کے چلانے پر صرف یوپی کے مسلمانوں کا کم از کم تین کروڑ روپیہ سالانہ صرف ہوگا اور اتنی بڑی رقم کا ان کی جیب سے نکل جانا ان کی معاشی تباہی کا پیش خیمہ بنے گی، اس لئے مسلمانوں کو یا تو گورنمنٹ کے منظور شدہ اسکولوں میں اپنے بچوں کو بھیجنا چاہئے، یا پھر جو مکاتب قائم ہیں یا قائم کئے جائیں ان کو گورنمنٹ سے منظور کرا لینا اور ایڈ کرا لینا چاہئے۔"

انصاری صاحب نے اسکو اتنے بھیانک انداز میں پیش کیا کہ بعض کمزور دل لوگوں کا کلیجہ دہلنے لگا، مگر عام مسلمانوں نے اس کا کوئی اثر نہیں لیا، اور انہوں نے آزاد، خودکفیل اور معیاری مکاتب اور مدارس

کھولنے اور چلانے کا کام برابر جاری رکھا، اور بحمد اللہ نہ وہ معاشی پستی میں مبتلا ہوئے اور نہ ان کے عزم و ارادے میں کوئی تزلزل آیا، بلکہ مختلف اسباب کی بنا پر اس کام کی برکت سے بیس برس میں مسلمانوں نے جتنی معاشی ترقی کی ہے اتنی نصف صدی میں بھی نہیں کی تھی۔

مدارس و مکاتب کے اس وسیع نظام کے ساتھ ہندوستان کے مسلمانوں کا دوسرا بڑا کارنامہ یہاں کا وہ دعوتی و تبلیغی نظام ہے جو ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے، آج ہندوستان کے لاکھوں غریب مسلمان اپنی گاڑھی کمائی کا پیسہ خرچ کر کے نہ صرف ہندوستان کے مختلف حصوں میں دعوت و تبلیغ کیلئے در در پھر رہے ہیں، بلکہ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں ہندوستان کے مسلمان کا وفد نہ پہنچا ہو، اور یورپ اور ساؤتھ ایسٹ ایشیا کے بعض ملکوں میں تو انہوں نے انقلابی کام کیا ہے، اور خود ملک کے اندر اس کے اثرات ہر جگہ دیکھے جا سکتے ہیں،

ہندوستان کے مسلمانوں کے ان دونوں کاموں کو جتنا بھی سراہا جائے وہ کم ہے، مگر اسی کے ساتھ یہاں کے مسلمانوں میں دو ایسی خرابیاں بھی ہیں جن کی وجہ سے ان کاموں کے جتنے اثرات عوام و خواص پر پڑنے چاہئیں وہ نہیں پڑ رہے ہیں، ———— ایک خرابی تو یہ ہے کہ مسلمانوں میں جو جماعتیں دعوت و تبلیغ کا کام کر رہی ہیں اور جو مدارس دین اور علم کی ترویج و ترقی کا کام کر رہے ہیں، ان میں آپس میں ہی نہیں کہ کوئی اتحاد و توافق نہیں ہے بلکہ ان میں ایک طرح کا ذہنی بعد بھی ہے۔ یہی حال ان مدارس کے پڑھے ہوئے طلبہ اور اساتذہ اور فارغ علماء کا ہے، اس بنا پر ان مدارس کا یا ہمارے علماء کا عوام پر اثر نکاح و طلاق یا روزہ نماز کے انفرادی مسائل تک محدود ہے، اور انہی میں وہ ان سے رہنمائی طلب کرتے ہیں، مگر اپنے اور کسی اجتماعی مسئلہ میں نہ تو وہ ان کی طرف رجوع کرتے ہیں اور نہ انکی کوئی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے اجتماعی مسائل میں علماء اور اہل مدارس کا فیصلہ کچھ ہوتا ہے اور عوام کا کچھ، اور کبھی کبھی یہ چیز دونوں کے درمیان کشمکش کا سبب بھی بن جاتی ہے، اور عوام ان کے آداب و احترام کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیتے ہیں، اور ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ علماء اپنا وقار بچانے کے لئے ان کے غلط فیصلوں کا ساتھ دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اگر ان کے اندر اتحاد و توافق کی کوئی صورت پیدا ہو جائے تو یقیناً یہ صورت بدل جائے گی، اور مسلمانوں کے اجتماعی مسائل میں ان کی رائے بے وزن نہ ہوگی،

دوسری خرابی وہ بدعات و خرافات ہیں جو ہندوستان کے ایک بڑے طبقے کے اندر سرایت کر گئی ہیں چونکہ

صحیح موحدانہ زندگی کے مقابلہ میں ان کے مظاہر ہر جگہ نظر آتے ہیں اس لئے اسلامی ملکوں کے لوگوں کے ذہنوں میں عام طور پر یہ خیال بیٹھ گیا ہے کہ ہندوستان کے مشرکانہ ماحول کے مسلمان بھی ان سے متاثر ہیں، اور کم سے کم وہ ان کو خرافی قسم کا مسلمان تو ضرور ہی سمجھتے ہیں، اور اس کے پھیلانے میں یہاں کے ایک خاص مسلک کے علماء کا ہاتھ بھی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہاں کے مسلمانوں میں جہالت کی وجہ سے بدعات وخرافات یقیناً بہت زیادہ ہیں اور ہم کو اس کی اصلاح کے لئے حکمت وموعظت کے ساتھ (مناظرانہ اور جارحانہ انداز سے نہیں) کوشش برابر جاری رکھنی چاہئے، مگر بحمداللہ خالص توحید کے ماننے والوں کی بھی یہاں کمی نہیں ہے، عرب ملکوں کی توحید صرف عقیدہ کے حد تک ہے "اسوۂ نبوی" کی پرکیف جھلک جو توحید خالص کو جانچنے کا سب سے بڑا معیار ہے، ان کی زندگی میں کم ہی دکھائی دیتی ہے، بلکہ ان کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی اس کے برعکس نظر آتی ہے، مگر ہندوستان میں توحید خالص کے ماننے والوں کی توحید صرف عقیدہ تک محدود نہیں ہے، بلکہ اس میں اسوۂ نبوی کی پرمحبت جھلک بھی دکھائی دیتی ہے اور جس حد تک انہیں آزادی ہے اس کے مظاہر ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہر جگہ دیکھے جا سکتے ہیں، اور جن معاملات میں انھیں آزادی نہیں ہے، اس کے لئے وہ برابر جدوجہد کر رہے ہیں۔

ہندوستان کے مسلمانوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ خصوصی انعام ہے، اس کے لئے ہم سراپا امتنان وتشکر ہیں، اور اس کی بارگاہ میں دعا کرتے ہیں کہ وہ ہماری اس کمی کو دور کر دے جس سے ہماری موحدانہ زندگی پر دنیا وآخرت میں حرف آوے، آمین !!

جامعۃ الرشاد کا کتب خانہ بحمداللہ جامعۃ الرشاد کے کتب خانہ میں پہلے سے ہر فن کی اہم کتابیں موجود ہیں، ادھر دو برس کے اندر اسمیں بڑے قیمتی اضافے ہوئے ہیں، اس سے پہلے ندوۃ الشباب الاسلامی اور ادارۃ الافتاء والدعوۃ والارشاد کی طرف سے کئی سو اہم کتابیں موصول ہوئی ہیں (انکا ذکر الرشاد کے صفحات میں آچکا ہے)۔ اس ماہ محترمہ سلمہ شکیل سلمہا نے الہ آباد سے کئی سو کتابیں اور رسائل کی جلدیں عنایت کی ہیں جنمیں لغات القرآن اور تفسیر مظہری کی جلدیں شامل ہیں۔ اس عطیہ کیلئے ہم انکے تہ دل سے مشکور ہیں، دارالافتاء ریاض کی طرف سے جو کتابیں موصول ہوئی ہیں انمیں ثلاث رسائل فی الصلوۃ مصنفہ شیخ عبدالعزیز بن عبداللہ ابن باز اور القرأت للماموم مع الفصل فی بعد الجمعہ مؤلفہ محمد عبدالسلام۔ ان تمام رسالوں پر انشاء اللہ آئندہ

امام اوزاعیؒ

(مجیب اللہ ندوی)

امام اوزاعی ان ائمہ تبع تابعین میں ہیں، جن کا شمار دوسری صدی کے ممتاز مجتہدین مثلاً امام ابوحنیفہ، امام مالک، سفیان ثوری وغیرہ کے زمرہ میں ہوتا ہے، ان کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ دوسری صدی ہجری میں فقہ و حدیث کے جو مکاتب فکر پیدا ہوئے ان میں ایک کے بانی یہ امام اوزاعی بھی ہیں، انہوں نے تقریباً پوری زندگی شام میں بسر کی، اس لئے زیادہ تر یہیں ان کے مسلک و فتاوے کی ترویج و اشاعت ہوئی اور یہیں سے یہ مسلک اندلس میں پہنچا۔

شام بنوامیہ کا سب سے بڑا سیاسی مرکز تھا، اس لئے اموی حکومت پر بھی ان کے علم و فضل اور فقہ و فتاوے کا اثر پڑا تھا، غالباً اسی وجہ سے حکومت نے ان کے سامنے عہدۂ قضا پیش کیا، مگر انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

سنہ ۱۳۲ھ میں جب مشرق سے بنوامیہ کا سیاسی اقتدار ختم ہوا تو اس خاندان کے بعض حوصلہ مند افراد مغرب اقصیٰ پہنچے اور اندلس کی حکومت میں ایک نئی جان ڈالی، ان ہی کے ذریعہ امام اوزاعی کا مسلک اندلس آیا، اور ایک مدت تک اس پر اہل اندلس کا عمل رہا، شام میں تقریباً دو صدی تک اور اندلس میں تقریباً ایک صدی یعنی حاکم بن ہشام متوفی سنہ ۲۵۶ھ کے عہد تک یہ مسلک زندہ رہا، اس کے بعد مشرق میں حنفی و شافعی اور مغرب میں مالکی و حنبلی مسلکوں نے اس کی جگہ لے لی اور بالآخر آہستہ آہستہ اس مسلک پر تعامل ختم ہو گیا۔ فقہ و حدیث کی کتابوں میں اب بھی ان کے مجتہدات کا ذکر ملتا ہو، ان کے سوانح حیات کی پوری تفصیل ملاحظہ ہو۔

ابتدائی حالات امام اوزاعی کا نسبی تعلق یمن کے قبیلہ بنو ہمدان یا بنو حمیر سے تھا، مگر ان کا خاندان

وہاں سے ترک وطن کرکے شام چلا آیا، اور یہاں دمشق کے قریب ایک بستی اوزاع[1] میں بود باش اختیار کرلی، اسی نسبت سے ان کو اوزاعی کہا جاتا ہے۔

بچپن کا نام عبدالعزیز تھا، بعد میں انہوں نے اسے تبدیل کرکے عبدالرحمٰن رکھا اور اسی نام سے وہ مشہور ہیں، ان کی کنیت ابوعمرو اور والد کا نام ابوعمرو[2] تھا۔

شام کے مشہور شہر بعلبک میں ۸۸ھ میں ان کی ولادت ہوئی، ابھی بچے ہی تھے کہ سر سے والد کا سایہ اٹھ گیا، اور یہ یتیم ہو گئے، ماں نے نہ جانے کن کن مصیبتوں اور تکلیفوں کے ساتھ ان کی پرورش کی، حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ان کا نشو و نما کسی ایک جگہ نہیں ہوا، بلکہ ان کی والدہ (غالباً معاشی پریشانیوں کی وجہ سے) ان کو شہر بہ شہر لیئے پھرتی تھیں، بہت دنوں تک ادھر ادھر کی خاک چھاننے کے بعد خدا نے نہ جانے کیا صورت پیدا کر دی کہ بیروت میں قیام پذیر ہو گئیں،

امام ذہبی نے لکھا ہے کہ ان کی ولادت بعلبک میں ہوئی اور پرورش کرک[3] میں ہوئی، اس کے بعد ان کی والدہ ان کو کرک سے لے کر بیروت چلی آئیں اور یہیں اقامت گزیں ہو گئیں[4]، بہرحال بیروت پہنچنے کے بعد غالباً ان کو کچھ اطمینان نصیب ہوا تو ان کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا،

ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت اور بچپن کے دوسرے حالات و کوائف کا ذکر تذکروں میں بہت ہی کم بلکہ قریب قریب نہیں ملتا ہے، اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے۔

جو بچے خوشحال اور فارغ البال گھرانوں میں پیدا ہوتے ہیں یا کم از کم ان کو اپنے والدین کا

---

[1] بعض ارباب تذکرہ نے لکھا ہے کہ اوزاع یمن کے قبیلہ ذوالکلاع کی ایک شاخ کا نام ہے، یمن سے ترک وطن کرکے جب یہ لوگ شام آئے تو جہاں یہ آباد ہوئے اسی کا نام اوزاع پڑ گیا، مگر میں نے سمعانی کے بیان کو ترجیح دی ہے، حافظ ذہبی نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ اصلہ من سبی السند ان کا خاندانی تعلق سندھ سے تھا، اس اعتبار سے ان کو ہندوستانی کہنا چاہیئے مگر راقم کو اس بیان پر شک ہے اس لئے کہ اس کی تائید کسی دوسرے بیان سے نہیں ہوتی، راقم نے اس کی تردید میں ایک مفصل مضمون لکھا ہے جو معارف اپریل ۶۶ء میں چھپ گیا ہے، جو لوگ اس کی تفصیل چاہتے ہوں وہ مضمون دیکھ لیں [2] ابن خلکان ج ا ص ۲۹۴ سمعانی لفظ اوزاعی [3] دمشق کے پاس ایک گاؤں تھا اس نام کے دوسرے مقامات بھی ہیں [4] ابن خلکان ج ا ص ۲۹۲ حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ انہوں نے آخری عمر میں بیروت میں سکونت اختیار کرلی تھی، مگر دوسرے تذکرہ نگاروں نے وہی لکھا ہے جس کو میں نے اختیار کیا ہے۔

سایۂ عاطفت ہی نصیب ہوتا ہے، ان کا بچپن ایک خاص نہج سے گزرتا ہے، ان کی تعلیم ایک خاص نظم و ترتیب اور تربیت ایک خاص معیار کے مطابق ہوتی ہے۔ ایسے بچے آگے چل کر جب کسی کمالِ حیثیت کے مالک ہوتے ہیں تو ان کے بچپن اور تعلیم و تربیت کے واقعات سینکڑوں آدمیوں کو یاد ہوتے ہیں، اس لئے سوانح نگاروں کو ان کے ابتدائی حالات معلوم کرنے میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی، مگر امام اوزاعی اس طرح کی تمام نعمتوں سے محروم تھے، نہ تو وہ کسی خوشحال گھرانے میں پیدا ہوئے نہ ان کے والد کا سایہ ان کے سر پر تھا، حتیٰ کہ سن شعور تک کسی ایک جگہ رہنا بھی نصیب نہیں ہوا، ان کی ولادت کہیں ہوئی بچپن کسی اور جگہ گزرا، اور جوانی کے ایام کہیں اور بسر ہوئے، ایسی صورت میں ان کے بچپن کے حالات اور تعلیم و تربیت کے ابتدائی واقعات پردۂ اخفا میں ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔

تعلیم اور اساتذہ

مگر اس کے باوجود ان کی انشا پردازی، فصاحت و بلاغت اور تحریر و تقریر کی بے پناہ قوت و صلاحیت سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ایسے ماحول اور ایسے اساتذہ کی صحبت میں ہوئی جو اپنی حیثیتوں سے ممتاز تھے،

اہل تذکرہ نے ان کے زمانہ طالب علمی کے جو دو ایک واقعے بیان کئے ہیں، اور ان کے جن اساتذہ کا ذکر کیا ہے، ہم اسے یہاں نقل کرتے ہیں۔

اوپر ذکر آچکا ہے کہ یہ اپنی والدہ کے ساتھ بیروت میں سکونت پذیر ہو گئے تھے، یہ بیروت ہی میں تھے کہ ایک بار ان کو یمامہ جانے کا اتفاق ہوا۔ یمامہ میں اس وقت ممتاز محدث یحییٰ بن کثیر کی مجلس درس برپا تھی، اس میں شریک ہونے لگے، ان کو یحییٰ کی مجلس ایسی پسند آئی کہ انہی کے ہو رہے کچھ دنوں کے بعد (غالباً ان کی صلاحیت کے اندازے کے بعد) استاذ نے ہدایت کی کہ وہ بصرہ جاکر محمد بن سیرین اور شیخ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہما سے سماع حدیث کریں۔ استاذ کے حکم کے بموجب وہ بصرہ روانہ ہو گئے، مگر یمامہ سے بصرہ پہنچنا کچھ آسان نہ تھا، یمامہ اور بصرہ کے درمیان کئی سو میل کی مسافت پھر امام اوزاعی کو نہ تو سواری میسر تھی اور نہ بھرپور زادِ راہ، نہ جانے وہ کس کس طرح اور کتنے دنوں میں افتاں و خیزاں بصرہ پہنچے، وہاں پہنچتے ہی یہ اندوہناک خبر ملی کہ جن بزرگوں سے سماع حدیث کے لئے وہ اتنی دور سے پا پیادہ آئے ہیں، ان میں سے ایک یعنی امام حسن بصری واصل بحق ہو چکے

اور دوسرے امام محمد بن سیرین صاحب فراش ہیں، اس خبر سے جو ان کو رنج ہوا ہوگا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، مگر سوائے صبر کے چارہ کار کیا تھا،

وہ ابن سیرین کی خدمت میں پہنچے تو دیکھا کہ وہ بستر مرگ پر پڑے ہیں، ایسی حالت میں وہ سماع حدیث سے تو بہرہ مند نہیں ہو سکتے تھے، اس لیے انھوں نے اپنی سعادت اسی میں سمجھی کہ جو مہلت بھی میسر ہے اس میں حضرت ابن سیرین کی خدمت میں حاضر ہو جایا کریں، چنانچہ وہ جب تک وہاں رہے برابر ان کی عیادت کے لئے جاتے رہے، ممکن ہے اس اثنا میں انہوں نے ان سے کوئی زبانی حدیث سنی ہو جیسا کہ بعض تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے، مگر عام ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ ان کو محمد بن سیرین سے سماع حدیث حاصل نہیں ہے (البدایہ و النہایہ)

انہوں نے تابعین کی ایک کثیر تعداد سے حدیث نبوی کی سماعت کی ہے، حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے،

ادرک خلقاً من التابعین — تابعین کی ایک کثیر تعداد کی انھوں نے صحبت اٹھائی ہے

(البدایہ ج ۱۰ ص ۱۱۶)

اہل تذکرہ نے ان کے جن اساتذہ کا ذکر کیا ہے، ان میں سے چند ممتاز تابعین اور تبع تابعین کے نام یہ ہیں۔

عطا بن ابی رباح، قتادہ، نافع مولی ابن عمر، امام زہری، محمد بن ابراہیم، شداد بن ابی عمار، قاسم بن مخیمرہ، ربیعہ بن یزید وغیرہ،

امام زہری اور یحییٰ بن کثیر کے بارے میں امام اوزاعی کا خود بیان ہے کہ ان دونوں اماموں نے (غالباً زبانی سماع حدیث کے بعد) مجھے اپنے اپنے صحیفے (جن میں ان کی مرویات لکھی ہوئی تھیں) دیئے اور فرمایا کہ

اروها عنی — میرے واسطے سے تم اس کی روایت کرو

یعقوب بن شیبہ نے یحییٰ بن معین کا قول نقل کیا ہے کہ وہ امام زہری سے امام اوزاعی کی روایت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، مگر ابن شیبہ ....
.... یہ قول نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

"امام زہری سے امام اوزاعی کی روایت ایک خاص چیز ہے"[1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن شیبہ نے ابن معین کی اس رائے کو قبول نہیں کیا ہے۔

درس وافتاء بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ یہ تیرہ برس کی عمر میں مسند درس وافتا پر بیٹھ گئے تھے مگر اس روایت میں یا تو مبالغہ ہے یا غلط فہمی کی بنا پر عمر غلط درج ہوگئی ہے ہو حافظ ابن کثیر نے لکھی ہے کہ ۱۱۳ھ سے جب کہ ان کی عمر پچیس برس کی تھی، انہوں نے فتوی دینا شروع کر دیا تھا، یہ تو پتہ نہیں چلتا کہ انہوں نے باقاعدہ اپنی کوئی مجلس درس قائم کی تھی، مگر تمام ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ دینی مسائل میں اہل شام ان ہی کی طرف رجوع کرتے تھے، مقل بن زیاد جو ان کے خاص شاگرد ہیں، ان کا بیان ہے کہ

افتی الاوزاعی فی سبعین الف مسئلۃ بحدثنا واخبرنا[2]	انہوں نے ستر ہزار مسئلوں کا جواب حدیث کی روشنی میں دیا،

اس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی کوئی خاص مجلس درس تو قائم نہیں تھی، مگر دوسرے طریقوں سے اہل علم ان سے استفادہ و روایت کرتے تھے، محاسن المساعی میں ہے کہ وہ نماز فجر کے بعد خاص ضرورت کے علاوہ کسی سے بات چیت نہیں کرتے تھے، بلکہ ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے، تلامذہ انتظار میں رہتے تھے، جب سورج نکل آتا تھا تو استاذ و تلامذہ فقہ و حدیث کے مذاکرہ میں لگ جاتے تھے، ثم

یقومون فیتذاکرون فی الفقہ والحدیث (ص ۲۷)

ان سے روایت کرنے والوں میں متعدد اکابر ائمہ ہیں، چند نام یہ ہیں۔

امام مالک، امام شعبہ، سفیان ثوری، عبد اللہ بن مبارک، یحییٰ بن سعید القطان، ابن ابی الزناد، مقل بن زیاد، ابو اسحٰق الفزاری وغیرہ،

امام اوزاعی کو یہ فخر حاصل ہے کہ امام زہری اور قتادہ نے بھی جو ان کے استاذ اور ائمہ تابعین کے سرخیل ہیں، ان سے روایت کی ہے،[3]

فضل و کمال ان کے فضل و کمال کا اعتراف تمام ائمہ اکابر فقہ و حدیث نے کیا ہے، یحییٰ بن معین

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۴۱۔ [2] البدایہ ج ۱۰ ص ۱۱۶ [3] تہذیب التہذیب ج ۶ ص ۲۳۹۔

فرماتے تھے، ائمہ تو چار ہیں، امام ابوحنیفہ، امام مالک، سفیان ثوری، اور امام اوزاعی[1]، عبدالرحمن بن مہدی کا قول ہے کہ اس وقت حدیث میں چار امام ہیں، امام اوزاعی، امام مالک، سفیان ثوری اور حماد بن زید[2]، ان ہی کا قول ہے کہ شام میں امام اوزاعی سے زیادہ سنت نبوی کا جاننے والا کوئی دوسرا نہیں ہے، امام شافعی کا بیان ہے کہ میں نے حدیث میں ان سے زیادہ سمجھ دار اور فقیہ آدمی نہیں دیکھا[3] سفیان بن عیینہ ان کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ اپنے زمانہ کے امام ہیں، ابواسحٰق فزاری کا قول ہے کہ میں نے امام اوزاعی اور سفیان ثوری جیسا صاحب علم وفضل نہیں دیکھا[4]

ابوزرعہ رازی فرماتے تھے، امام اوزاعی اپنے علم وفضل اور کثرت روایت کی بنا پر اہل شام کے مرجع خلائق بن گئے تھے، اور اہل شام ان ہی سے فتاوے لیتے تھے،

اوپر ذکر آچکا ہے کہ انہوں نے تقریباً ستر ہزار مسائل کا جواب حدیث وآثار کی روشنی میں دیا تھا، امیہ بن زید سے کسی نے پوچھا کہ مکحول[5] کے مقابلہ میں اوزاعی کا کیا درجہ ہے، انہوں نے کہا کہ اوزاعی کا رتبہ ہمارے نزدیک مکحول سے زیادہ ہے، پوچھا کہ مکحول نے تو صحابہ کرام رضہ کو دیکھا تھا، فرمایا کہ ہاں رویت صحابہ کا فضل انہیں ضرور حاصل تھا، مگر یہ فضل اضافی ہے، امام اوزاعی میں جو فضل وکمال ہے وہ ان کا ذاتی ہے[6] دوسری روایت میں ہے کہ ان میں علم، عبادت اور اظہار حق ہر چیز جمع تھی،

امام مالک فرماتے تھے کہ امام اوزاعی ان ائمہ میں ہیں جن کی اقتدا کی جا سکتی ہے (البدایہ ج۱۰ ص۱۱۶)

امام نووی ان کے فضل وکمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وقد اجمع العلماء علی امامة الاوزاعی وجلالته وعلو مرتبته وکمال فضله	امام اوزاعی کی امامت جلالت شان، علو مرتبت اور فضل وکمال پر سب کا اتفاق ہے۔

اس کے بعد انہوں نے لکھا ہے کہ ان کے علم وفضل زہد وتقوی اور اظہار حق میں ان کی جرأت

---

[1] البدایہ ج۱۰ ص۱۱۶ ابھی تک امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کے مسلکوں کی شہرت نہیں ہوئی تھی۔ بلکہ اسلامی مملکت کی بیشتر آبادی ان ہی ائمہ کے فقہ وفتاوے پر عامل تھی، [2] تہذیب التہذیب ج۶ ص۲۳۹ ان کے حالات کتاب میں درج ہیں، [3] تہذیب التہذیب ج۶ ص۲۴۲ [4] ایضاً۔ [5] مشہور تابعی ہیں، [6] تہذیب الاسماء ج۱ ص۲۹۹-۳۰۰ ۔

وہمت کے بارے میں سلف کے اقوال مشہور و معروف ہیں [1]

حافظ ابن کثیر نے ان کے علم و فضل کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

خلفاء، وزرا اور تجار وغیرہ کے کسی طبقہ میں بھی ان سے زیادہ صاحب علم و فضل اور فصیح و بلیغ، متقی و پرہیزگار آدمی نہیں دیکھا گیا، فقہ و حدیث، سیرت و مغازی اور دوسرے اسلامی علوم میں نہ صرف اپنے اہل وطن پر بلکہ تمام ممالک اسلامیہ پر ان کی سیادت کا سکہ بیٹھا ہوا تھا، زبان و ادب کا ذوق بھی ان میں فطری تھا، انکی تقریر و تحریر دونوں نہایت فصیح و بلیغ ہوتی تھیں، ان کی زبان سے جو بات بھی نکلتی لوگ حسن بیان اور فصاحت کی وجہ سے اس کو لکھ لیتے تھے۔ اور وہ تحریر بطور نمونہ اپنے پاس رکھتے تھے، دربار خلافت میں بھی ان کی تحریریں بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں خصوصیت سے عباسی خلیفہ منصور کو ان کی تحریر بہت پسند تھی، ایک بار اس نے اپنے خاص کاتب سے کہا کہ حکومت کی طرف سے جو خطوط و فرامین ملک کے دوسرے حصوں میں بھیجے جاتے ہیں، ان میں تمہیں امام اوزاعی کی تحریر سے مدد لینی چاہئے تاکہ ان خطوط کی زبان فصیح و بلیغ سمجھی جائے، کاتب نے کہا کہ امیر المومنین پوری مملکت میں اس وقت ایک آدمی بھی ایسا نہیں ہے جو ان کی تحریر کا چربہ اتار سکے یا اس کی تقلید کر سکے،

ان کے علم و فضل کا تذکرہ ان کی تصنیفات کے ضمن میں بھی آئے گا،

عقائد میں ان کا مسلک اس زمانہ میں جبر و قدر کے مسائل عام طور پر رائج ہو گئے تھے، خاص طور پر ایمان کے بسیط و مرکب ہونے کی بحثیں عام طور پر اہل علم کا موضوع بحث تھیں، امام اوزاعی اس بارے میں عام محدثین اور سلف کا مسلک رکھتے تھے، فرماتے ہیں کہ ہمارے اسلاف ایمان و عمل میں تفریق نہیں کرتے تھے، عمل ایمان سے ہے اور ایمان عمل سے، ایمان ایک جامع لفظ ہے تو جو اپنی زبان سے ایمان کا اقرار کرے، قلب میں اس کی معرفت رکھے، اور عمل سے اس کا ثبوت دے، اس نے ایک کڑا تھام لیا جو ٹوٹ نہیں سکتا فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ لا انفصام لھا۔

اور جو شخص زبان سے تو ایمان کا اظہار کرے، مگر نہ تو اس کا قلب اس کی معرفت کا لذت شناس ہو اور نہ وہ عمل سے اس کا ثبوت دے تو ایسے شخص کا ایمان خدا کے یہاں مقبول نہیں، آخرت میں وہ ناکام ہوگا،

مناظرہ امام اوزاعی بحث و مباحثہ اور مناظرہ و مجادلہ سے بہت دور رہتے تھے، مگر جب اس کی ضرورت آجاتی تھی، تو اثبات حق کے لئے مناظرہ بھی کر لیتے تھے، پہلی صدی کے آخر

میں یونانی فلسفہ کے اثر سے بہت سے فرقے پیدا ہو گئے تھے، ان میں ایک فرقہ قدریہ بھی تھا، دوسری صدی کی ابتدا میں اس کا بڑا زور تھا، ان کا خیال تھا کہ تقدیر کوئی چیز نہیں، خدا پیدا کرنے کے بعد پھر اس میں تبدیلی پیدا کرنے پر قادر نہیں ہے، انسان بالکل مختار مطلق ہے، وہ جو چاہے کرے، اس کے لئے محض اس کی مشیت اور اس کا ارادہ کافی ہے۔

ہشام بن عبدالملک متوفی ۱۲۵ھ سے لوگوں نے ایک قدری کی شکایت کی، اس نے اس کو بلوایا اور کہا کہ کیا بات ہے کہ تمہارے بارے میں لوگ چہ می گوئیاں کر رہے ہیں، بولا کہ اگر لوگ میری شکایت کرتے ہیں تو اس کا فیصلہ تو اسی وقت ہو سکتا ہے جب مجھے کوئی قائل کر دے کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ غلط ہے، اگر کوئی مجھے قائل کر دیتا ہے تو آپ کو میری طرف سے پوری اجازت ہے کہ میرا سر قلم کر دیں، ہشام نے کہا بات معقول ہے، ہشام نے امام اوزاعی کو بلا کر عرض کیا کہ آپ ہماری طرف سے اس سے گفتگو کیجئے، امام اوزاعی نے قدری سے فرمایا کہ تین یا چار باتیں تم سے پوچھتا ہوں، تم ان میں انتخاب کر لو اس نے کہا آپ تین سوال کر سکتے ہیں، فرمایا هل قضى الله على ما نهى؟ کیا خدا نے جس چیز سے روکا ہے اس کے خلاف بھی فیصلہ کرتا ہے؟ بولا کہ اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے، پھر پوچھا کہ خدا نے جو حکم دیا ہے اس کے درمیان خود حائل بھی ہو جاتا ہے، بولا کہ یہ تو پہلے سوال سے بھی سخت ہے، اس کا بھی میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے، پھر سوال کیا کہ جن چیزوں کو اس نے حرام کیا ہے، اس کے استعمال کی بھی اجازت دیتا ہے، کہا یہ اور بھی مشکل ہے، امام اوزاعی نے فرمایا امیرالمومنین! میں نے تین باتیں پوچھیں، تینوں کے جواب سے عاجز رہا، اب آپ خود فیصلہ کریں، ہشام نے اس کو وہی سزا دی جس کا وہ مستحق تھا، پھر الگ سے ہشام نے امام اوزاعی سے پوچھا کہ اگر وہ ایک سوال کی اجازت دیتا تو آپ اس سے کیا پوچھتے؟ فرمایا! میں اس سے پوچھتا کہ تمہاری اور خدا کی مشیت برابر درجہ کی چیز ہے یا کم درجہ کی اس کا وہ جو جواب دیتا اس کے عقیدہ کے خلاف ہوتا، پھر انہوں نے اپنے سوالات کی تفصیل بتائی۔

خلافت کی اہلیت غیر معمولی علم و فضل کے ساتھ حکمرانی و انتظام ملکی کی صلاحیت بہت کم جمع ہوتی ہے، مگر یہ دونوں خوبیاں بیک وقت ان میں موجود تھیں، ایک بار امام اوزاعی اور سفیان ثوری امام مالک کے پاس گئے وہاں سے واپس ہوئے تو امام مالک نے ان کے بارے میں فرمایا

کہ سفیان علم میں بڑھے ہوئے ہیں اور اوزاعی علم کے ساتھ انتظام ملکی کی صلاحیت بھی رکھتے تھے، امام ذہبی نے لکھا ہے،

وکان یصلح للخلافۃ   وہ خلیفہ بنائے جانے کے لائق تھے،

امام مالک فرماتے تھے انہ یصلح للامامۃ یہ امامت کے لائق تھے، ابواسحٰق فرماتے تھے کہ اس زمانہ میں اگر خلفا کے انتخاب کا اختیار امت کو دیدیا جائے تو میں امام اوزاعی کو منتخب کروں گا

(محاسن المساعی ص۱۱)

امیر شکیب ارسلان لکھتے ہیں کہ

امام اوزاعی عالم تھے، مگر وہ عام علما کی طرح نہیں تھے، بلکہ ان کے علم و عمل میں مطابقت تھی، انہوں نے حفظ و روایت اور فکر و نظر ہی تک اپنی توجہ مبذول نہیں رکھی بلکہ امت کے ہر کام سے دلچسپی لی، انہوں نے عبادت و ریاضت کرکے محض اپنی ذات ہی کیلئے نجات کی راہ نہیں ڈھونڈی، بلکہ عدل و انصاف کے پھیلانے اور مخلوق خدا کی بھلائی اور راحت رسانی کی فکر بھی کی، امام کثرت عبادت اور ورع و زہد کے ساتھ اس حدیث پر بھی عامل تھے،

عدل ساعۃ خیر من عبادۃ الف شھر   ایک گھڑی کا عدل و انصاف ہزار مہینہ کی عبادت سے بہتر ہے۔ (محاسن المساعی ص۹)

سیرت و کردار سیرت و کردار میں صحابہ و تابعین کا نمونہ تھے، زہد و قناعت، سخاوت و فیاضی حق گوئی و بے باکی، وعظ و پند اور امت کی خیرخواہی، یہ سب ان کے نمایاں اوصاف تھے،

بچپن سے انہوں نے فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی تھی، مگر زہد و قناعت کا حال یہ تھا کہ خود کبھی دربار خلافت کا رخ نہیں کیا، خلفائے بنو امیہ کے یہاں بھی معزز و محترم تھے اور خلفائے عباسیہ میں بھی ان کا وقار اور اعزاز تھا، مگر کبھی کسی سے کوئی مدد نہیں لی، خلفائے بنو امیہ نے ان کو متعدد جاگیریں دی تھیں، نیز دربار خلافت کی طرف سے مختلف اوقات میں تقریباً ستر ہزار دینار کے عطیے ان کی خدمت میں پیش کیے گئے، مگر انہوں نے نہ تو کبھی ان جاگیروں کے کسی حبہ سے فائدہ اٹھایا اور نہ نقد رقم کا ایک حبہ اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ کیا، بلکہ یہ ساری جائداد اور پوری رقم فقرا و مساکین اور

جہاد فی سبیل اللہ میں لگادی، اور خود فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی، جب انتقال ہوا تو سارا اثاثہ بیت سات دینار سے زیادہ کا نہ تھا،

جرأت وحق گوئی

جرأت وحق گوئی ان کی سیرت کا سب سے نمایاں وصف تھا، اس سلسلہ میں امیر شکیب ارسلان نے جو کچھ لکھا ہے، اس کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

امام اوزاعی نے خلفاء و امرا کے سامنے جس جرأت وحق گوئی کا ثبوت دیا ہے، اس کی مثال تاریخ اسلام میں بہت کم ملے گی، لبنان کے عیسائیوں کے بارے میں وہاں کے امیر صالح بن علی کو انہوں نے جو خط لکھا اس کو غور سے پڑھیئے، بنوامیہ کے بارے میں عبداللہ بن علی سے انہوں نے جو گفتگو کی، اسکو سامنے رکھیئے، منصور کو انہوں نے جو ناصحانہ خطوط لکھے ان پر ایک نظر ڈالیئے، ان سب میں آپ کو ان کا یہ وصف نظر آئے گا۔

ولعمری لوکان العلماء الذین	خدا کی قسم اگر علمائے امت میں امام اوزاعی
من نمط الاوزاعی عددا کبیراً	کی روش اختیار کرنے والوں کی ایک معتدبہ
فی الاسلام لما قد کان اسرع	تعداد موجود رہا کرتی تو اسلامی معاشرہ میں
الفساد الی المجتمع الاسلامی	نہ تو اتنی جلدی فساد پیدا ہوجاتا اور نہ
ولاکانت انحطت دول الاسلام	اسلامی حکومت غیر معمولی عروج کے بعد اتنی
بعد ذالک العلو فی الارض وانما	جلد زوال پذیر ہوتی، اس امت کی ساری
کانت آفۃ ھذہ الامۃ فساد	مصیبت امرا کا بگاڑ اور علماء کی بزدلی
امرائھا وجبن علمائھا	ہے (ص۳۱)

امام اوزاعی نے جن جن مواقع پر امراء اور خلفاء کے سامنے جرأت وحق گوئی کا ثبوت دیا ہے اس کی تفصیل ملاحظہ ہو، بنوامیہ کی حکومت سے امام اوزاعی کا کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا، مگر جس ظلم و تشدد کے ساتھ وہ شام سے جلاوطن کیے گئے تھے، غالباً وہ امام کو پسند نہیں تھا، ممکن ہے کہ انہوں نے اس بارے میں کچھ اظہار خیال بھی کیا ہو، عبداللہ بن علی جس نے شام سے بنوامیہ کا خاتمہ کیا تھا، جب اس کو بنوامیہ کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو اس نے ان تمام لوگوں کا صفایا کرنا شروع کیا، جن کو اموی حکومت سے کسی درجہ میں بھی ہمدردی تھی، اس سلسلہ میں امام اوزاعی کی بھی تلاش ہوئی، یہ کئی دن چھپے رہے، مگر

پھر جرأت کر کے خود دربار میں حاضر ہو گئے، فرماتے ہیں کہ جس وقت میں دربار میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ عبد اللہ ایک تخت پر شکن ہے اور اس کے ہاتھ میں ایک نیزہ ہے، اس کے ارد گرد بہت سے جلاد تھا سپاہی ننگی تلواریں لئے کھڑے ہیں، میں نے پہنچ کر سلام کیا اس نے سلام کا جواب دینے کے بجائے اپنے نیزہ کو زمین پر ٹیکتے ہوئے کہا، اوزاعی! ہم نے ان ظالموں (بنو امیہ) سے ملک اور اس کے باشندوں کو نجات دلانے میں جو جنگ کی ہے، یہ جہاد ہے کہ نہیں؟ امام اوزاعی کے لئے یہ بڑا سخت وقت تھا مگر انہوں نے نہایت حکیمانہ جواب دیا، فرمایا کہ میں نے یحییٰ بن سعید کے واسطے سے یہ حدیث نبوی سنی ہے کہ

"تمام اعمال کا مدار نیت پر ہے، ہر شخص اپنے اعمال میں جیسی نیک و بد نیت کرے گا، ویسا ہی اس کو اجر ملے گا"۔

مقصد یہ تھا کہ اگر تمہاری نیت صرف ملک گیری کی تھی تو تم کو اس کا اجر ملے گا، اور اگر اعلائے کلمۃ اللہ مقصود تھا تو پھر جہاد کا ثواب ملے گا۔

یہ غیر متوقع جواب سن کر ابن علی غصہ سے بیتاب ہو گیا اور اسی غصہ میں اپنے نیزہ کو زمین پر ایک بار پھر تیزی سے پٹکا اور معًا دوسرا سوال یہ کیا کہ

یا اوزاعی ما تقول فی دماء بنی امیۃ	اے اوزاعی! بنی امیہ کے خون کے بارے میں کیا خیال ہے؟ (یعنی ان کا قتل کرنا جائز ہے یا حرام)

آپ نے اپنی طرف سے کوئی جواب دینے کے بجائے نہایت ہی متانت کے ساتھ ایک حدیث پھر سنائی، وہ حدیث یہ ہے،

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ مسلمان کا خون کرنا تین حالتوں میں جائز ہو سکتا ہے، قصاص میں یا شادی کے بعد زنا میں یا پھر ارتداد کے بعد"۔

یہ جواب بھی اس کی توقع کے بالکل خلاف تھا، اسی لئے اس نے اس دفعہ زیادہ غصہ کا اظہار کیا، پھر پوچھا کہ اچھا "بنو امیہ کے مال کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟"

آپ نے فرمایا "ان کے پاس جو دولت تھی اگر وہ حرام ذریعہ سے ان کے ہاتھ میں آئی تھی تو بہرحال وہ تمہارے ہاتھ میں پہنچ کر حلال نہیں ہو سکتی اور اگر وہ حلال تھی تو تم اس کو اسی طریقہ سے لے سکتے ہو جس طرح شریعت نے اجازت دی ہے"

یہ جواب سن کر وہ بالکل آگ بگولہ ہو گیا۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ میں اس جواب کے بعد متوقع تھا کہ ابھی وہ میرے قتل کا حکم دیدے گا۔ مگر اب اس نے ترہیب کے بجائے ترغیب سے کام لینا شروع کیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیوں اگر آپ کو عہدۂ قضا سونپ دیا جائے تو کیا حرج ہے؟ انہوں نے کہا کہ آپ کے اسلاف نے اس ذمہ داری سے مجھے سبکدوش رکھا تو میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اسی روش پر قائم رہیں۔

اس سوال و جواب کے بعد اس نے ان کو واپس جانے کی اجازت دیدی، امام اوزاعی دربارِ خلافت سے رخصت ہو کر ابھی کچھ ہی دور گئے تھے کہ عبداللہ کا ایک قاصد لپکا ہوا ان کے پاس پہنچا۔ امام اوزاعی نے دیکھا تو سمجھے کہ وہ غالباً وہ میرے قتل کا پروانہ لا رہا ہے، چاہا کہ فوراً سواری سے اتر کر دو رکعت نماز ادا کر لیں[1] چنانچہ انہوں نے نماز کی نیت باندھ لی، قاصد انتظار کرتا رہا جب وہ نماز سے فارغ ہوئے تو اس نے دو سو دینار کی ایک تھیلی پیش کی اور کہا کہ امیر نے آپ کے لئے بھیجا ہے، امام اوزاعی کا بیان ہے کہ میں نے خوف کی بنا پر رقم لے لی، مگر گھر پہنچنے سے پہلے پوری رقم صدقہ کر دی[2]

منصور کو ناصحانہ خطوط

خلفائے عباسیہ میں منصور حد درجہ خود رائے، جابر اور متشدد واقع ہوا تھا، اسی نے عہدۂ قضا نہ قبول کرنے پر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو کوڑے لگوائے اور قید کر دیا۔ اسی نے طلاق مکرہ میں اس کی مرضی کے خلاف فتویٰ دینے پر امام مالکؒ کو سر بازار رسوا کیا اور ان کا ایک ہاتھ بازو سمیت اکھڑوا لیا، اسی نے سفیان ثوریؒ جیسے برگزیدہ بزرگ کو طرح طرح کی تکلیفیں دیں، یہ سب واقعات امام اوزاعی کے سامنے تھے، مگر اس کے باوجود وہ حق گوئی و بے باکی سے باز نہیں رہے، منصور اپنی خودرائی اور جبر و استبداد کے باوجود غالباً اپنی سیہ کاری کو چھپانے کے لئے اس بات کا خواہش مند رہتا تھا کہ امام اوزاعی اس کے دربار میں آ کر نیک

---

[1] قتل سے پہلے دو رکعت نماز ایک صحابی حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کی سنت ہے۔ [2] البدایہ والنہایۃ ص ۱۱۸ تذکرۃ الحفاظ ج ۱ ص ۱۶۲، ۱۶۳۔

مشورے دیں، مگر امام اوزاعی بغیر طلب کے نہ کبھی دربار میں آئے اور نہ بغیر کسی شدید ملی ضرورت کے کوئی تحریر لکھی، پہلی بار جب منصور شام آیا اور امام اوزاعی سے ملاقات ہوئی، تو انہوں نے اس کو بہت سی نصیحتیں کیں، جب واپس ہونے لگے تو انہوں نے منصور سے کہا کہ مجھے سیاہ لباس[1] پہننے سے معاف رکھا جائے، اس نے اجازت دیدی، جب وہ دربار سے رخصت ہوگئے تو اپنے ندیم خاص ربیع کو ان کے پاس بھیجا اور کہا کہ میرا نام ظاہر کرنا بلکہ اپنی طرف سے دریافت کرنا کہ وہ سیاہ لباس کیوں ناپسند کرتے ہیں، ربیع کے دریافت کرنے پر فرمایا کہ سیاہ لباس نہ تو احرام میں استعمال کیا جاتا ہے، نہ تجہیز و تکفین میں اور نہ شادی کے موقع پر تو پھر اس کی کیا ضرورت ہے[2]

ایک بار منصور نے ان کو ایک خط لکھا اور یہ آرزو کی کہ کوئی خیرخواہانہ مشورہ دیجئے، اس کے جواب میں انھوں نے نہایت مختصر اور بلیغ خط لکھا، اس کے الفاظ ملاحظہ ہوں۔

اما بعد: فعلیك یا امیر المؤمنین!
بتقوی اللہ عز وجل وتواضع
یرفعك اللہ تعالیٰ یوم یضع
المتکبرین فی الارض بغیر الحق
واعلم ان قرابتك من رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لن
تزید حق اللہ الا وجوباً[3]

امیر المومنین! آپ اپنے اوپر خدا کا تقویٰ
لازم کر لیجئے، اور تواضع اختیار کیجئے، خدا
تعالیٰ آپ کو اس دن بلند کرے گا جس دن
ان متکبرین کو جو ناحق زمین پر بڑے بنتے ہیں
ذلیل کرائے گا، اور اچھی طرح غور کر لیجئے
کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی
قرابت خدا کے یہاں حق سے زیادہ آپ
کو کچھ نہ دلائے گی۔

اس خط میں امام اوزاعی نے منصور کی تین کمزوریوں کی طرف توجہ دلائی ہے، جنھوں نے اس کو حد درجہ مستبد بنا دیا تھا، یعنی خوف خدا کی کمی، حکومت کا غرور، اور نسلی شرافت۔

اگر کوئی اہم دینی یا ملی ضرورت پیش آجاتی تھی، تو بغیر طلب بھی اس کو خط لکھ کر اس کی طرف متوجہ کرتے تھے،

---

[1] سیاہ لباس عباسی حکومت کا سرکاری لباس تھا، اس وقت دربار میں اس لباس میں نہ پہنچنے کے معنی حکومت سے بغاوت کے تھے [2] حسن المساعی مرتبہ امیر شکیب ارسلان ص۱۱۹ [3] ایضاً ص۲۰۔

ابراہیم بن علی اور محمد بن حسن نے منصور کے خلاف جب علم بغاوت اٹھایا، تو منصور نے سرحدی مسلمانوں سے بھی مدد مانگی، انہوں نے مدد نہیں دی، چونکہ وہ رومی حکومت کے بالکل زد میں تھے اغالباً رومی حکومت نے منصور کی خفگی سے فائدہ اٹھاکر انہوں نے بہت سے سرحدی مسلمانوں کو قید کرلیا، اور منصور کے پاس لکھا کہ اگر آپ چاہیں تو فدیہ دے کر مسلمان قیدیوں کو چھڑا سکتے ہیں، منصور چونکہ ان سے ناخوش تھا اس لئے اس نے انکار کردیا، امام اوزاعی کو جب اس کی اطلاع ہوئی کہ ہزاروں مسلمان رومیوں کے ہاتھ قید و بند کی مصیبت جھیل رہے ہیں، اور منصور کو رہا کرنے کی کوئی فکر نہیں ہے تو انہوں نے ایک لمبا سخت خط لکھا، جس میں منصور کی ذمہ داری کا ذکر کر کے مسلمان قیدیوں کی رہائی کیطرف توجہ دلائی، اس خط کو مع ترجمہ ہم یہاں نقل کرتے ہیں

اما بعد: فان الله تعالى استرعاك الله هذه الامة لتكون فيها بالقسط قائما وبنبيه صلى الله عليه وسلم في خفض الجناح والرأفة متشابها واسأل الله تعالى ان يسكن على امير المؤمنين دهماء هذه الامة ويرزقه رحمتها فان سائغة المشركين التي غلبت عام اول وموطئهم حريم المسلمين واستنزالهم العواتق والذراري من المعاقل والحصون كان ذالك بذنوب العباد وما عفا الله اكثر فبذنوب العباد استنزلت العواتق والذراري من المعاقل

اما بعد! اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس امت کا ذمہ دار اور نگہبان اس لئے بنایا ہے کہ آپ اس میں انصاف قائم کریں، اور مسلمانوں کے ساتھ محبت اور شفقت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے مشابہت پیدا کریں، میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ مسلمانوں پر اس وقت جو مصیبت آئی ہے اس میں وہ آپ کو اطمینان نصیب کرے، اور ان پر رحم کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اس سال کی ابتدا میں رومی مشرکین کو جو غلبہ ہوا ہے اس میں انہوں نے مسلمانوں کے گھروں کو روند ڈالا ہے، ان کی عورتوں اور بچوں کو ان کے گھروں اور قلعوں سے نکال کر ذلیل کیا ہے، یہ سب بندوں کے گناہوں کا نتیجہ ہے، اگرچہ خدا نے ان کے گناہوں کو بہت کچھ معاف کردیا ہے اور

والحصون، لا يلقون لهم ناصرا
ولا عنهم مدافعا كاشفات
رؤسهن وأقدامهن فكان
ذالك بمرأى ومسمع وحيث
ينظر الله الى خلقه اعرامنه
واعراضهم فليتق الله يا امير
المومنين! وليتبع بالمفاداة
بهم من الله سبيلاً وليخرج
من حجة الله فان الله تعالى
قال لنبيه "وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ
فِي سَبِيلِ اللهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ
مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ"
وقد بلغني عن رسول الله صلى الله
عليه وسلم انه قال انى اسمع
بكاء الصبى فى الصلاة فاتجوز
فيها مخافة ان تفتن" فكيف
بتخليتهم يا امير المومنين! فى
ايدى العدو يمتنونهم ويكشفون
منهم مالا يستحله الا بنكاح
وانت راعى الله والله تعالى
فوقك وسوف منك "يوم
تَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ
الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا"

اور بڑی مصیبت آئی، تو بندوں کے گناہوں
ہی کا نتیجہ ہے کہ عورتیں اور بچے اپنے گھروں
اور پناہ گاہوں سے اس طرح نکالے گئے،
کہ نہ کوئی ان کا مددگار رہے اور نہ ان کی طرف
سے کوئی مدافعت کرنے والا ہے، عورتوں
کی بے بسی کا حال یہ ہے کہ ان کے سر اور پیر
ننگے ہیں، اور یہ سب ہمارے دیکھتے اور سنتے
ہو رہا ہے، اور جس وقت خدا تعالیٰ اپنی اور
ان کی عزت کی تخلیق پر نگاہ ڈالے گا، تو
امیر المومنین اس بارے میں آپ کو خدا
سے ڈرنا چاہئے، اور ان کا فدیہ دے کر خدا
کے غضب سے بچنے کا کوئی راستہ ڈھونڈنا
چاہیے اور اس کی حجت سے کوئی مفر تلاش کرنا
چاہیے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ
علیہ وسلم سے کہا ہے کہ تم کو کیا ہو گیا ہے کہ
تم اللہ کے راستہ میں لڑتے نہیں اور کمزور مرد،
عورتیں، بچے اس بستی سے نکلنے کی دعا کرتے
ہیں، مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ
ارشاد گرامی پہنچا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "اگر
نماز میں بچے کی رونے کی آواز سنتا ہوں تو
اس کو مختصر کر دیتا ہوں، کہ اس کی ماں پریشان
نہ ہو، ان احکام کی موجودگی میں امیر المومنین
مسلمانوں کو ان کے دشمنوں کے ہاتھ میں چھوڑ کر

وَاِنْ کَانَ مِثْقَالَ حَبَّۃٍ مِنْ خَرْدَلٍ اَتَیْنَا بِھَا وَکَفٰی بِنَا حَاسِبِیْنَ ۝

دینا کیسے جائز ہوسکتا ہے، کہ وہ ان کو تکلیف دیں، اور ان کی بے حرمتی کریں، آپ خدا کے راعی ہیں، اور خدا تعالیٰ آپ کے اوپر راعی ہے، وہ آپ سے اس دن اس ذمہ داری کا پورا پورا حق چاہے گا، اس نے کہا ہے کہ جس دن ہم انصاف کی ترازو لائیں گے اس دن کسی پر کوئی ظلم نہ ہوگا، اگر کوئی رائی کے برابر بھی برائی کرے گا تو ہم اس کو سامنے لائیں گے اور ہمارا حساب کافی ہے۔

اہل تذکرہ بیان کرتے ہیں کہ اس خط کا اثر یہ ہوا کہ اس نے فوراً فدیہ دے کر مسلمانوں کو رہا کر لینے کا حکم دیا۔

فلما وصل کتابہ امر بالفداء

جس وقت یہ خط پہنچا، اسی وقت اس نے فدیہ دے کر مسلمانوں کو چھڑا لینے کا حکم دیا،

اس خط کی اہمیت کا پورا اندازہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب منصور کی مستبدانہ روش کو بھی نگاہ میں رکھا جائے۔

غیر مسلم رعایا کے ساتھ عدل کی تاکید

ان کا یہ طرز عمل صرف مسلمانوں ہی کے ساتھ نہیں تھا، بلکہ غیر مسلموں پر بھی وہ اسی طرح شفیق ورحیم رہتے تھے، اس سلسلہ میں امیر شکیب ارسلان کا بیان ملاحظہ ہو،

امام اوزاعی ضروری سمجھتے تھے کہ اسلام نے انسان کو جو بنیادی حقوق دیئے ہیں وہ ان کو دین و مذہب کی تفریق کے بغیر دیئے جائیں، چنانچہ امیر صالح بن علی نے جب جبل لبنان کے نصاریٰ پر ظلم کیا تو انھوں نے سخت نکیر کی اور اس کو خط لکھا، وہ اس آیت قرآنی پر عامل تھے، لَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا، اسی طرح جب اہل قبرص کا معاملہ پیش ہوا تو اس میں بھی مداخلت کی، غرض یہ کہ ان کی روش سے صاف طور پر معلوم ہوتا تھا کہ اسلام عدل و انصاف اور انسانی حقوق کی حفاظت

کرنے والا دین ہے اور ظلم و تعدی سے اس کو نفرت ہے (صلا)

ایک بار منصور نے ان کو بلا بھیجا، دور سے آنا تھا اس لئے دیر ہوگئی، دربار میں پہنچے تو منصور نے کہا میں دیر سے منتظر تھا، آپنے اس کا تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن یہ پوچھا کہ آپ نے کس لئے یاد کیا ہے؟ بولا، کچھ اخذ و استفادہ کرنا چاہتا ہوں، ارشاد ہوا، میں تیار ہوں مگر اس شرط کے ساتھ کہ میں جو کچھ کہوں اسے آپ بھول نہ جائیں، بولا یہ کیسے ممکن ہے کہ میں آپکے ارشادات کو بھلا دوں، جب کہ میں نے خود ہی اس کے لئے آپ کو تکلیف دی ہے، فرمایا ہاں اس کو آپ سن تو لیں گے مگر اس پر عمل نہ کریں گے، ان کا یہ انداز گفتگو منصور کے حاجب ربیع کو برا معلوم ہوا اور ان کو تنبیہ کرنی چاہی، مگر منصور نے اس گستاخی سے یہ کہکر اسے روک دیا کہ تم کو معلوم نہیں ہے کہ یہ درس و افادہ کی مجلس ہے، شاہی دربار نہیں' جب امام اوزاعی کو پورا اندازہ ہو گیا کہ منصور میں اس وقت جذبہ نصیحت پذیری موجود ہے، اور ان کی باتوں کو بڑی توجہ سے سن رہا ہے، تو اس کے سامنے چند احادیث نبوی بیان کیں، پہلی حدیث مکحول کے واسطہ سے یہ بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب کسی بندے کو خدا کے دین کی کوئی بات معلوم ہوتی ہے اور وہ اس کو قبول کرکے اس کی قدر کرتا ہے، تو اس کے لیئے وہ خدا کی ایک نعمت ہوتی ہے جو خاص طور پر اس کے لیئے بھیجی گئی ہے، اور اگر وہ ٹھکرا کر اس کی ناقدری کرتا ہے تو اس کے اوپر وہ ایک حجت ہوتی ہے اور اس ناقدری کی وجہ سے وہ اپنے گناہوں میں بھی اضافہ کر لیتا ہے اور خدا کا غضب بھی بڑھ جاتا ہے"

اس حدیث کے سنانے کا مقصد یہ تھا کہ جو باتیں میں کہوں اس کی قدر دانی تمہارے لئے مفید ہوگی اور اگر ناقدری کروگے تو دنیا و آخرت دونوں جگہ تم نقصان اٹھاؤ گے،

پھر دوسری حدیث یہ سنائی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو حاکم رعیت پر ظلم و زیادتی کرکے چین کی نیند سوتا ہے، خدا اسکے اوپر جنت حرام کر دے گا،

یہ حدیث سنانے کے بعد آپنے ایک لمبی تقریر کی جس کا ایک ایک جملہ حرز جان بنانے کے قابل ہے، عام فائدہ کے لئے ہم یہاں چند جملے نقل کرتے ہیں،

امیر المومنین! جس نے حق بات کو ناپسند کیا، اس نے خدا کو ناپسند کیا، اس لئے کہ اللہ سراسر حق ہی ہے، ہو الحق المبین، امیر المومنین جس چیز نے لوگوں کے

دلوں کو آپ کی طرف مائل کیا اور انہوں نے آپ کو اپنا حاکم بنایا وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرابت نسبی تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امت کے لئے نہایت ہی مہربان، رحیم، ہمدرد اور غمخوار تھے۔ آپ کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ لوگوں پر حق (خدا کا حق ہو یا بندوں کا) نافذ کریں، ان کے درمیان انصاف کریں، ان کی غلطیوں سے چشم پوشی کریں۔ (اس بات پر اس ماحول کو سامنے رکھ کر غور کرنا چاہئے، جس میں ادنی سی غلطی پر گردن زدنی کا حکم ہو جایا کرتا تھا) ان کے اوپر اپنا دروازہ کھلا رکھیں، یہ نہ ہو کہ آپ کے دروازہ پر پہرہ دار بیٹھے رہیں، اور لوگ آپ تک نہ پہنچ سکیں، آپ کو عوام کی خوشحالی سے مسرت ہو اور ان کی بدحالی سے رنج۔ آپ کے زیر حکومت عرب و عجم، مسلم و کافر سبھی ہیں، ان میں سے ہر ایک کا یہ حق ہے کہ آپ ان کے ساتھ انصاف کریں، پھر سوچئے کہ یہاں گروہ در گروہ ایسے لوگ ہیں جنھیں آپ سے کوئی نہ کوئی شکایت ہے، اور ان پر کوئی نہ کوئی ظلم آپ کی طرف سے ہوا ہے۔

امیر المومنین! مکحول سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ایک چھڑی رہا کرتی تھی، جس پر آپ ٹیک لگا کر چلا کرتے تھے، اور ہاتھ میں ہونے کی وجہ سے منافقین پر ایک رعب بھی طاری رہتا تھا، چنانچہ ایک دن حضرت جبرئیل علیہ السلام آئے۔ اور کہا کہ اے محمد! کیا ہی چھڑی ہے جس سے آپنے اپنی امت کا سر کچلنے اور ان کو خوف زدہ کرتے ہیں؟ آپ سوچئے کہ اس شخص کا خدا کے یہاں کیا حال ہوگا جس نے لوگوں کے چہرے خون آلود کئے ان کا خون بہایا، ان کی بستیاں اجاڑ دیں، ان کو جلا وطن کیا اور ان پر رعب جمایا،

امیر المومنین! اپنے نفس کو اپنے فائدہ ہی کے لئے راضی کر لیجئے اور اس کے لئے اپنے رب سے امان حاصل کیجئے۔ امیر المومنین! اگر حکومت وسلطنت آپ سے پہلے گذرنے والوں کے ساتھ رہنے والی ہوتی تو وہ آپ تک نہ پہنچتی، اور یہ آپکے پاس بھی باقی نہیں رہے گی، جس طرح دوسروں کے پاس باقی نہیں رہی،

آپنے اس آیت لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَّلَا كَبِيرَةً کی تفسیر اپنے نانا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی سنی ہے، آپ نے فرمایا کہ صغیرہ سے مراد تبسم اور کبیرہ سے مراد ضحک یعنی کھلکھلا کر ہنسنا ہے تو پھر کیا وہ مظالم خدا کے یہاں لکھے ہوئے نہ ہوں گے، اور ان کا بدلہ نہ ملے گا، جو آپ کے ہاتھوں اور زبان کے ذریعہ ہوئے ہیں۔

امیر المومنین! حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کتنا احساس ذمہ داری تھا، اس بارے میں یہ روایت مجھے ملی ہے، فرمایا

لو ماتت سخلتہ علی شاطئ	اگر ایک بکری کا بچہ رابغیر میری دیکھ
الفرات لخشیت ان اسأل عنہا	بھال کے فرات کے کنارے مرجائے تو مجھے
	ڈر ہے کہ مجھ سے اسکی باز پرس ہوگی،

تو پھر اس کے بارے میں آپ سے کتنی زبردست باز پرس ہوگی، جو آپ کے سامنے آپ کے عدل سے محروم رہا، امیر المومنین! اس آیت يَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوَىٰ کی تفسیر آپ کے دادا (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم) نے کیا فرمائی، یہ فرمائی کہ خدا تعالیٰ کہتا ہے کہ اے داؤد! اگر تمہارے سامنے دو آدمی فیصلہ کرانے کے لئے آئیں، اور ایک کی تمہارا میلان ہو اور اس سے تمہیں محبت ہو تو تمہارے دل میں یہ خیال نہ ہو کہ کاش اس کے موافق فیصلہ ہو اور وہ اپنے فریق کے مقابلہ میں کامیاب ہو، اگر ایسا کروگے تو میں نبوت کی ذمہ داری تم سے واپس لے لوں گا، ظاہر ہے کہ اس کے بعد نہ تمہاری خلیفۃ الارض کی حیثیت باقی رہے گی، اور نہ کوئی دوسرا شرف (کیونکہ یہ سب نبوت کے طفیل میں ہے) اے داؤد! میں نے جن لوگوں کو بندوں کے پاس رسول بناکر بھیجا ہے، ان کو ان کا اسی طرح گلہ بان ہونا چاہیے جس طرح اونٹ کے گلہ بان ان کی گلہ بانی کرتے ہیں، ان کے علم کا تعلق دیکھ بھال اور نگرانی سے ہے اور ان کی نرمی کا تعلق حکمرانی سے ہے، تاکہ شکستہ دلوں کے زخم پر پھایا رکھیں۔ اور مجبوروں اور ناتوانوں کی ضروریات پوری کریں،

امیر المومنین! آپ پر ایک ایسی ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ اگر وہ آسمان وزمین اور پہاڑوں

پر ڈال جاتی تو وہ اس کے اٹھانے سے انکار کر دیتے، مجھ سے یزید بن یزید فقیہ شام نے یہ بیان کیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو زکوٰۃ کی وصولی پر مقرر کیا، کچھ دنوں کے بعد دیکھا کہ وہ گھر پر موجود ہے، آپ نے پوچھا کہ کیا چیز مانع ہوئی، کہ تم وصولی پر گئے نہیں تم کو معلوم نہیں کہ تم کو اس کام کا اجر جہاد کے برابر ملے گا، اس نے کہا ایسا نہیں ہے آپ نے فرمایا کیوں، اس نے کہا کہ مجھے یہ حدیث نبویؐ پہنچی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن ہر والی اور حاکم بلایا جائے گا۔ اور اس کو آگ کے پل پر کھڑا کر دیا جائے گا، جس کی وجہ سے اس کے جسم کے اعضا ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، اس کے بعد وہ پھر واپس لایا جائے گا اور اس سے حساب کتاب ہوگا، اگر اس نے اپنی ذمہ داری بخوبی انجام دی ہے تو بچ جائے گا، ورنہ پھر وہ پل جہنم میں پہنچا دے گا،

حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ یہ روایت کس نے بیان کی ہے، اس نے کہا، ابوذر اور سلمان نے، آپ نے ان دونوں صاحبوں سے اس روایت کے بارے میں دریافت کرایا، انہوں نے کہا کہ یہ روایت ہم نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے، حضرت عمر نے یہ روایت سن کر ایک سرد آہ کھینچی اور فرمایا کہ افسوس عمر کو بھی اس سے گذرنا ہوگا،

امام اوزاعی کی اس تقریر کا منصور پر اس قدر اثر ہوا کہ وہ منہ پر رومال ڈال کر زور زور سے رونے لگا۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ اس کے گریۂ بے اختیار نے مجھے بھی رلا دیا، جب اس کے آنسو کچھ تھمے تو امام اوزاعی نے پھر اپنی تقریر شروع کی، فرمایا

امیر المومنین! آپ کے دادا حضرت عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مکہ اور طائف کی امارت کی خواہش کی تو آپ نے فرمایا کہ اے میرے چچا! "امارت جس کا حق ادا نہ کیا جائے اس سے الگ تھلگ رہنا زیادہ بہتر ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے جو محبت اور تعلق خاطر تھا اس کی بنا پر انہوں نے ان کو امارت سے دور رہنے کا مشورہ دیا، اس لئے کہ آپ خدا کے یہاں اس کے وبال سے ان کو بچا نہیں سکتے تھے، جب یہ آیت نازل ہوئی وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ تو آپ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ، اپنی پھوپھی، اپنی صاحبزادی حضرت صفیہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کرکے فرمایا۔

انی لست اغنی عنکم من اللّٰہ شیئا الا لی عملی ولکم عملکم[1] — میں خدا کے یہاں تم کو بچا نہ سکوں گا، ہوشیار کہ میرے لئے میرا عمل ہے، اور تمہارے لئے تمہارا عمل،

حضرت عمرؓ نے فرمایا ہے کہ لوگوں کے معاملات کی ذمہ داری وہی شخص اٹھا سکتا ہے، جو اچھی رائے اور پختہ عقل رکھتا ہو، لوگوں کی دیکھ بھال کرتا ہو، اس سے برائی نہ پیدا ہوتی ہو، وہ بے دینی پر لپکتا نہ ہو، اور خدا کے معاملہ میں لومۃ لائم سے ڈرتا نہ ہو، پھر آپؓ نے فرمایا کہ حاکم کئی طرح کے ہوتے ہیں، ایک تو وہ مضبوط، قوی الارادہ حاکم جو اپنے کو بھی قابو میں رکھے، اور اپنے کارندوں کو بھی، تو یہ مجاہد فی سبیل اللہ ہے، جس پر خدا کی رحمت سایہ فگن رہتی ہے دوسرے وہ کمزور حاکم جو اپنے کو تو قابو میں رکھتا ہو، مگر اس کے عمال اور کارندے اس کی کمزوری کی وجہ سے نفس پروری میں منہمک ہو جائیں، تو یہ ہلاکت و تباہی کے کنارے کھڑا ہوا ہے، بس اللہ ہی اس کو بچا سکتا ہے، تیسرے وہ حاکم جو عمال پر تو کڑی نگاہ رکھتا ہے مگر خود نفس کا بندہ ہے، تو یہ اس ظالم چرواہے کی طرح ہے، جس کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے شر الرعاء الحطمۃ بدترین چرواہا وہ ہے جو جانوروں پر ظلم کرتا ہو،

مجھے حضرت عمرؓ کا یہ قول بھی معلوم ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اے اللہ! اگر تو یہ جانتا ہے اگر دو فریق میرے پاس آئیں اور میں ان میں سے اس شخص کی طرف مائل ہو جاؤں جو حق سے دور ہو، خواہ میرا رشتہ دار ہو یا اجنبی تو مجھے ایک لمحہ کی بھی مہلت نہ دے،

امیر المومنین! سب سے سخت چیز قیام حق اور خدا کے یہاں سب سے معزز چیز تقویٰ ہے جو شخص اللہ کی اطاعت کے ذریعہ عزت چاہتا ہے، اللہ اس کو بلندی و عزت دیتا ہے، اور جو شخص اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور عزت کا خواہاں ہوتا ہے، خدا اسے پست و ذلیل کر دیتا ہے،

امام اوزاعی کہتے ہیں کہ یہ تقریر کرنے کے بعد میں مجلس سے اٹھ گیا، منصور نے پوچھا کہ یہاں سے کہاں جانے کا قصد ہے، بولے وطن، اگر آپ اجازت دیں، منصور نے کہا آپ کو اجازت ہے، میں آپ کا مشکور ہوں

---

[1] بخاری شریف میں یہ روایت ذرا اور تفصیل کے ساتھ آئی ہے۔

کہ آپ نے مجھے ایسی قیمتی نصیحتیں کیں، میں ان کو نہایت خوشی سے قبول کرتا ہوں، خدا مجھے ان پر عمل کی توفیق دے اور میری مدد کرے، وہو حسبی ونعم الوکیل، میں امید کرتا ہوں کہ آپ آیندہ بھی اسی طرح اپنی زیارت سے سرفراز کرتے رہیں گے، امام اوزاعی یہ کہکر رخصت ہوئے کہ انشاءاللہ ایسا ہی کروں گا، منصور نے حکم دیا کہ آپ کو سفر خرچ دے دیا جائے، چنانچہ آپکے سامنے پیش کیا گیا، مگر آپنے اسے قبول نہیں کیا اور فرمایا۔

ماکنت لا بیع نصیحتی بعرض	میں اپنی نصیحت کو دنیا کی ایک حقیر متاع کیا،
عن الدنیا و لا بکلھا	پوری دنیا کے بدلہ بھی نہیں بیچ سکتا

راوی کا بیان ہے کہ منصور کو چونکہ ان کے طرز عمل سے واقفیت تھی، اس لئے ان کے رد کردینے سے کبیدہ خاطر نہیں ہوا،

اس نصیحت نامہ کے ایک ایک لفظ سے امام کے خلوص وللّٰہیت اور حق گوئی کا پتہ چلتا ہے، آپ کی للّٰہیت اور خلوص ہی کا نتیجہ تھا کہ منصور جس کے استبداد و جبر کا ایک زمانہ شکار ہو چکا تھا، وہ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا، اس میں منصور کی کوئی ایسی کمزوری نہیں ہے جسکا ذکر نہ کیا گیا ہو، مگر جو کسی شخص معمولی بات سننا گوارہ نہ کرتا ہو، وہ اپنی کمزوریاں اس شخص کی زبان سے سنتا اور ان کے دور کرنے کا وعدہ کرتا ہے، جس کے بارے میں معلوم تھا کہ وہ عباسیوں کی حکومت کو پسند نہیں کرتا۔

انہوں نے حکومت کے بعض ایسے معاملات میں دخل اندازی کی ہے، جس کی توقع اس زمانہ میں نہیں کی جاسکتی تھی، اوپر مسلمانوں کے فدیہ دے کر رہا کرانے اور لبنان کے عیسائیوں پر ظلم سے باز رکھنے کا ذکر آچکا ہے، وہ غالباً حضرت عمر بن عبدالعزیز کا زمانہ واپس لانا چاہتے تھے، یہی وجہ ہے کہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے ہوش وحواس کی حالت میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کو دیکھا ہے۔ (تاریخ الصغیر بخاری ص)

بقیہ الرشاد کی ڈاک صفحہ ۴۳ سے آگے

یہ آپکے ذوق کی کتاب ہے اسے ضرور دیکھیں، مدرسۃ الرشاد کے عربی درجے کا نصاب بھیجوایا جاسکے تو کرم ہوگا، ضلع اعظم گڈھ کے مرکزی عربی مدارس کے نام اگر الرشاد کی کسی اشاعت میں لکھ دیں تو بڑی عنایت ہوگی۔ اس سے پہلے والے خط میں اعظم گڈھ جاکر آپسے ملاقات نہ ہوسکنے کا افسوس ظاہر کرچکا ہوں۔ الرشاد اور آپکے چند رسائل دیکھنے کے بعد اس میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ خط ضرورت سے زیادہ لمبا ہوگیا ہے اور میں نے ایکساتھ کئی فرمائشیں لکھ دی ہیں، اس تکلیف

کی تکلیف دہی پر بے حد معذرت خواہ ہوں۔ فقط والسلام مخلص شیخ بدیع الزمان مدیر اردو ادب ...

ہندی اسلامی تہذیب کے
ایرانی اور زردشتی عناصر

(جناب کبیر احمد صاحب جائسی (علیگ) ریڈر اقبال انسٹی ٹیوٹ۔ کشمیر یونیورسٹی۔ سری نگر)

ہندوستان میں اسلام جن لوگوں کے ذریعہ پھیلا ان میں سے زیادہ تر افراد وسط ایشیا اور ایران سے آئے تھے۔ ان میں بہت سے خانوادے ایسے بھی تھے جن کے آبا و اجداد تو نسلاً عرب تھے مگر ان کو ایران اور وسط ایشیا میں رہتے رہتے اتنی مدّت گذر چکی تھی کہ وہ لوگ بھی فکر وعمل کے لحاظ سے ایرانی یا وسط ایشیائی بن چکے تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایران اور وسط ایشیا سے آنے والے افراد نے تو اپنے آئین و آداب کی بڑی حد تک حفاظت کی اور ان کو ہندوستان کی فضا میں اس طرح رچا بسا دیا کہ وہ ہندوستانی معلوم ہونے لگے۔ مگر وہ عرب جو وقتاً فوقتاً غزوات، جہاد یا تجارت کے سلسلہ میں ایران یا وسط ایشیا کیطرف ہجرت کرتے رہے وہ ایرانی یا وسط ایشیائی معاشرے میں کچھ اس طرح گھل مل گئے کہ ان کی "عربیت" افسانۂ پارینہ معلوم ہونے لگی، اور وہ ایرانی آئین وتہذیب کے نمائندے بن کر دنیا کے سامنے ابھرے اور زندگی کے ہر شعبہ پر اپنے اَن مٹ اثرات چھوڑ گئے۔ ایرانی اور وسط ایشیائی معاشرے میں عرب اس طرح کیوں جذب ہوئے اور ان کی اصل خصوصیت کیوں باقی اور برقرار نہ رہ سکی؟ اس موضوع پر تو پھر کبھی اظہار خیال کیا جائے گا اس وقت تو صرف اتنا ہی عرض کرنا مقصود ہے کہ ہندوستان میں جو اسلام پھیلا وہ براہ راست

عرب سے نہیں بلکہ ایران اور وسط ایشیا سے آیا تھا اور اسلام کے آنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں جو تہذیب پروان چڑھی اور بعد میں اسلامی تہذیب کے نام سے موسوم ہوئی وہ دراصل ایرانی اور وسط ایشیائی تہذیب تھی جس میں اسلامی عناصر بھی شامل ہو گئے تھے۔ اس تہذیب نے ہندوستان کی معاشرت، بولیوں، زبانوں، مصوری، موسیقی، ادب، فن تعمیر غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے پر اپنے بہت گہرے اور دور رس اثرات چھوڑے جن کے مظاہر آج کے ہندوستان میں بھی قدم قدم پر نظر آتے ہیں۔

ایرانی اور وسط ایشیائی مسلمان مذکورہ تہذیب و تمدن کے ساتھ ساتھ ایک چیز اور بھی ہندوستان لائے جو وقت اور زمانے کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستانی معاشرہ میں اس طرح گھل مل گئی کہ اب وہ خالص ہندوستانی چیز معلوم ہوتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے جو اولین دستے آئے وہ انتہا سے زیادہ مذہبی رواداری کے حامل تھے وہ اپنے ساتھ صرف اسلامی تصورات ہی نہیں لائے بلکہ اس کے جلو میں وہ قدیم ایرانی اور زردشتی تصورات بھی ہندوستان میں داخل ہوئے جو ان اولین مسلمانوں کے لئے اجتماعی لاشعور کا درجہ رکھتے تھے۔ یعنی یہ وہ تصورات تھے جو ان کے آبا و اجداد کے ذریعہ ورثہ کے طور پر ان کو ملے تھے اور اس ورثہ کو انہوں نے نہ صرف محفوظ رکھا بلکہ اپنے ساتھ ہندوستان لاکر ان کو ایک ایسے سانچے میں ڈھال دیا جو خالص ہندوستانی سانچہ کہا جا سکتا ہے۔

ہندوستان آنے والے اِن مسلمانوں کے اِس عمل کو چاہے جس نام سے یاد کیجئے اس کو "عرب دشمنی" سمجھے یا کچھ اور مگر حقیقت یہ ہے کہ انہی مسلمانوں کے اثر سے ہندوستان کے لوگ قدیم ایرانی و تورانی بادشاہوں، بہادروں، ہیروؤں، زشت کردار لوگوں اور زردشتی تصورات سے نہ صرف آشنا ہوئے بلکہ ان سے اس طرح متاثر ہوئے کہ ان الفاظ کو ہندوستان کے لوگوں نے اپنے ذخیرۂ الفاظ میں شامل کرکے اپنے الفاظ کے ذخیرہ کو وسیع کیا اور ان الفاظ کو نئے نئے معانی و مفاہیم بھی عطا کئے۔

اصل موضوع پر اظہار خیال کرنے سے پہلے ایک اور نکتہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن قدیم ایرانی اور زرتشتی تصورات کی طرف گذشتہ سطور میں اشارہ کیا گیا ہے وہ مسلمانوں کے ذریعہ نہیں بلکہ ان پارسی مہاجرین کے ذریعے عام ہوئے ہوں گے جو ایران سے ترک وطن کرکے ہندوستان میں بس گئے تھے، ہمارے خیال میں ایسا کہنا درست نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو پارسی ہندوستان میں بس گئے تھے انہوں نے اپنی نسلی اور مذہبی شناخت برقرار رکھنے کے لئے نہ صرف اوستائی رسم خط کو برقرار رکھا تھا بلکہ اپنے عبادت خانے اور مذہبی کتابوں کو بھی دوسروں کی نظر و دسترس سے دور رکھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ عرصہ دراز تک وہ ہندوستان کے لوگوں سے رسمی اور کاروباری تعلقات رکھتے رہے۔ اور نہ تو وہ کسی پر اثر انداز ہوئے اور نہ ہی انھوں نے ہندوستان کے کسی فرقے یا طبقے پر اپنا کوئی گہرا اور دیرپا اثر چھوڑا، ان پارسیوں کو جب ہندوستان میں رہتے رہتے ایک مدت گذر گئی تو انہوں نے محسوس کیا کہ ان کو اپنے گنبدے در سے نکل کر کھلی اور آزاد فضا میں سانس لینی چاہئے اس احساس کو انہوں نے جب عملی جامہ پہنایا تو ان سے ایک چوک ہوگئی۔ انہوں نے اپنے اظہار خیال اور مذہبی تبلیغ کے لئے جس زبان کا انتخاب کیا وہ کوئی ہندوستان گیر زبان نہ تھی بلکہ ایک علاقائی زبان تھی جس کا دائرہ کار و اثر بہت محدود تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہندوستانی زبان گجراتی اختیار کر لینے کے باوجود ایک عرصہ دراز تک پارسی حضرات ہندوستان کے دوسرے فرقوں کے لوگوں سے کٹے کٹے رہے۔ ان کے جو مذہبی تصورات و افکار ہندوستانیوں میں عام ہوئے وہ ان مسلمانوں کی کوششوں کا نتیجہ تھے جو ایران اور وسط ایشیا سے ترک وطن کرکے ہندوستان آئے تھے۔ اس سلسلہ میں خود پارسیوں نے نہ تو کوئی کوشش کی اور نہ ہی ایسا کرنا ان کی تہذیبی اور نسلی شناخت کے لئے مفید تھا۔

ہم اپنے اس مطالعہ کا آغاز پہلے ان الفاظ و تصورات سے کرتے ہیں جو یا تو فارسی باستان کے الفاظ ہیں یا اوستائی زبان کے لیکن ان کو ہندوستانی مسلمانوں نے اس

طرح اپنے مذہبی تصورات کا جزو بنالیا ہے کہ ان کا غیر عربی یا یوں کہئے غیر اسلامی ہونا محسوس تک نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر یہاں وہ چند اسماء پیش کیے جاتے ہیں جو آج کے ہندوستانی اسلامی معاشرے کے جانے پہچانے اسماء ہیں اور جن کے مترادفات عربی زبان میں موجود ہیں مگر وسط ایشیائی اور ایرانی مسلمانوں کے اثرات سے ہندوستانی مسلمان انہی غیر عربی اسماء اور اصطلاحات میں اپنے مذہبی تصورات وخیالات کو ظاہر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان چند الفاظ پر غور فرمائیں۔ خدا۔ ایزد و یزدان۔ سروش، رستخیز یا رستاخیز۔ نماز۔ فرشتہ۔ روزہ۔ اہرمن یا اہرمن۔ بہشت اور دوزخ۔

یہ سارے کے سارے الفاظ کسی نہ کسی شکل میں پہلوی یا اوستائی زبان میں موجود تھے۔ اور ان کے معانی بھی آج کے مروج معانی سے مختلف تھے۔ سب سے پہلے خدا کا لفظ لیجئے جو ہندوستانی مسلمانوں میں اللہ کے لفظ کے مترادف کے طور پر نہ صرف یہ کہ مستعمل ہے بلکہ اللہ کے لفظ کے مقابلہ میں کچھ زیادہ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لفظ پہلوی الاصل ہے۔ پروفیسر نذیر احمد صاحب نے اپنے ایک مقالے میں تحریر فرمایا ہے کہ "پہلوی اشکانی میں" خودائے " "تھا" پہلوی اور پاژند دونوں ہی میں اس لفظ کے معنی بادشاہ کے تھے اور یہ لفظ کبھی بھی اللہ کے معنوں میں استعمال نہ ہوتا تھا۔ یہ لفظ ایرانی اور وسط ایشیائی مسلمانوں کے ہمراہ ہندوستان آیا جس سے شہنشاہیت اور پادشاہت کا تصور تو بالکل مفقود ہوگیا اور یہ لفظ صرف اللہ کے لفظ کے مترادف کے طور پر استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ آج بھی اللہ کے لفظ کے مقابلہ میں خدا کا لفظ ہمارے معاشرہ میں زیادہ مستعمل ہے۔

کچھ یہی حال ایزد و یزداں کے الفاظ کا بھی ہے۔ اوستائی زبان میں جس لفظ کا تلفظ "یزتا" تھا وہ پہلوی زبان میں ایزد ہوگیا ہے جو اسی شکل میں فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں استعمال ہوتا ہے۔ فارسی اور اردو میں یہ لفظ خالق اور اللہ کے لئے بولا جاتا ہے مگر یہ جس زبان کا لفظ ہے اس میں اس کے معنی بالکل ہی دوسرے ہیں اوستائی زبان میں "یزتا" کا لفظ "اہورامزدا" کی ایک ایسی مخلوق کے لئے استعمال

ہوا ہے جس کا نام بالکل فرشتوں جیسا ہے اور اس مخلوق کی تعداد ہزاروں سے بھی متجاوز ہے، لطف کی
بات یہ ہے کہ "اہورا مزدا" کی مخلوقات میں ایک مخلوق ایسی بھی جو "ایزد" سے بلند اور اعلیٰ مرتبہ
پر فائز ہے۔ اور اس کی تعداد اوستا کے مطابق صرف سات ہے۔ یہ کہنا تو دشوار ہے کہ کس طرح ایرانی
اور وسط ایشیائی مسلمانوں نے ایک ایسی مخلوق کے نام کو خدائے واحد کے نام کے طور پر استعمال کرنا
شروع کیا جس کی تعداد ہزاروں سے زیادہ ہے۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ ایزد کا لفظ فارسی اور اردو
دونوں زبانوں میں خدائے واحد کے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے، جہاں تک لفظ یزداں کا تعلق ہے
یہ لفظ "ایزد" کے جمع کے طور پر پہلوی زبان میں مستعمل تھا اور اس کا اصل تلفظ "ایزداں" تھا، اس
جمع کے علاوہ دو لفظ اور بھی تھے جو لفظ ایزد کی جمع کے طور پر استعمال ہوتے یعنی ہماری مراد "یزتاں"
اور "یزداں" کے الفاظ سے ہے۔ یزداں کا لفظ فارسی زبان میں برقرار رہا، اور ایرانی و وسط
ایشیائی مسلمانوں کے اثر سے ہندوستان کے اسلامی معاشرے سے بھی اس کو قبولیت کی سند ملی، اس سلسلے
میں ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ یزداں کا لفظ اپنی شکل کے اعتبار سے تو جمع ہے، مگر اب معنی کے
اعتبار سے اس کا شمار واحد الفاظ میں ہوتا ہے۔ ایزد اور ایزداں، یہ دونوں الفاظ ہماری زبان
اور معاشرہ میں اس طرح رچ بس گئے ہیں، کہ ان کے غیر اسلامی اور غیر ملکی ہونے کا احساس تک نہیں
ہوتا

اسی طرح فرشتہ کا لفظ فارسی اور اردو زبانوں میں "ملک" کے لفظ کے مترادف کے طور پر
استعمال ہوتا رہا ہے۔ اور آج بھی مستعمل ہے۔ یہ لفظ اپنی اصل کے لحاظ سے ایک قدیم ایرانی لفظ ہے جس
کا اوستائی تلفظ فرایشتا (फराएश्ता) ہے، اور فارسی باستان میں فرایشتا------
(फराईश्ता)۔ اوستا اور فارسی باستان میں اس لفظ کے معنیٰ صرف "فرستادہ" کے ہیں،
یہ بات تحقیق طلب ہے کہ کب اور کیونکر "ملک" کو ایرانی اور وسط ایشیائی مسلمانوں نے فرشتہ کہنا شروع
کیا؟ ایک قیاسی وجہ اس کی یہ ہو سکتی ہے کہ مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت جبرئیل علیہ السلام
باری تعالیٰ کا کلام لے کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لائے تھے، چونکہ وہ فرستادۂ خدا
تھے اس لئے ممکن ہے کہ اول اول ان کو فرشتہ کے لقب سے ملقب کیا گیا ہو، اور وقت و زمانہ گذرنے
کے ساتھ ساتھ اس لفظ میں اتنی وسعت پیدا کرلی گئی ہو کہ اس کا اطلاق ملائکہ کے پورے طبقے پر کیا جانے

لگا ہو۔ بہر حال یہ امر تحقیق طلب ہے اور اس سلسلہ میں کوئی حتمی بات نہیں کہی جا سکتی، فرشتہ کا لفظ ہندوستان کے اسلامی معاشرے میں کچھ اس طرح جذب ہو گیا ہے کہ اس کی اصل وکنہ کی طرف ہمارا دماغ متوجہ ہی نہیں ہوتا اور ہم اس کو ایک " اسلامی " لفظ سمجھتے ہیں، حالانکہ اس لفظ کے اصل اور سیدھے سادے معنی فرستادہ کے ہیں،

اب آیئے نماز اور روزہ کے الفاظ کی طرف۔ فارسی اور اردو میں عربی لفظ "صلوٰۃ" کے مترادف کے طور پر " نماز " کا لفظ بولا جاتا ہے، ہندوستان میں تو صلوٰۃ کا لفظ استعمال کرنے والے معدودے چند ہی ہوں گے۔ نماز کا لفظ پاژند کے لفظ " نماژ " کی یاد دلاتا ہے، اور گمان غالب یہی ہے کہ یہ لفظ براہ راست پاژند سے اخذ کیا گیا ہے۔ اور " ژ " کو " ز " سے بدل دیا گیا ہے۔ اوستائی زبان میں اس کی دو شکلیں ملتی ہیں، کہیں کہیں پر اس کو " نمہ " کہا گیا ہے، جس میں دعا کا مفہوم غالب ہے۔ اور کہیں کہیں پر " نمہ " کی جگہ پر " نمس " کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ یہی لفظ جب پہلوی زبان میں استعمال ہوتا ہے تو اس کا تلفظ " نمج " ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں میں نماز کا جو طریقہ رائج ہے۔ زردشتیوں کے یہاں اس طرح کی کوئی عبادت نہیں تھی۔ بلکہ ان کے یہاں آتش کدوں میں دعا خوانی ہوتی تھی، اس لئے یہ سمجھنا تو دشوار ہے کہ ایرانی اور وسط ایشیائی مسلمانوں نے اپنی صلوٰۃ کو نماز کا نام کیوں دیا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ چونکہ صلوٰۃ کا اختتام دعا پر ہوتا ہے اس لئے انہوں نے صلوٰۃ ہی کو اس نام سے موسوم کرنا شروع کر دیا ہو، جس کو ان کے آباواجداد دعا کے معنوں میں بولتے تھے۔ وہ یہی لفظ لے کر ہندوستان آئے اور انہی کے زیر اثر ہندوستان میں بھی صلوٰۃ کی جگہ پر نماز کا لفظ اس طرح رائج ہو گیا کہ اب اگر ہم نماز کا لفظ ترک کر کے صلوٰۃ کا لفظ رائج بھی کرنا چاہیں تو عوام کو اس لفظ (نماز) کے ترک کرنے میں بہت تکلف ہوگا۔

یہی حال روزہ کے لفظ کا بھی ہے، اس لفظ کی کوئی نہ کوئی شکل اوستا، فارسی باستان اور پہلوی تینوں زبانوں میں ملتی ہے۔ اس لفظ کی اوستائی شکل " ز اُچاہ " ([illegible]) ہے جو فارسی باستان میں " ز اُوچاہ " (रऊचाह) اور پہلوی میں روچ (रोच) ہے۔ جہاں تک اس لفظ کے معنی کا تعلق ہے اوستا میں اس کے معنی روشنی کے ہیں، اور فارسی باستان پہلوی میں دن کے۔ اوستا، فارسی باستان اور پہلوی تینوں زبانوں میں اس لفظ کے جو معنی ہیں اس کا

تعلق مذہبی عمل سے نہیں ہے ۔ نہ جانے کس طرح اور کیوں وسط ایشیائی اور ایرانی مسلمانوں نے اس لفظ کو صوم کا مترادف قرار دے دیا ، ممکن ہے کہ اس لفظ کو صوم کے معنی میں استعمال کرنے کی وجہ یہ ہو کہ روزہ کی ابتدا روشنی کے پھوٹنے سے پہلے پہلے ہی ہو جاتی ہے ، اور اس کا اختتام روشنی کے ختم ہونے پر ہوتا ہے ۔ چونکہ روزہ کی ابتدا اور اختتام دونوں ہی کا تعلق کسی نہ کسی شکل میں روشنی سے ہے ۔ اس لئے ایرانی اور وسط ایشیائی مسلمانوں نے صوم کے لفظی معنی کو ظاہر کرنے کے لئے روزہ کا لفظ منتخب کر لیا ہو ، جس میں دن کے بھی معنی مضمر ہیں اور روشنی کے بھی ، بہرحال اتنی بات تو مسلم ہے کہ روزہ کا لفظ خالص ایرانی لفظ ہے جو وسط ایشیائی اور ایرانی مسلمانوں کے ہمراہ ہندوستان آیا ، اور یہاں کے معاشرے اور زبان میں جذب ہو کر رہ گیا ،

ابھی تک ہم نے جن الفاظ کا مطالعہ پیش کیا ہے وہ نہ تو عربی ہیں اور نہ ہی خالص اسلامی ، لیکن ہندوستانی مسلمانوں نے ان قدیم ایرانی اور زرتشتی الفاظ کو اس طرح اپنی مذہبی لغت کا جزو بنالیا ہے کہ اب ان الفاظ کو ترک کرنا دشوار ہی نہیں بلکہ ایک حد تک ناممکن بھی ہے ۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے دوسرے الفاظ پیش کیے جا سکتے ہیں جو ہندوستانی مسلمانوں کی مذہبی اصطلاح بن گئے ہیں اور ان الفاظ کا سہارا لیے بغیر کوئی بھی ہندوستانی مسلمان اپنے مذہبی خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا ۔ اس طرح کے الفاظ میں بہشت ، دوزخ ، سروش ، رستخیز یا رستا خیز وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں ۔ ہم مذکورہ الفاظ سے صرف نظر کرتے ہوئے اس مطالعے کے دوسرے حصے کی طرف آتے ہیں ۔

ایرانی اور وسط ایشیائی مسلمان جب ہندوستان آئے تو اس زمانے میں ایران میں شاہنشاہیت کو قائم ہوئے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کا عرصہ گذر چکا تھا ۔ اس مدت میں جن خاندانوں نے ایران پر حکمرانی کی ان کو ہم بآسانی دو حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں ، پہلے حصے میں تو ایران کے وہ شاہی خاندان آتے ہیں جن کا کوئی ریکارڈ دنیا میں باقی نہیں ہے ، اور ان کے بارے میں ہماری جو معلومات ہیں وہ سینہ بہ سینہ چلی آنے والی ان افسانوی روایات پر مشتمل ہیں جن میں بیشتر کا تذکرہ پہلوی زبان کے شاہناموں اور پھر فردوسی کے شاہنامہ میں موجود ہے ۔ دوسرا حصہ ان شاہی خاندانوں پر مشتمل ہے جن کے بارے میں یونانی اور عرب مورخین کی شہادتیں دستبرد زمانہ سے محفوظ ہیں ۔ اس کے علاوہ خود ان کے زمانے کے بہت سے کتبے مکشوف ہو گئے ہیں جن کی مدد سے ان کی شخصیت اور عہد کے بارے میں صحیح رائے قائم

کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ ہم نے درج بالا سطور میں جن بادشاہوں کا تذکرہ کیا ہے، ان کے نام اور کارنامے ایرانی اور وسط ایشیائی مسلمانوں کے اجتماعی لاشعور کا ایک حصہ بن چکے تھے۔ قبول اسلام کے بعد بھی ان ایرانی اور وسط ایشیائی مسلمانوں نے اپنے اس تہذیبی ورثے اور اجتماعی لاشعور کی اس طرح آبیاری کی کہ وہ ان کو اپنے ہمراہ ہندوستان لائے اور ہندوستان لاکر انھوں نے ان افراد کو ہندوستانی زبانوں سے اس طرح روشناس کرایا کہ وہ ان کا ایک ناقابل تقسیم جز بن گئے۔ صرف اردو ہی میں نہیں بلکہ فارسی سے متاثر ہونے والی دوسری زبانوں میں بھی گیومرث، ہوشنگ، ضحاک، فریدون، ایرج، نوذر، گرشاسپ، تہماسپ، کیقباد، کیکاؤس، سیاوش، افراسیاب، لہراسپ، بہمن، داراب، دارا، سکندر، اردشیر اور خسرو پرویز جیسے بادشاہوں کے نام اور کارنامے اس طرح بیان ہوئے گویا یہ شخصیتیں غیر ملکی نہیں بلکہ ہندوستانی ہوں۔ ان بادشاہوں کے علاوہ جوانمردوں پہلوانوں، ہیروں میں اردو کے علاوہ دوسری زبانوں میں بھی رستم، سہراب، زال، روداب، بہرام، برزو، گیو اور گودرز کے قصے اسی طرح مشہور ہیں جس طرح ہندوستانی نبرد آزماؤں کے قصے۔ عشق و عاشقی کے میدان میں دیکھئے تو شیریں و فرہاد، بیژن و منیژہ کے قصے ہندوستان میں اسی دلچسپی سے پڑھے اور سنے جاتے ہیں، جس دلچسپی سے لوگ ہیر رانجھا اور سسی پنوں کے قصوں کو پڑھتے ہیں۔ ہندوستان آنے والے وسط ایشیائی اور ایرانی مسلمانوں نے ہندوستان کی زبانوں کو زردشت، اوستا، ژند، پاژند، مانی، مزدک، آتش کدہ، مغ اور موبد سے صرف آشنا ہی نہیں کیا بلکہ ان کے بارے میں معلومات کا وہ خزینہ بھی دیا جو ہندوستان کی مشترکہ تہذیب کا گرانمایہ حصہ ہے۔

قدیم ایرانی اور زردشتی الفاظ، افکار و افراد کا یہ مختصر ترین جائزہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے بہت کافی ہے کہ ہندوستان آنے والے مسلمان اپنے ساتھ صرف مذہب اسلام اور اسلامی تصورات ہی نہیں لائے بلکہ قدیم ایرانی اور زردشتی تہذیبی ورثہ بھی اپنے ہمراہ لائے جو وقت اور زمانہ کے گذرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے تہذیبی ورثہ کا ایک ناقابل تقسیم جزو بن گیا۔

* * * *

مجلس

بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی مدظلہ

فرمایا کہ آپ کو معلوم ہے کہ دل کی موت اور اس کی حیات کیا چیز ہے؟ اللہ کی یاد سے جو غافل ہے۔ اللہ کے ذکر سے جو خالی ہے، وہ دل مردہ ہے۔ مشکوٰۃ شریف میں حدیث آئی ہے۔

عن ابی موسیٰ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مثل الذی یذکر ربہ والذی لا یذکر مثل الحی والمیت (متفق علیہ) (مشکوٰۃ باب ذکر اللہ ج، ص۱۹۶)

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ "مثال اس آدمی کی جو اپنے رب کا ذکر کرتا ہے اور اس کو یاد کرتا ہے اور اس آدمی کی جو اپنے رب کو نہیں یاد کرتا بلکہ بھولا ہوا ہے زندہ اور مردہ کی سی ہے،

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا، اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنے والا، اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کرنے والا، اللہ تبارک و تعالیٰ کا نام رٹنے والا زندہ ہے، اور اس کا دل زندہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کو بھول جانے والا، اللہ کی بندگی سے جی چرانے والا، اس کی یاد سے غافل رہنے والا مردہ ہے، اس کا دل بھی مردہ ہے،

حقیقت میں دنیا کی زندگی فانی اور مٹ جانے والی ہے، اور دنیا کی بہار چند روزہ ہے جس پر ہم قربان ہو رہے ہیں، اللہ کے بندو! اس دنیا سے دل مت لگاؤ، اور آخرت کی طرف قدم بڑھاؤ، آخرت باقی رہنے والی ہے، وہاں کی راحت جاودانی ہے،

اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و کرم سے اپنی طرف بلانے کے لیے حضرات انبیاء علیہم السلام کو مبعوث

فرمایا اور اپنے اپنے زمانہ میں تمام پیغمبروں نے اللہ کا پیغام بندوں تک پہنچایا اور دین کی تبلیغ فرمائی اور اس میں انہوں نے طرح طرح کے مصائب برداشت کئے تکلیفیں جھیلیں، اخیر زمانہ میں ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھیجا اور نبوت کا سلسلہ آپ کے اوپر ختم ہو گیا، آپ خاتم النبیین ہیں، آپکے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا، اس لئے تاقیامت اب آپ ہی کی تعلیمات پر عمل کرنا ہوگا،

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے، توراۃ و انجیل، صحف ابراہیم، صحف موسیٰ، اور زبور داؤد سب کو اللہ تعالیٰ نے منسوخ فرما دیا ہے، اس لئے اب اگر نجات و فلاح ہوگی تو اسی کتاب پر عمل کرنے اور اسی کا اتباع کرنے سے ہوگی، کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے گا، وہ ضلالت و گمراہی کا طریقہ ہوگا، ہدایت تو بس اسی میں منحصر ہے،

قرآن کی عظمت کا ہم کو اندازہ ہی نہیں اور ہم کو یہ معلوم ہی نہیں کہ اس میں کتنا وزن ہے، اس اندازہ اس سے کیجئے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی، تو آپ کے چہرے سے اس کے آثار نمایاں ہوتے تھے، پیشانی مبارک سخت سردی کے باوجود پسینہ سے تربتر ہو جاتی تھی، بسا اوقات آپ اونٹ پر سوار ہوتے اور اس وقت وحی نازل ہونے لگتی تو اونٹ اس کے بوجھ سے بیٹھ جاتا تھا،

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تأثر کا تو پوچھنا ہی کیا، صحابہ کرام پر آیات قرآنی کا ایسا اثر ہوتا تھا کہ بعض وقت اس کی وجہ سے کئی کئی روز بیمار رہتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ گشت کو نکلے، اتفاقاً ایک مسلمان کے گھر کے پاس سے آپ کا گذر ہوا تو وہ قرآن پاک پڑھ رہے تھے، آپ کھڑے ہو کر ان کی تلاوت سننے لگے، انہوں نے سورۂ طور پڑھی، جب اس آیت پر پہنچے،

إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۝ مَا لَهُ مِن دَافِعٍ ۝ يَوْمَ تَمُورُ السَّمَاءُ مَوْرًا ۝ وَتَسِيرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ۝

بے شک آپ کے رب کا عذاب ضرور ہو کر رہے گا، کوئی اس کو ٹال نہیں سکتا، اور یہ اس روز واقع ہوگا جس روز آسمان تھرتھرانے لگے گا اور پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان آیات کو سن کر فرمایا قسم ہے پروردگار کعبہ کی یہ قسم حق ہے، پھر اپنی سواری سے اترے اور دیوار کے ساتھ تکیہ لگایا اور دیر تک ٹھہرے رہے پھر اپنی جگہ کو لوٹ آئے، اور گھر پہنچ کر ایک ماہ تک بیمار رہے، لوگ دور دور سے ان کی بیمار پرسی کو آتے اور یہ نہ سمجھتے تھے کہ

ان کی بیماری کیا ہے، کسی کو یہ پتہ بھی نہ تھا کہ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا کیا حال ہے اور ان کے دل پر کیا گذر رہی ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ ان کے نزدیک قرآن پاک کی کیسی عظمت تھی، ہم بھی تلاوت کرتے ہیں اور تلاوت سنتے ہیں مگر ہماری وہ کیفیت نہیں، آج ہم لوگ اپنے حالات میں غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کی عظمت ہمارے دلوں میں باقی نہیں اس لئے ہم محروم ہیں، اور جو لوگ تھوڑی بہت تلاوت کرتے بھی ہیں تو اس پر عمل کرنے والے کہاں ہیں، اللہ کی یہ ہی مقدس اور مبارک کتاب ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے بڑی شان سے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے، اس کتاب کی عظمت کا کیا پوچھنا، ہم تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے، اللہ تعالیٰ خود فرماتے ہیں۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ۔	یعنی اگر اس قرآن کو ہم کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا،

اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا مگر ہم پر جو اللہ کے کلام کا اثر نہیں ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے قلوب سخت ہو گئے ہیں، اور اس پر ایسا زنگ لگ گیا ہے کہ بڑی سے بڑی اثر کرنے والی چیز بھی اس میں کچھ اثر نہیں کرتی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے پھر اگر وہ توبہ کر لیتا ہے تو وہ نقطہ مٹ جاتا ہے، اور اگر توبہ نہیں کرتا اور گناہ کرتا ہی رہتا ہے تو وہی سیاہی بڑھتی رہتی ہے حتیٰ کہ پورا قلب سیاہ ہو جاتا ہے،

اس سے معلوم ہوا کہ گناہ سے دل میں تاریکی پیدا ہوتی ہے اور یہی تاریکی دل کا زنگ ہے، نیز معلوم ہوا کہ توبہ نہ کرنے کی وجہ سے قلب کی سیاہی بڑھتی ہی جاتی ہے، یہاں تک کہ سارا قلب سیاہ ہو جاتا ہے اور ایسے ہی دل کو مردہ دل کہتے ہیں، ہمارے قلوب تاریک ہو چکے ہیں مگر ہم لوگوں کو اسکا احساس نہیں ہوتا، مگر اللہ والوں کو قلب کی تاریکی کا بھی احساس ہوتا ہے، اسی طرح حق تعالیٰ کی اطاعت اور فرمانبرداری سے جو نور پیدا ہوتا ہے، اس کو بھی اللہ والے محسوس فرماتے ہیں، اگر ہم ان کے پاس جاتے اور ہمارے دلوں کا زنگ دور ہو جاتا تو ہم کو بھی قلب کی تاریکی اور اس کا نور محسوس ہونے لگتا۔

شیخ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ

"شیخ عبدالوہاب شعرانی رح متوفی ۹۷۳ھ کا شمار ان اکابر امت میں ہوتا ہے فقہ و تصوف میں جن کی کتابیں سند کی حیثیت رکھتی ہیں، ان کی کتاب "تنبیہ المغترین" کے ترجمہ "اخلاقِ سلف" کا ذکر اور اس کے اقتباسات الرشاد میں آچکے ہیں، تصوف میں ان کی دوسری اہم کتابیں "الطبقات الکبریٰ" اور "الیواقیت والجواہر" ہیں، معلم الامت حضرت مولانا وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہ کتابیں بہت پسند تھیں اور وہ ان کے اکثر مضامین اہل مجلس کو سنایا کرتے تھے، محترم مولانا قمرالزماں صاحب جو مولانا کے خویش ہونے کے ساتھ بحمد اللہ صاحب دل عالم بھی ہیں، انہوں نے الطبقات الکبریٰ کو اردو کا جامہ پہنانے کی کوشش کی ہے، انشاء اللہ آئندہ اس کتاب کے کچھ اقتباسات اس میں آتے رہیں گے، مگر کتاب کے اقتباسات سے پہلے بہتر معلوم ہوتا ہے کہ خود شیخ شعرانی کے سوانح حیات کے اہم پہلو سامنے آجائیں، اس لئے ہم یہاں مولانا عبدالحلیم صاحب چشتی مد ظلہ کی وہ تحریر نقل کرتے ہیں جو انہوں نے "مجالہ نافعہ" کی شرح کے ضمن میں لکھی ہے۔"

عبدالوہاب نام، ابوالمواہب کنیت ہے، سلسلہ نسب یہ ہے،

عبدالوہاب ابن احمد بن علی ابن احمد بن محمد بن موسیٰ الانصاری الشافعی المصری الشعرانی ۸۹۹ھ میں ساقیہ ابی شعرہ میں (جو منوفیہ مصر کے اطراف میں ایک مقام ہے) پیدا ہوئے بچپن میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اور شعرانی یتیم ہوگئے، ابتدائی تعلیم ساقیہ ابی شعرہ میں پائی، سات برس کی عمر میں انہوں نے قرآن مجید حفظ کیا اور اجرومیہ وغیرہ یاد کرلیں، بارہ برس کی عمر میں مصر

آئے اور جامع عمری میں ٹھہرے، یہیں منہاج، الفیہ، توضیح، تلخیص، شاطبیہ، قواعد ابن ہشام اور کتاب الروض (باب القضا تک) یاد کیں، اور پھر اپنے استادوں کو سنائیں،

شیخ امین الدین امام جامع عمری سے فن قرأت کی تحصیل کی، مشہور فقیہ و محدث شیخ شمس داخلی، نورالدین محلی، نورالدین جارحی، ملا علی عجمی، علی قسطلانی، علامہ شمونی، شیخ الاسلام قاضی زکریا انصاری، شمس الدین رملی سے تفسیر، حدیث اور فقہ وغیرہ پڑھی، پھر حدیث سے شغف ہوا اور اکابر شیوخ سے جن کی تعداد دو سو سے کم نہیں، حدیثوں کا سماع کیا، بعد ازاں تصوف کی طرف میلان ہوا تو شیخ نوصلی، شیخ موصفی، شیخ محمد شناوی سے جو اس زمانہ کے نہایت بلند پایہ صوفیا میں سے تھے، اس فن کی تکمیل کی، شیخ زیادی نے اپنے رحلہ (سفر نامہ) میں بصراحت لکھا ہے۔

واخذ الطریق عن نحو ماۃ شیخ — انہوں نے تصوف کی تعلیم سو سے زیادہ شیوخ سے حاصل کی ہے۔

اس اعتبار سے موصوف کی شیوخ کی تعداد تین سو سے کم نہیں ہے، جن میں سے بعض کا ذکر طبقات اور ذیل طبقات میں کیا ہے، اور القلائد المشحون میں شیوخ طریقت کو نام بنام گنایا ہے۔

شیخ شعرانی رحمہ نے مجاہدہ اس طرح کیا کہ کئی برس تک مطلق نہیں سوئے، چھت میں ایک رسی باندھ لی تھی، خلوت میں اسے گردن میں ڈال لیتے تھے تاکہ گر نہ پڑیں، کئی کئی دن برابر کچھ نہیں کھاتے، اور مسلسل روزے رکھتے تھے، بس چند اوقیہ (۱½ رطل) روٹی کے ٹکڑوں پر افطار کرتے تھے، کھال کی ٹوپی اوڑھتے اور پیوند کے کپڑے پہنتے تھے، اخلاق و عادات، گفتار و کردار میں موصوف اپنے شیوخ کا نمونہ تھے، اور مرتے دم تک ان ہی کے طریقہ پر عمل پیرا رہے تھے،

ان کی خانقاہ میں عشا کے بعد سے مجلس ذکر کا آغاز ہوتا تو فجر تک یہ مجلس قائم رہتی تھی، شب جمعہ میں موصوف پوری رات درود شریف پڑھتے تھے، اس خانقاہ میں سو نابیناؤں کو کپڑا ملتا تھا اور علاوہ رضائے الٰہی کی تربیت ہوتی تھی،

شعرانی تازندگی ارشاد و تبلیغ، درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں مشغول رہے، حاسدوں نے ان کو بدنام کرنے کے لئے ان کی تصانیف میں بعض خلاف شریعت باتوں کا اضافہ کر دیا تھا، جس کی وجہ سے کچھ خلفشار ہوا، مگر اللہ تعالیٰ نے حاسدین کو رسوا و ذلیل کیا اور ان کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا۔

علامہ عبدالرؤف مناوی طبقات میں لکھتے ہیں:

"ہمارے شیخ امام، عالم، عابد، زاہد، فقیہ، محدث اصولی، صوفی اور سالک کی تربیت کرنے والے جو محمد بن حنفیہ کی اولاد میں سے تھے، انہیں حدیث سے شغف ہوا تو اس میں منہمک ہوگئے اور اس فن کو اہل فن سے حاصل کیا، لیکن ان میں ایسا جمود نہیں تھا جیسا کہ محدثین اور جامعین حدیث میں ہوتا ہے، بلکہ وہ فقیہ النفس اور صوفی مشرب بزرگ تھے، اقوال سلف اور مذاہب خلف کے امام تھے، وہ فلاسفہ پر دار وگیر کرنے اور ان کی تنقیص کرنے سے منع کرتے تھے، اور جو ان کی مذمت کرتے ان کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور فرماتے کہ یہ دانشمند لوگ تھے، موصوف سنت کے بڑے پابند تھے، ورع و تقویٰ میں مبالغہ کرتے تھے، اور فاقہ مست کو کھانے پینے اور پہننے میں اپنے اوپر ترجیح دیتے اور تکلیف کو برداشت کرتے تھے، اپنے اوقات کو تصنیف و تالیف، عبادت و ریاضت اور درس و تدریس اور سلوک کی تعلیم میں تقسیم کر رکھا تھا"،

نجم الدین غزی، الکواکب السائرہ (ج ۳ صفحہ ۱۷۷) میں رقمطراز ہیں:

"کتابوں کا بہت مطالعہ کیا تھا، اللہ کی ان پر رحمت ہو، وہ علم، تصوف اور تالیف میں اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے تھے۔......... ان کی تمام کتابیں مفید ہیں اور ان کی تالیفات اس امر کی شاہد ہیں کہ موصوف کی بہت سے علماء اولیاء اور صلحاء سے صحبتیں رہی ہیں"

شیخ ابوالعباس احمد بن مبارک ملطی نے موصوف کا ذکر ان الفاظ سے کیا ہے:

"سیدنا الامام ولی العلماء عالم الاولیا مربی السالکین وبقیۃ الائمۃ العارفین المہتدین"

شیخ زیادی اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں:

" وہ اکثر مذاہب مروجہ اور غیر مروجہ کی تمام دلیلوں سے آگاہ تھے اور وہ اپنی غیر معمولی یادداشت اور کثرت معلومات کی بنا پر ان میں سے ہر مذہب کے علم استنباط سے واقف تھے، اس موضوع پر ان کی تالیفات پانچ ضخیم جلدوں میں پھیلی ہوئی ہیں اور اکثر دو ضخیم جلدوں میں ہیں"

حافظ سید عبدالحئی الکتانی فہرس الفہارس ج ۲ صفحہ ۲۶۶ میں لکھتے ہیں:

وہ عام طور پر قاضی زکریا، حافظ سیوطی، اور کمال الدین طویل قادری اور قلقشندی کے

اور اس طبقہ سے جو حافظ ابن حجر کے اصحاب پر مشتمل ہے روایت کرتے ہیں، نیز قسطلانی سے بھی راوی ہیں، ان کی فہرست چھپ چکی ہے جس میں اپنی مرویات کو بروایت سیوطی جمع کیا ہے۔"

۹۷۳ھ میں انتقال ہوا، اور اپنی خانقاہ میں دفن ہوئے۔

شیخ ابو الانس ملیجی شافعی ازہری نے موصوف کے اور ان کی اولاد و احفاد اور تلامذہ کے حالات میں دو کتابیں لکھی ہیں جن کے نام درج ذیل ہیں،

(۱) السر الربانی فی طریقۃ الشعرانی (۲) تذکرۃ اولی الالباب فی مناقب سیدی عبدالوہاب

موصوف کی تالیفات سے حسب ذیل کتابیں مشہور ہیں؛

(۱) الاجوبہ المرضیہ عن ائمۃ الفقہاء والصوفیہ (۲) الاخلاق الزکیہ والعلوم الدنیہ
(۳) الاخلاق المتبولیہ المفاضۃ من الحضرۃ المحمدیہ۔
(۴) ارشاد المغفلین من الفقہاء والفقراء الی شروط صحبۃ الامراء
(۵) الانوار القدسیہ فی لمزمۃ آداب العبودیۃ (۶) البحر المورود فی المواثیق والعہود
(۷) البروق الخواطف (۸) تنبیہ الاغنیاء علی قطرۃ من بحر علوم الاولیاء
(۹) تنبیہ المغترین فی القرن العاشر علی ما خالفوا فیہ سلفہم الطاہر
(۱۰) الجواہر والدرر (۱۱) الجوہر المصون والسر المرقوم فیما تنتجہ الخلوۃ من الاسرار والعلوم
(۱۲) حقوق اخوۃ الاسلام (۱۳) درۃ الخواص فی فتاوی سیدی علی الخواص
(۱۴) الدرر المنثورہ فی بیان زبد العلوم المشہورہ (۱۵) ردع الفقراء عن دعوی الولایۃ الکبرے۔
(۱۶) الدرر واللمع فی الصدق والورع (۱۷) السراج المنیر فی غرائب احادیث البشیر النذیر،
(۱۸) سر المسیر والتزود الیوم المصیر (۱۹) السر المرقوم فیما اختص بہ اہل اللہ من العلوم،
(۲۰) شرح جمع الجوامع (۲۱) الطراز الابہج علی خطبۃ المنہج
(۲۲) طہارۃ الجسم والفواد من سوء الظن باللہ تعالےٰ والعباد
(۲۳) علامات الخذلان علی من لم یعمل بالقرآن (۲۴) الفتح المبین فی ذکر جملۃ من اسرار الدین

شیخ نے حدیث و فقہ اور تصوف میں تقریباً ۳۰ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں

الرشاد کی ڈاک

معہد ملت مالیگاؤں

۲۸ر شوال المکرم ۱۴۰۲ھ

مخدومی و مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج عالی بخیر ہوگا، میں لکھنؤ سے واپسی پر آپ کی خدمت میں نصف یوم کے لئے حاضر ہوا آپ سے ملاقات کا بے پناہ شوق تھا، آپ کی تصنیفات سے میں پہلے ہی سے متأثر تھا لیکن ملاقات کے بعد آپ کے مقام علم، سادہ زندگی اور سرگرم حیات کو دیکھ کر نہ صرف دل پر گہرا اثر ہوا بلکہ اپنی مادر درسگاہ معہد ملت کے لئے نئے حوصلے اور جواں امنگیں لے کر واپس ہوا، بلاشبہ ہم جیسے نیازمندوں کے لئے آپ بزرگوں کا دم غنیمت اور بے بہا نعمت ہے۔ خدا آپ کی ذات سے ملت کو زیادہ سے زیادہ استفادہ کا موقع عنایت فرمائے۔

جامعۃ الرشاد میں ایک یوم کا قیام میرے لئے بڑا روح پرور اور علم آگیں رہا، آپ کی مخلصانہ کوششوں نے بلاشبہ اس ویرانے کو چمن زار علم بنادیا اور قبرستان کی خاموش فضا پر بہار علمی گلشن میں تبدیل ہوگئی، خدا آپ کو اس ہمت مردانہ پر جزائے خیر عطا فرمائے۔ آپ کی بندہ پروری ہے کہ اس ناچیز کو بیگانگی کے باوجود اپنی گراں بہا تصنیفات سے نوازا۔

میں ایک ہفتہ اعظم گڈھ مختلف قصبوں میں رہ کر مالیگاؤں واپس آگیا، آنمحترم سے بہت درخواست ہے کہ آپ کی کوئی بھی تازہ ترین کتاب شائع ہو تو اسے میرے نام معہد ملت مالیگاؤں کے پتہ پر ضرور ارسال فرمادیں۔ اور رسالہ جامعہ بھی مستقل طور پر جاری رکھیں، مولانا نعمانی صاحب بخیر ہیں، خصوصی دعاؤں کی درخواست ہے۔

مخلص

(مولانا) محمد حنیف ملی (مالیگاؤں)

دفتر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ / دفتر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام
پنجاب یونیورسٹی - لاہور

۲۴ / ۸ / ۱۹۸۲ء

فاضل محترم

السلام علیکم - مزاج گرامی - رسالہ الرشاد کے ساتھ آپ کے چند رسالے گذشتہ اپریل میں ملے تھے، ان کی رسید میں میں نے خط لکھا تھا اور چند استفسارات بھی کئے تھے، شاید میرا یہ خط آپ تک نہیں پہنچا، یا ہو سکتا ہے کہ آپ نے میرے خط کا جواب لکھا ہو اور مجھے نہ ملا ہو، کیونکہ آج کل ڈاک کا انتظام غیر تسلی بخش ہے - بہر حال چند سوالات پیش خدمت ہیں۔

(۱) آپ نے رسالہ الرشاد (جنوری، فروری ۱۹۸۲ء) کے صفحہ ۲۶ پر امام زہری کی کتاب المغازی کی اشاعت کا ذکر کیا ہے۔ اور ساتھ ہی آپ نے لکھ دیا ہے کہ یہ کتاب مصنف عبد الرزاق کے ضمن میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ فقرہ کچھ مبہم سا ہے۔ اگر آپ نے اس کتاب پر تبصرہ کیا ہے تو اسکی ایک کاپی ضرور بھجوا دیں کیونکہ آجکل ہمارے یہاں سیرت پاک پر مقالہ زیر تسوید ہے۔

(۲) عرب ممالک سے متقدمین کی کتابیں اس کثرت سے شائع ہوئی ہیں کہ انکا شمار مشکل ہے۔ کتب تفسیر میں معانی القرآن (الفرا اور الزجاج) شائع ہو چکی ہے۔ مراکش کی وزارت اوقاف نے ابن عطیہ اندلسی کی تفسیر القرآن چھاپ دی ہے، جو بقول ابن خلدون زمخشری کی کشاف سے بھی بہتر ہے۔ افسوس ہے کہ یہ تفسیر ابھی تک ہمارے یہاں نہیں پہنچی۔ التمہید شرح موطا (امام مالک) بھی مراکش سے شائع ہو چکی ہے۔ آپ نے دیکھی ہوگی۔ علوم اعجاز القرآن پر امام السیوطی کی کتاب معترک الاقران فی اعجاز القرآن تین جلدوں میں چھپی ہے جو اعجاز القرآن وائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتی ہے۔ قاموس والے مجد الدین فیروز آبادی کی بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز (چھ جلدیں) علوم قرآن اور اس کی تفسیر پر گرانقدر تصنیف ہے۔ اسی طرح اصول فقہ پر ابو الحسین الطیب المعتزلی البصری (م ۴۳۶ھ) کی کتاب المعتمد فی اصول الفقہ سلاست زبان اور فصاحت بیان کے اعتبار سے بھی شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ میری ناقص رائے میں امام غزالی اور امام رازی کی اصول فقہ پر کتابیں اسی کتاب سے ماخوذ ہیں۔ اسے ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے بیروت سے شائع کیا ہے۔ باقی ص۲۶ پر

ایک سوال کا دلچسپ جواب

مولانا عبدالمجید صاحب اصلاحی استاذ جامعۃ الرشاد

شیخ محمد الغزالی مصر کے مشہور عالم اور معروف مصنف ہیں۔ انہوں نے دینی و اخلاقی موضوع پر عربی میں جو کتابیں لکھی ہیں۔ ان ہی میں ایک کتاب "عقیدۃ المسلم" بھی ہے۔ ________ یہ سوال و جواب اسی کتاب سے ماخوذ ہے۔ (ادارہ)

ایک شخص نے پوچھا "انسان مجبور ہے یا با اختیار؟"

میں نے مڑ کر اسے دیکھا اور طے کر لیا کہ جیسا پیچیدہ سوال ہے، ویسا ہی پیچیدہ جواب بھی دوں

میں نے کہا۔

"انسان دو ہیں۔ ایک وہ جو مشرق میں رہتا ہے اور ایک وہ جو مغرب میں۔ پہلا مجبور ہے، دوسرا مختار۔"

آدمی نے ہنستے ہوئے اپنا منہ اس طرح پھاڑا جیسے جمائی لیتا ہوا انسان آدھا منہ کھولدے۔ اس نے کہا۔

"یہ کیا؟ میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ فعل و ترک میں کیا انسان آزاد ارادہ اور قدرت کا مالک ہے یا مجبور؟"

میں نے کہا، میں جواب دے چکا ہوں۔ مغرب کا انسان مختار اور مشرق کا مجبور ہے۔

ایک صاحب خوش طبع وہاں موجود تھے، ہنسکر بولے " یہ ہوا سیاسی جواب "
میں نے کہا " دینی بھی "
مغرب کے لوگوں نے محسوس کیا کہ ان کے پاس عقل بھی ہے، چنانچہ انہوں نے اس سے کام لیا اور حریم فطرت کے پردوں میں جھانک کر آرٹ کے راز معلوم کئے
انہیں اوراک ہوا کہ وہ ایک آزاد ارادہ کے مالک ہیں، چنانچہ اس سے کام لے کر تقدیر اقوام کے مالک بن گئے۔
انھیں معلوم ہوا کہ قدرت بھی رکھتے ہیں، چنانچہ مشرق و مغرب کے تمام گوشوں میں پھیلکر محیر العقول کارنامے انجام دیئے۔
مگر ہمارا حال یہ ہے کہ یہ شخص انسانوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر سے نکل کر ایک گتھی پیش کرتا ہے اور اس کا حل معلوم کرنا چاہتا ہے۔
وہ پوچھنا چاہتا ہے کہ
کیا واقعی اس کے پاس ایک آزاد عقل ہے جس سے سوچ سکے ؟
کیا واقعی اسے کوئی ارادہ حاصل ہے جس سے کام لے سکے :
کیا واقعی اس کے اندر حرکت کرنے کی قدرت بھی ہے ؟
ثابت کرکے ہم بتادیں تب کہیں جاکر وہ سوچے گا۔ ارادہ کریگا اور عمل کی دنیا میں آئے گا۔ مگر اسوقت تو اسوقت مغرب کے با اختیار انسان کے مقابل میں بالفعل مجبور ہے۔
دونوں میں کتنا فاصلہ ہے ؟
مغرب کا آدمی زندگی کے سمندر میں اترتا ہے تو اسے معلوم رہتا ہے کہ تیرنے کیلئے اسکے پاس اعضاء جوارح موجود ہیں، چنانچہ کبھی وہ موجوں کے پہلو بہ پہلو تیرتا ہے۔ اور کبھی اسکے مخالف اسطرح آہستہ آہستہ وہ کنارے سے جا لگتا ہے۔
مگر مشرق کا انسان جب زندگی کی موجوں کے حوالہ ہوتا ہے تو پوچھتا ہے کہ " کیا واقعی زندہ ہوں یا ایک لاشۂ بے حس وحرکت " یا ظریفانہ انداز میں یوں کہیئے کہ " کیا حقیقۃً آزاد ہوں یا ہاتھ پیر بندھے ہوتے ہیں؟ "
زندگی کا تیز دھارا اس حماقت کے نتائج کا انتظار نہ کرے گا، سمندر کی بپھری ہوئی لہریں جلد ہی اسے اتھاہ گہرائیوں میں چھپا دیں گی ●●

Reg. No 3393/81 U,P,RI Phone 461
MONTHLY- JAMEATUR RASHAD
Agamgarh u.P,

اکتوبر و نومبر، دسمبر ۱۹۸۲ء

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان

ماہنامہ

الرشاد

مرتبہ

مجیب اللہ ندوی

دارالتالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ
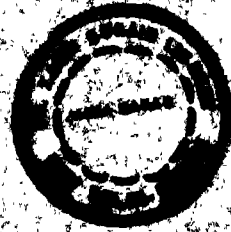
ماہنامہ الفرقان لکھنؤ کی خصوصی پیشکش!

حضرت شیخ الحدیث نمبر

بہت بڑی تعداد میں نہایت آب و تاب کے ساتھ دسمبر ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آرہا ہے

جو انشاء اللہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا نور اللہ مرقدہ کی جامع و عالی مقام شخصیت کے متعلق ایک تاریخی دستاویز اور آپ کا مستند تذکرہ ہوگا۔ جسکا اندازہ آپ عنوانات اور شرکاء بزم کی درج ذیل فہرست سے بخوبی لگا سکتے ہیں

اہم عنوانات

- حضرت شیخ الحدیث۔ نسبی سلسلہ اور اجداد کا محققانہ تعارف
- حضرت شیخ کی مشہور و معروف خود نوشت "آپ بیتی" کی تلخیص
- حضرت شیخ بحیثیت محدث و مصنف
- حضرت شیخ کے ملفوظات و مکتوبات کا ایک نیا انتخاب
- حضرت شیخ کی مزاجی خصوصیات
- حضرت شیخ اپنے اہل خانہ کے ساتھ
- حضرت شیخ ایک عاشق رسول
- حضرت شیخ کے چند بیرونی اسفار

شرکاء بزم:

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی (مدیر اعلیٰ الفرقان) حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ حضرت مولانا حکیم عبدالرشید محمود گنگوہی۔ مولانا قاضی زین العابدین صاحب میرٹھی، مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی۔ مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی

مولانا تقی الدین ندوی مظاہری، اور بعض دیگر اصحاب علم و قلم

صفحات ۳۲۵ ۔ طباعت فوٹو آفسیٹ ۔ قیمت ۱۸/- (مع محصول ڈاک ۲۱/-)

شیخ الحدیث نمبر سے خریداری قبول کرنے کے خواہشمند حضرات صرف ۳۲/- روپے ارسال فرمائیں۔ نمبر ان کی خدمت میں رجسٹری سے بھیجا جائے گا۔ زیادہ تعداد میں نمبر منگوانا ہو تو خصوصی رعایتوں کی شرح بذریعہ خط لکھ کر دفتر سے دریافت فرمائیں۔ وی پی سے نمبر منگوانے کیلئے چوتھائی رقم پیشگی بھیجنا ضروری ہے ۔۔۔ الفرقان الحمد للہ اب بڑی تعداد میں بیرونی ممالک جاتا ہے اور یہ نمبر تو کافی بڑی تعداد میں جائیگا۔ اسلئے مشتہرین کے لئے اس میں اشتہار بہت نفع مند ثابت ہوگا انشاء اللہ ۔۔۔ آج ہی دفتر سے نرخنامہ طلب فرما کر نمبر میں جگہ محفوظ کرائیں۔

منیجر ماہنامہ "الفرقان" ۳۱ نیا گاؤں مغربی نظیر آباد لکھنؤ

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان

ماہنامہ

الرشاد

سالانہ چندہ
ہندوستان 24/=
چندہ ششماہی 12/=
قیمت فی پرچہ 2/50

سالانہ چندہ
ممالک غیر سے
بارہ ڈالر امریکی
12/= ڈ

جلد (۲) | اکتوبر، نومبر ۱۹۸۲ء مطابق محرم، صفر ۱۴۰۳ھ | شمارہ ۲۱، ۲۲

فہرست مضامین

پرچہ کی ترتیب و اشاعت کے ذمہ دار مولوی عقیل احمد قاسمی ہیں۔

نظامی پریس ناشاد بھی آباد حیدرآباد

رشحات

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی۔ یہ تقسیم گو ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذمہ دار لیڈروں کی رضامندی سے ہوئی۔ مگر چونکہ اس سے پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک طویل سیاسی کشمکش رہ چکی تھی، اس لئے تقسیم ہند کی ساری ذمہ داری مسلمانوں کے سر ڈال کر پورے ملک میں ہندوؤں کے اندر غم و غصہ کی غیر معمولی جذبات پیدا کئے گئے۔ جس کے نتیجہ میں لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام ہوا اور لاکھوں کی عزت و آبرو لٹی۔ اور لاکھوں بے وطن و بے گھر ہوئے۔ مسلمانوں سے انتقام کی اس کارروائی میں جو انسانیت سوز اور گھناؤنے واقعات رونما ہوئے، وہ انتہائی قابل نفرت ہوتے ہوئے بھی کسی قدر قابل درگذر کہے جا سکتے ہیں۔ کہ وہ ایک فوری غلط جذباتیت کے نتیجہ میں وقوع پذیر ہوئے، مگر افسوس ہے کہ اس "غلط جذباتیت" نے اب ایک تحریک کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اور اب منصوبہ بند طریقہ پر مسلمانوں کو جانی، مالی اور معاشی حیثیت سے بے وزن بنانے کی مسلسل کوشش کی جا رہی ہے اور یہ سلسلہ ۳۵ برس سے برابر جاری ہے۔ کوئی مہینہ خالی نہیں جاتا کہ کسی فساد کی خبر نہ آ جاتی ہو۔ اس ملک میں اگر دو چار ہریجن کا قتل ہو جاتا ہے، یا دو چار سکھ گولی کا نشانہ بن جاتے ہیں، تو مرکزی اور صوبائی تمام حکومتیں حرکت میں آ جاتی ہیں، صرف وزراء ہی نہیں بلکہ خود وزیر اعظم صاحبہ بھی بنفس نفیس تسکین و تسلی کے لئے پہنچ جاتی ہیں، اور تحقیقاتی کمیشن مقرر ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر ان کی طرف سے ملک سے علیحدگی اور لاقانونیت کی بات کی جاتی ہے تو ان سے پر امن بات چیت کے لئے سو سو جتن کیے جاتے ہیں۔ مگر جبل پور، احمد آباد، فیروز آباد، بہار، برادر کیلا، اور میرٹھ میں ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام ہوا، ہزاروں عورتیں بیوہ ہوئیں اور ہزاروں بچے یتیم ہوئے، اور ہزاروں لوگ بے گھر ہوئے، مگر نہ تو سینئر وزراء حضرات میں کوئی جنبش ہوئی، اور نہ خود وزیر اعظم صاحبہ جن کے آنے جانے میں چند گھنٹے سے زیادہ صرف نہیں ہو سکتے تھے

ان مظلوموں کو تسلی دینے کی کوئی ضرورت محسوس کی اور نہ تحقیقاتی کمیشن مقرر ہوا، اور نہ آجتک اس کا کوئی نتیجہ نکلا۔ ہندوؤں میں یہ ذہنیت یقیناً آر ایس ایس اور جن سنگھ کی پیدا کی ہوئی ہے، مگر جو سیاسی پارٹیاں زبان سے اپنے کو سیکولر ظاہر کرتی ہیں، اور بہت اونچی اونچی اخلاقی باتیں کرتی ہیں، عملاً وہ سب آر ایس ایس سے متأثر ہیں، اور سب کا طرز عمل مسلمانوں کے ساتھ یکساں ہیں، اور حکومت کے ذمہ دار اور اس کی پولس اور پی۔ اے۔ سی سب وہی کچھ کر رہی ہے جو آر ایس ایس کے ہیڈ کوارٹر سے ہدایت جاری کی جاتی ہے۔ ہم ایسا اس لئے کہہ رہے ہیں کہ جتنے فساد ہوئے ان سب میں کہا یہ گیا کہ آر ایس ایس کا ہاتھ رہا ہے، مگر ابتک کسی تحقیقاتی کمیشن کی تحقیق سے بھی یہ حقیقت ظاہر نہیں ہو سکی، اور اگر ہوئی تو اس کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ اس لئے ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ حکومت چاہے کسی پارٹی کی ہو۔ مگر سکہ آر ایس ایس کا چلتا ہے۔

ہندو، ہندی ہندوستان کا نعرہ گو آر ایس ایس اور اس سے متأثر جماعتیں لگاتی ہیں، مگر اس پر عمل ہندی بولنے والے صوبوں کی تمام حکومتیں کر رہی ہیں۔ اور اس ذہنیت کا شکار نہ صرف مسلمان ہو رہے ہیں، بلکہ ملک میں دوسری زبان بولنے والے لوگ اور دوسری اقلیتیں بھی ہو رہی ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مسلمان اپنی کمزوری کی وجہ سے یہ سب برداشت کر رہے ہیں۔ مگر دوسری اقلیتیں اور دوسری زبان بولنے والے اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اس لئے ان کی دلجوئی کی ظاہری تدبیریں ضرور اختیار کی جاتی ہیں۔ مگر مسلمانوں کے لئے اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کیجاتی۔ ہندی بولنے والے صوبوں کے لوگوں اور حکومت کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ ذہنیت اگر دبی نہیں تو ملک کیلئے ایسے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں جو آگے چل کر انتہائی خطرناک ہو سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں موجودہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ الیکشن کی کامیابی و ناکامی کی پرواہ کئے بغیر ایسی طاقتوں کو کمزور کرنے کی پوری کوشش کرے جس سے پورے ملک کی سالمیت کو نہ صرف خطرہ لاحق ہے، بلکہ وہ خطرہ کسی حد تک سر پر آگیا ہے۔

بہرحال حکومت اس سلسلہ میں کیا کرتی ہے، یہ اس کی ذمہ داری ہے۔ مگر خود مسلمانوں کو یہ سوچنا ضروری ہے کہ وہ اس جارحانہ ذہنیت کے ختم کرنے یا اس میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے کیا کچھ کر سکتے ہیں،

خوشی کی بات ہے کہ مسلمانوں کے اندر جذباتیت کم ہو رہی ہے۔ اور خدا اعتمادی اور خود اعتمادی کے ساتھ تعمیری کاموں کا شعور بھی ان میں پیدا ہونے لگا ہے۔ مگر ابھی ان میں دو تین باتوں کے پیدا ہونے یا کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ خدمت خلق، اجتماعی احساس اور اتحاد۔

خدمت خلق سے مراد یہ ہے کہ مسلمان اپنی انفرادی زندگی میں بھی اپنی بستی اور محلہ پڑوس کے لوگوں کی خدمت کرکے ان کا دل جیتنے کی کوشش کریں۔ اور اجتماعی طور پر بھی ایسے رفاہی کام کریں، اور ایسے رفاہی ادارے کھولیں جن کے ذریعہ ملک میں ان کی افادیت محسوس کی جائے اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ راقم الحروف نے اپنی کتاب "عبادت و خدمت" میں اس کے تمام گوشوں کی وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے۔

اجتماعی احساس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو اگر اللہ تعالیٰ نے دولت دی ہے تو اس سے محض انفرادی طور پر فائدہ نہ اٹھائیں۔ بلکہ اپنے دوسرے غریب بھائیوں کو بھی اس سے فائدہ پہونچائیں۔ فائدہ پہونچانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ زکوٰۃ و خیرات کے چند پیسے انہیں دے دیں بلکہ اپنے پیسے سے انھیں بھی اتنا اوپر اٹھانے کی کوشش کریں کہ آپ میں اور ان میں ایک اور سو کا فرق باقی نہ رہے۔ اسی طرح اگر آپ تعلیم یافتہ ہیں تو اپنے بچوں کے ساتھ گرے پڑے دوسرے غریب بھائیوں کے بچوں کو بھی تعلیم یافتہ بنانے میں مدد دیں۔ اگر کوئی ہنر جانتے ہیں تو کچھ غریب بچوں کو سکھا دیں۔ اگر آپ اپنے لڑکے یا لڑکی کی شادی میں دس بیس ہزار خرچ کرنے کی پوزیشن میں ہیں تو اپنے خاندان اور پڑوس کے کچھ غریب لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے اس میں سے کچھ رقم بچا کر ان کی شادی کر دیں۔ غرض یہ کہ آپ اپنی ترقی و خوشحالی میں اپنے دوسرے بھائیوں کو بھی شریک کرنے کی کوشش کریں۔

اتحاد سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان عقیدہ و مسلک یا عمل کا جو اختلاف ہے وہ اپنے پیچھے غلط یا صحیح ایک تاریخ رکھتا ہے۔ اس لئے اب اس تاریخ کو ہم بدل نہیں سکتے۔ اس لئے اس اختلاف کو بڑے بڑے ملی مصالح کے تحت ہم برداشت کرلیں اور اس خلیج کو اور زیادہ وسیع نہ ہونے دیں، دوسرے لوگ ہمارے اصولی یا جزئی اختلاف سے واقف نہیں ہوتے۔ اس لئے ہمارے آپسی اختلاف سے ہماری ہوا اکھڑتی ہے، اور بلا وجہ جگ ہنسائی ہوتی ہے۔ حکمت و موعظت کے ساتھ اپنی بات سمجھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ مگر اس میں جارحانہ اور مناظرانہ انداز اختیار نہ کیا جائے۔ اس انداز سے ہم دوسرے کو اپنی بات تو سمجھا نہیں سکتے، البتہ ضد، دشمنی اور اپنا کان بند کر لینے کی صورت ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ موجودہ حالات میں اس اتحاد کی شدید ضرورت ہے۔ کاش ہمارے علما و خواص اس پہلو پر غور کرنے کی زحمت گوارہ کرتے تو

اسلامی شریعت میں
میاں بیوی کے حقوق و فرائض

(مجیب اللہ ندوی)

اسلامی شریعت میں جس طرح رشتۂ نکاح کے قائم کرنے کے لئے تفصیل سے قانونی اور اخلاقی ہدایتیں دی گئی ہیں، اسی طرح رشتۂ نکاح کے قائم ہونے کے بعد اس کو خوشگوار اور استوار رکھنے کے لئے بھی اصولی طور پر شوہر و بیوی دونوں کے حقوق و فرائض کی نشاندہی کردی گئی ہے اور ان میں سے ہر ایک کے عمل و اختیار کا دائرہ بھی متعین کر دیا گیا ہے۔ اور حقوق و فرائض کی نشان دہی اور دائرہ عمل واختیار کی تعیین اور ہر موقع کے لئے ہدایتیں اس لئے دی گئی ہیں کہ یہی ایک رشتہ ہے جو باشعور ہونے کے بعد ایک مرد اور ایک عورت کو اتنی لمبی مدت تک باندھے رکھتا ہے، اور اس رشتہ کے ذریعہ مرد و عورت میں اتنا ہی قرب ہو جاتا ہے جتنا قرب خون اور گوشت کا ہوتا ہے۔ لیکن یہ رشتہ اپنی طوالت اور قرب ہی کی وجہ سے اپنے اندر بڑی نزاکت بھی رکھتا ہے، اگر مرد و عورت دونوں اس کو قائم رکھنے کیلئے مسلسل کوشش نہ کریں، اور ہر ایک اپنے اپنے دائرۂ اختیار و عمل کا لحاظ و پاس نہ کرے تو یا تو یہ رشتہ ٹوٹ جائے گا، یا اگر ٹوٹتا نہیں تو اس کا بندھن اتنا کمزور ہو جائے گا کہ اس کے ذریعہ وہ مقاصد پورے نہ ہو سکیں گے، جن کے لئے یہ گرہ لگائی گئی ہے، اور اس میں سے کوئی صورت بھی پسندیدہ نہیں ہے۔

مرد اور عورت کی حیثیت

میاں بیوی کے حقوق و فرائض کی تفصیل سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مرد اور عورت کی حیثیت پر روشنی ڈال دی جائے کیونکہ ان کی اصلی حیثیت معلوم کئے بغیر ان کے حقوق و فرائض کی حیثیت اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہو سکتی۔

مرد قوام ہے

دنیا کا چھوٹا یا بڑا کوئی کام بھی ہو اس کے نظم و نسق کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ ایک آدمی کو اس کا اصل ذمہ دار قرار دیا جائے، اور دوسرے لوگ اس کی معیت میں کام کریں اگر کسی کام کے لئے کوئی ذمہ دار نہ قرار دیا جائے، بلکہ جتنے کام کرنے والے ہیں، ان سب کو مساویانہ حقوق دے دیئے جائیں تو پھر دنیا کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام بھی انجام نہیں پا سکتا، ایک اسکول میں ہیڈ ماسٹر کالج میں پرنسپل، کارخانے میں منیجر، گھر میں ایک مالک اسی لئے بنایا جاتا ہے کہ اس کے نظم و انتظام کے لئے ایسا کرنا ضروری ہے۔ اگر ایک کام کے کئی نگراں اور ذمے دار بنا دیئے جائیں تو پھر اس کام میں خلل پڑے گا، مثلاً اگر ایک اسکول کے تمام ماسٹر، ایک کالج کے تمام لکچرر، ایک کارخانے کے تمام کارکن اور ایک گھر کے تمام افراد ذمے دار اور نگراں ہو جائیں تو پھر اس اسکول، کالج، کارخانے کا نظم ایک دن بھی نہیں چل سکتا۔

یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ رشتۂ مناکحت کے ذریعہ ایک نئے خاندان کی داغ بیل پڑتی ہے۔ اور خاندان کی داغ بیل ہی پر معاشرہ اور تہذیب و تمدن کی ساری عمارت کھڑی ہوتی ہے، اس لئے ایسے بنیادی اور اہم کام کے لئے کسی کو اصل ذمہ دار و نگراں قرار نہ دیا جائے تو پھر اس میں انتشار و بدنظمی پیدا ہونی ضروری ہے۔ اور جب اس میں انتشار و بدنظمی پیدا ہوگی تو رشتۂ مناکحت کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ مرد اور عورت میں کس کو اس ذمے داری کا منصب دیا جائے۔ اسلام چونکہ ایک فطری مذہب ہے اس لئے اس نے مرد و عورت کی مخصوص فطرت کے پیش نظر یہ درجہ مرد کو عطا کیا ہے، موجودہ دور میں مرد و عورت کی مساوات کی جو کوشش کی جا رہی ہے، اسلامی شریعت کی رو سے یہ ایک غیر فطری کوشش ہے اور واقعہ بھی ہے کہ یہ غیر فطری نظریہ جن قوموں نے پیش کیا ہے وہ بھی مکمل طور پر ایک دن بھی اس پر عمل نہ کر سکیں، کیونکہ عورت کی مخصوص جبلت اور اس کے فطری اعمال و خواص اس کی راہ میں حائل ہوتے ہیں، اور جہاں ان کو کچھ توڑنے یا موڑنے کی کوشش کی گئی ہے وہاں فائدہ کے مقابلہ میں نقصانات زیادہ ہوئے ہیں۔ جن قوموں نے مساوات کی دھن میں عورت کو گھر سے نکال کر دفتر، پارک اور میدان سیاست میں پہنچایا ہے اس کا نتیجہ ان کے سامنے جو کچھ ظاہر ہوا ہے اس کی تصویر ایک مشہور امریکی مفکر نے ان الفاظ میں کھینچی ہے۔

"اب ہم کھانا ہوٹلوں اور ریسٹوران میں کھاتے ہیں، ہماری روٹی بیکری سے آتی ہے کپڑے لانڈری میں دھلتے ہیں، اگلے وقتوں میں تفریح کے لئے لوگ خاندانوں کی طرف رجوع کرتے تھے، لیکن اب اس کے لئے سینماؤں، تھیٹروں اور کلبوں کا رخ کرتے ہیں۔ پہلے خاندان ہماری دلچسپی کا مرکز تھا اور خاندانی زندگی میں ہی سکون و آسائش تلاش کی جاتی تھی مگر اب خاندان کے افراد بکھر گئے اور اگر کچھ مل کر بھی رہتے ہیں تو ان کا مقصد ہی فوت ہوگیا ہے، ہمارے گھر ہمارے آرام و استراحت کی جگہ نہیں رہے۔ جہاں بہرحال ہم رات گذارتے ہوں۔" (ترجمان القرآن اپریل ۱۹۵۵ء)

قرآن میں مرد کو قوامیت کا درجہ دیتے ہوئے عورت پر اس کے اس فطری تفوق کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے جس کی بنا پر عورت کے بجائے اس کو یہ مرتبہ عطا ہوا ہے۔

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (نساء)

مردوں کو عورتوں کے اوپر قوام اس لئے بنایا گیا ہے کہ فطری طور پر اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے۔

قوام کے معنی قوام محافظ، نگراں اور خبر گیری کرنے والے کو کہتے ہیں، اور نگراں اور خبر گیری کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس کو اس کے اوپر جس کی وہ خبر گیری کر رہا ہے، کچھ امتیاز حاصل ہو، مگر امتیاز کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت کی حیثیت ایک لونڈی کی اور مرد کی حیثیت آقا کی ہو۔ بلکہ بنیادی حقوق میں دونوں برابر ہیں۔ یہ تفوق اور مرتبۂ قوامیت مرد کو بعض ایسی ذمہ داریوں کی بنا پر دیا گیا ہے جنھیں مرد کی مخصوص فطرت کے پیش نظر اسلام ان کی انجام دہی اسی پر ڈالتا ہے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو بما فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ سے ظاہر کیا گیا ہے، ورنہ جہاں مرد کے تفوق کا ذکر کیا گیا ہے، وہاں یہ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے کہ عورتوں کے بنیادی حقوق ان پر اسی طرح ہیں جس طرح ان کے اوپر مردوں کے حقوق ہیں۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ)

اور قاعدہ شرعی کے مطابق عورتوں کا حق مردوں پر اسی طرح ہے جس طرح مردوں کا حق عورتوں پر ہے، اور مردوں کا کچھ مرتبہ ان سے زیادہ

عورتوں کے حقوق یا مردوں کے فرائض | مردوں کے اوپر عورتوں کے حسب ذیل حقوق ہیں، یا دوسرے الفاظ میں اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ قوام اور ذمے دار ہونے کی حیثیت سے مردوں کے حسب ذیل فرائض ہیں۔

۱۔ مہر | قوام ہونے کی حیثیت سے شوہر کا پہلا فرض مہر کی ادائیگی ہے، یہ مہر مرد کو نکاح ہی کے وقت ادا کر دینا چاہئے، اگر اس وقت ادا نہ کرے تو اس کے لئے عورت سے مہلت لینی چاہئے۔ یہ ایسا حق ہے کہ اگر نکاح کے وقت اس کا ذکر نہ آئے، جب بھی شریعت نے مرد کے اوپر اس کی ادائیگی ضروری قرار دی ہے، اگر عورت اس کو ادائگی کی مہلت دے دے تو اس مہات کے بعد اسے فوراً ادا کر دینا چاہئے ورنہ عورت کو یہ حق ہوگا کہ وہ اس کو مباشرت سے روک دے۔ اس حق سے عہدہ برآ ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں، ایک یہ کہ وہ اسے ادا کر دے، دوسرے یہ کہ عورت اپنی خواہش سے یا اس کے حق سے زیادہ سلوک کے عوض میں معاف کر دے، لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ مرد نے عورت پر دباؤ ڈال کر مہر معاف کرا لیا ہے تو اخلاقاً و قانوناً اس معافی کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اگر کسی وجہ سے میاں بیوی میں نباہ نہ ہو سکے، اور دونوں میں علیحدگی ہو جائے تو مرد کو یہ حق نہیں ہے کہ مہر میں ادا کی ہوئی رقم عورت سے واپس لے لے۔

۲۔ نفقہ | شوہر کا دوسرا ضروری فرض یا عورت کا دوسرا حق نفقہ ہے۔ نفقہ کے معنی وہ چیز جو آدمی خرچ کرے، یعنی قوام ہونے کی حیثیت سے مرد کا فرض ہے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے لئے روٹی کپڑے اور دوسری ضروریات زندگی کا سامان کرے، مرد کی قوامیت کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اسکی قوامیت کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ کچھ اپنی کمائی عورت کے اوپر صرف کرتا ہے۔ وَبِمَا اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ

یہاں مال سے مراد مہر کی رقم بھی ہے اور روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ بھی ہے۔

نفقہ کا معیار | (۱) نفقہ اگرچہ عورت کا حق ہے، مگر چونکہ اس کی ذمہ داری شوہر کے اوپر ہے، اس لئے اس کی حیثیت اور آمدنی کے لحاظ ہی سے یہ ذمہ داری اس پر ڈالی جائے گی، لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس سلسلہ میں عورت کی حیثیت، مرضی اور خواہش کا لحاظ بالکل نہ کیا جائے، بلکہ اس کا خیال شوہر کو کرنا ہے گا۔

قرآن پاک نفقہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے۔

لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا اٰتٰهُ اللّٰهُ

(طلاق)

فارغ البال آدمی کو (بیوی بچوں پر) اپنی وسعت کے مطابق خرچ کرنا چاہئے اور جو تنگ حال ہو اس کو بھی چاہئے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اس کو دیا ہے، اس میں سے خرچ کرے (بخل نہ کرے)

عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ (بقرہ)

خوش حال پر اس کی وسعت کے مطابق نفقہ ہے۔ اور مفلس پر اسکی استطاعت کے مطابق ہے

یہ احکام گو طلاق کے موقع کے ہیں مگر اس کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ اگر طلاق یعنی اس رشتے کے کٹ جانے کے بعد بھی مرد کی حیثیت کا لحاظ کرنا ضروری ہے تو پھر نکاح یعنی اس رشتے کے قیام کے وقت بدرجۂ اولیٰ ضروری ہونا چاہئے۔

حدیث میں ہے کہ ایک صحابی نے دریافت کیا کہ "یارسول اللہ! عورتوں کے اوپر ہمارے کیا حقوق ہیں؟" فرمایا۔

اَنْ تُطْعِمَهَا اِذَا طَعِمْتَ وَتَكْسُوْهَا اِذَا اكْتَسَيْتَ وَلَا تَضْرِبِ الْوَجْهَ وَلَا تُقَبِّحْ وَلَا تَهْجُرْ اِلَّا فِى الْبَيْتِ

جب تم کھاؤ تو ان کو بھی کھلاؤ اور جب تم پہنو تو ان کو بھی پہناؤ اور ان کے منہ پر نہ مارو، ان کی شکل وصورت اور ان کے کام کاج میں عیب نہ نکالو اور برا بھلا نہ کہو اور اگر کچھ ناگواری ہو جائے تو گھر کے اندر اسکی خوابگاہ اپنے سے علٰحدہ کردو (یعنی ناراضگی اتنی طویل نہ ہو جائے کہ وہ گھر کے باہر میکے وغیرہ جانے پر مجبور ہو۔)

آپ نے اپنے آخری حج میں جو خطبہ دیا تھا اس میں بہت سی باتوں کے ساتھ فرمایا تھا وَلَهُنَّ عَلَيْكُمْ نَفَقَتُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ان کے کھانے پینے اور کپڑے کی ذمہ داری تمہارے اوپر ہے قرآن وحدیث کی انہی ہدایات کی روشنی میں فقہا نے حسب ذیل احکام مستنبط کئے ہیں۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ہر حال میں شوہر کی حیثیت اور اس کی آمدنی کو نفقہ کا معیار قرار دیا ہے، مگر امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد رحمۃ اللہ علیہم نے درمیان کی راہ اختیار کی ہے وہ یہ کہ اصل لحاظ تو مرد کی آمدنی ہی کا کیا جائے گا، مگر عورت کی حیثیت بالکل نظرانداز نہیں کی جائے گی، قرآن کریم وحدیث کی مذکورہ روایتوں سے بھی اس رائے کی زیادہ تائید ہوتی ہے۔

ضروری مسائل

(۱) اگر مرد مالدار ہو، یا اس کی آمدنی اچھی خاصی ہو، اور عورت بھی مالدار گھرانے کی ہو تو مرد کو اپنی حیثیت اور عورت کی حیثیت اور اس کے معیار زندگی کا خیال کرکے نفقہ دینا پڑے گا، یہ نہیں ہو سکتا کہ عورت اپنے گھر تو اچھا کھاتی اور اچھا پہنتی ہو اور شوہر بھی اس حیثیت کا ہو کہ اس کے معیار کے مطابق خرچ دے سکتا ہو مگر بخل کی وجہ سے موٹا جھوٹا کھلاتا پہناتا ہو۔ اگر ایسا کرتا ہے تو عورت اس سے قانوناً اپنے معیار کا کھانا کپڑا طلب کر سکتی ہے۔

(۲) اگر مرد خوش حال ہو یا اس کی آمدنی خوش حال جیسی ہو مگر عورت کسی غریب گھرانے کی ہو تو مرد کو عورت کی حیثیت کے مطابق نہیں، بلکہ اپنی حیثیت کے مطابق نان ونفقہ دینا چاہئے۔ شوہر بخل کی وجہ سے اس کی غربت سے فائدہ اٹھاکر اس کو غربت وتکلیف میں رکھنا چاہے۔ تو عورت قانوناً اس سے زائد کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

(۳) اگر مرد غریب اور تنگ حال ہے اور عورت بھی غریب گھر کی ہے تو پھر مرد کو اپنی اور عورت کی حیثیت کے مطابق ہی روٹی کپڑا دینا چاہئے۔ عورت اسکی حیثیت سے زیادہ نہیں مانگ سکتی۔

(۴) اگر کوئی مرد غریب ہو مگر عورت مال دار اور خوش حال گھرانے کی ہو تو مرد کو اپنی حیثیت کے ساتھ اس کی حیثیت کا لحاظ کرکے نفقہ دینا چاہئے۔ مگر خود عورت کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ مرد سے اس کی حیثیت سے زیادہ نفقہ طلب نہ کرے، ورنہ یا تو وہ خرچ سے مجبور ہوکر حرام ذریعہ آمدنی تلاش کرے گا یا پھر دونوں کے تعلقات خراب ہو جائیں گے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات نے ہمیشہ تنگی سے بسر کی لیکن ایک بار جب فتوحات وغیرہ کے ذریعہ آپ کے پاس کافی مال آنے لگا تو انہوں نے بھی اپنے نفقہ میں زیادتی کی خواہش کی۔ مگر یہ خواہش نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ناگوار ہوئی، اور خدائے تعالیٰ کو بھی۔ چنانچہ قرآن میں ان کی سخت تنبیہ کی گئی۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ — اے نبی اپنی ازواج سے کہہ دیجئے کہ اگر

اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا
وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَ
اُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا وَاِنْ
كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ
وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ
لِلْمُحْسِنَاتِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝
(احزاب)

تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت زیادہ
پسند کرتی ہو اور تم چاہتی ہو تو آؤ میں تم کو
کچھ کپڑا وغیرہ دے دوں، پھر تم کو خوش اسلوبی
سے اپنے سے علٰحدہ کر دوں۔ اور اگر تم خدا
اور اس کے رسول اور آخرت کی طلبگار ہو
تو اللہ تعالیٰ نے نیک کار عورتوں کے لئے بہت
بڑا اجر رکھا ہے۔

چنانچہ اس تنبیہ کے بعد انھوں نے پھر کبھی نفقے کی زیادتی کا مطالبہ نہیں کیا، اس آئینے میں ہر مسلمان عورت کو اپنا چہرہ دیکھنا چاہئے۔

(۵) آرائش و زیبائش کی وہ چیزیں جو عورتوں کی صحت و صفائی کے لئے ضروری ہیں وہ بھی نفقہ میں داخل ہیں اور ان کا فراہم کرنا بھی مرد کے لئے ضروری ہے۔ مثلاً تیل، کنگھی، صابون، غسل اور وضو کا پانی وغیرہ، البتہ جو چیزیں محض آرائش و زیبائش کی ہوں اور ان سے کوئی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو مثلاً پان، تمباکو، پاؤڈر، لپسٹک وغیرہ، ان کا فراہم کرنا مرد پر ضروری نہیں ہے۔

(۶) اگر عورت ایسے گھر کی ہے جہاں لوگ اپنے ہاتھ سے کام کاج نہیں کرتے بلکہ نوکر چاکر کرتے ہیں، یا عورت اتنی کمزور یا مریض ہے جس کی وجہ سے اس کے گھر کا کام کاج نہیں ہوتا تو شوہر ایسی عورت کو کام کاج پر مجبور نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کو بغیر کام کئے ہوئے بٹھا کر روٹی کپڑا دینا پڑے گا۔
اگر ایسی عورت اپنے ذاتی کام کے لئے یا گھر کے کام کاج کے لئے ملازم کا مطالبہ کرے تو شوہر اگر خوش حال ہے تو اس کو ملازم رکھنا پڑے گا اور اس کا خرچ اس کو دینا پڑے گا، لیکن اگر شوہر کی آمدنی میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ وہ ملازم رکھ سکے تو پھر عورت کو گھر کے اندر کام کاج خود اپنے ہاتھ سے کرنا پڑے گا، اور مرد کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ باہر کا کام خود کرے۔ مثلاً سودا سلف، جنس، لکڑی اور پانی وغیرہ گھر میں لا دے۔ اگر مرد یہ چیزیں فراہم نہ کرے تو عورت پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔
بعض علماء فقہ نے لکھا ہے کہ کپڑے کی دھلائی مرد کے اوپر واجب نہیں ہے، بلکہ اس کو صرف پانی اور صابون فراہم کر دینا ضروری ہے۔ عورت اپنے ہاتھ سے اپنا کپڑا دھوئے اگر مرد دھلائی دیتا ہے تو یہ

اس کا احسان ہے۔ یعنی یہ عورت کا قانونی حق نہیں ہے۔ لیکن راقم کے خیال میں یہ مرد کا احسان اس صورت میں تو ہو سکتا ہے جب اس کے اندر اس کی ادائگی کی استطاعت نہ ہو، اور پھر بھی وہ دیتا ہو، یا عورت اپنے گھر اس کی عادی رہی ہو، لیکن شوہر اپنے گھر میں اس کو اپنے ہاتھ سے کپڑا دھونے نہیں دیتا، بلکہ دھوبی سے دھلواتا ہے۔ لیکن جب مرد میں استطاعت ہو یا عورت اس کام کی عادی نہ ہو تو اس کو کپڑے کی دھلائی بطور حق ملنا چاہیے۔ جب مرد کی وسعت اور عورت کی حیثیت کا خیال کر کے اس کو خادم مل سکتا ہے تو صحت و صفائی کی دوسری چیزیں بطور استحقاق کیوں نہ ملنی چاہئیں، البتہ اگر عورت اس کا بار مرد پر نہ ڈالے تو یہ اس کا احسان ہے، اور اس تعلق کا تقاضہ یہ ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے صرف قانونی تعلق نہ رکھیں، بلکہ اخلاقی تعلق بھی رکھیں۔ یعنی ایک دوسرے کی تکلیف و آرام کا خیال رکھیں۔

(۷) اسی طرح بعض علماء نے لکھا ہے کہ دوا علاج کا خرچ شوہر کے اوپر واجب نہیں ہے، بلکہ اس کے اوپر صرف نان نفقہ واجب ہے، اگر وہ دوا علاج کرتا ہے تو یہ اس کا احسان ہے۔ اس مسئلہ میں بھی راقم کی رائے یہ ہے کہ دوا علاج خاص طور پر اس زمانے میں انسان کی اس سے کم بنیادی ضرورت نہیں ہے جیسی کہ تیل، کنگھی اور صابون وغیرہ ہے۔ جب عورت کے جسم کی صحت و صفائی کے لیے ان چیزوں کے فراہم کرنے کو فقہاء نے واجب لکھا ہے، تو پھر دوا علاج کیوں نہ واجب ہو، پھر فقہاء یہ بھی لکھتے ہیں کہ بالغ لڑکوں کا نفقہ باپ پر واجب نہیں ہے، لیکن اگر کوئی بالغ لڑکا بیمار پڑ جائے تو پھر اسکا نان نفقہ باپ پر ضروری ہو جاتا ہے، اور پھر یہ تو لڑکا ہے، فقہاء نے مضارب کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کو علاج کا خرچ بھی ملے گا۔ کیونکہ بغیر اس کے مضاربت کا کام وہ نہیں کر سکتا ہے، تو عورت سے جو فوائد متعلق ہیں ان کا لحاظ کر کے اس کے دوا علاج کا خرچ مرد پر ضروری کیوں نہ قرار دیا جائے، اگر عورت اس کا بار خود شوہر پر نہ ڈالے تو یہ عورت کا احسان کیوں نہ سمجھا جائے۔ اس کے علاوہ مرض کی اور اس کے دوا کی جو اہمیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے معلوم ہوتی ہے، اس کی روشنی میں بھی یہ عورت کا ایک ضروری حق قرار دیا جانا چاہیئے۔

اسی طرح بچہ جننے کے وقت دائی وغیرہ کی فیس کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ اس کو وہ برداشت کرے گا جو اس کو بلائے گا یعنی اگر بیوی خود بلائے گی تو وہی برداشت کرے گی، اور اگر شوہر بلائے گا تو

وہ برداشت کرے گا۔ راقم کے خیال ناقص میں اس کو بھی ہر حال میں مرد ہی کی ذمے داری ہونی چاہیے کیونکہ جب بچہ اس کا ہے، جب اسی پر اس کے دودھ پلانے کی اجرت ہے، اور اس کا نفقہ واجب ہے تو پھر ولادت کے وقت کے تمام اخراجات اس پر کیوں نہ واجب ہوں جبکہ یہ ایسا نازک موقع ہوتا ہے کہ اس وقت کی ذرا سی بے احتیاطی سے زچہ اور بچہ دونوں کی جان خطرہ میں پڑ جانے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

(۸) لڑکی بالغ ہے مگر ابھی اس کی رخصتی نہیں ہوئی ہے، یعنی وہ ابھی میکے ہی میں ہے تب بھی وہ نان نفقہ کی مستحق ہے۔ البتہ اگر شوہر رخصت کرانا چاہتا ہے مگر اس کے گھر والے رخصت نہیں کرتے ہیں تو پھر اس پر اس کا نفقہ واجب نہیں ہے۔

(۹) اگر لڑکی نابالغ ہے اور اپنے میکے میں ہے، شوہر کے گھر نہیں آئی ہے تو پھر اس کا نان نفقہ مرد پر واجب نہیں ہے، اگر وہ اخلاقاً دے تو اس کا احسان ہوگا، البتہ اگر شوہر نے اپنے گھر بلالیا تو اس کا روٹی کپڑا اس کے ذمے واجب ہے۔

(۱۰) اگر بیوی بالغ ہے، مگر شوہر ابھی نابالغ ہے تو عورت کو نان نفقہ ملے گا۔

(۱۱) اگر کوئی عورت شوہر کی اجازت کے بغیر اپنے میکے یا اپنے اعزہ کے گھر چلی جائے تو جتنے دن وہاں رہے گی، اس کا نفقہ شوہر پر واجب نہیں ہے۔ البتہ اگر اجازت سے جائے تو پھر بدستور اس کو نفقہ ملے گا۔

(۱۲) اگر شوہر قدرت کے باوجود اپنی حیثیت یا عورت کی حیثیت سے کم خرچ دیتا ہے، جس سے عورت کی ضرورتیں پوری نہیں ہوتیں تو اگر وہ اپنی یا بچوں کی ضرورت سے بالکل مجبور ہو جائے تو وہ شوہر کی اجازت کے بغیر اس کے مال سے اپنی ضرورت پوری کر سکتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی صورت میں حضرت ابوسفیان کی بیوی ہندہ کو اس کی اجازت دی تھی۔ مگر یہ شرط لگا دی تھی کہ خُذِی مَا یکفیكِ وَوَلَدَكِ بِالمَعرُوفِ اچھی نیت سے اتنا لے سکتی ہو جتنا تمہاری اور تمہارے بچوں کی ضرورت کیلئے کافی ہو۔

(۱۳) شوہر نے ایک مہینے کا خرچ عورت کو دے دیا، عورت نے اس میں سے بچا لیا تو یہ عورت کا حق ہے، مرد نہ تو اس کو لے سکتا ہے، اور نہ آئندہ اس کے نفقہ میں کمی کر سکتا ہے، لیکن اگر عورت نے خرچ کرنے میں اتنی کنجوسی کی ہے کہ اس کی وجہ سے اس کی صحت پر بُرا اثر پڑا، اور دبلی ہو گئی، یا اس کا رنگ فق

ڈھل گیا، تو پھر شوہر کو یہ قانونی حق ہے کہ وہ اس کو اس سے منع کرے، کیونکہ عورت کا حسن و جمال اور اس کی ظاہری کشش شوہر کا ضروری حق ہے۔ اس کو وہ قصداً ضائع نہیں کرسکتی۔ (درمختار)

(۱۴) اگر مہینہ بھر کا خرچ ۱۵، ۲۰ دن میں فضول خرچی سے اڑا ڈالتی ہے، یا اس کی بے توجہی کی وجہ سے وہ چوری ہوجاتا ہے، تو شوہر پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ (درمختار)

۳۔ سکنیٰ سکنیٰ کا لفظ سکون سے نکلا ہے، یعنی گھر میں پہنچ کر آدمی چونکہ سکون محسوس کرتا ہے اس لئے اس کو سکون کی جگہ کہتے ہیں، مرد کا تیسرا فرض یا بیوی کا مرد کے اوپر تیسرا حق یہی ہے۔ یعنی مرد کو عورت کی اور اپنی حیثیت کے مطابق ایک گھر بھی دینا ہوگا۔ نفقہ یعنی روٹی کپڑے کی طرح سکنیٰ بھی عورت کا ایسا حق ہے کہ طلاق کے بعد اختتام عدت تک عورت کو شوہر اس سے محروم نہیں کرسکتا۔ قرآن میں ہے۔

أَسْكِنُوهُنَّ مِنْ حَيْثُ سَكَنتُم مِّن وُجْدِكُمْ (طلاق)	ان کو اپنے مقدور بھر وہیں رکھو جہاں تم خود رہتے ہو۔

ایک مسلمان عورت کے لئے اس کی اتنی اہمیت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد دوسرا کام یہ کیا کہ ازواج مطہرات کے سر چھپانے کے لئے مکان کی تعمیر فرمائی حتیٰ کہ آپ نے طلاق پانے والی عورتوں کو بھی عدت تک نفقہ و سکنیٰ دلایا۔

گھر کیسا ہونا چاہئے؟ اس کی تفصیل فقہاء کی زبانی سنیئے:

(۱) بیوی کو حتی الامکان شوہر کے گھر کے لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنا چاہئے۔ تاکہ خواہ مخواہ مرد کو اس کی وجہ سے دردِ سر مول نہ لینا پڑے، لیکن اس کے باوجود مناسب یہ ہے کہ شوہر خود یا اس کے گھر والے عورت کے لئے گھر کا ایک گوشہ یا ایک کمرہ مخصوص کردیں، تاکہ وہ اپنی چیزیں ایک جگہ حفاظت سے رکھ سکے۔ اور میاں بیوی وہاں بے تکلفی سے رہ سکیں، اور گھر کے دوسرے لوگوں سے اس سلسلہ میں کوئی اختلاف کی نوبت نہ آئے۔

(۲) اگر عورت سب کے ساتھ رہنا نہیں چاہتی اور اپنے لئے ایک علیحدہ گھر کا مطالبہ کرتی ہے تو مرد کے لئے اس کو ایک علیحدہ کمرہ یا کم سے کم گھر کا کوئی گوشہ اس کے لئے مخصوص کردینا ضروری ہے جس کو وہ بند کرسکے یا جہاں وہ حفاظت سے اپنا سامان بھی رکھ سکے اور میاں بیوی لیٹ بیٹھ سکیں وہ جگہ جو اس نے اس کے لئے مخصوص کردیا ہے، اس میں عورت جسے چاہے آنے سے روک سکتی ہے اور جب چاہے علیحدہ

اس کے علاوہ دوسری چیزیں مثلاً غسل خانہ، پاخانہ اور باورچی خانہ الگ دینا ضروری نہیں ہے، لیکن یہ اس صورت کا حکم ہے جب شوہر معمولی حیثیت کا ہو۔ لیکن اگر شوہر مالدار ہے تو اس کو ایسا گھر دینا چاہیئے جس میں اس کی ضرورت کی تمام چیزیں ہوں، مثلاً غسل خانہ، پاخانہ، باورچی خانہ وغیرہ (رد المحتار)

۴۔ حسن سلوک جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، عورت و مرد کا تعلق محض ایک کاروباری تعلق نہیں ہے۔ بلکہ ان دونوں میں وہی تعلق ہوتا ہے، جو جسم وجان اور خون و گوشت میں ہوتا ہے۔ اس لئے ان کو جو حقوق دیئے گئے ہیں، ان کی ادائگی محض رسمی طور پر نہ ہونی چاہیئے۔ بلکہ ان کی ادائگی ایک عبادت اور انتہائی پسندیدہ کام سمجھ کر کرنی چاہیئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک دینار جو آدمی فی سبیل اللہ خرچ کرتا ہے، اور ایک دینار جو اپنے اہل وعیال پر خرچ کرتا ہے دونوں کا اجر برابر ہے۔ (مسلم)

آپ نے اسی بنا پر بیوی سے حسن سلوک کی سخت تاکید کی ہے، حسن سلوک کا مطلب صرف اتنا نہیں ہے کہ اس کو روٹی، کپڑا، مکان اور دوسری مادی ضروریات زندگی فراہم کر دی جائیں۔ کیونکہ یہ تو ایسے قانونی حقوق ہیں جنھیں ہر حال ادا ہی کرنا ہوگا، خواہ خوشی سے ادا کرے یا بجبر۔ لیکن اس نازک رشتے کی پاکیزگی، لطافت اور اہمیت کا تقاضہ یہ ہے کہ بیوی کے ساتھ اس سے زیادہ کچھ کیا جائے۔ رہنے، سہنے، کھانے پینے میں مساوات برتی جائے۔ بات چیت میں نرمی اور ملاطفت ملحوظ رکھی جائے۔ اس کو بات بات میں ٹوکا اور ڈانٹا نہ جائے، اس کی غلطی اور نقصان سے درگذر کیا جائے۔ اس سے کام لینے میں اسکی کمزور اور نازک فطرت کا لحاظ کیا جائے۔ قرآن میں بار بار معروف طرز عمل اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ۝ (نساء)	اور عورتوں کے ساتھ حسن وخوبی کے ساتھ رہو اگر ان کو تم کسی وجہ سے ناپسند کرتے ہو تو ممکن ہے کہ ایک چیز جو تمہیں ناپسند ہو، اس میں خدا تعالٰی نے تمہارے لئے بہت سی بھلائیاں اور فائدے رکھ دیئے ہوں۔

اس آیت میں دو ہدایتیں دی گئی ہیں۔ ایک تو معروف طریقہ پر رہنے سہنے کا حکم دیا گیا ہے، معروف کا مفہوم بہت ہی وسیع ہے، اس میں ہر طرح کی قانونی اور اخلاقی خوبیاں اور بھلائیاں آجاتی ہیں۔ اس کی پوری تفصیل آگے ارشادات نبوی میں آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ایک آدمی اپنی بیوی کے ساتھ

معاملہ کرنے میں معروف طریقہ سے اسی وقت ہٹتا ہے، جب اس کو یا تو بیوی کی ظاہری خصوصیات پسند نہ ہوں یا پھر اس کی باطنی خصوصیات مثلاً مزاج یا سیرت وکردار میں کوئی خرابی پاتا ہو، یا اس نے اپنے ذہن میں عورت کی صورت وسیرت کا جو بلند معیار بنا یا تھا، وہ اس معیار سے کچھ فروتر نظر آئی ہو، تو ایسے لوگوں کے بارے میں یہ انتہائی حکیمانہ بات کہی گئی ہے کہ وہ اول وہلہ میں ان کی اختیاری یا غیر اختیاری کمزوریوں کی وجہ سے ان سے نفرت نہ کرنے لگیں، بلکہ ان کو ذرا صبر وتحمل سے کام لینا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک عورت جس کی شکل وصورت رفتار وگفتار اور ناز وانداز پسند نہ ہو مگر اس کا باطن بہت اچھا ہو مثلاً وہ انتہائی فرمانبردار اور کفایت شعار ہو، صابر وشاکر ہو، ہنرمند وسلیقہ مند ہو۔ بخلاف اس کے ہوسکتا ہے کہ ایک عورت اپنے حسن وجمال کے اعتبار سے اس کے معیار پر پوری اترتی ہو، لیکن سیرت وکردار اور اخلاق ومعاملات میں بالکل صفر ہو، اس لئے ظاہری حسن وجمال سے محروم بیوی کی طرف سے نفرت وحقارت پیدا کرنے میں جلدی نہ کرنی چاہئے۔ بلکہ صبر سے کام لینا چاہیے، شکل وصورت اس کے اختیار کی چیز نہیں ہے۔

معروف اور غیر معروف طریقۂ معاشرت یا حسن سلوک کی پوری تفصیل حدیث نبوی میں ملے گی چند حدیثیں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔ آپ نے فرمایا:

خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهٖ (ترمذی)	تم میں سب سے اچھا وہ شخص ہے جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ اچھا ہو۔

اپنے بارے میں آپ نے فرمایا کہ میں بھی اپنے اہل وعیال کے ساتھ تم میں سب سے بہتر ہوں۔ آپ نے فرمایا:

خِيَارُكُمْ خِيَارُكُمْ لِنِسَائِهِمْ (مسند احمد، ترمذی)	تم میں بہتر لوگ وہ ہیں جو اپنی بیویوں کے ساتھ بہتر ہیں۔

بیوی کے معاملہ میں صبر وضبط سے کام لینے کی جو ہدایت قرآن میں دی گئی ہے، آپ نے اس کی تفسیر یوں فرمایا:

لا يفرك مؤمن مؤمنة ان كره منها خلقا رضي منها آخر	مسلمان کا یہ شیوہ نہیں ہے کہ اپنی بیوی میں کوئی برائی یا خلاف مرضی بات دیکھ کر [illegible]

(مسلم) نفرت کرنے لگے ، اگر اس کو اپنی بیوی کی ایک عادت ناپسند معلوم ہوتی ہے تو اس کی دوسری عادت اسے پسند بھی آسکتی ہے۔

عورتیں چونکہ فطرۃً کمزور ہوتی ہیں اس لئے ان کی طبیعت میں عام طور پر ضد اور ہٹ دھرمی ہوتی ہے ، اور یہ کمزور آدمی کا خاصہ ہوتا ہے ، اس لئے جب کبھی عورت سے کسی کمزوری کا ظہور ہو تو اس کے دور کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ان کے ساتھ سختی و درشتی سے کام لیا جائے ، بلکہ ان کو سمجھا بجھا کر اسے دور کرنا چاہئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تشبیہ دے کر عورت کی اس فطری کمزوری کو سمجھایا اور اس کے دور کرنے کا طریقہ بتایا ہے آپ نے فرمایا ؛

اسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ فَإِنَّ الْمَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ

(بخاری و مسلم)

عورتوں کے ساتھ نیک برتاؤ کرو۔ عورت کی پیدائش پسلی سے ہوئی ہے اس لئے وہ اسی کے مانند کج ہے ، اگر تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو وہ ٹوٹ جائیگی اور اگر تم اسی ٹیڑھے پن کے ساتھ اس سے کام لوگے تو اچھا نتیجہ برآمد ہوگا ، تو عورتوں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔

۵۔ ظلم و زیادتی اور ایذا رسانی اسی حسن سلوک کا تقاضہ ہے کہ ان کے اوپر ظلم و زیادتی نہ کی جائے ، ان کو ایذا و تکلیف نہ دی جائے ، مثلاً ان کو بلا وجہ مارا نہ جائے ، ان کو برا بھلا نہ کہا جائے ، ان کی دل شکنی نہ کی جائے ۔ ان کے اوپر طعن و تشنیع نہ کی جائے ، انھیں اپنے اعزہ واقربا سے ملنے سے نہ روکا جائے ۔ ان کی مادی ضرورتوں کے ساتھ ان کی نفسانی خواہشوں کے پورا کرنے کا بھی خیال کیا جائے ۔ قرآن نے ظلم و زیادتی سے باز رہنے کا حکم اپنی منکوحہ عورتوں ہی کے بارے میں نہیں بلکہ مطلقہ عورتوں کے بارے میں بھی دیا ہے

وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِتَعْتَدُوا وَمَنْ يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ (بقرہ)

ان کے اوپر زیادتی کرنے اور ایذا پہنچانے کے لئے ان کو نہ روک رکھو ، اور جو ایسا کرے گا

وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا۔

دینی کاموں کی وجہ سے عورت کی حق تلفی بعض لوگ دین کے غلط تصور کی بنا پر نماز روزہ یا دین کے کام میں ایسا منہمک ہو جاتے ہیں کہ عورتوں کے مادی اور جنسی حقوق سے ان کی توجہ بالکل ہٹ جاتی ہے، ایسا کرنا ثواب نہیں ہے، بلکہ یہ ایک بے سہارا بندہ خدا کی حق تلفی ہے، اور حق تلفی بہرحال گناہ ہے۔ ایک بڑے ممتاز صحابی ہر وقت نماز روزے میں لگے رہتے تھے۔ اور بیوی کی طرف ان کی کوئی توجہ نہیں تھی۔ آپ کو اطلاع ملی تو آپ نے بلا کر تنبیہ فرمائی اور فرمایا کہ

وانّ لزوجك عليك حقًّا — تمہاری بیوی کا تمہارے اوپر حق ہے۔

حضرت عمر چار پانچ ماہ کے بعد فوجیوں کو میدان جہاد سے اس لئے گھر واپس کر دیا کرتے تھے کہ وہ اپنے حق زوجیت ادا کر سکیں۔

دینی تربیت ایک حدیث میں آپ نے ہدایت کی ہے کہ رشتۂ نکاح کے قائم کرنے میں لڑکے اور لڑکی کی ظاہری خوبیوں ہی کو وجہ ترجیح نہ بنایا جائے۔ بلکہ ترجیح کی بنیاد دین واخلاق کو بنانا چاہیے ورنہ فساد عظیم برپا ہوگا۔ یہ حدیث اس کے علاوہ بعض اور احادیث اور قرآن کی آیات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مرد کے اوپر بحیثیت نگراں و ذمے دار یہ فرض بھی عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کی دینی و اخلاقی تربیت بھی کرتا رہے۔ قرآن میں ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا ۝	اے مسلمانو! اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو آگ سے بچاؤ۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح عام مسلمانوں کو دین کی باتیں بتاتے تھے، اسی طرح گھر میں اپنی ازواج مطہرات کو دین و حکمت کی باتیں بتاتے رہتے تھے، چنانچہ ازواج مطہرات کو مخاطب کرکے کہا گیا

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيَاتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ	اور تمہارے گھروں میں جو خدا کی آیتیں پڑھی جاتی ہیں اور حکمت کی جو باتیں سنائی جاتی ہیں، ان کو یاد رکھو۔

حضرت مالک بن حویرث رضی صحابی بیان کرتے ہیں کہ ہم چند نوجوان اسلام لانے کے بعد خدمت نبوی میں حصول تعلیم کے لئے حاضر ہوئے، اور آپ کی خدمت میں بیس دن رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

انتہائی نرم خو اور رحم دل تھے، آپ کو بیس دن کے بعد یہ خیال ہوا کہ لوگ گھر جانا چاہتے ہیں، چنانچہ آپ نے دریافت فرمایا کہ گھر میں کس کو چھوڑ آئے ہیں، جب ہم نے بتایا تو آپ نے فرمایا۔

ارجعوا الی اھلیکم فاقیموا فیھم	اپنے اہل وعیال میں واپس جاؤ اور انہی
و علموھم و امروھم	میں رہو سہو اور ان کو علم دین سکھاؤ اور
(بخاری و مسلم)	ان کو نماز، روزہ اور نیکی کا حکم دو۔

اس کے علاوہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے جو عام احکام قرآن و حدیث میں آئے ہیں، ان کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آدمی کو باہر کی فکر سے پہلے گھر کی فکر کرنی چاہئے۔ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے پہلے اپنے قریبی لوگوں میں تبلیغ کا حکم دیا گیا تھا۔

وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ — اپنے کنبے اور خاندان والوں کو انجام سے باخبر کرو۔

بعض فقہا نے اسی بنا پر لکھا ہے کہ اگر شوہر بیوی کو نماز کی تاکید کرتا ہے، اور وہ نماز نہیں پڑھتی، تو وہ طلاق دے سکتا ہے۔ اگرچہ وہ مہر دینے پر قادر نہ ہو، (عالمگیری) دینی تربیت کی اس اہمیت کے پیش نظر بعض ائمہ نے یہ اجازت بھی دی ہے کہ اگر کوئی آدمی عورت کا مہر مقرر کرے کہ ہم اس کو قرآن پڑھائیں گے تو اس سے بھی نکاح ہو جائے گا، گو اس کو نقد مہر بھی دینا پڑے گا۔

مگر بیوی کی اصلاح و تربیت میں ان احکام کو سامنے رکھنا چاہئے۔ جو اصلاح و تربیت کے سلسلے میں دیئے گئے ہیں، یعنی یہ اصلاح و تربیت حکمت و موعظت اور موقع و محل کے ساتھ ہو، اس سے خالی نہ ہو، اس سلسلہ میں وہ حدیث نبوی بھی سامنے رہنی چاہئے جس میں کہا گیا ہے کہ عورت کی اصلاح میں اس کی فطری کمزوری اور کجی کو ملحوظ رکھا جائے، ورنہ درست ہونے کے بجائے ٹوٹ جائے گی۔

خلع و تفریق اگر کوئی مرد اپنے فرائض انجام نہیں دیتا، تو عورت کو یہ حق ہے کہ وہ اس مرد سے صلح و مصالحت کے ذریعہ اپنے حقوق لینے کی کوشش کرے، اگر صلح و مصالحت سے بات نہ بن سکے تو پھر وہ قانونی طور پر اسے حاصل کرے، اور اگر وہ اس سے بھی مطمئن نہ ہو تو پھر اس کو حق ہے کہ وہ اس سے خلع و تفریق کرالے۔

بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی مدظلہ

ایک مجلس میں فرمایا کہ حق تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے ارشاد فرمایا کہ وَذَکِّرْ ۔ تذکیر، نصیحت اور یاد دہانی آپ فرماتے رہیے۔ اس کے بعد فرمایا کہ فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ یعنی ذکریٰ، نصیحت اور یاد دہانی بالیقین، بلاشبہ ایمان والوں کو نفع پہونچاتی ہے۔

اس آیت میں حق تعالیٰ اتنے دعوے کیساتھ فرما رہے ہیں کہ بے شک یقیناً تذکیر مومنین کو نفع پہنچاتی ہے، اب ہمارے اور آپکے سوچنے کی بات ہے کہ آج روزانہ یہ وعظ کے جلسے اور یہ محفلیں جو منعقد ہوتی ہیں اگر یہ تذکیر کے لئے نہیں ہیں تو پھر اس کا مقصد بتایا جائے کیا ہے؟ اور اگر تذکیر کے لئے ہیں تو اس تذکیر سے کتنا نفع پہونچتا ہے وہ آپ سوچ کر مجھے بتائیں۔ میں تو بہت سوچ چکا ہوں اور یہ دیکھتا ہوں کہ بالکل سو فیصد نفع سے خالی ہیں۔ چنانچہ ایک آدمی کے سامنے اگر جھوٹ بولنے کی مذمت بیان کی جاتی ہے تو اس تذکیر سے پہلے جتنا جھوٹا تھا کل کو اس سے کچھ بڑھ ہی کے جھوٹا ملے گا۔ بہرحال کم تو ہوتا نہیں۔ نماز کا پابند نہیں ہے۔ کوئی پابندی اس میں نماز کی نہیں ہوتی، حرام مال کھاتا ہے قطعاً اجتناب کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا۔ پس ہم کو اور آپ کو غور کرنا چاہئے کہ اس کی وجہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تو دعوے کے ساتھ فرماتے ہیں کہ تذکیر مومنین کو نفع پہونچاتی ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہماری تذکیر سے نفع نہیں ہو رہا ہے۔ تو اس کی دو ہی وجہ ہو سکتی ہے۔ یا تو ہم تذکیر کے نام سے جو کام کرتے ہیں وہ حقیقۃً تذکیر نہیں، یا پھر جو ایمان ہم سے مطلوب ہے وہ ایمان ہم میں نہیں۔ ورنہ اگر صحیح معنوں میں تذکیر ہو اور صحیح معنوں میں ہم مومن ہوں تو ناممکن ہے کہ نفع نہ ہو۔ ضرور نفع ہوگا حق تعالیٰ کا ارشاد برحق ہے۔

بس یہ بات میرے سوچنے کی بھی ہے جو مذکر بن کر اس کرسی پر بیٹھتا ہوں اور آپ کے بھی سوچنے کی ہے جو مذکر بن کر وہاں بیٹھتے ہیں، میں اپنی نسبت کہہ دوں کہ خوب اچھی طرح جانتا ہوں کہ ہماری تذکیر تذکیر نہیں ہے، ہم قرآن کی آیت بھی پڑھتے ہیں، ہم حدیث بھی سناتے ہیں، ہم بزرگوں کے واقعات بھی بتلاتے ہیں مگر تذکیر بالحقیقت تذکیر کی صورت کا نام نہیں ہے، جس طرح شیر کی تصویر کا نام شیر نہیں ہے، درخت کی تصویر کا نام درخت نہیں ہے۔ اگر درخت کا فوٹو کسی کاغذ پر اتار لیجئے تو وہ فوٹو درخت نہیں ہے، بلکہ درخت یہ ہے جو ہمارے سامنے کھڑا ہے۔ درخت کی حقیقت کے اوپر جو نتائج مرتب ہو سکتے ہیں وہ اس پر ہو سکتے ہیں اس کی تصویر پر نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح شیر جو بڑا بہادر اور جری جانور تصور کیا جاتا ہے وہ کاغذ پر جو اس کا فوٹو بنا ہوتا ہے وہ نہیں ہے۔ کیونکہ شیر کی صفات اس میں نہیں پائی جاتیں۔ وہ حملہ آور نہیں ہو سکتا، وہ شجاع اور بہادر نہیں ہے۔

اچھا میں اس سے بڑھ کر مثال آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ نماز جو مدار نجات ہے، جو موجب دخول جنت ہے، جو جہنم سے نکالنے والی ہے۔ جس سے حق تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ وہی مدار ہے حق تعالیٰ کی خوشنودی حاصل ہونے کا۔ وہ صرف اس ظاہری رکوع و سجود کا نام نہیں ہے۔ بلکہ آپ اللہ اکبر کہہ کر جتنے ارکان جتنے واجبات اور جتنے سنن و مستحبات نماز کے ہیں ان سب کی رعایت کر کے نماز پڑھیے۔ اور اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لئے پڑھیئے تو وہ نماز ہے۔ چنانچہ دو شخص اسی طرح نماز پڑھیں، جو شکل و صورت کے لحاظ سے اجزائے ترکیبی کے لحاظ سے بالکل یکساں ہوں مگر نیت کے اعتبار سے مختلف ہوں، تو بظاہر تو دونوں برابر معلوم ہونگے۔ مگر ایک کی نماز واقعی نماز ہے، اور دوسرے کی نماز نماز نہیں ہے۔ چنانچہ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

کلید در دوزخ است آں نماز
کہ در چشم مردم... گذاری دراز

یعنی جو نماز لوگوں کو دکھانے کے لئے لمبی لمبی پڑھو وہ دوزخ کے دروازے کی کنجی ہے۔ یعنی اس سے جنت کا دروازہ نہیں کھلے گا بلکہ اس سے جہنم کا دروازہ کھلے گا۔

تو آخر کیا بات ہے کہ اس نماز کو جہنم کے دروازے کی کنجی کہا جا رہا ہے۔ بات یہ ہے کہ نماز کی صورت کا نام نماز نہیں ہے۔ حقیقی نماز کا نام نماز ہے، اور حقیقی نماز وہ ہے جو لوگوں کو دکھانے کیلئے نہ پڑھی جائے بلکہ

اللہ تعالیٰ کو دکھانے کے لئے پڑھی جائے اور اللہ ہی کی رضا و خوشنودی اس سے مقصود ہو۔
جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

من صلیٰ وھو یرائی فقد اشرک	جس نے نماز پڑھی مگر ریاکاری سے تو اس نے
ومن صام وھو یرائی فقد اشرک	شرک کیا اور جس نے روزہ رکھا ریاکاری سے تو اس نے
	بھی شرک کیا۔

بس اس تمثیل کے بعد میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم قرآن کی آیتیں سناتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیثیں سناتے ہیں، بزرگوں کے واقعات و ملفوظات سناتے ہیں تو اگر اس سنانے کا مقصد یہ ہے کہ پوری دلسوزی سے آپ کی اصلاح کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کا بھولا ہوا سبق یاد دلانا چاہتا ہوں، اس میں دوسری کوئی اور غرض شامل نہیں ہے تب تو یہ تذکیر واقعی تذکیر ہے، لیکن یہی سارے کام اگر اس لئے کروں کہ لوگ کہیں گے کہ مولانا نے بہت لاجواب تقریر کی، اور واقعی آج تو دل خوش ہوگیا تو عربی کا ایک فقرہ مشہور ہے۔ الشیء اذا خلا عن مقصودہ لغی۔ جس نے بھی یہ بات کہی بالکل اصولی کہی کہ کوئی چیز اگر اپنے مقصود سے خالی ہے تو لغو اور بے کار ہے۔ ہماری یہ تذکیر اگر اپنے مقصود اصلی سے خالی ہے تو یہ تذکیر ہی نہیں ہے۔ اور آج ہماری تذکیر کے غیر نافع ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے، اور دوسرا سبب اُدھر بھی ہے، یعنی ادھر (تذکیر) بھی نقص ہے اور ادھر بھی پانی مرتا ہے۔ کہ جو ایمان مطلوب ہے، اس ایمان سے ہم عاری اور خالی ہیں۔ ورنہ تو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک ہی میں نہیں بلکہ ان کے بعد بھی بہت دنوں تک اس تذکیر کا یہ حال تھا کہ مذکر کرسیٔ تذکیر پر بیٹھتا تھا اور وعظ کہتا تھا تو مجلس میں کئی کئی لاشیں ہوتی تھیں لوگ تڑپ تڑپ کر مر جاتے تھے۔ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تذکیر کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ آپ کی جان کے دشمن، خون کے پیاسے، شرک سے آلودہ، ہمیشہ کے شرابی کبابی جواری بھی آپ کی ایک تقریر سن کر ہر چیز سے تائب ہو جاتے تھے، اور ایک ہی مجلس میں پاک و صاف ہو جاتے تھے اس لئے کہ آپ کی تذکیر حقیقی تذکیر تھی، وہ نبوت و رسالت کی طاقت الگ سہی، مگر تذکیر حقیقی تھی، اسی حقیقی تذکیر کا یہ اثر ہوتا تھا۔

آپ کہیں گے وہ تو نبی تھے ان کی کیا مثال دیتے ہو تو میں عرض کرتا ہوں کہ اچھی بات ہے، جو غیر نبی تھے میں ان کی مثال دیتا ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت میں اعلان کر دیا کہ کوئی

شخص دودھ میں پانی نہ ملا دے۔ آج دیکھ لیجئے ملاوٹ کے اوپر کتنے کتنے قانون بنتے ہیں، کیسی کیسی سزائیں مقرر ہوتی ہیں۔ کیسی کیسی جانچ اور انکوائری ہوتی ہے، مگر آپ دیکھ لیجئے کچھ رک رہا ہے؟ اور حضرت عمرؓ کا دور دیکھئے کہ انہوں نے اس کی ممانعت کردی کہ دودھ میں کوئی پانی نہ ملا دے۔ ایک لڑکی سویرے سحر کے وقت اٹھی اور دودھ دوہا، اس کی ماں نے کہا کہ ابھی تو اندھیرا ہے۔ دیکھتا کون ہے اس میں تھوڑا پانی ملا دے۔ لڑکی نے کہا اماں! شاید تم مجھے یہ بتانا چاہتی ہو کہ عمر کو کیا خبر ہوگی تو ٹھیک ہے عمر کو خبر نہیں ہوگی، مگر عمرؓ کا پیدا کرنے والا تو دیکھ رہا ہے (جس کے حکم سے عمرؓ کی اطاعت واجب ہوتی ہے)

دیکھا آپ نے یہ ان لوگوں کی تذکیر تھی، ان کی تذکیر دل سے ہوتی تھی، صحیح مقصد کو لیئے ہوئے ہوتی تھی، اس لئے اس کا اثر ہوتا تھا۔ چنانچہ مشہور ہے۔ ؎

آنچہ از دل خیزد بر دل ریزد

یعنی جو بات دل سے نکلتی ہے وہ دل پر اثر کرتی ہے۔

پس یہاں تذکیر کے نافع ہونے کے لئے دو شرطیں ہیں۔ ایک تو صحیح معنوں میں تذکیر ہو، دوسرے سامعین میں جو ایمان مطلوب ہے وہ موجود ہو۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک بڑی حد تک یہ دونوں ہی شرطیں مفقود ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ٹھاٹ سے جلسے ہوتے ہیں، ہزار ہزار، دس دس ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ کا مجمع ہوتا ہے، تین تین دن جلسے ہوتے ہیں، دس دس مقرروں کی تقریریں ہوتی ہیں۔ اور تقریر کرنے والے بھی پورا زور صرف کر ڈالتے ہیں، دو دو، چار چار گھنٹے تقریر کر ڈالتے ہیں، مگر نفع کچھ بھی نہیں اور یہ لمبی لمبی تقریریں خود اس بات کی دلیل ہیں کہ ہم صحیح معنوں میں سنت کے مطابق تذکیر نہیں کرتے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

ان اطول صلوٰۃ الرجل وقصر خطبتہ مئنۃ من فقھہ

یعنی کوئی آدمی نماز تو لمبی پڑھے لیکن وعظ مختصر کرے، یہ اس کے عقلمندی کی دلیل ہے۔ گویا حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرما رہے ہیں کہ یہ حماقت ہے کہ نماز تو بہت مختصر کرے اور خطبہ خوب لمبا دے۔ اسی سے معلوم معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصول تذکیر یہ نہیں تھا جو آپ ہے۔

صحیح بخاری پڑھو، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے تذکیر کے لئے پنجشنبہ کا دن مقرر کر رکھا تھا۔ لوگوں نے ان سے فرمائش کی کہ حضرت، ہفتہ میں ایک آدھ دن کا اور اضافہ فرمادیتے تو بہتر ہوتا

آپ نے فرمایا کہ:

كان رسول الله صلى الله عليه وسلم يتخولنا بالموعظة مخافة السآمة علينا

یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تذکیر یہ تھا کہ آپ گاہ گاہ اور کبھی کبھی ہماری خبرگیری نصیحت کے ساتھ فرمایا کرتے تھے تاکہ ہم اکتا نہ جائیں۔

دیکھئے میں بتاتا ہوں کہ آج ہماری تذکیر میں بھی نقص ہے۔ صحیح معنوں میں اور صحیح طریقہ سے نہیں ہو رہی ہے، اس لئے نفع نہیں دے رہی ہے۔ آپ جلسوں میں جاکر دیکھ لیجئے کیا ہوتا ہے کہ ایک مقرر تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہے گھنٹہ دو گھنٹہ پھر لوگ سنتے سنتے جب بھاگنے لگتے ہیں تو مقرر صاحب کہتے ہیں بس دس منٹ میں ختم کرتا ہوں، پھر انہوں نے دس کا بیس منٹ لیا، پھر لوگ بھاگنے لگے تو کہتے ہیں بس اب ختم ہی کرتا ہوں، دعا سن کے چلے جائیے گا۔

بہرحال میں یہ کہتا ہوں کہ نبوی طریقہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو اسی قدر پلاتے تھے۔ جتنا آسانی سے پی سکیں، زبردستی نہیں تھی۔ اور اسی معمول کو عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بھی اپنایا تھا۔ چنانچہ صاف فرمادیا کہ جی نہیں وعظ و تذکیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا جو معمول تھا وہی طریقہ ہم کو اختیار کرنا چاہئے۔ اور دیکھ لیجئے کہ اس کا کیا اثر تھا۔ اور آج جو ہم نے طریقہ اختیار کر رکھا ہے اس کا کیا اثر

بقیہ نئی کتابیں ۔۔۔ شامل ہے۔ اس مضمون میں ان کی پوری زندگی اور خیالات کا پورا مرقع سامنے آجاتا ہے۔ ان کے علاوہ جن لوگوں نے اپنے تاثرات ظاہر کئے ہیں اس میں مولانا کی زندگی کی طرح کسی میں کوئی بناوٹ نہیں معلوم ہوتی، اس لئے ان کو پڑھ کر قلب متاثر ہوتا ہے، اور ان کے سادہ طالب علمانہ زندگی کے واقعات میں اہل ذوق کے لئے بڑا سامان بصیرت موجود ہے۔

مولانا اپنے بعض تفردات اور حدیث نبوی کے بارے میں اپنے مخصوص خیالات کی وجہ سے جمہور امت سے کٹ گئے تھے۔ مولانا عبد السلام ندوائی مرحوم نے ان کے خیالات کی جو توجیہ کی ہے اس کے باوجود یہ خیالات بعد میں ایک فتنہ کا سبب بن گئے۔ ان کے تفردات اور حدیث کے بارے میں ان کے خیالات کے متعلق یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ یہ ان کے قلت مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ محدثین نے قطعی اور ظنی حدیث کی جو تقسیم کی تھی اسے انہوں نے اصطلاحی معنی میں لینے کے بجائے لفظی معنی میں لے لیا جس سے انکے دل میں یہ خیال بیٹھ گیا

باقی صفحہ

ترجمہ طبقات کبریٰ امام شعرانی رحمۃ اللہ علیہ

(جناب مولانا قمر الزماں صاحب الہ آبادی)

الرشاد کے پچھلے پرچہ میں امام عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات زندگی کے کچھ گوشوں پر روشنی ڈالی جاچکی ہے۔ اب مترجم موصوف نے اس ترجمہ کے سلسلہ میں جو تمہیدی باتیں لکھی ہیں اور خود مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب کا جو خطبہ لکھا ہے، اسے یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ انشاء اللہ اگلی اشاعت میں ارشادات نبوی ﷺ سے کتاب کا آغاز کیا جائے گا۔ (ادارہ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

مرشدی ومقتدائی حضرت مصلح الامت مولانا وصی اللہ صاحب اعظم گڑھی ثم الہ آبادی قدس سرہٗ کو عارف باللہ ابوالمواہب علامہ عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ کے علوم ومعارف سے خاص مناسبت تھی۔ اس لئے ان کی مصنفات مثلاً "الیواقیت والجواہر" اور "الطبقات الکبریٰ" وغیرہ سے اکثر مضامین سنایا کرتے تھے۔ اور بطور استدلال پیش فرماتے تھے جس کی وجہ سے اس حقیر کو بھی ان کتابوں سے یک گونہ مناسبت ہوگئی۔ چنانچہ جب حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کی عدم موجودگی میں ان کی روزانہ کی مجلس میں انکے امرسے بیان کرنے کی سعادت نصیب ہوتی تو اکثر طبقات کبریٰ سے بزرگوں کے مقالات حکمت وموعظت سناتا، جس سے سامعین متأثر ومحظوظ ہوتے۔ حتیٰ کہ بعض مخلص احباب نے اس کے ترجمہ کی خواہش کی۔ اس کی افادیت پر نظر کرکے اس حقیر کو بھی خواہش ہوئی کہ اس کا ترجمہ ہو جاتا تو عوام وخواص سب کے لئے نفع بخش ہوتا مگر چونکہ اس کتاب میں مشائخ کرام کے ایسے بھی اقوال واحوال مذکور ہیں جو عوام کی فہم سے بالاتر ہیں اس لئے ان کے حرف بحرف ترجمہ سے کوئی فائدہ سمجھ میں نہ آیا۔ اس لئے خیال ہوا کہ ایسے اقوال کا انتخاب کیا جائے جو سبھی

آسانی سے سمجھ میں آجائیں، اور ان میں کوئی نہ کوئی نصیحت وہدایت ہو۔

پس اللہ کا نام لے کر ذو قعدہ ۱۳۹۵ھ سے انتخاب مقالات کا کام شروع کر دیا۔ اور الحمدللہ جلد ہی اختتام تک پہونچ گیا۔ اثنائے تلخیص وانتخاب میں حضرت مرشدی بقیۃ السلف مولانا محمد احمد صاحب دامت برکاتہم سے اس کا ذکر برابر آتا رہا۔ اور بعض اقوال سلف کو سناتا بھی رہا تو ارشاد فرمایا کہ اس کا ترجمہ اردو میں ہو جاتا تو عوام وخواص سب کے لئے مفید ہوتا۔ پس اس حقیر نے حضرت دامت برکاتہم کی دعا وتوجہ کے ساتھ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۶ھ میں اس کا ترجمہ شروع کر دیا۔ اور ۱۸ رجمادی الاولیٰ ۱۳۹۷ھ کو اس سے فراغ نصیب ہوا۔ فللہ الحمد والمنۃ۔

خیال تھا کہ اس کو مستقل کتابی شکل میں طبع کیا جائے گا۔ مگر اس کی صورت نہ نکلی تو یہ مشورہ ہوا کہ ہندوستان کے موقر ماہنامہ "الرشاد" جس کے بانی ومدیر مکرم بندہ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی مدظلہ ہیں اس میں قسط وار شائع کرایا جائے۔ چنانچہ جب مولانا المکرم سے بات کی گئی تو مولانا مدظلہ نے بخوشی منظور فرمالیا جس سے بہت اطمینان ہوا جزاہ اللہ خیرالجزاء۔

اس حقیر نے مولانا المکرم سے یہ درخواست کی کہ ترجمہ میں جو خامی وکمی ہو اس کو بلا تکلف اصلاح فرمادیں اور مناسب مقام پر اگر کوئی مقولہ نظر سے گذرے تو اس کا اضافہ فرمادیں۔ نیز حقیر کا یہ ارادہ ہے کہ طبقات کبریٰ کے علاوہ اگر کسی معتبر کتاب مثلاً صفۃ الصفوۃ لابن الجوزی، البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر، خلفائے راشدہ مصنفہ مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی۔ اسوۂ صحابہ مؤلفہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم وغیرہ سے مناسب مقام اقوال مفیدہ یا احوال رفیعہ ملیں گے تو ان کو درج کر دوں گا۔ اور اس کا حوالہ لکھ دوں گا۔

ایک خوشی کی بات یہ ہے کہ بعض انتخاب وتلخیص کے معلوم ہوا کہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی رسالہ قشیریہ اور طبقات کبریٰ کا بالاستیعاب مطالعہ فرما کر بزرگان سلف کے چیدہ چیدہ واقعات وحالات اور مقالات کا انتخاب فرما کر مستقل رسالہ کی شکل میں جمع فرمادیا ہے۔ اور ہر واقعہ یا ملفوظ پر ایک عنوان بھی قائم فرمادیا ہے، اور مزید توضیح وتشریح کے لئے کہیں کہیں فوائد کا اضافہ بھی فرمادیا ہے۔ اس مجموعہ کو اگر اخلاق وتصوف کی روح کہا جائے تو بجا ہے۔

چونکہ یہ رسالہ عربی زبان میں تھا اس لئے حضرت حکیم الامت ؒ نے حضرت مولانا مفتی محمد شفیع ؒ کو امر

فرمایا کہ اس کا اردو میں ترجمہ کر دیں۔ چنانچہ انہوں نے ترجمہ فرما دیا۔ جو روح تصوف یعنی مقالات صوفیہ کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ جو چاہے اس کا مطالعہ کرے۔ اس لئے کہ بے حد مفید ہے۔

حضرت العلامہ شعرانی رحمہ نے طبقات کبریٰ میں حضرت امیر المومنین ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے لے کر اپنے ہم عصر علماء مشائخ اور سلف صالحین کے ارشادات و مقالات درج فرمایا ہے۔ تو ہمارے دل میں یہ داعیہ و شوق پیدا ہوا کہ حضرت سید المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام جو جوامع الکلم و منابع الحکم ہیں، ان کے کلمات طیبات کو درج کر کے ان کی روحانیت کو متوجہ کریں، اور ان کا ذکر کر کے اللہ کی رحمت کو اپنی طرف مبذول کرائیں۔ اس لئے کہ آپ کا ارشاد ہے تنزل الرحمۃ عند ذکر الصالحین تو پھر رأس الصالحین واشرف المرسلین کے ذکر کے وقت کیسی کچھ رحمت الٰہیہ کا نزول ہوگا۔

لہٰذا اس تحفہ نے حضرت حکیم الامت مولانا الشاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی رح کی چہل حدیث کو مع ترجمہ نقل کر دینا مناسب سمجھا۔ اس لئے کہ احادیث مقدسہ کا مجموعہ جو محدث کبیر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی کا انتخاب فرمودہ ہو۔ اس سے بڑھ کر کس کا ہو سکتا ہے۔

نیز یہ بھی جذبۂ دل اور داعیہ ہے کہ انشاء اللہ دسویں صدی سے لے کر چودھویں صدی تک کے اکابر علماء کے چیدہ چیدہ اقوال کا اضافہ کروں تاکہ معرفت و موعظت کا مزید مواد جمع ہو جائے اور یہ معلوم ہو کہ متقدمین اور متاخرین کے کلمات و تعلیمات کے درمیان کس قدر یکسانیت و مطابقت ہے۔ بلکہ ان کا یہ کہنا بالکل درست ہے ع

نیاوردم از خانہ چیزے نخست

ان ارشادات اکابر کے مجموعہ کا نام "اقوال سلف" رکھا۔ جیسا کہ علامہ شعرانی کی کتاب "تنبیہ المغترین" کی تلخیص و ترجمہ کا نام حضرت مولانا محمد احمد صاحب دامت برکاتہم نے "اخلاق سلف" رکھا۔ جو الحمد للہ زیور طبع سے آراستہ ہو چکی ہے۔ اور عوام و خواص ہر طبقہ میں مقبول ہو رہی ہے۔ یقیناً حضرت مولانا دامت برکاتہم نے امت مرحومہ کے لئے بہت ہی مفید خدمت فرمائی۔ فجزاہ اللہ تعالیٰ خیر الجزاء عنا وعن سائر المسلمین۔ اللہ تعالیٰ اقوال سلف کو بھی قبول فرمائیں۔ اور اس کی افادیت کو عام و تام فرمائیں۔ آمین یارب العلمین بجاہ مصطفیٰ صلوٰۃ وسلاما علیہ وعلی آلہ وصحبہ اجمعین۔

اخیر میں یہ التماس ہے کہ خطبۂ طبقات میں حضرت علامہ شعرانی رح کی اس بات کو بوقت مطالعہ مستحضر

رکھیں کہ "جس شخص نے اس جیسی کتاب کا مطالعہ کیا اور اس کے اندر اللہ کے طریق کا شوق و جذبہ پیدا نہ ہوا تو وہ اور مردہ برابر ہے۔" پس ہم کو چاہئے کہ مطالعہ عقیدت اور عمل کی نیت سے کریں۔ اللہ کی رضا کیلئے کریں تو انشاء اللہ تعالیٰ ان اصحابِ نفوسِ قدسیہ کے اقوال و احوال کے مطالعہ سے فرور نفع ہوگا۔ اور حیاتِ قلب نصیب ہوگی۔ اپنے لئے اسی طرح مطالعہ کرنے کی توفیق کی دعا کی درخواست ہے۔

محمد قمر الزماں عفی عنہ
خادم مدرسہ عربیہ بیت المعارف الہ آباد
شوال ۱۴۰۶ھ

خطبۂ کتاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمام تعریف اس اللہ کے لئے ہے جس نے اپنے اولیاء کو انعام کی خلعت سے نوازا جس کی وجہ سے وہ ان کی حمد میں لگے رہتے ہیں۔ اور ان کو اپنی محبت کے ساتھ مخصوص فرمایا۔ اور اپنی خدمت و طاعت میں رہنے کی توفیق مرحمت فرمائی۔ جس کی وجہ سے اپنی نمازوں پر محافظت فرماتے ہیں۔ اور ان کو اپنے دربار میں بلا کر ان کے درجات کو ظاہر فرمایا فَالسَّابِقُونَ السَّابِقُونَ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُقَرَّبُوْنَ۔ پس وہی لوگ سبقت لیجانے والے ہیں۔ وہی مقرب ہیں۔ اور ان کے لئے اپنی بارگاہ کے ابواب مفتوح فرما دیئے۔ اور بُعد کے حجابات کو مرتفع فرما دیئے۔ جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں باادب کھڑے ہوگئے۔ اور ان کو اپنی خاص عنایت و مودت کی وجہ سے اپنے لطف و کرم سے نوازا۔ اور ان کو اعراض و روگردانی سے مامون فرما دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ٥ یعنی اولیاء اللہ کو نہ خوف ہے اور نہ ان کو حزن لاحق ہوگا۔

اپنے فضل سے ان کے بصائر کو منور فرما دیا۔ اور ان کے باطن کو پاک و صاف کر دیا۔ اور ان پر اسرار کو آشکارا فرما دیا۔ اور اغیار سے محفوظ رکھا۔ اور فساق و فجار سے مستور رکھا۔ اس لئے کہ یہ حضرات عروس ہیں اور مجرمین عروس کو دیکھنے نہیں پاتے۔ اور یہ مجرم لوگ تو ایسے ہیں کہ جب ان کے پاس سے کوئی ولی گذرتا

تو اس کو زندیق و مجنوں کہتے ہیں۔ تراهم ینظرون الیك وهم لا یبصرون آپ ان کو دیکھ کر یہ سمجھینگے کہ آپ کو وہ لوگ دیکھ رہے ہیں، حالانکہ فی الحقیقت وہ نہیں دیکھتے۔

چنانچہ ان میں سے بعض تو ان حضرات کی کرامات کا انکار کرتے ہیں، اور بعض ان کے مقامات کی تنقیص کرتے ہیں۔ اور بعضے تو ان کی عزت و آبرو پر حملہ کرتے ہیں، اور بعض ان کے احوال پر اعتراض کرتے ہیں، اور ان کے ارشادات میں اپنی جہالت کی وجہ سے کھود کرید کرتے ہیں، اور ان کے ساتھ استہزا کا معاملہ کرتے ہیں۔ حالانکہ اللّٰہُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَیَمُدُّهُمْ فِی طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ استہزار فرمارہے ہیں، اور ان کو ان کے طغیان میں چھوڑے ہوئے ہیں کہ اس میں بھٹک رہے ہیں۔

پس پاک ہے وہ ذات جس نے کچھ لوگوں کو اپنا مقرب بنایا اور اپنی خدمت و طاعت کے لئے چن لیا، پس وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے در اقدس کے ملازم ہو گئے۔ اور پاک ہے وہ ذات جس نے ان حضرات کو چرخ ولایت کا ستارہ بنایا۔ جن کے ذریعہ زمین والے ہدایت یاب ہوتے ہیں —— اور پاک ہے وہ ذات جس نے ان لوگوں کو اپنے دربار میں حضوری کا شرف بخشا اور ان پر رد و انکار کرنے والوں کو اس سے دور رکھا، پس اولیاء اللہ تعالیٰ قرب کی جنت میں لطف اندوز ہو رہے ہیں، اور منکرین بعد کی آگ میں گرفتار عذاب ہیں۔ لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَهُمْ یُسْئَلُوْنَ ۔ یعنی اللہ تعالیٰ سے ان کے افعال کے متعلق سوال نہ کیا جائے گا، مگر، اور لوگوں سے ان کے افعال کے متعلق باز پرس ہوگی۔

اور میں شہادت دیتا ہوں جیسا کہ اہل یقین شہادت دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور میں شہادت دیتا ہوں کہ ہمارے سردار اور ہمارے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بندے اور اس کے رسول ہیں جو نور مخزون اور سر محفوظ ہیں۔ اے اللہ ان پر اور تمام انبیاء و مرسلین پر اور ان کے جملہ آل و اصحاب پر اپنی رحمت و سلامتی نازل فرما جب تک ذکر کرنے والے ذکر کرتے رہیں اور غافلین اپنی غفلت کے شکار رہیں (یعنی ہمیشہ ہمیش)

بعد حمد و صلوٰۃ کے معلوم ہو کہ اس کتاب میں میں نے جماعت اولیاء کے ان طبقات کی تلخیص کی ہے جن کی اللہ عزوجل کے طریق میں اقتدا کی جاتی ہے۔ یعنی صحابہ و تابعین اور نویں صدی کے آخر اور دسویں صدی کے بعض حصہ تک کے اولیاء اللہ۔ اور میرا مقصود اس کتاب کی تالیف سے یہ ہے کہ تصوف یعنی آداب مقامات و احوال میں قوم صوفیہ نے جو طریقہ بیان کیا ہے اس کو واضح کردوں۔

پس میں نے اولیاء کرام کے انہیں ارشادات کو نقل کیا ہے جو مغز و جوہر تھے، نہ وہ جن میں دوسرے حضرات بھی شریک ہیں۔ اور ائمہ شریعت کی کتابوں میں مسطور ہیں۔ اسی طرح ان حضرات کے ابتدائی حالات کو بھی نہ لکھونگا۔ ہاں مگر وہ حالات جس سے مریدین کو نشاط پیدا ہو جیسے بھوک کی شدت اور بیداری کی کثرت اور عدم شہرت اور گمنامی کی طلب وغیرہ، اور یا تو ایسے اقوال کو نقل کروں گا جو تعظیم شریعت پر دلالت کرتے ہوں تاکہ ان لوگوں کے اعتراض کا جواب ہو جائے جن کو یہ خیال ہوگیا ہے کہ صوفیہ نے تصوف کو اختیار کرکے شریعت کا بعض حصہ ترک کر دیا ہے۔۔

اور ان حضرات کے اقوال کو نقل کرنے کی غرض یہ ہے کہ جن کا اعتقاد ان حضرات کے ساتھ صحیح ہے اور ان کے کلام کو قبول کرنے میں ان کے لئے طریق کو قریب کر دیا جائے۔ اس لئے کہ مرید صادق وہی ہے کہ جب اپنے شیخ سے کوئی نصیحت کی بات سنے تو جزم و یقین کے ساتھ اس پر عمل کرے۔ پس جب عمل پورا ہو جائے گا۔ تو اس طرح اپنے شیخ کے برابر ہو جائے گا، اور شیخ کے لئے مرید پر کوئی زیادتی باقی نہ رہے گی، سوا اس کے کہ شیخ نے اس کو (ابتداءً) فیض پہونچایا ہے۔ اور یہیں سے کہا گیا ہے کہ بدایۃ المرید نہایۃ شیخہ یعنی مرید کی ابتدا اس کے شیخ کی انتہا ہے۔ اس لئے کہ شیخ اپنی اخیر عمر میں جو کچھ کر رہا ہے یا کہہ رہا ہے وہ اس کے طویل عمر کے مجاہدات و ریاضات کا خلاصہ و ثمرہ ہے (پس جب مرید ان باتوں پر عمل کرے گا تو اس کے مرتبہ تک پہونچ جائے گا)

اور ان طبقات کو میں نے اپنے ان مشائخ کے ذکر پر ختم کیا ہے، جن کو میں نے دسویں صدی کے شروع میں پایا اور ان کی خدمت میں عرصہ تک مقیم رہا، کبھی کبھی بطور تبرک ان کی زیارت کی اور ان سے کوئی ادب یا حکمت کی بات سنی تو اس کو اسی جزم و یقین کے ساتھ نقل کروں گا۔ جیسا کہ مشائخ سلف کے کلام کو نقل کیا ہے۔ اور یہ حضرات کل کے کل منجملہ مصر کے علماء و مشائخ کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو۔

اے میرے بھائی! یقین کر و کہ جو شخص بھی اس کتاب کا مطالعہ اعتقاد کے ساتھ کرے گا، ایسا ہے گا، گویا اس کو جملہ اولیاء مذکورین کی معاصرت حاصل ہوگئی اور اس نے ان حضرات کے کلام کو سن لیا، بلکہ اگر کوئی شخص کسی شیخ کا زمانہ نہ پائے تو اس کی محبت و صحبت میں قادح نہیں ہے، اس لئے کہ ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین اور ائمہ مجتہدین سے محبت کرتے ہیں، حالانکہ ہم نے ان کو نہ دیکھا ہے اور نہ ان کا زمانہ پایا ہے، اس کے باوجود ان کے اقوال سے منتفع ہوتے ہیں اور ان کے اخلا

کی اقتداکرتے ہیں۔ جیسا کہ مشاہدہ ہے، اس لئے کہ جب معتقدات کی صورت حاصل ہو جائے تو اشخاص کی صورت دیکھنے کی حاجت باقی نہیں رہ جاتی۔

نیز یہ بھی سن لو! کہ جس شخص نے اس جیسی کتاب کا مطالعہ کیا اور اس کے اندر اللہ کے طریق کا شوق وجذبہ پیدا نہ ہوا تو وہ اور مردہ برابر ہے۔ اس کتاب کا نام "لوافح الانوار فی طبقات الاخیار" رکھا اور اس کے شروع میں مفید مقدمہ لکھا ہے۔ پس جو شخص قوم صوفیہ کا معتقد ہوگا۔ وہ جب اس کا مطالعہ کرے گا تو اس کا اعتقاد مزید ہو جائے گا، ہم اس مقدمہ میں پوشیدہ طور پر اس بات کیطرف اشارہ کریں گے کہ اس طائفہ پر انکار ہر زمانہ میں رہا ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ان حضرات کے ذوق کی بلندی کی وجہ سے اکثر عقول کی وہاں تک رسائی نہیں ہوتی اور ان حضرات کے کمال کا یہ حال ہے۔ کہ لوگوں کے انکار سے متغیر نہیں ہوتے جس طرح پہاڑ مچھر کی پھونک سے متغیر نہیں ہوتا۔

پس کس قدر عمدہ کتاب ہے کہ باوجود حجم میں چھوٹی ہونے کے اہل طریق کے اکثر فقہ (باطنی) کو جمع کر رکھا ہے۔ پس یہ کتاب اہل طریق اور ان کی تقلید کرنے والوں کے نصوص کے جمع و تالیف میں مثل روضہ کے ہے۔ مذہب امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ میں۔

اللہ تعالیٰ اس کو اپنی ذات کریم کی رضا کے لئے خالص کر دے، اور اس کے مؤلف و کاتب و سامع و ناظر کو اس کے ذریعہ نفع دے انہ قریب مجیب بے شک وہ قریب ہے اور دعاؤں کا قبول کرنیوالا ہے (آمین)

بقیہ رشحات صفحہ ۵۹ سے آگے! ... پھر ان بعض غیر ضروری کھیلوں کی وجہ سے مادی نقصان کے ساتھ جو اخلاقی نقصان ہوتا ہے وہ مادی نقصان سے بھی زیادہ ہے۔ اس کے ذریعہ ناقص العقل عورت کو استعمال کیا جاتا ہے۔ ان کھلاڑیوں کیلئے یہی عورت دلچسپی کا سامان مہیا کرتی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس ایشیائی کھیل کے مہمانوں کی مدارات کیلئے ۵ ہزار عورتیں مقرر تھیں۔ گویا حکومت نے منظم طور پر کرپشن کا سامان مہیا کیا۔ پھر اسکیو جہ سے عوام و خواص کے ذہن میں جو سطحیت پیدا ہوتی ہے وہ بھی کم درجہ کی چیز نہیں ہے۔ ملک کے نوجوانوں کا مزاج انہی چیزوں سے ایسا بن گیا ہے کہ وہ اپنے بڑوں اور بزرگوں کے ناموں تک سے واقف نہیں ہیں مگر ساری دنیا کے فلم ایکٹرس اور کھلاڑیوں کے نام ان کو از بر ہوتے ہیں۔ کاش کھیل کود اور ان تماشے پر مشرقی ملکوں کی حکومتیں اور خواہ غور کرتے [illegible]

عہ مگر مقدمہ اس کا خلاصہ و ترجمہ درج نہیں کیا جا رہا ہے۔ کبھی کسی موقع سے پیش کیا جائے گا۔ انشاء اللہ تعالیٰ

وہ عیوب جن کی بنا پر فسخ نکاح جائز ہے

مجیب اللہ ندوی

عام طور پر نو عیوب کی بنا پر خیار فسخ و عدم خیار فسخ کا حکم ائمہ لگاتے ہیں. عنین اور مجبوب سے فسخ نکاح کے سلسلے میں تو ائمہ اربعہ متفق الرائے ہیں. لیکن اور چیزوں کے بارے میں ان کے درمیان قدرے اختلاف ہے۔

امام ابو حنیفہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہما کی رائے یہ ہے کہ اگر بیوی میں مذکورہ امراض میں سے کوئی مرض ہے، تو اس کی وجہ سے مرد کو نکاح فسخ کرانے کا اختیار نہیں ہے، کیونکہ جب اس کو طلاق کا اختیار ہے تو اس کو کیا ضرورت ہے. اسی طرح اگر مرد میں کوئی عیب یا مرض مثلاً جنون، جذام یا برص وغیرہ ہے تو ان کی رائے میں عورت کو فسخ نکاح کا اختیار نہیں ہے۔ البتہ اگر مرد نامرد ہے یا اس کا آلہ تناسل ہے ہی نہیں تو عورت کو فسخ کا حق ہے. مگر امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز شاگرد امام محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان امراض میں بھی عورت کو حق ہے کہ وہ اپنا نکاح فسخ کرالے۔ کیونکہ جس طرح کی تکلیف اس کو مرد کی نامردی اور مجبوب ہونے کی صورت میں تھی اور اس کو فسخ نکاح کی اجازت دی گئی ہے. اسی طرح کی تکلیف اس کو ان امراض کی صورت میں بھی ہو سکتی ہے. تو جب سبب مشترک ہے تو پھر ان صورتوں میں بھی کیوں نہ فسخ نکاح کا اختیار دیا جائے۔ امام محمدؒ کے الفاظ صاحب ہدایہ کے بیان کے مطابق یہ ہیں۔

لها الخيار رفعاً للضرر عنها	ان امراض میں اس کی تکلیف رفع کرنے کیلئے
كما في الجب والعنة	فسخ نکاح کا حق اسی طرح ہے جس طرح

ج ۲، ص۴۰۲ شوہر کے آلۂ تناسل نہ ہونے یا نامرد ہونے کی صورت میں ہے۔

البتہ مرد کو یہ حق وہ بھی اس لئے نہیں دیتے کہ اس وقت ہر وقت اختیار ہے، اور اس میں اس کے لیئے کوئی قانونی وقت بھی نہیں ہے

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ برص، جنون اور ایسے تمام امراض میں جو مانع مباشرت ہوں ان میں عورت کو تفریق کی اجازت دیتے ہیں۔ اور بقیہ امراض میں نہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ عنین، مجبوب، مفقود، متعنت، مجنون، مجذوم اور مبروص سے بھی فسخ نکاح کی اجازت دیتے ہیں۔ اور ایسے امراض میں جو متعدی اور گھناؤنے ہوں، مثلاً آتشک، سوزاک وغیرہ یا عورت کی ایسی خرابی ہو جو مانع مباشرت ہو، خیار فسخ کی اجازت دیتے ہیں۔

اسی طرح امام احمد رحمۃ اللہ علیہ بھی ان عیوب کی بنا پر خیار فسخ کی اجازت اس شرط کے ساتھ دیتے ہیں کہ مرد یا عورت کو نکاح سے پہلے ان کا علم نہ ہو، اگر علم کے باوجود انہوں نے نکاح کر لیا ہے تو فسخ کی اجازت نہیں ہے، اور امام مالک، اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما مطلقاً۔ چاہے اس کا علم رہا ہو یا نہ رہا ہو، خیار فسخ کی اجازت دیتے ہیں[1]

اوپر ائمہ اربعہ کے مسلک کا جو ذکر کیا گیا ہے اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس میں کتنی وسعت ہے۔ امام ابوحنیفہ رح مرد کو عورت کے کسی عیب کی بنا پر خیار فسخ کی اجازت اس لئے نہیں دیتے کہ وہ چاہے تو طلاق دے سکتا ہے۔ لیکن عورت کو مرد کے دو عیب یا دو مرض کی بنا پر یہ اختیار دیتے ہیں۔ ایک عنین ہونا، دوسرے مجبوب ہونا مگر ان کے شاگرد امام محمد رح بعض آثار صحابہ کی بنا پر جنون برص اور جذام کی صورت میں بھی عورت کو فسخ نکاح کی اجازت دیتے ہیں۔ اسی طرح ان کے بعد بعض دوسرے ائمہ احناف نے بھی اپنے اپنے زمانہ میں مصلحت و ضرورت کے ماتحت ہمیشہ دوسرے ائمہ کے مسلک پر فتویٰ دیا ہے۔

علماء احناف نے اس شوہر کے بارے میں جو اپنی بیوی کے نفقے پر بیماری، پیری یا غربت کی وجہ سے قادر نہیں ہے، لکھا ہے کہ ایسے شوہر کی بیوی کو خیار فسخ نہیں دیا جا سکتا، عورت کو چاہیئے کہ

[1] المیزان شعرانی اور رحمۃ الامۃ فی اختلاف الائمۃ، المغنی لابن قدامۃ ج ۷ ص ۱۴۲-۱۵۰

وہ مرد کے نام سے قرض لے کر اپنا نان نفقہ پورا کرے۔ اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے شرح وقایہ کے مصنف لکھتے ہیں:

واصحابنا لما شاهدوا ضرورة الناس الى التفريق لان دفع الحاجة الدائمة لا يتيسر بالاستدانة والظاهر لا يجد من يقرضها وغنى الزوج في الحال امر متوهم استحسنوا ان ينصب القاضي تابعاً شافعي المذهب يفرق بينهما

فقہائے احناف نے جب دیکھا کہ نفقے کی دائمی ضرورت محض قرض کے بھروسے پر پوری نہیں ہوسکتی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ عورت قرض کے لئے ایسے آدمی کو کہاں تلاش کرتی پھرے گی جو اس کو قرض دیتا رہے۔ اور پھر اس صورت میں جب شوہر کی خوشحالی اور ادائیگی مشتبہ ہو تو ایسی صورت میں انہوں نے یہ بہتر سمجھا کہ جہاں حنفی قاضی ہو وہاں وہ ایک شافعی المذہب قاضی مقرر کرکے اس معاملہ کو اس کے سپرد کردے اور دونوں میں تفریق کرادے

اسی طرح علامہ شامی وغیرہ نے مفقود الخبر کے بارے میں امام مالک کے مسلک پر عمل کرنے کی اجازت دی ہے، بلکہ بعض علماء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ یہ مسئلہ اب فقہ حنفی کا جز بن گیا ہے۔

اسی ضرورت کی بنا پر سابق ریاست بھوپال کے شعبۂ قضا کی طرف سے علماء کی نگرانی میں ۱۹۳۱ء میں تحفظ حقوق زوجین کے نام سے ایک ضابطہ شائع کیا گیا ہے جس میں حنفی مسلک کی رعایت کرتے ہوئے امام مالک اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہما کے مسلک کی روشنی میں عورت کو شوہر کے ظلم، حق تلفی اور مرض و عیب سے بچانے کے لئے حق تفریق دیا گیا۔

اسی ضرورت کے پیش نظر مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی نگرانی میں مولانا مفتی محمد شفیع اور دوسرے ممتاز علماء کی مدد سے چند رسالے مرتب کرائے جن میں فقہ حنفی کے بجائے دوسرے ائمہ کے مسلک کے مطابق عورت مرد کے درمیان تفریق کی اجازت دی گئی ہے۔ یہ رسالے "الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ" المختارات فی مہمات التفریق والخیارات، المرقومات المتعلقات کے نام سے چھپ گئے ہیں اور پورے ہندوستان میں اس پر عمل درآمد ہے۔

غرض کہنا یہ ہے کہ ضرورت شدیدہ کے وقت عورت کو جنسی اور معاشی تکلیف اور ذہنی کوفت سے بچانے کے لئے علمائے متاخرین احناف نے ہمیشہ دوسرے ائمہ کے مسلک کے مطابق فتوے دیئے ہیں۔ اور ان پر عمل درآمد کیا ہے۔ اس لئے جن امراض کی بنا پر امام مالک اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے تفریق اور خیار فسخ کی اجازت دی ہے، ان پر بھی علماء کو غور کرنا چاہئے۔ اگر جذام اور برص کی بنا پر امام محمد رح نے تفریق کی اجازت دی ہے، تو پھر جب مرد ان سے بھی اہم امراض مثلاً آتشک اور سوزاک میں مبتلا ہو تو کیوں نہ تفریق کی اجازت دی جائے۔ قروح فروج یعنی شرمگاہ کے زخم اور اس کی خرابی کا فقہاء ذکر کرتے ہیں تو اس کو عمومیت ہی پر محمول کرنا چاہئے۔ بشرطیکہ تفریق کے شرائط پائے جائیں، اور یہ امراض لاعلاج ہو جائیں، البتہ اگر علاج سے یہ ٹھیک ہو جائیں تو پھر عورت کو خیار فسخ نہ ہونا چاہئے البتہ عورت کے عیوب میں جیسا کہ امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ رحمۃ اللہ علیہم کہتے ہیں، مرد کو خیار فسخ کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اس کو جب طلاق کا اختیار شریعت نے دے رکھا ہے تو اس کے لئے مزید کوئی صورت پیدا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

الفقہ المیسر (عربی)

عربی مدارس میں فقہ کی پہلی کتاب "نور الایضاح"، "یا منیۃ المصلی" وغیرہ پڑھائی جاتی ہے ان میں مسائل کی تفصیل اور تعیین اتنی زیادہ کر دی گئی ہیں کہ طلبہ ان کو محفوظ نہیں کر پاتے اور اگلی کتابوں یعنی قدوری وغیرہ میں اتنی شقیں نہیں ملیں تو انھیں قدرے الجھن بھی ہوتی ہے۔
دار العلوم ندوۃ العلما کے ایک استاد مولوی شفیق الرحمٰن صاحب ندوی نے انہی کتابوں کو سامنے رکھ کر نہایت ہی آسان عربی زبان میں ایک نئی نور الایضاح لکھ دی ہے۔ اس کتاب پر تفصیلی تبصرہ اگلے پرچہ میں کیا جائے گا۔ مگر اتنی بات بلا مبالغہ کہی جا سکتی ہے کہ اگر مسلکی یا گروہی عصبیت حائل نہ ہو تو یہ کتاب ہر عربی مدرسہ میں داخل نصاب کرنے کے لائق ہے۔ بہت دنوں کے بعد ندوہ کی طرف سے شاید یہ پہلا علمی کام سامنے آیا ہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ اور ــــــ اشتراکیت

تحریر : محمد الغزالی

اقتباس و ترجمہ : عبدالمجید اصلاحی

"محمد الغزالی مصر کے معروف عالم ہیں اور ایک زمانہ میں تحریک الاخوان المسلمون کے ایک سرگرم کارکن رہ چکے ہیں، ایک کتاب بعنوان "الاسلام المفتری علیہ" (اسلام جسے بدنام کیا گیا ہے) لکھی ہے، جو معاندین اسلام اور دور حاضر کے ان مسلمانوں کے جواب میں ہے جو مغرب سے آئی ہوئی ہر شئی کو گلے لگا لینا ترقی پسندی تصور کرتے ہیں۔ یوں تو پوری کتاب ترجمہ کے لائق ہے، مگر سر دست اس کے دو ابواب "الفقہ الاسلامی یسایر التطور الاقتصادی" (فقہ اسلامی معاشی انقلاب کے پہلو بہ پہلو) اور "نماذج العدالۃ فی الاسلام" (اسلامی عدل و انصاف کے نمونے) میں سے ہم اس حصہ کا ترجمہ پیش کر رہے ہیں جو موصوف نے حضرت ابوذر غفاری کے بارے میں قلمبند کیا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ ایک جلیل القدر صحابی گذرے ہیں، مگر ان کی شخصیت کو اشتراکیت کے لئے وجہ جواز کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے، جبکہ کی آلودگی سے انکا دامن بالکل پاک ہے۔" ـــــــــــــــــــ ادارہ

جامع ازہر (مصر) کی فتویٰ کمیٹی نے ایک اہم فتویٰ صادر کیا ہے جسے ہم یہاں لفظاً بلفظ نقل کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ اس پر ہم اپنا تبصرہ بھی پیش کریں گے جو ہمارے نزدیک موجودہ حالات کے پیش نظر انتہائی ضروری ہے۔

"دین اسلام کے اصول و مبادی میں یہ بات بھی ہے کہ ملکیت کا احترام کیا جائے گا، ہر شخص کو آزادی

ہے کہ تخلیقِ زر اور کسبِ معیشت کے لئے قانونی ذرائع کے اندر رہتے ہوئے جو چاہے کر سکتا ہے، اور جتنا چاہے ان وسائل کے توسط سے اپنی ملکیت بنا سکتا ہے۔

جمہور صحابہ اور عام طور پر فقہائے مجتہدین کا مذہب یہ ہے کہ عام حالات کے اندر دولت مندوں کے مال میں زکوٰۃ، خراج نیز شوہری یا قرابت داری کے تعلق سے واجب شدہ اخراجات کے علاوہ اور کچھ واجب نہیں ہے۔

خصوصی حالات کے اندر اور وقتی حوادث میں بھی بشرطیکہ بیت المال کفایت نہ کر سکے ان کے مال میں سے لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً کسی مصیبت زدہ کی امداد یا کسی بھوکے بیکس کو کھانا کھلانا یا دفاعی ضرورتوں پر ملکی نظام کی حفاظت کا مسئلہ درپیش ہو تو ایسا کیا جا سکتا ہے۔

ایسے عام قانونی مصالح کے مواقع پر جیسا کہ تفسیروں اور سنت اور فقہ اسلامی کی کتابوں میں وارد ہے، ان کے مال میں سے لیا جا سکتا ہے۔

اتنا فرض ہے۔ باقی اسلام، صاحب مقدرت ہر مسلمان کو اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ رضاکارانہ طور پر وہ اپنی دولت سے جس قدر چاہے اسراف سے بچ کر نیکی کے کاموں میں خرچ کرے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے،

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا	اپنے ہاتھ کو اپنی گردن میں نہ باندھ لو (یعنی نہ بخل کرو) اور نہ اس کو بالکل کھلا چھوڑ دو (یعنی اسراف کر بیٹھو) کہ پھر ملامت زدہ ہو کر بیٹھ جانا پڑے

اپنے پسندیدہ بندوں کے حق میں اس طرح فرمایا ہے۔

وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا (الفرقان)	اہل ایمان جب خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور بخل سے کام لیتے ہیں۔ معاملے کا درمیانی راستہ بہترین راستہ ہے

بے شمار احادیث کے اندر سنت کا بیان بھی ایسا ہی ملتا ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رض کا مذہب یہ ہے کہ ہر شخص جو مال بھی جمع کرے اس میں سے زائد از ضرورت مستحق افراد یعنی نیکوکاری کے کاموں میں دیدے۔ زائد از ضرورت کا ذخیرہ کرنا حرام ہے۔ یہ مذہب صرف ابوذر غفاری رض کا ہے۔ باقی دیگر کسی صحابی کا نہیں ہے۔ اکثر علماء اسلام نے حضرت ابوذر رض کے اس مذہب کی تردید اور جمہور صحابہ اور تابعین کے مذہب کی تصویب فرمائی ہے۔ بنا برایں کوئی شبہ نہیں کہ حضرت ابوذر رض کا مذہب غلط ہے۔

اور یہی بات ہے کہ حضرت ابوذر رض جیسے جلیل القدر صحابی کی جانب سے اس طرح کے مذہب کا پیش کیا جانا عجیب و غریب ہے۔ کیونکہ یہ اسلام اور حق ملکیت کے اصولوں سے بالکل ہٹا ہوا ہے یہی وجہ ہے کہ خود لوگوں نے آپ کے زمانہ میں اس مذہب کو استعجاب کی نگاہوں سے دیکھا۔

علامہ آلوسی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

" حضرت ابوذر رض کے دعویٰ پر کثرت سے اعتراضات وارد ہوئے ہیں، آپ کے سامنے میراث کی آیت پڑھ کر لوگ کہا کرتے تھے کہ اگر کل مال خرچ کرنا واجب ہوتا تو اس آیت کی کیا ضرورت تھی۔ آپ جہاں جاتے لوگوں کی بھیڑ اکٹھا ہو جاتی اور تعجب کا اظہار کرتے۔"

مذکورہ بالا شرعی وجوہ کی بنا پر حضرت ابوذر کا یہ نظریہ غلط معلوم ہوتا ہے۔ اس نظریہ کے حامل کو ہم زیادہ سے زیادہ "مجتہد مخطی" کا درجہ دے سکتے ہیں۔ مگر کتاب اللہ، سنت رسول اور اسلامی اصولوں کی روشنی میں اس نظریہ کی پیروی نہیں کی جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے اس مذہب سے جب نظام حکومت میں خلل اور عوام میں فتنہ کا اندیشہ ہوا تو شام کے گورنر حضرت امیر معاویہ رض نے خلیفۂ وقت حضرت عثمان رض سے درخواست کی کہ انکو مدینہ بلایں اس وقت حضرت ابوذر رض شام میں تھے۔ خلیفہ نے انہیں مدینہ واپس بلا لیا مگر یہاں بھی آپ نے اپنے مذہب کی نشر و اشاعت کی تو حضرت عثمان نے آپ کو عوام سے دور چلے جانے کا مشورہ دیا تو آپ نے مقام ربذہ (مکہ اور مدینہ کے درمیان) قیام فرمایا۔

ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"حضرت ابوذر رضہ کا مذہب یہ تھا کہ اہل و عیال کا نفقہ پورا کرنے کے بعد جو بچ رہے اس کا ذخیرہ کرنا حرام ہے، اس کا وہ فتویٰ بھی دیتے، تحریک بھی کرتے اور حکم بھی دیتے نیز خلاف ورزی پر سختی بھی فرماتے۔

حضرت معاویہؓ نے جب انہیں روکا تو باز نہ آئے۔ چنانچہ عوام کو نقصان پہونچنے کے اندیشے سے آپ نے امیر المومنین حضرت عثمان رضہ کے یہاں ایک شکایتی مکتوب بھیجا جس میں انھیں بلالینے کی درخواست کی۔ حضرت عثمانؓ انہیں واپس بلاکر مقام ربذہ کو بھیج دیا۔ جہاں حضرت عثمان ہی کی خلافت میں آپ کا انتقال ہوا۔"

حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں رقمطراز ہیں:

"باعث فساد شی کا ازالہ مصلحت کے مقابلہ میں مقدم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر چند حضرت ابوذر رضہ کا مدینہ میں قیام طلبائے علم کے حق میں بڑی مصلحت تھی مگر پھر بھی حضرت عثمان نے آپ کو بمقام ربذہ قیام کا حکم دیا۔ کیونکہ مدینہ میں آپ کا قیام باعث فساد تھا جو آپ کے اپنے مذہب کی نشر و اشاعت سے پیدا ہو رہا تھا۔"

جامع ازہر کا یہ فتویٰ مطالعہ میں آیا تو اس پر کافی غور و خوض کی ضرورت محسوس ہوئی کیونکہ اس میں کچھ ایسے علمی احکام و دلائل بیان ہوئے ہیں جن کی اگر تشریح نہ کی جائے تو نادر اقبل و قتل کا باعث بنیں گے۔ کیونکہ بہر حال اسلام کو ایک طرف عدل اجتماعی کے موجودہ علمبرداروں کی بدگمانی سے بچانا ہے تو دوسری طرف اصحاب جائداد اور جاگیرداروں میں جو حضرات تجوریوں پر سانپ بن کر بیٹھے ہیں انہیں بھی اس موقف میں رکھنا ہے کہ اطمینان کا سانس نہ لے سکیں بلکہ قلق و اضطراب کی فضا میں سانس لیں۔ یہ فتویٰ ٹھیک اسی نظریہ کی عکاسی کر رہا ہے جس کا کہ صدیوں سے مشرق عربی کے علماء اپنے علاوہ ادھر اور غیر اسلامی اداروں سے اس نظریہ کے حامل ہیں۔

مسلم کارکن جماعتیں بھی تقریباً اس نظریہ کے حدود سے باہر نہیں ہیں۔ وہ بھی گھوم پھر کر اسی نظریہ کی حد تک آکر رک جاتی ہیں۔

فہم کا جہاں تک تعلق ہے اور جہاں تک اس فہم کی بنیاد پر فتویٰ صادر کرنے کا معاملہ ہے تو اس میں کوئی عیب کی بات نہیں ہے، بشرطیکہ ہمارا جو حال ہے وہی حال مثال کے طور پر اقوام متحدہ کا بھی ہو۔ جہاں ترقی پذیر سرمایہ ہمہ آن حرکت میں رہتے ہیں۔ جہاں کے عوام اپنے مکمل حقوق اور عمدہ ترین معیار زندگی سے مستفید بھی ہو رہے ہیں۔ یہاں اشتراکیت کے در انداز ہونے کی راہ میں کوئی مصنوعی رکاوٹ ہرگز موجود نہیں ہے، پھر بھی کم ہی لوگ یہاں اسے قبول کرتے یا اس کی جانب توجہ دیتے ہیں۔

مگر مشرق میں جو حالت ہے بنیادی طور پر بھی اور اپنی تشکیلات کے اندر بھی قطعاً اقوام متحدہ کے حالات سے مختلف ہے۔ بنا بریں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس فتویٰ پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں۔ امریکہ والوں کے پیش نظر یہ فتویٰ اگر اسلام کو اس حیثیت سے پیش کر رہا ہے کہ وہ ایک سرمایہ دارانہ نظام کا حامی ہے تو اس میں کوئی بھی مضائقہ نہیں ہے۔

مگر مشرق کی محکوم اور کمزور اقوام کے سامنے بھی اسلام کو اسی انداز میں پیش کیا جائے اس سے ہمیں اختلاف ہے۔ ہم اس انداز پر بھرپور تبصرہ پیش کریں گے۔

حضرت ابوذر رضؓ کی زندگی کے اقتصادی پہلو کا جہاں تک تعلق ہے اس کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، اس سے اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایک جلیل القدر صحابی کے فکر و خیال کو جیسا کہ بعض حضرات سمجھتے ہیں، اشتراکیت کی آلودگی سے داغدار تصور کرنا اور پھر ان کی جانب سے معذرت آمیز انداز میں اس طرح کا دفاع کہ ان سے اجتہادی غلطی سرزد ہو گئی تھی، ایک ایسی جسارت ہے جس کا حق و صواب سے کوئی تعلق نہیں۔

اگر اشتراکیت کا یہ مفہوم ہے کہ یہ دین اسلام، اللہ اور اس کے رسولوں کی منکر ہے تو اس حق میں حضرت ابوذر رضؓ ہرگز اشتراکی نہ تھے۔ اگر یہ مفہوم ہے کہ یہ ملکیت اور نظام وراثت کی منکر ہے تو اس مفہوم میں وہ اشتراکی نہ تھے اور اگر یہ مطلب ہے کہ فقہ اسلامی پر عجمی تصورات کے اثرات قبول کر لیے جائیں تو اس مفہوم میں بھی ہرگز وہ اشتراکی نہ تھے۔

باقی یہ بات کہ حضرت ابوذر رضؓ عبد اللہ ابن سبا کی تحریک سے متاثر تھے تو یہ بھی بالکل جھوٹ اور سراسر بہتان ہے۔ تاریخی تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ عبد اللہ ابن سبا کی ملاقات سے پہلے ہی آپ کا انتقال ہو گیا تھا۔ پھر اثر پذیری کا سوال کہاں سے آیا؟

جو حضرات، حضرت ابوذر غفاری رضؓ کو اشتراکی قرار دے رہے ہیں وہ دراصل اپنے زعم باطل کے لئے خوبصورت دلیل فراہم کرنا چاہتے ہیں کہ سرمایہ کاروں کے خلاف دارو گیر، مظلوموں کی حمایت، اور استعماری ذہنیت کے حامل امراء و حکام پر تنقید کی جائے تو یہ ساری باتیں دین حنیف کے مزاج سے خارج ہیں۔

مگر اشتراکیت کے کچھ باطنی یا ظاہری خد و خال ایسے ہی ہیں جو خود اشتراکی حضرات کو مورد الزام قرار دے رہے ہیں۔

حضرت ابوذر رضؓ نے اجتماعی خرابیوں پر تنقیدیں کردیں تو آخر کون سا گناہ کا کام ہو گیا، لوگوں نے آپ کو نظر بند کردیا۔ آخر کیوں؟ صرف اسی لئے نہ کہ شام میں مطالبہ کر بیٹھے تھے کہ مسلمانوں کو قومی اعتبار سے بھی اور حکومت کی سطح پر بھی ٹھیک اسی طرح زندگی بسر کرنی چاہئے، جس طرح وہ صدر خلافت یعنی حضرت صدیق و حضرت فاروق رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں بسر کرتے تھے۔ ایک دفعہ جمعہ کی نماز میں لوگوں نے شیخین کے فضائل و مناقب کا تذکرہ کیا تو حضرت غفاریؓ نے فرمایا:

> "دیکھو نہ: لوگوں نے آپ کے بعد کیا کچھ کر ڈالا۔ عالیشان عمارتوں کی تعمیر ہو رہی ہے نرم و نازک پوشاکیں پہنی جارہی ہیں۔ گھوڑوں کی سواری کا شوق کیا جا رہا ہے، عمدہ قسم کے پکوان تیار ہو رہے ہیں"

آپ جانتے ہیں کہ ان باتوں کو اسلام نے حرام نہیں ٹھہرایا ہے، مگر حضرت ابوذر رضؓ کی دارو گیر صرف اس لئے تھی کہ یہ سب کچھ بیت المال سے ہو رہا تھا۔

کسی حکمران کے لئے اسلام میں جائز نہیں ہے کہ اپنا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے امت کا استحصال کرے۔ اور خوش عیشی اور خوش پوشی کا امتیاز پیدا کرے بالخصوص ایسے حالات میں جب کہ معاشرہ پست اور زبوں تر ہو۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ حضور گرامی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل فرماتے ہیں،

"میری امت پر سب سے زیادہ رحم کرنے والے ابوبکر۔ اللہ کے معاملہ میں سب سے زیادہ سخت عمر، سب سے زیادہ حیادار عثمان، سب سے زیادہ فیصلہ کن بات کرنے والے علی، سب سے زیادہ حلال وحرام کا علم رکھنے والے معاذ بن جبل، سب سے زیادہ فرائض میں مہارت رکھنے والے زید بن ثابت، سب سے بڑے قاری ابی بن کعب ہیں"

اور ہر امت کا ایک امین ہوتا ہے، میری امت کے امین ابن الجراح ہیں۔

اور پھر ساری زمین کی پشت پر ابوذر سے زیادہ سچی زبان بولنے والا اور کوئی نہیں ہے، زہد و ورع میں کیا لگتے ہیں جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام،

حضرت عمر رضا نے جلکر فرمایا "تو کیا ہم انہیں اسی حیثیت سے پہچانیں"

فرمایا "انہیں اسی حیثیت سے پہچانو"

کیا یہ وہی انسان ہیں جن سے اسلامی معاشرہ کو فساد کا اندیشہ لاحق تھا۔ اگر ایسا ہے تو پھر اصلاح کسے کہیں گے؟

حضرت ابوذر رضا نے مدینہ پہنچ کر جو موقف اختیار کیا وہ بھی قابل ذکر ہے۔ یہاں نہ کوئی ہنگامہ اٹھا نہ حکومت وقت کے خلاف کوئی شورش برپا ہوئی۔ جیسا کہ طبقاتی جنگوں کو ابھارنے میں اشتراکیت کا رول ہوا کرتا ہے۔ ہوا یہ کہ مدینہ میں عوام آپ کے گرد و پیش جمع ہو گئے، ایسا آپ کے موقف کی تائید میں تھا نہ کہ حکومت کے خلاف شورش برپا کرنے کے لئے۔

حتیٰ کہ جہاں آپ نظر بند ہوئے وہاں سے اپنے ایک بیان میں فرمایا:

"حبشی غلام بھی میرا امیر ہو تو سمع وطاعت ہی میرا دستور ہوگا"

شر و فساد سے دور، بہت دور، یہ لوگ۔ کیا واقعی حضرت ابوذر غفاری کو اشتراکیت کا مجرم گردانا ہے؟

حضرت ابوالحسن، حضرت ابوذر اور بہت سے بزرگان سلف وہ ہیں کہ جن کی عظمت کے شہپارکو قرآن نے رضوان الٰہی کی حسین کلغی فراہم کی ہے۔

السَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ	سابقین اولین مہاجرین و انصار اور وہ
وَالْأَنْصَارِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ	لوگ جنہوں نے ان کا اتباع کیا۔ ان سے

باِحْسَانٍ رَّضِیَ اللّٰہُ عَنْہُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ اللہ تعالیٰ راضی ہے اور وہ اس سے راضی ہیں۔

اس شہادت کے بعد ہماری معلومات کی حد تک اللہ تعالیٰ نے اپنی بخشی ہوئی یہ حسین کلغی ان شاہبازوں سے واپس نہیں لی ہے۔

مالیات کے باب میں حضرت ابوذر رضی کے افکار و خیالات میں ہرگز کوئی ندرت نہیں ہے ان کا مذہب وہی ہے جو مسلمانوں کے معکوس معاشرتی انقلاب اور فتنۂ عظیم سے پیشتر جمہور مسلمانوں اور اجلۂ صحابہ کا رہا ہے۔

حضرت ابوذر رضی کے خلاف غم و غصہ کا سبب صرف یہ تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کی رگوں میں اسلامی تعلیمات کی جو لہر دوڑا دی تھی، اس کے آپ پابند تھے۔ یہ وہ تعلیمات تھیں جن کو حضرت ابوذرؓ نے نہ صرف یہ کہ قبول کر لیا تھا، بلکہ اس ضمن میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے بعد دونوں خلفاء اسلام کے نقوش راہ کے پابند بھی رہے۔

حضرت عثمان رضی کے گورنروں اور مشیر کاروں سے آپ کو جو اختلاف ہوا، ہم اس کی حقیقت سے پردہ اٹھانے کی کوشش کریں گے تاکہ اصل صورت آئینہ ہو کر سامنے آسکے۔

حضرت ابوذر رضی نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے جو "معاشی نظریہ" اخذ کیا تھا اس کی دلیل وہ روایت ہے جسے خود انہوں نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل فرمائی ہے۔

مدینہ کے حرہ (سیاہ سنگلاخ علاقہ) میں آنحضور رضی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا کہ احد پہاڑ سامنے آگیا۔ آپ نے فرمایا

" احد پہاڑ جتنا سونا بھی مل جائے تو باعث مسرت یہ نہ ہوگی کہ تین دنوں کے بعد اس میں سے سوائے اس مقدار کے کچھ باقی رہ جائے جسے ادائیگی قرض کیلئے رکھ چھوڑوں۔ میں اللہ کے بندوں میں اسے اس طرح، اسطرح، اسطرح (ہاتھوں سے دائیں، بائیں، پیچھے اشارہ فرماتے ہوئے) بکھیر دوں گا "

پھر آگے بڑھے تو فرمایا

" آج جن کے پاس زیادہ ہے قیامت کے دن ان کے یہاں کم ہوگا مگر وہ شخص

مستثنیٰ ہے جو اس طرح، اس طرح، اس طرح (دائیں بائیں اور پیچھے کی جانب اشارہ فرماتے ہوئے) بکھیر دے۔"

یہ حضرت ابوذر رضؓ کی روایت ہے۔ اسی طرح کی روایتیں حضرت ابوہریرہؓ، عبداللہ ابن مسعودؓ، اور دیگر اکابر صحابہ کی بھی ملتی ہیں۔

مالداروں کی پرواہ نہ کرنا۔ لوگوں کو صرف اخلاقی اور علمی پیمانہ سے ناپنا، اور جگہ دینا، تمام سماجی معاملات کو صحیح اصولوں اور ضابطوں سے وابستہ رکھنے کی کوشش کرنا، یہ ہے وہ معاشی نقطۂ نظر جس کی تعلیم حضرت ابوذر رضؓ نے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی۔ خود آپ ہی کی روایت ہے:

"مجھ سے رسول خدا نے فرمایا: کیا خیال ہے۔ غنا دولت کی کثرت ہے؟" میں نے کہا "ہاں یا رسول اللہ" فرمایا "کیا خیال ہے فقر دولت کی قلت کا نام ہے؟" میں نے کہا "ہاں یا رسول خدا"، آپ نے فرمایا "غنا قلب کا غنا ہے، اور فقر قلب کا فقر ہے۔"

آپ نے پھر مجھ سے قریش کے ایک شخص کے بارے میں دریافت فرمایا "کیا فلاں کو جانتے ہو؟"

میں نے کہا "ہاں، یا رسول خدا۔ آپ نے فرمایا "اس کے باب میں تمہارا کیا خیال ہے" میں نے کہا "وہ آدمی طلب کرتا ہے تو پاتا ہے اور کسی مجلس میں آتا ہے تو اسے جگہ دی جاتی ہے۔"

پھر اہل صفہ میں سے ایک شخص کے بارے میں پوچھا "فلاں کو جانتے ہو؟" میں نے کہا "نہیں یا رسول خدا! بخدا میں اسے نہیں جانتا" آپ اس کے خط و خال ظاہر فرماتے رہے، حتیٰ کہ میں نے اسے پہچان لیا، اور کہا "پہچان گیا حضور کہ وہ کون ہیں"، فرمایا "اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے کہا "مسکین شخص ہیں"۔ فرمایا "پہلے شخص کے مقابلہ میں یہ تمام دنیا سے بہتر ہے" میں نے کہا "آخر پہلے کو جو ملتا ہے اس کا تھوڑا ہی حصہ اس دوسرے کو کیوں نہیں ملتا؟"۔ فرمایا "ملے تو۔ اس کا مستحق ہے نہ ملے تو اسے ایک بھلائی اور حاصل ہے"

ایسی ہی روائتیں حضرت ابوہریرہ رضؓ اور سہل بن سعد سے بھی بیان ہوئی ہیں۔
حضرت ابوذر رضؓ اور آپ کی طرح دوسرے حق گو اصحاب ایمان نے مذکورہ ارشادات عالی کی روشنی میں جب دیکھا کہ ویران دل صدر نشین ہو چکے ہیں۔ اور محض اپنی مالی حیثیت کی بنا پر اگلی صفوں میں جا بیٹھے ہیں اور دل کے تو نگر خالی ہاتھ ہونے کے سبب پیچھے جا چکے ہیں تو بے اختیار ہو گئے۔
اقوام عالم کی قیادت کا سہرا انہیں سے ان حضرات کے سر بندھا جو اخلاقی اور علمی اعتبار سے تو کم درجے کے تھے، مگر دولت نے انھیں یہ حوصلہ دیا کہ وہ صفوں کو پھاند کر آگے جا بیٹھیں۔
مشرق چند صدیوں سے اسی مادی فلسفہ کا شکار ہے، صرف اسی ایک بات سے عوام کے سینوں میں زندگی، حوصلہ اور اقدام کے ولولے سرد پڑ چکے ہیں۔
اس لاقانونیت کی فضا میں اگر دولت ہی علۃ العلل قرار پائے تو کیوں نہ اس کی تقسیم کا ضابطہ قابلیتوں، عہدوں اور صلاحیتوں اور اعمال کے تناسب سے عمل میں آئے۔
شاعر کہتا ہے:
۔۔۔ زمانہ کے تجربوں سے معلوم ہوا ہے کہ کثرت مال سے مالدار کو نفع پہونچتا ہے۔ مذموم اخلاق کا حامل انسان محمود قرار پاتا ہے۔
۔۔۔ مگر مال کی قلت آدمی کے لئے وجہ فساد ہے۔ اس کا کوڑا اس طرح لگتا ہے، جیسے بدن پر کسی موذی کا ڈنک۔
۔۔۔ بزرگی کے مدارج آنکھوں سے دیکھتا ہے مگر طے نہیں کر سکتا، قوم کے بیچ بیٹھتا ہے مگر بول نہیں سکتا۔
یہ باتیں نہ معلوم ہوں تو زمانہ عنقریب تجھے باخبر کر دے گا۔

یہ تصویر بڑی حد تک ان سرمایہ دارانہ سماجوں کے حق میں سچی ہے جو اخلاقی اعتبار سے انتہا سے زیادہ پست ہیں، دین کی مہم اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ فاسد معاشرتی خامیوں کی اصلاح کرے۔
آخر دولت کو اتنا بڑا اقتدار حاصل کیوں ہوتا ہے؟ آخر کیوں محمود انسان کمی دولت کے باعث مذموم، اور مذموم انسان کثرت دولت کے باعث محمود قرار پائے؟ آخر مال کی فراوانی کیوں سماج میں ایک غبی کو منہ کھولنے اور مال کی قلت ایک ذکی دطباع کو منہ بند رکھنے کا پیغام لاتی ہے؟
دولت والوں کے سامنے آخر کیوں تہذیبی فیروزمندی کے دروازے کھلے ہیں اور تہی دستوں کو یہ

مواقع نصیب نہیں ہوتے ہیں۔

آخر اسلام کے نظام معاشرت کو ہم علمبرداران حق کیونکر اس حال میں چھوڑ کر کنارہ کش ہو جائیں کہ یہاں معاشی نشیب و فراز ہو ، اور تمام افراد امت کو یکساں مواقع حاصل نہ ہوں

آخر روز روز کہاں سے کوئی نبی آئے گا جو انسانوں کی قدر و قیمت کا صحیح صحیح معیار بتایا کرے " بڑوں " کو نیچے اور " چھوٹوں " کو اوپر بٹھاتا ہے ۔ جس کی تعلیم آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ، حضرت ابوذر رضہ اور دیگر صحابہؓ کو فرما گئے ، آپ نے ان لوگوں کو پرکھنے کا معیار بتایا ۔ پھر ابوذر رضہ ہدف ملامت کیوں ہیں اگر آپ نے اسلامی نظریہ کی صحیح صحیح ترجمانی فرمادی ہے ۔

یہ حضرات فرماتے ہیں کہ حضرت ابوذر رضہ اشتراکی تھے ۔ وہ اپنے مذہب میں " مجتہد مطلق " کا درجہ رکھتے تھے ۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ حضرت ابوذر رضہ کو اس مفہوم کی جانب کیوں کھینچا جا رہا ہے ۔ کیوں ہم بڑے انسان اور اسلام دونوں پر بیک وقت ظلم کر رہے ہیں ، کیوں ہم اس اسلامی اشتراک کو جو ضروری ہے ۔ خالص مارکسی اشتراکی نظریہ حیات قرار دے رہے ہیں ؟؟

حضرت ابوذر رضہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی امین تھے ۔ آپ کا وصال ہوا تو آپ کے بعد دونوں خلفاء اسلام کے امین رہے ۔ حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمر رضہ دونوں بزرگوں کی خلافت میں بالکل پرسکون اور باوقار رہے ۔ اس وقت آپ دیکھ رہے تھے کہ اسلام کی روشنی دور دور تک پھیل رہی ہے ، حق کے لشکر روم و فارس میں پاپائی قلعوں کو مسمار کرکے آگے بڑھ رہے ہیں ، اور دنیائے انسانیت کو اس کی فطرت کی سیدھی راہ پر واپس لا رہے ہیں ۔ اسلامی ملک کے اندر اس وقت جو حال تھا وہ حضرت ابوذرؓ جیسے انسانوں کے نزدیک ہر شک و شبہ سے بالا تر تھا ۔

مگر سہولت پسند لوگوں نے جب آرام طلبی کو گلے لگایا ، اور یہ چاہا کہ ترقی پذیر اسلامی سماجوں کے اندر جمود و تعطل کی فضا پیدا ہو جائے ، فتوحات کے اموال غنیمت سے ان عیش پسند طبقات کی تعمیر ہو جنہیں تمام کاموں میں صرف لہو و لعب اور لذت کام و دہن سے سروکار ہو ، تو اس وقت ابوذرؓ اور دیگر بے چین

ؔ اسلام کے نزدیک معاشی مساوات کا نعرہ بالکل غیر فطری ہے ، فطری چیز معاشی انصاف ہے ۔ کیونکہ جو معاشی مساوات کا نعرہ دیتا ہے وہ محض ایک فریب ہے ، ایک دن بھی اس پر عمل نہیں ہو سکتا ہے ۔ (ادارہ)

فطرت رکھنے والوں نے برملا روک ٹوک شروع کی۔ ان میں سب سے بھاری بھرکم آواز، سب سے وزنی دلیل اور آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے زیادہ سابقہ حضرت ابوذر رضہ کا تھا۔

حضرت ابوذر رضہ یہاں پہونچکر نکیر کرتے ہیں۔ مگر حضرت عمر رضہ کے عہد خلافت میں جو عمومی حال تھا اس سے وہ خوش تھے اور آپ نے حکومت کے لئے جو طریق کار اختیار فرمایا اس سے وہ راضی اور مطمئن تھے پھر کیا خیال ہے، حضرت عمر رضہ بھی حضرت ابوذرؓ ہی کی طرح اشتراکی تھے؟

بیان ہے کہ ایک دن حضرت عمر رضہ آزردہ صورت باہر نکلے۔ حضرت ابوذر رضہ کی ان سے ملاقات ہوگئی پوچھا "آزردہ نظر کیوں آرہے ہیں؟" بولے "کیوں نہ ہوں۔ بشر بن عاصم کو کہتے سنا ہے کہ حضور کو فرماتے سنا ہے"

"مسلمانوں کے کسی معاملہ کا کوئی سربراہ بنایا جائے تو اسے قیامت کے دن جہنم کے پل کا کھڑا کیا جائے گا، اگر بہتر کام کیا ہوگا تو نجات ورنہ پل سمیت جہنم میں جا رہے گا، اور ستر سال تک اسی میں رہے گا۔"

حضرت ابوذر رضہ نے پوچھا "کیا یہ بات خود حضورؐ سے نہیں سنی ہے؟ بولے "نہیں" فرمایا "میں گواہی دیتا ہوں کہ حضور رضہ کو کہتے ہوئے سنا ہے:

"جو کوئی کسی مسلمان کا سربراہ بنایا جائے گا تو قیامت کے دن اسے جہنم کے پل پر لایا جائے گا، اگر بہتر رہا تو نجات ورنہ پل ٹوٹ کر جہنم میں جا رہے گا، اس میں ستر سال تک پڑا رہے گا، اس پورے عرصہ میں جہنم تاریک اور سیاہ رہے گی۔"

فرمائیں وہ دونوں حدیثوں میں کس کی زیادہ چوٹ پڑ رہی ہے؟" بولے "دونوں ہی کی مگر اس معاملہ کو سنبھالے گا کون؟" حضرت ابوذر رضہ نے کہا "وہ جو اللہ کی خاطر اپنی ناک کاٹے، زمین سے رخسار چپکائے جہاں تک اپنا تعلق ہے میں تو آپ کو بہتر ہی پاتا ہوں۔ ہاں اگر آپ نے خلافت، ایسے شخص کے سپرد کردی جو انصاف نہ کرے تو ہو سکتا ہے اس کے گناہ سے آپ بچ نہ سکیں۔"

یہ ہیں ابوذر رضہ۔ جو سیاست فاروقی کی تائید فرما رہے ہیں۔ بلکہ حضرت عمر رضہ کو ترغیب بھی دے رہے ہیں کہ بار خلافت خواہ کتنا دشوار کیوں نہ ہو مگر نبھا لیں۔ مبادا مسلمانوں میں کوئی ایسا سربراہ ہو جائے [illegible]

اور مسلمانوں پر ظلم و ستم شروع کر دے۔
کوئی شک نہیں کہ حضرت ابوذر رضی کا یہ خیال ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جو نکران کا تھا وہی نکر حضرت عمر رض کا بھی تھا، چنانچہ حضرت عمر رض نے اس سلسلہ میں جو اعلیٰ ترین کلام فرمایا ہے، وہ حسب ذیل ہے۔

" اپنے معاملہ کی جو بات بعد میں سمجھ آئی اگر پہلے ہی آگئی ہوتی تو امرا کے فالتو اموال لے کر غربا میں تقسیم کر دیتا "

حضرت عمر رض کی خلافت، اولین خلافت ہی کا پھیلاؤ تھی۔ اولین خلافت وہی تو تھی جس نے مانعین زکوٰۃ اور مرتدین کو ایک صف میں تصور کیا اور ان کے خلاف سخت معرکہ آرائی کی۔ تاریخ شاہد ہے کہ دونوں خلافتیں پوری شدت سے اور انتہائی حزم و احتیاط کے ساتھ راہ نبوت کے نقوش پر گامزن رہیں۔
رسالت کبریٰ علیٰ صاحبہا الف الف تحیۃ وسلام کیا تھی ؟ ایک نمونہ اس بات کی کہ عوامی مصالح میں ڈوب کر انسانوں کے لئے کام کیا جائے۔ آپ کا ارشاد ہے:

" مجھے تلاش کرنا ہو تو کمزوروں میں تلاش کرو، کیونکہ روزی اور نصرت انہی کمزوروں کے طفیل حاصل ہوتی ہے "

پس اقوام عالم کی اقتصادی اور اجتماعی سیاست کے لئے اسلام جو صحیح راہ بلکہ واحد طریق کار متعین کرتا ہے، وہ یہ ہے کہ جو بڑی جماعتیں ہوں ان کی مختلف ٹولیوں کی کفالت کی جائے۔ ان سے طاقت حاصل کی جائے اور ان کے خلاف تحکم اور بالادستی کی جو شئی بھی ہو اسے جڑ سے کاٹ کر پھینک دی جائے۔
ننگی آنکھوں سے دیکھی جانے والی اسلام کی اس برہنہ حقیقت کو حضرت ابوذر رض نے دیکھ لیا تو ہدف ملامت انھیں کیوں بنایا جا رہا ہے۔

حضرت عثمان رض زمام خلافت ہاتھوں میں لیتے ہیں، آپ کی شرافت اور اعلیٰ مقامی ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے، اسلام میں آپ نے جو کارنامے انجام دیئے وہ آپ کے فضل و کمال اور مجاہدانہ سرگرمیوں کے شاہد عادل ہیں۔
مگر ان کا تعلق خاندان عبد شمس سے تھا، جس کے افراد کا شمار مسلمانوں کی پچھلی صف میں تھا، زمانہ جاہلیت میں گو وہ حکمراں طبقہ سے تعلق رکھتے تھے مگر اسلام سے اولین کشمکش انہی کی ہوئی۔ اور حلقہ بگوش اسلام بھی آخر میں ہوئے۔

خاندان عبدشمس کے افراد اور انہی جیسے دیگر اہل ایمان کے باب میں حضرت ابوبکر صدیق رضؓ کی رائے یہ تھی کہ بیت المال سے استفادہ میں انہیں بھی "السابقون الاولون" کے مساوی قرار دیا جائے، مگر حضرت عمر رضؓ سریر آرائے خلافت ہوئے تو یہ مساوات ختم کر دی، اور اللہ اور اس کے رسول نے انہیں جو مقام دیا تھا اسی پر باقی رکھا۔ چنانچہ وہ دوبارہ مسلمانوں کی پچھلی صفوں میں چلے گئے۔[1]

بایں ہمہ ماضی کے شرف کی جانب رجوع کا شوق اور ما قبل اسلام سماج میں انہیں جو عزت و مرتبہ حاصل تھا اسے حاصل کرنے کی تمنا ان کے دلوں میں اب بھی موجود تھی۔ چنانچہ خلافت کے لیے جوں ہی حضرت عثمان رضؓ کا انتخاب عمل میں آیا، یہ آپ کے اردگرد مجتمع ہو گئے، اور ہاتھ ان کے دولت کی جانب لپکنے لگے، چنانچہ اب وہ اس قدر حاصل کرنے لگے جتنا صدر خلافت میں حاصل نہ کر پاتے تھے[2]

حضرت عثمان رضؓ سے یہ حضرات خواہ نزدیک رہے ہوں یا دور ہر جگہ ان کی کوشش ہوتی کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ سمیٹ لیں اس ناروا طرز عمل پر بعض مسلمان بھڑک اٹھے، انہی میں ایک حضرت ابوذر غفاریؓ بھی تھے۔

ان مسلمانوں میں حضرت ابوذر غفاری رضؓ کچھ نفسیاتی خصوصیتوں کے اعتبار سے ممتاز تھے، انہی خصوصیات کی بدولت آغاز اسلام میں انہوں نے کافروں کے مجمع میں گھس کر بے محابا اپنے مسلمان ہونے اعلان کیا، اور پرواہ نہ کی کہ اس صریح اعلان کا انجام کیا ہوگا۔ چنانچہ آپ پر سخت ضربیں پڑیں۔ مکوں اور گھونسوں سے آپ کی خبر لی گئی۔

پھر بھی کافروں کو وہی سننا پڑا جسے وہ پسند نہ کرتے تھے، آپ نے ان پر اپنی جرأت اور بے باکی سے یہ ثابت کر دیا کہ ان کا مستقبل انتہائی تاریک اور وحشتناک ہے۔

مسلمانوں کی اقتصادی سیاست میں جس وقت فساد پیدا ہوا اس وقت بھی آپ سے اپنی نفسیات کے پیش نظر رہا نہ گیا، چنانچہ اس کے لئے کیل کانٹے درست کئے اور میدان میں کود پڑے، آپ کے دل و دماغ میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ منکر کے خلاف آواز اٹھانا وہ کام ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے طاقتور بندوں

---

[1] یہ بات محض خاندان عبدشمس تک محدود نہیں بلکہ عام مسلمانوں کے سلسلے میں ان کی رائے یہی تھی۔ [2] بنی عبدشمس کے افراد کے بارے میں عمومی طور پر یہ بات صحیح نہیں ہے۔ [3] راقم الحروف کو علم نہیں کہ حضرت ابوذر غفاریؓ کے سخت ماننے کی کسی اور صحابی نے بھی تائید کی [illegible]

کے سپرد کرتا ہے۔

اور کعب احبار نے جب اپنا یہ فتویٰ صادر کیا:

"کوئی حرج نہیں کہ حاکم پیش آمدہ معاملات پر خرچ کے لئے
بیت المال سے جتنا چاہے لے اور جس کو چاہے دے۔"

تو حضرت ابوذر رض ان کے سینہ پر خود ان کے عصا سے مارتے ہوئے چیخے۔

"یہودی زادے! آخر ہمارے دین کے باب میں تجھے
زبان کھولنے کی جرأت کیسے ہوئی!"

یہ فتویٰ باطل تھا۔ اور نہ جانے کتنے باطل فتوؤں پر حکومتیں عمل پیرا ہوتی رہی ہیں۔ قرآن نے مال زکوٰۃ کے معارف کی بھی تعیین کی ہے اور مال غنیمت کے معارف کی بھی ٹیکس اور جزیہ کی جو رقم حکومت کی تحویل میں آتی ہے، اس کا مصرف یہ ہے کہ عمومی مصلحتوں پر خرچ کی جائے۔ نہ کہ کسی تنہا شخص یا خاندان کی خوش عیشی پر۔ پھر کسی حکمراں کے لئے کیونکر روا ہے کہ وہ امت کا مال جیسے چاہے خرچ کرے۔

اسلام کو تباہ کرنے کے لئے یہ دوسرا یہودی ہتھکنڈا تھا۔ پہلا کامیاب ہو چکا تھا جس کی رو سے اسلامی معاشرت کو حضرت عمر رض جیسے انتہائی مساوات پسند فقیہ سے خالی کیا جا چکا تھا۔ جنہوں نے اپنی بے مثال عبقریت سے حکومت کا نظام اس طرح چلایا کہ ایک پیسہ بھی وہیں خرچ ہوتا جہاں اسے خرچ کئے جانے کا حق ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے عہد حکومت میں نہ کوئی بھوکا رہا، نہ پیاسا، نہ ننگا، نہ کسی کے سر میں تکبر کا سودا سمایا، اور نہ ہی کسی کو سرکشی کی ہمت ہوئی۔

کس قدر ضرورت ہے آج مشرق کو اسی عصائے ابوذر رض کی تاکہ کعب احبار نے اپنے پیچھے جو ہزاروں کعب[1] چھوڑے ہیں بروقت ان کی سرزنش ہو سکے۔

حضرت ابوذر رض اور حضرت معاویہ رض کے درمیان جبکہ وہ شام کے گورنر تھے بڑا سخت معرکہ برپا

---

[1] یہ انتہا پسندانہ رائے ہے۔ کعب احبار بعض روایتی غلطیوں کے باوجود امت کے قابل اعتماد افراد میں شمار کیے گئے ہیں۔ کعب احبار کو یہودیوں

ہوا. جو اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ حضرت ابوذر رضؓ کی شخصیت انتہائی عظیم، فراست و دانائی ان کی انتہائی سچی اور فکر و نظر ان کا انتہائی ارفع و اعلیٰ تھا۔

یہ بات ظاہر ہے کہ حضرت معاویہ رضؓ کے طرز عمل سے سیاسی میدان میں اسلامی جمہوریت کو اور اقتصادی میدان میں اسلامی مساوات کو نقصان پہنچا۔ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے بجائے اس میں قیصر و کسریٰ کی کی شان پیدا ہو گئی۔

اس موقع پر مسلمانوں کی صفوں سے نکل کر حضرت ابوذر رضؓ نے اپنی آواز بلند فرمائی اور عوام کو اپنے حقوق حاصل کرنے کی جانب توجہ دلائی۔

حضرت معاویہ رضؓ کو انہوں نے دیکھا کہ اپنا قصر الخضراء تعمیر کر رہے ہیں اور اس کے لئے ہزاروں کارکن مہیا کر لئے ہیں تو فرمایا:

"اگر یہ مسلمانوں کا مال ہے تو خیانت ہے اور اگر آپ کا مال ہے تو اسراف ہے۔"

ایسا کرتے ہوئے دیکھ کر ہم حضرت معاویہ رضؓ کو کس مثال سے یاد کریں۔ رسول خدا کی مثال سے جن کا کوئی دربان نہ تھا یا "خوفو" کی مثال سے، جو ہرم اکبر کی تعمیر پر کسانوں سے بیگار لیتا تھا۔

فرزندان اسلام کے مال میں اگر اسلام کے حکمران اسی طرح کا تصرف روا رکھیں گے۔ تو اسلام کی بلندیاں کہاں باقی رہیں گی۔

یہی وجہ ہے کہ ہر طرف سے جب شکایتوں اور دادرسیوں کی بھرمار ہوئی تو حضرت ابوذر رضؓ نے اپنی تقریر میں فرمایا:

"ایسے کام عالم وجود میں آ چکے ہیں جو معروف نہیں ہیں۔ بخدا یہ کتاب الٰہی میں ملتے ہیں نہ سنت میں۔ خدا کی قسم حق بجھتا ہوا، باطل ابھرتا ہوا اور حرص و طمع کا بے محابا طوفان امنڈتا نظر آتا ہے۔"

ایک شخص نے حضرت ابوذر رضؓ سے اپنی ملاقات میں کہا:

"معاویہ رضؓ کہتے ہیں کہ مال خدا کا مال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لوگوں کو نہ دیں گے۔ مسلمانوں کا اس پر سے نام مٹا دیں گے۔"

حضرت ابوذر رضؓ حضرت معاویہ رضؓ کے پاس تشریف لے گئے، اور اظہار نکیر کے طور پر پوچھا:

"آخر مسلمانوں کے مال کو اللہ کا مال کیوں کہتے ہو؟"

انہوں نے جواب دیا:

"کیا ہم اللہ کے بندے اور مال اللہ کا مال نہیں ہے؟"

حضرت ابوذر رضؓ نے ڈانٹتے ہوئے کہا:

"ایسا نہ کہو"

حضرت معاویہ رضؓ نے لجاجت کے انداز میں کہا:

"ابوذر رضؓ! آخر ہمارے خلاف غم و غصہ کی وجہ؟"

حضرت ابوذر رضؓ نے فرمایا:

"مال غنیمت مسلمانوں کا حق ہے، تمہیں یہ حق نہیں پہونچتا کہ اس میں سے کچھ بھی جمع کرو، تم نے رسول خدا کی، ابوبکر کی اور عمر کی مخالفت کی ہے، اسے اپنے اور بنو امیہ کے لئے جمع کر رہے ہو۔ غنی کو غنی تر اور فقیر کو فقیر تر بنا کر رکھ دیا ہے۔"

اس بحث و مباحثہ کے جھروکے سے دونوں بزرگوں کی نفسیات صاف جھلکتی نظر آسکتی ہے۔ ایک صراحت و استقامت اور دفاع عن الحق کا فریضہ انجام دے رہا ہے، اور دوسرا تعلق کا انداز اور خفیہ تگ و تاز کا بیڑا اٹھائے ہوئے، تاکہ تمام ممکن وسائل سے مدمقابل کو زیر کرے اور لیلائے مقصود سے ہمکنار ہو۔

روایت ہے کہ خفیہ طور پر حضرت معاویہ رضؓ نے ایک لاکھ درہم حضرت ابوذر رضؓ کی خدمت میں بھیجا۔ مقصد غالباً آپ کی زبان بندی تھا۔ مگر حضرت ابوذر رضؓ نے یہ رقم پوری کی پوری مسلمانوں میں تقسیم کردی۔ اس طرح دونوں فریق اپنے اپنے موقف پر قائم رہے۔ ایک اس موقف پر کہ مال اللہ کا مال ہے اور ایک اس پر کہ مال مسلمانوں کا مال ہے۔ دونوں ہی موقف نام اور کام دونوں کے اعتبار سے کتنے عجیب ہیں۔

حضرت معاویہ رضؓ نے ایک دفعہ حضرت ابوذر رضؓ سے کہا:

"دولت کا ذخیرہ اس لئے کرتا ہوں کہ عام مصالح پر خرچ کروں"

حضرت ابوذر رضؓ نے جواب دیا:

"اپنی بخششوں میں تجھے اللہ کی خوشنودی مطلوب نہیں، بلکہ یہ چاہتے ہو کہ تجھے فیاض کہا جائے اور کہا بھی جاچکا ہے۔"

اب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہ گیا کہ حضرت معاویہ رضؓ حضرت عثمان رضؓ سے مدد لیں۔ چنانچہ حضرت ابوذر رضؓ کو شام سے نکالنے کا جو مقصود حضرت معاویہ رضؓ کا تھا وہ پورا ہوا، اور یہ سرزمین اصلاح کی آواز سے خالی ہو گئی۔

حضرت ابوذر رضؓ کا اخراج، سرزمین شام سے اس انداز پر ہوا کہ ان کے رتبہ و مقام، شاندار ماضی اور ان کی بے آمیز مقبولیت کے شایان شان نہ تھا

آپ کو انتہا پسندانہ اصولوں کی نشر و اشاعت یا عصری زبان میں یوں کہیئے کہ اشتراکیت کا مجرم قرار دے کر شام سے نکالا گیا۔ اس اتہام اور بہتان طرازی کے ذمہ دار تھے حضرت معاویہؓ۔ اور حضرت عثمانؓ نے اس سلسلہ میں ان کی تائید فرمائی۔

یقین ہے کہ حضرت عثمان رضؓ کو رازہائے درون پردہ کا علم ہوتا اور یہ اندازہ ہوتا کہ معاویہؓ اپنے اور اپنی خاندان بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کے لئے کیا کچھ کر رہے ہیں تو ہرگز حضرت ابوذر رضؓ کو بے یار و مددگار نہ چھوڑتے جن کا شمار "السابقون الاولون" میں تھا۔

حکومت اور نظام حکومت کے نام پر معذرت خواہانہ انداز میں کلام کرنے والوں کو حضرت ابوذر رضؓ کے خلاف سخت رویہ اختیار کیے جانے کے لئے وجہ جواز تلاش کر لینے میں چنداں دشواری نہیں، یہ دعوے ایسے ہیں کہ ان کی بنیاد دن پر مجرموں سے زیادہ بے گناہوں کو پیس دیا جاتا ہے۔ اگلوں کے سامنے حضرت ابوذرؓ کو متہم کرنے کا کوئی عذر رہا ہو تو رہا ہو، پچھلے آخر کیوں اس طرح کا عذر پیش فرما رہے ہیں، جب کہ بعد کے حوادث و انقلابات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ کس طرح ایک فتنۂ عظیم برپا ہو گیا اور خود اسلام کی بھی مسلمانوں کے خلاف ایک عرصہ تک چلتی رہی۔

اگر حضرت ابوذر رضؓ کی رائے مان لی گئی ہوتی، حضرت معاویہؓ کو شام سے ہٹا دیا جاتا۔ اور مدینہ میں حالات عہد فاروقی کے معمول کے مطابق کر دیئے جاتے تو بعد کے فتنے اور سارے انقلابات کیا وجود میں آسکتے تھے؟ ہرگز ہرگز نہیں۔ پھر بھی لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ آج بھی حضرت ابوذر رضؓ کو متہم فرما رہے ہیں اور ان کی جدوجہد کو ازالۂ فساد کا عنوان دے رہے ہیں۔

ؔ حضرت ابوذر غفاری کی عظمت اپنی جگہ پر مگر ان کی ایک غلط رائے کی بنا پر حضرت معاویہ کے سارے کارناموں کو غارت کر دینا کہاں کی [illegible]

حضرت ابوذر رضہ فتنہ و فساد کی ان لہروں کے خلاف چلے جن کی لپٹ میں بہتیرے آ آگئے، مگر آپ ایک ناقابل شکست چٹان بن کر ڈٹ گئے، نہ شکست کھانا جانا نہ نرم ہونا۔

اپنی تیز و تند تنقیدات سے بلا شبہ حضرت ابوذر رضہ نے ارباب سیاست حکمرانوں کا ناطقہ بند کر رکھا تھا مگر یاں ہمہ اپنی مخصوص زندگی میں ان کا رویہ انتہائی نرم اور شگفتہ رہا، دنیاوی نعیبہ بھی ان کا بس اسی قدر تھا جتنا ان کے خادم کا تھا۔ دونوں ہی ایک طرح کا کھاتے اور ایک ہی نوعیت کا پہنتے۔

جلاوطنی کے مقام پر جب وفات ہوئی تو کفن کا کپڑا استعار لیا گیا اور اسی میں دفن ہو کر وہ اپنے پروردگار سے جا ملے۔ آپ کو سپرد خاک کرنے کے لئے ایک عراقی وفد پہونچا جو ربذہ کی راہ سے ریاض جا رہا تھا حضرت ابوذر رضہ کی میت نہ کسی پرچم میں لپیٹی گئی نہ کسی توپوں والی گاڑی پر لیجائی گئی، بس اتنا کافی تھا کہ رحمت کے فرشتوں نے ان کے استقبال کے لئے اپنے پر پھیلائے اور رب العالمین کے جوار میں انہیں اپنے سایوں میں لے چلے ۔۔

مضمون پر ایک نظر

حضرت ابوذر غفاری رضہ کے بارے میں جامع ازہر نے جو فتویٰ صادر کیا ہے، پوری امت ان کے بارے میں ہمیشہ وہی رائے رکھتی رہی ہے، حضرت ابوذر غفاری رضہ کی عظمت اپنی جگہ مسلم ہے مگر قرآن کی آیت الَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ کی جو یہ تفسیر فرماتے تھے کہ ایک حبہ بھی اپنے پاس نہ رکھا جائے اس کی تائید نہ تو کسی حدیث نبوی سے ہوتی ہے اور نہ کسی دوسرے صحابی سے یہ منقول ہے، اور نہ حضرت صدیق اور حضرت فاروق نے اپنے دور میں اس پر عمل کرنے کی کوشش کی، شیخ محمد الغزالی، سید قطب، مولانا مودودی اور بعض دوسرے حضرات نے حضرت ابوذر رضہ کی رائے اور بعض دوسرے واقعات اور روایات کو صحیح سمجھ کر حضرت معاویہ ہی نہیں بلکہ حضرت عثمان رضہ تک کو بھی مطعون کرنے میں دریغ نہیں کیا ہے۔ ان سے اگر پوچھا جائے کہ وہ فدک اور وادی القریٰ کی جائداد کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، اور حضرت عمر رضہ نے سواد عراق کی زمینوں کے بارے میں جو طرز عمل اختیار فرمایا تھا وہ کیا حضرت ابوذر رضہ کی رائے کے مطابق

تھا اگر ان کی رائے تسلیم کرلی جاتی تو اسلامی حکومت کی ساری اجتماعی ترقی ہی رک جاتی ۔ جمہور امت نے نہ تو شیعیت کو پسند کیا ہے اور نہ ناصبیت اور خارجیت کو ۔ حضرات صحابہ اور حضرت معاویہ اور حضرت عثمان کو مطعون کرنا شیعیت ہے ، اور اہل بیت یا بنو ہاشم کو مطعون کرنا ناصبیت و خارجیت ہے حضرت معاویہ رض کے طرز عمل پر جو لوگ اعتراض کرتے ہیں وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کاتب وحی مقرر فرمایا تھا ۔ اور قرآن پاک نے رضی اللہ عنہم کی جو بشارت دی ہے اس کے مصداق یہ حضرات بھی تھے ، اور وہ حضرت صدیق رض اور حضرت فاروق رض کے دور میں اعلیٰ عہدوں پر قائم رہے اور ان کے ہاتھوں بڑے بڑے کارنامے انجام پائے پھر ان کا یہ کارنامہ ناقابل فراموش ہے کہ سنہ ۱۴ھ سے لیکر سنہ ۳۴ھ تک پورے بیس برس انہوں نے پوری امت کو متحد رکھا اور جو فتنے حضرت عثمان رض کی شہادت کے بعد سر اٹھا چکے تھے وہ سرد پڑ گئے ۔ اور اسلامی حکومت کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوا ۔ اس سلسلہ میں ایک اور بات بہت اہم ہے وہ یہ کہ جمہور امت نے حضرت عثمان رض اور حضرت معاویہ رض اور خاندان عبد شمس کے دوسرے افراد کے بارے میں جو معتدل رائے ہمیشہ اختیار کی اس کو چند مشکوک تاریخی روایتوں کی بنا پر نظر انداز کر کے ان حضرات کو مطعون کرنا نہ صرف دین سے بے اعتمادی پیدا کرنے کا پیش خیمہ ہے ، بلکہ انتہائی کم علمی کی دلیل بھی ہے ۔

حدیث نبوی کی روایات کے سلسلہ میں امت نے جتنا بلند معیار قائم کیا ہے اس کی کوئی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی مگر اس احتیاط کے باوجود نہ جانے کتنی روایات کو مختلف فرقوں نے اپنے مزعومات کے مطابق اس ذخیرہ میں داخل کر دینے کی کوشش کی تو پھر تاریخی روایات جن میں بہت کم احتیاط برتی گئی ہے اور جن میں رطب یابس ہر طرح کی روایتیں جمع ہو گئی ہیں ان میں سے چند روایات کو سامنے رکھکر لعنت و ملامت کی پوری عمارت کھڑی کر لینا نہ تو علمی دیانتداری ہے اور نہ یہ تاریخی تحقیق کہی جا سکتی ہے ۔ حضرت ابوذر کا نام مصنف نے معاشی مساوات کے سلسلہ میں بار بار لیا ہے مگر مصنف کے ذہن میں یہ بات نہیں رہی کہ کمیونزم کی طرح اسلام معاشی مساوات کا غیر فطری نعرہ نہیں لگاتا جس پر آج تک ایک دن بھی عمل نہ ہو سکا ، بلکہ وہ معاشی انصاف کا اصول پیش کرتا ہے ۔ حضرت معاویہ رض نے اہل بیت اور بنو ہاشم کے ساتھ برابر معاشی اور معاشرتی انصاف سے کام لیا ممکن ہے کہ دو چار مثالیں بنو امیہ کو ترجیح دینے کی مل جائیں ، مگر ان کا طرز عمل معاشی انصاف ہی کا رہا ہے ۔ یہ حضرات آج مغرب کی لائی ہوئی تعیشات کی ہر چیز کو اپنے لئے اور

موجودہ دور کے حکمراں کے لئے جائز سمجھتے ہیں اور اس پر کسی تنقید کو ضروری نہیں سمجھتے بلکہ مدح و ستائش ہی کرتے ہیں۔ مگر حضرت معاویہ رض اسلامی حکومت کے رعب و دبدبہ کے لئے اگر سرکاری قیام گاہ کی تعمیر کر لیتے ہیں تو ان حضرات کے لئے وہ اتنے ناپسندیدہ ہو جاتے ہیں کہ وہ اپنے جن کارناموں کی وجہ سے خدا کی بارگاہ میں خوشنودی حاصل کر چکے ہیں وہ اپنی بارگاہ میں ان کو اس سے محروم کر دینا چاہتے ہیں۔

حضرت معاویہ رض اپنے خلاف شدید سے شدید تنقید سن کر جتنے صبر و ضبط سے کام لیتے تھے وہ آپ اپنی مثال ہے حضرت ابوذر رض سے ان کے جو مکالمے ہوئے ہیں ان سے خود پتہ چلتا ہے کہ ان کا طرز عمل کیا تھا۔ حضرت ابوذر رض سے ان کا اختلاف صرف ان کے طرز عمل پر تنقید ہی نہیں تھا بلکہ وہ آیات اور احادیث جن میں مال کی مذمت کی گئی ہے ان کے سلسلہ میں ان کی وہ مخصوص تفسیر و تشریح تھی جس سے واقعی ایک انتشار کی صورت پیدا کر دی تھی ورنہ نفس تنقید کو نہ صرف حضرت معاویہ رض نے بارہا برداشت کیا بلکہ انہوں نے اپنے بہت سے اہم فیصلے بدل دیئے ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

حضرت معاویہ رض نے رومیوں سے ایک معاہدہ کیا اور مدت معاہدہ ختم ہونے سے پہلے ہی کسی خطرہ کی بناء پر ان کی سرحد پر اپنی فوجیں بھیج دیں۔ مشہور صحابی حضرت عمرو بن عنبسہ رض کو جب اس کا علم ہوا تو وہ فوراً حضرت معاویہ رض کے پاس پہونچے اور احتجاج کیا، انہوں نے وجہ دریافت کی تو حضرت عنبسہ رض نے معاہدہ کی پابندی آیات و احادیث سنائیں۔ حضرت معاویہ رض نے سر تسلیم خم کرتے ہوئے فوراً فوج کو سرحد سے بلا لینے کا حکم دیا۔ (مشکوٰۃ شریف باب الامان)

غور کیجئے اسلامی حکومت کے لئے یہ کتنا نازک موقع تھا مگر حضرت عمرو بن عنبسہ رض نے جب کتاب و سنت کی روشنی میں ان کے فیصلے کو غلط بتایا تو انہوں نے اپنا یہ اہم فیصلہ بدلنے میں ایک لمحہ بھی تامل نہیں کیا۔

(بقیہ صفحہ ۴۴)

کہ احادیث قابل اعتماد نہیں ہیں، حالانکہ محدثین نے اخبار آحاد کو جو ظنی الدلالت کہا ہے تو متواتر احادیث سے ممتاز کرنے کے لئے کہا ہے ورنہ جہاں تک اخبار آحاد سے کسی حکم کے نکلنے کا تعلق ہے اس اعتبار سے وہ احکام بھی اسی طرح قطعی الدلالت ہوتے ہیں جس طرح متواتر احادیث سے نکلے ہوئے احکام، صحیح احادیث کی جس طرح ایک قسم متواتر ہے اسی طرح مشہور اور عزیز و غیرہ بھی۔ یہ تقسیم راویوں کی کثرت اور قلت کے اعتبار سے ہے نہ کہ استخراج مسائل کے اعتبار سے۔ یہ تو مولانا کے خیالات کے سلسلہ میں چند باتیں عرض کر دی گئی ہیں یوں یہ پوا نمبر مرتبین نے بڑے سلیقہ سے شائع کیا ہے جو لائق تحسین ہے۔

جامعۃ الرشاد کے طلبہ کے سامنے کی گئی ایک تقریر کا کچھ حصہ

مرتبہ: محمد اختر حسین نیپالی متعلم درجہ عربی چہارم جامعۃ الرشاد

میرے عزیزو! ایک بات اور ذہن نشین کرلو کہ اس وقت جدید تعلیم حاصل کرنے کے لئے جتنی سہولتیں پیدا ہوگئی ہیں اتنی اس سے پہلے نہیں تھیں۔ اس وقت ہندوستان کی کوئی بستی ایسی نہیں ہے جس کے قریب کوئی ہائی اسکول یا کالج موجود نہ ہو۔ تمہارے والدین غریب ہیں جب بھی وہ چاہتے تو تم کو ان درسگاہوں میں بھیج کر کھانے کمانے کے بقدر تعلیم تو دلا ہی سکتے تھے مگر انہوں نے اس سہولت سے فائدہ نہ اٹھا کر تم کو گھر سے اتنی دور تعلیم کے لئے بھیجا ہے۔ اس تعلیم سے ان کو توقع نہ ہوگی کہ ہمارا لڑکا اس کی تکمیل کر کے کسی بڑے عہدہ پر پہونچ جائے گا۔ بلکہ ان کا جذبہ صرف یہ ہوگا کہ ہمارا بچہ دینی تعلیم اور حسن سیرت سے آراستہ ہوجائے۔ اس صورت میں تم سوچو کہ اگر تم نے ان کی توقع پوری نہ کی تو ان کو کتنی مایوسی اور شرمندگی ہوگی۔ کتنے لوگ ان پر طنز و تعریض کا جملہ کسیں گے کہ "فلاں کا بیٹا نہ دین کا ہوا نہ دنیا کا"۔ اس لئے تم طالب دنیا بن کر ان درسگاہوں میں نہ رہو بلکہ طالب آخرت بن کر رہو۔ اگر تم طالب دنیا بن کر دین کی تعلیم حاصل کروگے تو ممکن ہے تم کچھ عارضی دنیاوی وجاہت حاصل ہو جائے۔ مگر اس سے نہ تمہارے والدین کی توقع پوری ہوگی اور نہ قوم وملت کی اور نہ علم دین کا حق ادا ہوسکے گا اور نہ تمہارا علم علم نافع بن سکے گا۔ اتنا سب نقصان کر کے اگر تم کو تھوڑی سی راحت مل گئی تو تم میں اور اسکول وکالج میں پڑھنے والے طلبہ میں کیا فرق ہوگا۔

عزیز طلبہ! یہ بات بھی یاد رکھو کہ تم نے جو راہ اختیار کی ہے وہ عیش و عشرت اور دنیاوی عزت وجاہت کی راہ نہیں ہے، بلکہ اس راستہ پر چل کر تمہیں اس دنیا کی زندگی میں کھونا زیادہ اور پانا کم ہے۔ یہ انبیاء علیہم السلام کی راہ ہے جس راہ میں پھول نہیں بلکہ قدم قدم پر کانٹے، روڑے اور پتھر بکھرے

اس لئے میں عرض کئے دیتا ہوں کہ جن کے قلب وجگر میں ان شدائد کے سہارنے کی طاقت نہ ہو وہ ابھی سے اپنی راہ بدل لیں ورنہ وہ آگے چل کر اپنے آپ کو ایک عجیب مخمصہ میں پائیں گے۔ اس راہ میں چلنے کے لئے تو جان ودل کو کھونا ہوگا

وہ نہیں وفا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی
جس کو ہو جان ودل عزیز اسکی گلی میں جائے کیوں

یہ بات میں نے اس لئے عرض کردی کہ تم اگر بے جا توقعات اور امیدوں کے ساتھ اس راہ کو اختیار کروگے تو اپنے لئے بھی غیر مفید ہوگے اور ملت کے لئے بھی ایک بوجھ بنوگے۔ یا پھر کافی عمر گنوانے کے بعد تم کو اسکول وکالج یا کسی یونیورسٹی کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑے گا اور اس دروازہ میں داخل ہونے کے لئے ممکن ہے کہ تم کو دین واخلاق کو بھی بالائے طاق رکھ دینا پڑے۔ جیسا کہ عام طور پر دیکھا جارہا ہے اس لئے اپنے عزم وارادہ کا جائزہ لے لو۔ اپنے اندر اس تعلیم کا اہل ہوتا پاتے ہو تو اپنے دل ودماغ کی پوری یکسوئی کے ساتھ اس میں لگ جاؤ۔ انتشار ذہنی کے ساتھ کوئی کام انجام نہیں پاسکتا۔ زیادہ تر طلبہ اسی انتشار ذہنی کی بنا پر ناکام ہوتے ہیں۔ تم رزق کیطرف سے بے پرواہ رہو۔ جو علیم وخبیر کیڑے مکوڑوں کو پالتا ہے اور جانوروں کو رزق دیتا ہے وہ تم کو ضائع نہ کرے گا۔ تمہارے لئے تو اس نے رزق عام اور رزق مقسوم کے ساتھ ایک رزق موعودؔ کا بھی وعدہ کیا ہے۔ اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے۔

وَمَن يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَل لَّهُ مَخْرَجًا
وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ
(الطلاق)

جو پرہیزگاری اختیار کرے اللہ تعالیٰ اس کے لئے راستہ پیدا کردیگا اور ایسی جگہ اور ایسے طریقہ سے رزق دے گا جس کا اسے گمان بھی نہیں ہوگا

لہ قرآن پاک کی آیات کے تتبع سے معلوم ہوتا ہے کہ رزق کی تین قسمیں ہیں۔ ایک رزق عام جسمیں تمام مخلوق شریک ہے وَمَا مِن دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (ہود)، دوسرے رزق مقسوم یعنی ہر شخص کے لئے اللہ نے کچھ رزق مقرر کر رکھا ہے جو اسے ملے گا۔ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُم مَّعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا (زخرف)، تیسرے رزق موعود جو اعمال صالحہ پر ملتا ہے۔ جیسا کہ اوپر آیت میں مذکور ہے۔

تم قومی ملکیت ہو

قومی ملکیت کا تصور معاشیات میں بڑی حد تک غیر اسلامی ہے۔ مگر تمہارے بارے میں یہ تصور بالکل صحیح ہے کہ تم قومی ملکیت ہو۔ تم قوم و ملت کی امانت ہو۔ ہم نے قوم سے یہ کہہ کر چندہ لیا ہے کہ ہم علم دین کے خادم، اللہ کے سپاہی اور داعی پیدا کر رہے ہیں۔ ہم جدید تعلیم پانے والے طلبہ کیلئے کوئی سہولت فراہم نہیں کرتے۔ وہ سب کچھ خود کرتے ہیں یا ان کے والدین کرتے ہیں۔ وہ کھانے پر خرچ کرتے ہیں۔ تعلیمی فیس ادا کر کے پڑھتے ہیں۔ مگر ہر مدرسہ میں عربی طلبہ و حفاظ کے رہنے سہنے کھانے پینے کے ساتھ ان کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے کیا جاتا ہے کہ تم دین اور قوم و ملت کی خدمت کے لئے تیار ہو رہے ہو۔ اسی لئے قوم کا غریب سے غریب فرد بھی تم کو راحت پہونچانے میں حصہ لیتا ہے۔ تم بتاؤ کہ وہ تم کو قومی ملکیت سمجھنے میں حق بجانب ہیں یا نہیں۔

تمہارے قومی ملکیت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا علم، تمہاری صلاحیت اور تمہارے دل و دماغ کی ساری قوت تمہاری اپنی ذات سے زیادہ خاندان کے لئے۔ بستی کے لئے، دین و ملت کے لئے مفید ہونی چاہئے۔ اگر تمہاری یہ تعلیم تمہاری ذات کے لئے کچھ مفید ہو گئی اور دین و ملت کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہونچا تو سمجھو کہ تعلیم دین کا مقصد فوت ہو گیا۔ اور مدرسہ کی تعلیم اور اسکول و کالج کی تعلیم میں کوئی فرق نہیں رہا۔ یاد رکھو

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

بقیہ رشحات

مغربی تہذیب سے مشرق کو جو سوغات ملے ہیں ان میں بے شمار غیر فطری اور غیر مفید کھیلوں کے وہ مقابلے بھی ہیں جو دوسرے تیسرے سال دنیا کے مختلف ملکوں میں ہوتے رہتے ہیں۔

صحت درست کرنے کیلئے کھیل کود اچھی چیز ہے اور اسے جاری رہنا چاہئے۔ مگر اسوقت کھیل کود پر ایک ایک ملک اتنا روپیہ خرچ کرتا ہے جتنا کہ کسی غریب ملک سالانہ بجٹ ہوتا ہے۔ ابھی ہندوستان میں ایشیائی ملکوں کے درمیان کھیل کود کے جو مقابلے ہوتے ہیں اس پر اس غریب ملک کا کروڑوں نہیں بلکہ اربوں روپیہ صرف ہوا ہے۔ آیجالی تیموں نے جو کروڑوں روپئے صرف کئے ہیں وہ اسکے علاوہ ہے۔ جس ملک میں لاکھوں آدمیوں کو پیٹ بھرنے کیلئے روٹی، تن ڈھانکنے کیلئے کپڑا اور سر چھپانے کیلئے مکان نہ ہو وہاں اس ملک کی دولت کو ایک لاحاصل کام کیلئے پانی کیطرح بہانا کیا کوئی عقلمندی کی بات ہو سکتی ہے؟ بلکہ غریب عوام کیلئے یہ بہت بڑا ظلم ہے۔ عام طور پر ان مقابلوں کو دوستی کا ایک ذریعہ بتایا جاتا ہے یہ بھی بالکل غلط بات ہے۔ جنگ کھیل کے ذریعہ کسی دو مخالف ملکوں کے درمیان دوستی نہیں ہوئی ہے بلکہ اور بھی تیز ہی پیدا ہو جاتا ہے

معہد تدریب الدعاۃ

(مکۃ مکرمہ)

وقت کی اہم ترین ضرورت

ادارہ

اسلام اپنی فطرت میں ایک دعوتی اور تبلیغی مذہب ہے، کیونکہ عقائد و تصورات اور عملی تشکیلات میں وہ آفاقیت اور عالمگیر شان رکھتا ہے۔ یہ ہر دور میں انسانیت کا مطلوب اور اس کے ہمہ آن بدلتے ہوئے خوابوں کی تعبیر رہا ہے۔

صدیوں پہلے اللہ کے بندوں نے، رضائے الٰہی کے خاطر، اور انسانیت کی بہی خواہی کے لئے اس کا پرچم بلند کیا اور اسے عالم انسانی کے ایک ایک گوشہ میں پہونچا دینا چاہا، مگر تاریخ کے ایک طویل عرصہ میں انسانیت اس سے گریزاں رہی، شاید اس میں خدائے علیم وحکیم کی کوئی مصلحت رہی ہو، مگر اب پندرہویں صدی کا آغاز، پیغام اسلامی کی از سرنو نشر واشاعت کی علامت بن کر سامنے آیا ہے۔ انسانیت دوبارہ اسلام کے روحانی اور سماجی نظام عدل کے لئے مضطرب ہو چکی ہے۔ اب اس کے علمبرداروں پر بھی دوبارہ یہ فرض عائد ہو چکا ہے کہ اسلام کی قولی اور عملی دونوں تفسیریں، حکمت وموعظت اور مجادلہ حسن کے جدید اسلحہ سے لیس ہو کر، دنیائے انسانیت کے تمام گوشوں تک پہونچا دیں۔

مقام شکر ہے کہ مرحوم شاہ فیصل بن عبدالعزیز رحمہ رابطہ عالم اسلامی کے نام سے جو بین الاسلامی انجمن قائم کی تھی وہ اپنے کاموں کا دائرہ وسیع تر کر رہی ہے، اور اب اس کے صدر محترم محمد علی الحرکان

نے ایک ایسے ادارہ کے افتتاح کا اعلان کیا ہے جو ساری دنیا کے اندر دعوت اسلامی کے کام کو آسان تر اور نتیجہ خیز بنائے گا، خطیبوں، مبلغوں اور دعوت کا کام کرنے والوں کی تربیت کا یہ ادارہ گذشتہ مہینہ امیر منطقہ مکہ مکرمہ، جناب ماجد بن عبد العزیز اور دیگر زعمائے اسلام کی موجودگی میں افتتاح پذیر ہوا۔ افتتاحی جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے امیر موصوف نے فرمایا:

"اگر میں کہوں تو غالباً بالکل ہی نئی بات ہوگی کہ جلالۃ الملک عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کی ملکی سیاست اور انتظامی امور میں آغاز ہی سے دعوت اسلامی کو بنیادی اصول و نقطہ آغاز کی حیثیت حاصل تھی۔ کیونکہ یہ امت اپنی فطرت میں دعوت اسلامی سے بے حد محبت رکھتی ہے اور اس کے لئے اس کے دل میں اس کی جو عظمت ہے۔ اور کیوں نہ ہو جبکہ یہ انہی شخصیتوں کی اولاد ہے جنہوں نے اسلام کو پروان چڑھانے کے لئے اسے اپنے خونوں سے سینچا اور حکمت و بصیرت سے لوگوں کو اس کی جانب دعوت دی۔ قولی دعوت سے پہلے انہوں نے اپنے آپ کو اسلامی اعمال و اخلاق کے زیوروں سے سجایا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بہت جلد اس دین کی جانب مائل ہوگئی۔ اس لئے بھی مائل ہوگئی کہ یہی دین برحق ہے، لوگوں کے درمیان سماجی و معاشی مساوات قائم کرتا ہے، ظلم و ناانصافی کا ازالہ کرتا ہے اور شخصی اور اجتماعی آزادیوں کو برقرار رکھتا ہے۔ اس کے اندر ہر زمانہ اور ہر جگہ کے لئے صالح قوانین موجود ہیں، ادب و اخلاق اور رواداری کی تعلیمات بھی ہیں، شفقت و محبت اور باہمی یگانگت کے اسباق بھی ہیں، دعوت اسلامی کا یہ ہے منہج جس پر مکہ کی تمام تنظیمات رواں دواں ہیں۔

یہ نیا ادارہ جسے رابطۂ عالم اسلامی کی مجلس اعلیٰ عالمی للمساجد نے ائمہ، خطیب اور مبلغین کی تربیت کے لیئے قائم کیا ہے، دراصل اس تعمیر کی پہلی اینٹ ہے جسے خادم الحرمین جلالۃ الملک فہد اپنے عہد حکومت میں پایۂ تکمیل تک پہونچانا چاہتے ہیں۔ اسے عنقریب ہر طرح کی مالی اور مادی اعانتیں حاصل ہوں گی۔"

امیر منطقہ مکہ کے اس افتتاحی خطاب کے بعد رابطہ کے جنرل سکریٹری جناب محمد علی الحرکان نے جدید جمعیہ کے ابتدائی مراحل اور اس کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

"دعوت اسلامی کو ان مقاصد میں بنیادی اور اولین اہمیت حاصل ہے جن کی خاطر بیس سال پیشتر رابطہ عالم اسلامی کا قیام عمل میں آیا ہے۔ اس میدان میں رابطہ کو بفضلہ تعالیٰ نیز حکومت کی پیہم مالی اور معنوی فیاضانہ حوصلہ افزائیوں کے باعث کامیاب تجربے حاصل ہو چکے ہیں۔

ائمہ اور مبلغین کی تربیت کا خیال سب سے پہلے ۱۳۹۵ھ میں اسلامی جمہوریہ موریتانیا کے دارالسلطنت میں پیدا ہوا، جہاں رابطہ نے حکومت موریتانا کے تعاون سے سب سے پہلا کامیاب تجربہ کیا۔ یہاں سے ساٹھ مبلغ تیار ہوئے جن کو رابطہ نے اسی ملک میں اسلام کی نشر و اشاعت کے فریضہ پر مامور کیا۔ بعد ازآں رابطہ کو مکہ مکرمہ میں ایک ایسے ہمہ وقتی ادارہ کھولنے کی فکر ہوئی جو دعوت اسلامی کی دائمی تکمیل کا سامان فراہم کرے۔ اس ادارہ نے مختلف میقاتوں کے ذریعہ ۱۳۹۶ھ سے اب تک خطیبوں اور مبلغوں کی ایک بڑی ٹیم تیار کی جسے دنیا کے مختلف ممالک میں دعوت اسلامی کی مہم پر مامور کیا گیا

ایسے ہی ائمہ، خطیبوں اور مبلغوں کے لئے تربیتی میقاتیں افریقی، ایشیائی یورپین اور امریکی ممالک کے اندر بھی شروع کی گئیں جن سے دعوت اسلامی کا کام انجام دینے والوں کی ایک کثیر تعداد فراہم ہوئی۔ انہیں رابطہ کے خرچ پر ان کے ملکوں میں، دعوت و تبلیغ پر مامور کیا گیا

بالآخر مکہ کے اس وقتی اسکول کو ہمہ وقتی مرکز میں تبدیل کر دینے کا خیال پیدا ہوا تاکہ دنیائے اسلام کی اسلامی یونیورسٹیوں سے فارغ شدہ طلبہ کو انہی کے ملکوں میں دعوت اسلامی کا کام انجام دینے کے لئے تیار کیا جائے۔

اس ہمہ وقتی مرکز کی موجودہ میقات کے لئے پہلی بار پچاس ایسے طلبہ کا انتخاب عمل میں آیا جو مختلف قومیتوں کے حامل ہیں اور یونیورسٹیوں کی اسناد رکھتے ہیں تدریسی اسٹاف جامعہ ام القریٰ سے فارغ شدہ ان اساتذہ پر مشتمل ہے جو اپنے پاس تخصص کی سند رکھتے ہیں۔ یہ انتظام جامعہ ام القریٰ کے پرنسپل ڈاکٹر

یونیورسٹیوں کے ذمہ داروں کے باہمی تعاون سے عمل میں آیا، ان حضرات نے اس دعوتی تربیت کی مہم کو کامیاب بنانے میں ہر طرح کا تعاون پیش کیا۔ معہد تدریب الدعاۃ کے تدریسی اسٹاف کے لئے جس اعلیٰ قابلیت کی ضرورت تھی، اس کا خصوصی لحاظ کرتے ہوئے انہوں نے انتخاب میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ مجلس اعلیٰ عالمی للمساجد کی سکریٹری شپ اور جامعہ ام القریٰ کے درمیان یہ تعاون مستحکم بنیاد کی حیثیت سے ماضی میں بھی تھا، حال میں بھی ہے اور انشاء اللہ مستقبل میں بھی رہے گا۔

ائمہ، خطیب اور مبلغین کی علمی، فکری، ذہنی اور نفسیاتی اصلاح و تربیت کا مسئلہ دورِ حاضر کا اہم ترین مسئلہ ہے۔ عالم اسلامی کے جملہ مسائل میں اس مسئلہ کو جتنی بھی اہمیت دی جائے کم ہے، بالخصوص ایسے حالات کے اندر جبکہ یورپ سے ابھرنے والے مادی افکار اپنی موت مر چکے ہیں اور میدان میں فکر و عقیدہ کے نام سے کوئی ایسا پرچم موجود نہیں ہے جس کے زیر سایہ انسانیت امن و سکون کا سانس لے سکے، انسانی افکار و نظریات کو آزماتے آزماتے انسانیت تھک چکی ہے اور اب مزید وہ کسی بھی انسانی نظریۂ حیات کو آزمانے کے لئے تیار نہیں ہے۔ اسے اب ایک ایسا فکر، عقیدہ اور نظام درکار ہے جو عالمگیر ہو، اس کی فطرت کے عین مطابق ہو اور رہتی دنیا تک اس کے خوابوں کی تعبیر پیش کرتا ہو۔ اس طرح کا عظیم فکر اور آفاقی عقیدہ و نظام ظاہر ہے اسلام کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔

مسئلہ کی اہمیت کے پیش نظر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کام کو وسعت دی جائے، اور دنیا بھر میں دعوت اسلامی کا تجربہ رکھنے والے افراد، جماعتوں اور تحریکوں کے عملی تجربات سے فائدہ اٹھایا جائے، اسلامی اور دینی مدارس اور یونیورسٹیوں کے نظامہائے تعلیم و تربیت میں ایسی اصلاحی اور تعمیری تبدیلیاں پیدا کی جائیں، جن سے دین اسلامی کا صحیح اور فطری تصور ابھرے۔ اور پھر اعیان اسلام کو فکری اور عملی اعتبار سے خالصۃً ایسے نہج پر تیار کیا جائے جس کی بدولت وہ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی راہ پر گامزن ہوں۔ اس طرح عالم خود بخود ایک ایسا اسلامی سماج ابھرے گا جو اسلامی افکار و نظریات اور اعمال و اخلاق کی

باقی نشر پر

باب الاستفسار والجواب

عورت کے نان ونفقہ میں کیا چیزیں شامل ہیں

سوال :- تین ہفتہ پہلے الٰہ آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ مغرب بعد ہم لوگ مولانا قمر الزمان صاحب کے مکان پر بیٹھے ہوئے کچھ دینی باتیں کر رہے تھے کہ اسی درمیان چند حضرات آئے اور بیٹھ گئے اور پھر کچھ دیر بعد ان میں سے ایک صاحب نے راقم الحروف سے مخاطب ہو کر کہا کہ آج کل ہم لوگ نماز بعد مصلیوں کو آپ کی "اسلامی فقہ" پڑھ کر سناتے ہیں۔ کتاب میں ایک جگہ ہم لوگوں کو بڑا الجھاؤ پیدا ہوا۔ آپ نے بیوی کے حقوق کو بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "بیوی کے کپڑے کی دھلائی اور دوا علاج کی ذمہ داری شوہر کے اوپر نہیں ہے" یہ تو بڑے ظلم کی بات ہے کہ رہے تو آپ کے ساتھ اور جب وہ بیمار پڑے تو یا تو وہ میکہ جائے یا پھر کسی سے قرض لے یا پھر بھیک مانگے ؟

الجواب :- جن حضرات نے اس وقت سوال اٹھایا ان سے عرض کیا گیا کہ یہ ایک قانونی بات لکھی گئی ہے کہ عورت اپنے شوہر سے قانونی طور پر کیا مطالبہ کر سکتی ہے اور کیا نہیں۔ خاص طور پر اختلاف کی صورت میں۔ یوں اخلاقی طور پر شوہر کو یہ تمام ضروریات پوری کرنی چاہئے۔ چونکہ اس وقت کتاب سامنے نہیں تھی اس لئے اتنا جواب دے دیا گیا۔ مگر اس جواب سے وہ حضرات خاموش تو ہو گئے مگر پورے طور پر مطمئن نظر نہیں آئے۔ اور راقم الحروف نے جب "اسلامی فقہ" کی کتاب دیکھی تو محسوس ہوا کہ اس مسئلہ کے سلسلہ میں راقم الحروف نے ان سوالات کے نہیں

خود بھی ان کے اس علجان کی ترجمانی کی ہے۔ راقم الحروف نے اسلامی فقہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ذکر "اسلامی شریعت میں عورتوں اور مردوں کے حقوق" والے مضمون کے ضمن میں اوپر آچکا ہے اس میں راقم الحروف نے لکھا ہے کہ کپڑے کی دھلائی، زچگی اور دوا علاج کے خرچ کو شوہر کی اخلاقی ذمہ داری اور اس کا احسان نہیں سمجھنا چاہئے۔ بلکہ عورت کو قانوناً اس کا حق ملنا چاہئے یعنی اور یہ چیزیں شوہر کے اوپر واجب ہونی چاہئیں اس کے استدلال میں جو کچھ لکھا ہے اس کے سلسلہ میں فقہا کی کچھ اور تصریحات بھی سامنے آئی ہیں۔ جو یہاں درج کی جا رہی ہیں۔

زچگی میں دائی وغیرہ کے اخراجات کے سلسلہ میں فقہاء لکھتے ہیں کہ دائی کو بیوی یا شوہر میں سے جو بلائے اس کی فیس وغیرہ اس کے اوپر ہے اور اگر وہ خود آجائے تو اس میں کچھ فقہا اس کی ذمہ داری شوہر پر ڈالتے ہیں اور کچھ فقہا عورت پر۔ جن لوگوں نے اسے جماع کا نتیجہ قرار دیا ہے انہوں نے اسے شوہر کی ذمہ داری قرار دیا ہے اور جن لوگوں نے اسے ڈاکٹر وغیرہ کی اجرت پر قیاس کیا ہے انہوں نے اس کو عورت کی ذمہ داری قرار دیا ہے۔ اس پر علامہ ابن عابدین نے رائے دیتے ہوئے لکھا ہے۔

ویظهر لی ترجیح الاول لان نفع القابلة معظمه یعود الی الولد فیکون علی ابیه

(رد المحتار ص ۶۴۹ ج ۲)

میرے نزدیک پہلی رائے قابل ترجیح ہے اس لئے کہ دائی وغیرہ کا زیادہ تر فائدہ بچہ کو پہونچے گا۔ اور یہ باپ کی ذمہ داری ہے۔

نفقہ کی تفصیل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:۔

ان امتنعت المرأة عن الطحن والخبز ان کانت ممن لا تخدم او کان بها علة فعلیه ان یأتیها بطعام مهیأ

(ج ۲ ص ۶۷۵)

اگر عورت پیسنے اور پکانے سے انکار کرتی ہے تو اگر وہ اپنے گھر اس کی عادی نہیں رہی ہے یا وہ بیمار ہے تو شوہر پر ذمہ داری ہے کہ وہ پکا پکایا کھانا اسے دے اور اگر وہ اپنے میکہ میں یہ کام کرتی رہتی ہے تو اسے یہ کام کرنا ضروری ہے۔

پھر آگے "الجوہرۃ النیرۃ" کے حوالے سے لکھتے ہیں۔

ویجب علیہ ما یتنظف بہ وتزیل الوسخ کالمشط والدھن والسدر والخطمی والاشنان والصابون علی عادۃ اھل البلد اما الخضاب والکحل فلا یلزمہ بل ھو علی اختیارہ واما الطیب فیجب علیہ ما یقطع بہ السھوکۃ لا غیر وعلیہ ما تقطع بہ الصنان لا الدواء للمرض ولا اجرۃ الطبیب ولا الفصاد والحجام

(ج ۲ ص ۲۴۹)

شوہر پر ضروری ہے کہ وہ تمام چیزیں فراہم کرے جو صفائی ستھرائی اور میل کچیل کے دور کرنے کے لئے ضروری ہیں جیسے بیری کی پتی، خطمی، اشنان (ایک گھاس) صابون جیسا کہ وہاں کے باشندوں کا رواج ہے۔ البتہ خضاب اور سرمہ وغیرہ فراہم کرنا ضروری نہیں ہے وہ چاہے کرے یا نہ کرے۔ اسی طرح خوشبو، تیل وغیرہ بھی اسی حد تک ضروری ہے جس سے بغل کی یا بدن وغیرہ کی بدبو جاتی رہے۔

اسی طرح شیخ محمد بن قدامہ نے اس مسئلہ پر بڑی لمبی بحث کی ہے۔ ان کی عبارت کے چند الفاظ یہ ہیں۔

والنفقۃ مقدرۃ بالکفایۃ

المغنی ج ۷ ص ۵۶۴

نفقہ اتنا ضروری ہے جو اس کی ضروریات کے لئے کافی ہو۔

ومن المعلوم أن قدر کفایتھا لا ینحصر فی المدین بحیث لا یزید عنھما ولا ینقص

المغنی ج ۷ ص ۵۶۵

یہ بات معلوم ہے کہ نفقہ کے کافی ہونے کو کسی ذمہ داری میں محدود نہیں کیا جا سکتا کہ نہ اس سے کم ہو اور نہ زیادہ

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بقدر کفارہ نفقہ کے قائل نہیں ہیں انہوں نے امام شافعیؒ کے جواب میں دی ہے۔ پھر ان ضروریات کا ذکر کیا ہے جو عورت کی مخصوص ضرورتیں ہیں تیل

کنگھی، صفائی ستھرائی کی ضروری چیزیں ہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اسی طرح خادم کے بارے میں لکھتے ہیں:

فان کانت المرأة ممن لاتخدم نفسها لکونها من ذوی الاقتدار او مریضة وجب لها خادم لقوله تعالی "وعاشروهن بالمعروف" ومن العشرة بالمعروف ان یقیم لها خادما ولانه مما یحتاج الیه فی الدوام فاشبه النفقة

(المغنی ج ۷، ص۵۶۹)

اگر عورت ایسے گھرانے کی ہے کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے سارا کام نہیں کرتی یا وہ مریض ہے تو اس کے لئے ایک خادم کا مہیا کرنا شوہر کے لئے واجب ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وعاشروهن بالمعروف ان کے ساتھ بہتر طریقہ کا سلوک کرو، بہتر سلوک میں خادم بھی داخل ہے اس لئے کہ نفقہ کی طرح یہ بھی ایک دوامی ضرورت ہے۔

اوپر جو اقتباسات نقل گئے ہیں ان سب سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر ائمہ نفقہ کو عرف وعادت پر محمول کرتے ہیں جیسا کہ قرآن وحدیث نفقہ کے سلسلہ میں لفظ معروف کی قید سے معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود تمام ائمہ دوا علاج کو نفقہ واجبہ میں شمار نہیں کرتے بلکہ اسے شوہر کی اخلاقی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔

راقم الحروف کو اس سلسلہ میں برابر خلجان رہا کہ ایسا کیوں ہے مگر شیخ ابن قدامہ نے اس عورت کے بارے میں جو ایسے گھر کی ہو جس میں عورتیں سارا کام کاج اپنے ہاتھ سے نہیں کرتیں تو ان کو خادم مہیا کرنا قرآن کے اس فقرہ وعاشروهن بالمعروف کے تحت شوہر پر ضروری ہے، اس سلسلہ میں انہوں نے ایک فقرہ ایسا لکھا ہے جس سے کچھ خلجان بھی دور ہوا اور اس مسئلہ پر سوچنے کا ایک شرعی امداد بھی ملا۔ ان کا جملہ یہ ہے۔

ومن العشرة بالمعروف ان یقیم لها خادما ولانه مما یحتاج الیه فی الدوام فاشبه النفقة (ج ۷، ص۵۶۹)

معروف کے ساتھ زندگی گذارنے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ ایسی عورت کو ایک خادم دیا جائے اس لئے کہ کھانے پینے کی طرح یہ بھی اس کی بنیادی ضرورت ہے۔

خادم کو انہوں نے کھاتے پیتے لڑکی کے لئے اس لئے ضروری قرار دیا ہے کہ وہ اس کی مستقل اور دوامی ضرورت ہے جس طرح نفقہ۔ اس دوامی ضرورت سے یہ بات نکلتی ہے کہ فقہار اپنے زمانہ میں دوا علاج کو دوامی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے اس کو نفقہ واجبہ کا جز قرار نہیں دیا ہے۔ اس کو تبرعًا ضروری سمجھا۔

واقعہ بھی یہ ہے کہ آج سے ۵۰ برس پہلے عام طور پر لوگ آج کے مقابلہ میں زیادہ تندرست ہوتے تھے۔ اگر وہ بیمار پڑتے تو دوا علاج پر سرے سے کچھ خرچ ہی نہیں کرتے تھے بلکہ معمولی معمولی جڑی بوٹیوں یا پرہیز یا غذا سے علاج کرلیا کرتے تھے۔ اس لئے دوامی ضرورت نہ سمجھنا صحیح تھا، مگر جیسا کہ اوپر فقہار کی تصریحات نقل کی گئی ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ضروریات زندگی کا دائرہ ہمیشہ عرف وعادت اور عورت ومرد کی حیثیت اور مالی وسعت کے تحت مقرر کیا گیا ہے۔ چنانچہ ابن قدامہ لکھتے ہیں۔ اگر میاں بیوی میں نفقہ کی مقدار اور معیار میں اختلاف ہوجائے تو اس کا فیصلہ عرف وعادت اور عورت ومرد کی حیثیت کے مطابق کیا جائے گا

ویرجع فی تقدیر الواجب الی اجتہاد الحاکم او نائبہ ان لم یتراضیا علی شیٔ فیفرض للمرأۃ قدر کفایتہا من الخبز والادم فیفرض للموسرۃ تحت الموسر قدر حاجتہا من ارفع خبز البلد الذی یاکلہ امثالہا وللمعسرۃ تحت المعسر قدر کفایتہا من ادنی خبز البلد وللمتوسطۃ تحت المتوسط من اوسطہ بفعل احد علی

اور مرد وعورت میں نفقہ کے بارے میں اختلاف ہوجائے تو واجب نفقہ کی تعیین حاکم یا اس کے نائب کی صواب دید پر ہے تو وہ مقرر کرے گا عورت کو اتنا نفقہ دیگا جس سے اس کی ضروریات پوری ہوجائیں تو اگر کھاتے گھر کی عورت ہے تو اس مقام میں جو بہترین روٹی سالن اس جیسی عورتیں کھاتی ہیں وہ اسے ملے گا، اور اگر وہ غریب گھر کی ہے اور شوہر بھی غریب ہے، تو اسے عام روٹی کھانا ملے گا، اور اگر متوسط طبقہ کی ہے تو اسی معیار سے اسے نفقہ ملے گا۔ گویا سب کے حسب حیثیت نفقہ

حسب حاله علی ما جرت به العادة فی حق امثاله وکذلک الادم وللمتوسطة تحت الموسر قدر حاجتها من ارفع الادم من اللحم والارز واللبن ومایطبخ به اللحم والدهن علی اختلاف المواضع فی بلد انه السمن فی موضع والزیت فی آخر والشیرج فی آخر وللمعسرة تحت المعسر من الادم ادونه کالباقلا والخل والبقل والکامخ وماجرت به عادة امثالهم ومایحتاج الیه من الدهن وللمتوسطة تحت المتوسط اوسط ذالک من الخبز والادم کل علی حسب عادته (المغنی ج، ص ۵۶۶)

ملے گا۔ اسی طرح سالن میں بھی اس معیار کا خیال رکھا جائے گا۔ مثلاً اعلیٰ قسم کی عورت گوشت، چاول، دودھ اور مسالہ وغیرہ اسی طرح گھی اور تیل مختلف مقامات کے لحاظ سے اس کی قسم مقرر ہوگی۔ ایک جگہ روٹی سالن کے ساتھ گھی دیا جائے گا، دوسری جگہ تیل۔ تیسری جگہ تل کا تیل۔ اسی طرح ترکاری وغیرہ کا معاملہ ہے۔ عورت کی حیثیت کے مطابق یہ چیزیں ملیں گی۔

... ...

... ...

... ...

... ...

... ...

... ...

ظاہر ہے جب اس زمانہ میں لوگوں کے قوی کمزور ہو گئے ہیں اور بے شمار قسم کی بیماریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اور دوا علاج ایک لازمۂ حیات بن چکا ہے۔ تو اب عرف و عادت کے بدل جانے کی وجہ سے نفقہ واجبہ میں دوا علاج کو شامل کرنا چاہئے۔ فقہاء نے یہ اصول مقرر کر دیا ہے۔

اذا تغیر الزمان تغیر الاحکام واذا ضاق الامر اتسع

اوپر علامہ ابن عابدین کی رائے نقل کی جا چکی ہے کہ وہ زچگی کے خرچ کو لازماً شوہر کا حق سمجھتے ہیں اس لئے کہ اس کا تعلق اولاد سے ہے اور اولاد کے خرچ کی ساری ذمہ داری باپ پر ہے جو نفقہ کے وجوب کا ایک سبب عورت سے استمتاع یعنی نفسانی خواہشات کا پورا کرنا بھی ہے تو پھر [illegible]

مریض ہو جائے تو کیا یہ دونوں مقصد یعنی بچہ کی پرورش و استمتاع فوت نہیں ہو جائیں گے؟ اگر اس کا علاج شوہر نہ کرے اور مرض طول پکڑ جائے تو پھر نہ شوہر اس سے استمتاع کر سکتا ہے اور نہ اولاد پیدا ہو سکتی ہے اور جو اولاد موجود ہیں نہ ان کی پرورش اچھی طرح ہو سکتی ہے۔

ان وجوہ کی بنا پر دوا علاج ہی نہیں بلکہ نفقہ میں اس کی صحت قائم رکھنے والی ہر چیز شوہر پر واجب ہونی چاہیے۔ البتہ سوال کرنے والوں کی یہ غلطی کہ عورت ایسی صورت میں میکہ جائے یا قرض لے یا بھیک مانگے تو اسلامی شریعت میں عورت کو بالکل قلاش اور بے سہارا تصور کرنا صحیح نہیں ہے، اسے قلاش اور بے سہارا ہماری سوسائٹی نے بنا دیا ہے۔ ورنہ اسلامی شریعت میں وہ باپ سے ترکہ پاتی ہے، ماں سے ترکہ پاتی ہے، شوہر سے مہر اور ترکہ پاتی ہے، اسی طرح بعض صورتوں میں بھائی بہن سے ترکہ پاتی ہے۔ غرض یہ کہ وہ ہر چیز میں شوہر کی دست نگر نہیں ہے۔ پھر اس کی ضروریات کے لئے جو خرچ شوہر کی طرف سے ملتا ہے، اس میں وہ اگر پس انداز کر لیتی ہے تو وہ بھی اس کی ملکیت ہے۔

غرض یہ کہ اسلامی شریعت میں عورت اور مرد کو جو مساویانہ حیثیت حاصل ہے اس کے پیش نظر ہمارے فقہا نے دونوں کے قانونی حقوق میں یہ حد فاصل قائم کی ہے۔ ورنہ تبرعاً اور اخلاقاً ہر ضرورت کو پورا کرنا وہ بھی شوہر کی ذمہ داری سمجھتے ہیں، یہ سب قرآن کی اس ہدایت کے تحت ہے " وَعَاشِرُوهُنَّ بالمعروف" عورتوں کے ساتھ بہترین سلوک کرو۔

والله اعلم بالصواب

بقیہ معہد تدریب الدعاۃ

جیتی جاگتی تصویر ہوگا۔ دعوت اسلامی کے اندر یہ پہلو جیسا کہ امیر منطقہ کہ نے بھی ارشاد فرمایا اور جیسا کہ تبلیغی اور دعوتی منطق بھی ہے، انتہائی مخلص، نتیجہ خیز اور انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔

ہم جامعۃ الرشاد۔ اعظم گڈھ یوپی کے منتظمین، اساتذہ، طلبہ اور ہندوستان کے مسلم باشندگان بھی، رابطہ عالم اسلامی کے اس عظیم اور بروقت منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے پر دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں، اور بدرگاہ رب العزت دعا گو ہیں کہ وہ اس کو کامیاب سے ہمکنار فرمائے۔ اور اس کے ذریعہ اس آب حیات کو عام کرنے کی سبیل پیدا کرے جس کے لئے تمام انسانیت کے سینوں میں طلب اور تڑپ بالفعل پیدا ہو چکی ہے۔۔

کوائف جامعۃ الرشاد

بحمد اللہ جامعۃ الرشاد کا تعلیمی معیار ہمیشہ اچھا رہا، مگر درمیان میں کچھ برسوں بعض اسباب کی بنا پر اس کا تعلیمی نظام کچھ کمزور ہو گیا تھا، مگر خدا کے فضل سے اب لائق اساتذہ کے مل جانے کی وجہ سے اس کا پچھلا معیار نہ صرف قائم ہو گیا ہے، بلکہ اس نے اس میں مزید اضافہ کر لیا ہے، اب عربی درجات کی تعلیم عالمیت سے بڑھا کر فضیلت تک کر دی گئی ہے، اس سال دارالاقامہ کے کچھ نئے کمرے بن جانے کے باوجود طلبہ کی کثرت کی وجہ سے موجودہ عمارت ناکافی ہو رہی ہے۔ جس کی طرف اہل خیر حضرات کو توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

الرشاد میں اس سے پہلے ذکر آچکا ہے کہ دارالافتار کی طرف سے کئی سو قیمتی کتابیں ادارہ کو موصول ہو چکی ہیں۔ یہ بھی ذکر آچکا ہے کہ برادرم مولانا تقی الدین صاحب ندوی نے مدرسہ کے لئے "المعجم المفہرس" کے فراہم کرنے کا وعدہ کر لیا تھا ہم ان کے مشکور ہیں کہ انہوں نے اپنا وعدہ پورا کر دیا، اور وہ کتاب مولانا نعیم صاحب ندوی صدیقی کے ذریعہ مدرسہ کو پہنچ گئی۔ بحمد اللہ اب جامعۃ الرشاد کا کتب خانہ ضلع کے قابل ذکر کتب خانوں میں ہو گیا ہے۔

ہم خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ الرشاد پونے دو سال سے مسلسل نکل رہا ہے، گو اب تک مالی اعتبار سے پرچہ خسارہ پر چل رہا ہے۔ مگر اس کے معیار میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ اور اس کی اشاعت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ خریداری میں مزید دو سو کے اضافہ کے بعد امید ہے کہ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائیگا اس سلسلہ میں مدرسہ کے نمائندہ جناب عتیق احمد صاحب مختلف ضلعوں کا دورہ کر رہے ہیں، اور علمی اور دینی

اور کئی ہندوستان کا دورہ وہ شروع کریں گے۔ ہم اپنے ہمدردوں سے جو بحمد اللہ پورے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ امید کرتے ہیں کہ وہ ان کا پورا تعاون کریں گے۔ ناظرین الرشاد کو یہ خوشخبری دیتے ہوئے بھی خوشی محسوس کر رہے ہیں کہ الرشاد کا عربی ایڈیشن بھی جلد ہی منظر عام پر آجائے گا۔ فی الحال یہ سہ ماہی ہوگا، پھر جیسے جیسے حالات قابو میں آتے رہیں گے۔ یہ ماہنامہ میں تبدیل ہو جائے گا۔

مدرسہ کے ایک قدیم مخلص ہمدرد حاجی محمد یوسف صاحب دمہ سے شدید بیمار ہیں، اور اس وقت وہ بنارس میڈیکل کالج کے ہاسپٹل میں زیر علاج ہیں، ہم ناظرین سے ان کے لئے خصوصی دعا کی درخواست کرتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ بڑا سے بڑا کام کرنے کے بعد ان کو نہ یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ انھوں نے کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ اور نہ اس کے نتیجے میں کسی اعزاز کے وہ خواہاں ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے نظری طور پر تعمیر کا ان کو ایسا اچھا ذوق عطا کیا ہے کہ بڑے بڑے انجنیر بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ مدرسہ کی خوبصورت مسجد اور عمارتیں سب انہی کے ذوق تعمیر کا نتیجہ ہیں۔ جب مدرسہ کی کوئی تعمیر ہونے لگتی ہے تو باوجودیکہ وہ ایک بڑے کاروباری ہیں، سارا کام چھوڑ کر دن دن بھر اس کی نگرانی کرتے ہیں، اس بیماری میں بھی جب تک وہ صاحب فراش نہیں ہو گئے ہیں برابر تعمیری کاموں کی نگرانی کرتے رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ صحت یاب ہو کر جلد ہم لوگوں کے درمیان آجائیں، ان کی ذات مدرسہ کے لئے اور خصوصیت سے راقم الحروف کے لئے بڑی تقویت کا سبب ہے۔ مدرسہ میں جب بھی کوئی پیچیدہ مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو وہ اسے اس طرح حل کر دیتے ہیں کہ گویا وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔

معذرت

بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر پرچہ کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر ہو گئی جس کی وجہ سے وہ جنوری شمارہ میں نظر ملے۔ اس تاخیر کے لئے ہم ناظرین سے معذرت خواہ ہیں۔
ہم امید کرتے ہیں کہ ہماری ان ناگفتنی مجبوریوں کا خیال کر کے پرچہ کے انتظار میں انہیں جو تکلیف ہوئی ہے اسے معاف کریں گے ہمیں اللہ کی ذات سے امید ہے کہ انشاء اللہ آئندہ یہ صورت نہ پیدا ہوگی

نئی کتابیں

محدثین کی قوت حفظ | مولانا محمد ابوبکر غازیپوری۔ صفحات ۱۹۲۔ سائز $\frac{20}{26}$ ناشر المکتبۃ الاثریۃ قاسمی منزل سیدواڑہ غازیپور۔ قیمت بارہ[12] روپئے۔

دین کا مدار کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر ہے۔ قرآن کی لفظی و معنوی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے، مگر اس حفاظت کا کام اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام اور پوری امت کے ذریعہ لیا۔ حدیث نبوی خود قرآن کے ارشاد کے مطابق اس کی تفسیر و تبیین ہے، اس لئے حدیث نبوی کی روایت و حفاظت بھی کتاب اللہ کی معنوی حفاظت کا ایک حصہ ہے۔ مگر حدیث نبوی یعنی آپ کے پرسعادت اقوال و افعال قرآن پاک کی عملی تفسیر اور آپ کی ۶۳ سالہ زندگی کا مرقع ہیں۔ اس لئے ان کا احاطہ کرنا آسان نہیں ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو پورے دین کی حفاظت مطلوب تھی۔ اس لئے اس کی کتابت، زبانی روایت اور حفاظت کے لئے اس نے امت میں ایسے افراد پیدا کر دیئے کہ انہوں نے حدیث نبوی کی روایت و حفاظت کا ایسا کارنامہ انجام دیا۔ جس کی مثال دنیا کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ محدثین نے نہ صرف آپ کے اقوال و افعال اور تقریرات کے ایک ایک حرف کو محفوظ کر لیا ہے۔ بلکہ جن جن لوگوں نے انہیں روایت کیا ہے ان کی پوری زندگی کے حالات اور ان کے اخلاق و عادات کو بھی محفوظ کر لیا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کے ہزاروں ہزار اقوال و افعال کے ساتھ ہزاروں راویوں کی زندگی کے احوال و کوائف کو محفوظ کرنے کے لئے غیر معمولی محنت، دیانت اور تقویٰ کے ساتھ زبردست قوت حفظ کی بھی ضرورت تھی۔ مولانا محمد ابوبکر صاحب غازیپوری ہونہار ماشاء اللہ تصنیف و تالیف کا اچھا ذوق رکھتے ہیں، انہوں نے اس کتاب میں ایسے ہی افراد کے حالات اور ان کی قوت حفظ کے واقعات جمع کر دیئے ہیں، جن کی قوت حفظ نے اس سلسلے میں معجزانہ کارنامے انجام دیئے تھے۔ تعجب ہے کہ مصنف نے ابوعوانہ، عبدالرزاق، ابن ابی شیبہ، سفیان بن عیینہ، یحییٰ بن معین،

عبدالرحمن بن مہدی، علی بن المدینی استاذ بخاری۔ امام شعبہ۔ لیث بن سعد، اسد بن فرات۔ امام ترمذی وغیرہ اکابر حفاظ حدیث کو کیسے چھوڑ دیا۔ اسی طرح بعد کے لوگوں میں حافظ ابن قیم اور حافظ ابن کثیر وغیرہ بھی اسی فہرست میں لئے جانے کے قابل تھے۔ آخری دور میں ندوہ کے سابق شیخ الحدیث مولانا شاہ حلیم عطا صاحب رحمۃ اللہ علیہ انہی لوگوں میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں۔ جو صرف یہی نہیں کہ بہترین حافظ قرآن تھے بلکہ ان کے حافظہ میں حدیث و رجال کی کتابیں اس طرح مستحضر رہتی تھیں کہ صفحہ کے صفحہ عبارت دیئے بے تکلف طلبہ کو زبانی سنا دیا کرتے تھے، اسی طرح ادب و تاریخ کی بیشمار عبارتیں انھیں ازبر تھیں۔ اپنی قوت حفظ ہی کی بنا پر وہ کچھ شاگردوں سے اطراف بخاری کا کام کرا رہے تھے۔ افسوس ہے کہ وہ کام پورا نہ ہو سکا۔ اور دنیا ان کے علمی مقام سے واقف نہ ہو سکی۔ بہرحال یہ کتاب اردو زبان میں اس موضوع پر ایک اچھی کتاب سامنے آئی ہے۔ جو اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے۔

دولت اور غربت اسلام کی نظر میں از مولانا جمیل احمد صاحب نذیری۔ صفحات ۱۹۲ کتابی سائز کتابت وطباعت معیاری۔ پتہ: مکتبہ صداقت مبارک پور۔ قیمت ۹ روپئے۔

اس وقت دنیا سرمایہ داری اور کمیونزم کے تحت دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے، اور دونوں کا دعوی ہے کہ غربت دور کرکے انسان کو معاشی مساوات کی سطح تک لے آنا چاہتے ہیں، مگر ابھی تک نہ تو سرمایہ دارانہ نظام اس میں کامیاب ہو سکا ہے اور نہ کمیونزم۔ اسلام نے معاشی مساوات کا غیر فطری نعرہ نہیں دیا ہے۔ بلکہ اس نے معاشی انصاف کا فطری اصول پیش کیا ہے۔ معاشی انصاف کیلئے ضروری ہے کہ انسان کے اندر پہلے اخلاقی حس پیدا کیجائے۔ پھر اس کے بعد اس کے سامنے غربت و دولت کی اصل حیثیت واضح کی جائے۔ مولانا جمیل احمد صاحب نے اس کتاب میں دولت اور غربت کی اسی حیثیت کو واضح کیا ہے، اور دولت وغربت کے سلسلہ میں عام طور پر جتنے سوالات ابھرتے ہیں، انہوں نے سب کا قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ آخر میں مسلمانوں کا اصل مسئلہ" کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ کتاب کا سب سے اہم باب ہے۔

مصنف نے دولت وغربت کا جو اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا ہے، اگر اس کی کچھ عملی مثالیں دے کر اس کے نتائج کا ذکر کر دیتے تو کتاب کی افادیت اور زیادہ بڑھ جاتی۔ صفحہ ۹۳ پر ان ملاکے

بارے میں جو دولت مندوں کے ساتھ اختلاط رکھتے ہیں، مصنف نے جو حدیث نقل کی ہے، اس میں لفظ امرار کا ترجمہ انہوں نے امرا یعنی دولت مند کر دیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ یہاں ظالم حکام مراد ہیں۔ پھر مطلق دولت مندوں کے ساتھ اختلاط رکھنا غلط نہیں ہے۔ بلکہ خالص دنیادار قسم کے دولت مندوں سے علمار کو دور رہنا مناسب ہے، ورنہ مطلق دولت سے گریز کی بات کی جائے تو پھر بہت سے صحابہ اور اسلاف بھی جو صاحب ثروت تھے اس عموم میں آجائیں گے۔ بہرحال اس موضوع پر اردو میں غالباً یہ پہلی کتاب ہے۔ یہ کتاب ہر مسلمان کے مطالعہ کے لائق ہے۔

(۱) طلاق کے استعمال کا طریقہ	(۱) مولانا ضمیر احمد رحمانی	پتہ:۔ ناظم دار الاشاعت
(۲) دینی مدارس میں صنعتی تعلیم کا مسئلہ	(۲) مولانا محمد ولی رحمانی	رحمانی۔ مونگیر۔ بہار

یہ دونوں کتابچے مدرسہ رحمانیہ کے دو فضلار کے مرتب کردہ ہیں۔ پہلے رسالہ میں طلاق کے استعمال کا طریقہ بتانے کے ساتھ میاں بیوی کے حقوق و فرائض پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے مصنف نے بڑے سادہ اور موثر انداز میں اس مسئلہ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ طلاق کے سلسلہ میں مسلمان معاشرہ میں جو بے احتیاطیاں اور زیادتیاں ہو رہی ہیں ان کی اصلاح کے سلسلہ میں یہ رسالہ یقیناً مفید ثابت ہوگا۔

دوسرا رسالہ دینی مدارس میں صنعتی تعلیم کا مسئلہ ہے۔ عربی مدارس کے سلسلہ میں کچھ دنوں سے یہ بات بار بار دہرائی جا رہی ہے کہ ہر مدرسہ میں ایک صنعتی شعبہ بھی قائم ہونا چاہئے۔ تاکہ فراغت کے بعد طلبہ اس قابل ہو سکیں کہ وہ اپنی حلال روزی آسانی سے کما سکیں۔ مولانا محمد ولی رحمانی صاحب نے اس مسئلہ کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے نزدیک علم دین کے طالب علموں کے لئے نہ تو یہ مفید ہے اور نہ اس کی ضرورت ہے۔ البتہ جزئی طور پر یہ کام کیا جا سکتا ہے۔

عربی درسگاہوں میں جو طلبہ آتے ہیں عموماً وہ تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک کھاتے پیتے گھرانوں کے بچے، دوسرے غریب گھرانوں کے بچے، ان میں کچھ طلبہ اعلیٰ ذہن کے ہوتے ہیں اور کچھ متوسط یا اس سے کم درجہ کے۔

جہاں تک پہلی قسم کے طلبہ کی معاشی زندگی کا معاملہ ہے تو ان کے بارے میں کچھ زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح غریب طلبہ میں جو اعلیٰ ذہن کے طلبہ ہوتے ہیں، علم دین کے لئے بڑا مفید ہو سکتے

ہیں۔ اس لئے ان کے ذہن کو ہم اس طرح تیار کریں کہ وہ معاش سے بے نیاز ہو کر اپنی پوری زندگی علم دین کی راہ میں لگا سکیں، رہی تیسری قسم تو سب سے زیادہ تعداد انہی طلبہ کی ہوتی ہے۔ ان کے لئے پورے عربی نصاب کی تکمیل کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ رحمانی صاحب نے خود لکھا ہے۔ بلکہ اوسط درجہ کی تعلیم کے بعد ان کے لئے مدرسہ کی طرف سے کوئی کام مثلاً کتابت، جلد سازی، موم بتی سازی وغیرہ سکھلا دیا جائے تو بہت مناسب ہے۔ اسی زمرہ میں حفظ کے لڑکے بھی آتے ہیں۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اکابر صحابہ اور اصحاب صفہ کو معاشی جد وجہد سے دور رکھا، مگر بعض صحابہ کے لئے آپ نے کلہاڑی میں اپنے دست مبارک سے بینٹ بھی لگایا۔

راقم الحروف کو اس بات سے پورا اتفاق ہے کہ عربی مدارس کا اصل مقصد علم نبوت کا تحفظ ہے مگر اس مقصد کے لئے صرف کتابی تعلیم کافی نہیں ہے، بلکہ صحیح عملی تربیت کی شدید ضرورت ہے جس کی طرف عام طور پر توجہ نہیں کی جاتی جتنی کہ طلبہ کی کثرت، مدرسہ کی عمارت اور اس کی دوسری کمیات پر توجہ دی جاتی ہے۔ اسی وجہ سے مدرسوں سے جو طلبہ نکلتے ہیں تو وہ کچھ پڑھے لکھے تو ہو جاتے ہیں اور کھا کما بھی لیتے ہیں، مگر مدرسہ کا اصل مقصد ان سے پورا نہیں ہو پاتا۔ اس لئے مدرسہ کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ ان کو آخرت طلب بنایا جائے۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک یہ چیز منتظمین اور اساتذہ میں نمایاں طور پر نہ موجود ہو۔ بہر حال یہ رسالہ ہر لحاظ سے مفید ہے۔

رسالہ جامعہ کا اسلم جیراجپوری نمبر	ضیاء الحسن فاروقی۔ صفحات ۱۸۴۔ قیمت: ۶ روپئے پتہ: رسالہ جامعہ، جامعہ نگر نئی دلی ۲۵-۱۱۰۰

مولانا اسلم جیراج پوری مرحوم عربی، فارسی کے ذی استعداد عالم اور ممتاز صاحب قلم تھے، وہ یوں تو متعدد اداروں سے وابستہ رہے، مگر ان کی علمی زندگی کا بیشتر حصہ جامعہ ملیہ میں گذرا اور وہاں انھوں نے درس و تدریس کے ساتھ تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی جاری رکھا۔ انہوں نے تقریباً دو درجن کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں سب سے اہم کتاب "تاریخ الامت" ہے جو ۸ جلدوں میں ہے۔ رسالہ جامعہ کے اس نمبر میں مولانا کے حالات زندگی اور ان کے علمی و تدریسی کاموں کی بھی پوری تفصیل آگئی ہے اس میں بارہ ممتاز اہل قلم مولانا کے کارناموں اور ان کی زندگی کے بارے میں واقعات اور تاثرات پیش کئے ہیں، اس میں ایک مضمون خود مولانا کے قلم سے بھی "میری طالب علمی" کے عنوان سے ہے جس

باقی ص ۹۶

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کا ترجمان
ماہنامہ
الرشاد
مرتبہ
مجیب اللہ ندوی

سالانہ چندہ
ممالک غیر سے
بارہ ڈالر امریکی
ہند ۱۲/=

جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ کا ترجمان
ماہنامہ
مجلہ جامعۃ الرشاد

سالانہ چندہ
ہندوستان ۲۴/=
چندہ ششماہی ۱۲/=
قیمت فی پرچہ 2/50

شمارہ نمبر ۱۲
بابت دسمبر ۱۹۸۲ء مطابق ربیع الاول ۱۴۰۳ھ
جلد نمبر ۲

فہرست مضامین

مجلس ادارت

(۱) مجیب اللہ ندوی (مرتب) (۲) ڈاکٹر مولانا حافظ محمد نعیم صاحب صدیقی ندوی عالی تیم ابجی
(۳) ڈاکٹر پروفیسر بشیر الحق جامعہ ملیہ نئی دہلی (۴) مولانا عطاء احمد صاحب بیت المعارف الٰہ آباد
(۵) ایم۔ اے رشادی۔ پرچہ کی ترتیب و اشاعت کے ذمہ دار مولوی عقیل احمد رشادی ندوی ہیں

مجلہ کے مضامین و معلومات کے مولوی حکیم اللہ اشاعت کے ذمہ دار ہیں۔

پچھلے شمارہ میں راقم الحروف نے تقسیم ہند کے ناگوار واقعہ کا مختصراً ذکر کیا تھا، آج اسی سلسلہ کی چند اور گذری بسری باتوں کا تذکرہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، تقسیم ہند کے وقت پنجاب دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، مغربی حصہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور مشرقی حصہ میں ہندوؤں اور سکھوں کی پچھلے بیس پچیس برس سے ہندو مسلم کشمکش کے نتیجہ میں مغربی حصہ میں مسلمانوں کا یہ ذہن بننا ایک لازمی بات تھی کہ یہ حصہ ہندوؤں اور سکھوں سے خالی ہو جائے اور مشرقی حصہ میں ہندوؤں اور سکھوں کا یہ ذہن بننا بھی فطری بات تھی کہ اس حصہ کے مسلمانوں کو پاکستان چلا جانا چاہئے. اگر بات صرف اسی حد تک رہتی کہ دونوں قوموں کا پرامن طریقے پر تبادلۂ آبادی ہو جائے تو چنداں مضائقہ نہیں تھا، مگر یہ نہیں ہوا بلکہ دونوں طرف انتقامی جذبات اتنے مشتعل تھے کہ ایک دوسرے کا گلا کاٹ ڈالنے سے کم پر کوئی فریق راضی ہی نہ تھا، چنانچہ قتل و خونریزی کا ایسا بازار گرم ہوا کہ الامان والحفیظ اس صورت حال میں جو ہندو اور سکھ پاکستان سے ہندوستان کے جس حصے میں پہونچے وہاں بھی انتقامی جذبات بھڑک اٹھے، اسی طرح جو لٹے پٹے مسلمان ہندوستان سے پاکستان کے جس حصے میں پہونچے وہاں بھی جذبات مشتعل ہوئے اور اس ناحق انتقامی کارروائی میں دونوں فریقوں نے انسانیت کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی۔ پاکستان میں یہ اشتعال پنجاب تک محدود تھا مگر ہندوستان میں یہ انتقامی کارروائی صرف پنجاب تک محدود نہیں تھی بلکہ یہ پورے شمالی ہندوستان میں پھیلی، خاص طور پر دلی اور اس کے پاس کے ناکردہ گناہ مسلمانوں پر اس کی زد سب سے زیادہ پڑی، جن لوگوں نے ان واقعات کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہے وہ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہندوستان کے مسلمانوں پر کیا قیامت گذر گئی

اس وقت پورے شمالی ہندوستان کا شاید ہی کوئی شہر، قصبہ بلکہ گاؤں ایسا رہا ہوگا جہاں کے مسلمانوں میں سراسیمگی اور جان و مال اور عزت و آبرو کی طرف سے بے اطمینانی نہ پیدا ہو گئی ہو

مسلمانوں کے جتنے سورما اور سیاسی لیڈر تھے وہ ایک ایک کرکے پاکستان منتقل ہونے لگے، خلیق الزماں مرحوم جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ تقسیم کی تحریک کے اصل بانی یہی تھے، اور صوبہ مسلم لیگ کے صدر تھے دو دن پہلے پارلیمنٹ میں وفاداری کا اعلان کرتے ہیں، اور چپکے سے پاکستان نکل جاتے ہیں، ان کے جانے کے بعد پورے صوبہ کے مسلم لیگ کی ضلعی شاخوں نے اعلان کر دیا کہ مسلم لیگ کا دفتر بند کر دیا گیا۔

اس کس مپرسی کے عالم میں مسلمانوں کو تسلی دینے، ان کی ڈھارس بندھانے اور سب سے بڑھ کر ان میں خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے جو لوگ آگے بڑھے وہ مولوی طبقہ کے ہی لوگ تھے اور خاص طور پر جمیۃ العلماء کے وہ علماء تھے جن کا استقبال چند دن پہلے قوم کی طرف سے گالیوں اور جوتوں کے ہار سے کیا جاتا تھا اور ان کو ملت اسلامیہ ہند کا سب سے بڑا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ مولانا مدنی اور مولانا حفظ الرحمٰن رحمہما اللہ کی خدمت کو جانے دیجئے کہ ان کی پرعزیمت رائے اور جدوجہد ہی کی وجہ سے مسلمانوں کا بہت بڑا طبقہ اور دلی کا تبلیغی مرکز پاکستان منتقل ہونے سے بچ گیا۔ جیسا کہ مولانا زکریا صاحبؒ نے لکھا ہے، اور خود مولانا زکریا صاحب نے سہارنپور کو اسی کی وجہ سے نہیں چھوڑا، ان کے علاوہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولانا ابوالوفا اور مولانا قاسم شاہجہاں پوری، مولانا شاہد فاخری مرحومین اور بہت سے دوسرے علما نے اس موقع پر جس جرأت و بے خوفی کا ثبوت دیا وہ ناقابل فراموش ہے۔ اچھی طرح یاد ہے کہ تقسیم کے دو ماہ بعد بقرعید کا زمانہ قریب آگیا، بہت سے مقامات کی طرح اعظم گڑھ کے مسلمان بھی پریشان تھے کہ وہ اس مسموم فضا میں قربانی کریں یا نہ کریں، اسی زمانے میں مولانا ابوالقاسم صاحب شاہجہاں پوری یہاں آئے اور سبزی منڈی ہال میں جلسہ ہوا، جس میں مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کی تعداد شریک تھی، انہوں نے جس جرأت و بے باکی سے تقریر کی، اور ہندوؤں سے خطاب کرتے ہوئے جس صفائی سے کہا کہ اگر پاکستان بنانے کا مجرم تم ہم کو سمجھتے ہو تو ہم سے بڑے مجرم تم ہو، ہم نے نہیں بلکہ سب سے پہلے تمہارے لیڈروں نے اسے قبول کیا، اس تقریر کا اثر یہ ہوا کہ بقرعید کے ایام میں یہ محسوس نہیں ہوا کہ مسلمانوں کے اندر کوئی خوف و ہراس ہے۔

یہاں پر مجلس مشاورت اور پھر ڈاکٹر فریدی کا ذکر نہ کرنا بھی احسان ناشناسی ہوگی، مجلس مشاورت کی تشکیل میں گو جدید و قدیم دونوں طرح کے افراد تھے، مگر اس اصل روح وہ علما ہی تھے جنہوں نے پورے ہندوستان میں دورہ کرکے مسلمانوں میں خود اعتمادی کی فضا اور سیاسی بیداری پیدا کی، اور ڈاکٹر فریدی

نے اس سے آگے بڑھ کر مسلمانوں کو سیاسی میدان میں ایک اقدامی پوزیشن دینے کی کوشش کی۔ افسوس
ہے کہ ان کو [illegible] مخلص ساتھی ملے اور نہ معتد بہ تعداد میں مسلمان قوم نے ان کی آواز پر کان دھرا ورنہ
ہندوستان میں ان کی حیثیت اس سے بلند ہوتی جو اس وقت ہے۔ آزادی کے بعد علماء کی صف میں تو
بے شمار لوگ تھے جن کی قیمت نہ لگائی جا سکی اور نہ کوئی لگانے کی جرأت کر سکا۔ مگر جدید تعلیم یافتہ حلقہ
میں آزادی کے بعد ایک ڈاکٹر فریدی ہی ایسے پیدا ہوئے جن کی حق گوئی کو نہ کوئی بڑا سے بڑا آدمی روک
سکا اور نہ ان کو کوئی خرید سکا۔ ورنہ ان کو صوبہ کی کیا مرکز کی بڑی سے بڑی وزارت مل سکتی تھی، مگر انہوں
نے اپنے لئے کبھی الیکشن لڑنا بھی پسند نہیں کیا۔ گو مجلس مشاورت کی تشکیل آزادی کے بہت بعد فسادات کے رد عمل
میں ہوئی اور ڈاکٹر فریدی پر سیاسی میدان میں بے بسی کا رد عمل تھا، مگر ملت کو ان سے بہرحال فائدہ پہنچا۔

بحمد اللہ ندوہ کے زیادہ تر ممتاز علماء، اساتذہ اور طلبہ تقسیم ہند کے مخالف تھے۔ ندوہ جو شہر کی
مسلمان آبادی سے دور واقع تھا، اس وقت کے مہتمم مولانا عمران خاں صاحب ریاست بھوپال کے ہونے
کی وجہ سے ان کا کچھ میلان مسلم لیگ کی طرف تھا، مگر تقسیم ہند کے بعد انہوں نے پوری جوانمردی سے ندوہ
کے ماحول میں ایک دن بھی خوف و ہراس طاری نہیں ہونے دیا، اور اس کا اثر شہر لکھنؤ تک پہونچا، ....
دار المصنفین جو ہمیشہ سے آزادی کی تحریک کا مرکز رہا اور وہاں کانگریس کا کوئی بڑا سے بڑا لیڈر ایسا نہ تھا
جو نہ آیا ہو۔ حضرت سید صاحبؒ اپنے علمی انہماک کی وجہ سے رائے و مشورہ کی حد تک اور مولانا مسعود
عالم صاحب ندوی عملاً اس میں شریک تھے۔ تقسیم کے وقت حضرت سید صاحبؒ بھوپال میں تھے، مگر مولانا
مسعود علی ندوی کی وجہ سے یہاں عمومی فضا کانگریس اور جمعیۃ العلماء کے حق میں تھی، کچھ لوگ مسلم لیگ کے بھی
حامی تھے، مگر ان کی کوئی خاص آواز نہیں تھی، دار المصنفین مسلمان آبادی سے دور واقع ہے، اسی لئے کئی
بار لوٹ مار کا خدشہ پیدا ہوا، کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ ہم لوگ اسے کچھ دنوں کے لئے خالی کر دیں مگر مولانا
مسعود علی صاحب اس پر راضی نہ ہوئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہر کے عام مسلمانوں کی بھی ڈھارس بندھی۔
آزادی کے بعد مسلمانوں کو سہارا دینے کے لئے جتنی تحریکیں اٹھیں، بحمد اللہ ان سب میں علمائے ندوہ شریک
رہے اور شریک ہیں۔
راقم الحروف طالب علمی کے زمانے ہی سے ندوہ کے عام طلبہ کی طرح تحریک آزادی میں کانگریس کا حامی رہا، اس کی پوری تفصیل

اس نے ایک مضمون "ہم اور ہماری کانگریست" کے عنوان سے لکھ دی ہے جو قومی آواز میں آج سے چند برس پہلے شائع ہو چکا ہے۔ یہاں ایک چھوٹے سے واقعہ کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

میرے بڑے سگے بھائی محمد بسم اللہ مرحوم مسلم لیگ کے بڑے حامی تھے۔ تقسیم کے وقت وہ دہرہ دون میں محکمہ جنگلات میں ملازم تھے، وہیں سے اپنے بال بچوں اور والدین کو اطلاع دیئے بغیر پاکستان چلے گئے، میرے اور ابت سے دوری اعزہ کے علاوہ میرے بڑے اور چھوٹے بستی بھائی مولانا عزیز تھا اور محمد زبیر اور میرے ہم زلف مولانا فضیل صاحب یہ سب لوگ بھی پاکستان چلے گئے، اور مجھے برابر پاکستان جانے کی ترغیب دیتے رہے، میں کوئی نہ کوئی عذر کر دیتا تھا۔ ایک بار ایک ساتھ میرے بھائی اور کئی اعزہ نے خط لکھا کہ یہاں تصنیف و تالیف کے نئے نئے ادارے کھل رہے ہیں، آپ کے لئے بڑے مواقع ہیں، آپ فوراً بال بچوں سمیت چلے آئیں، جواب آنے کے بعد سارے انتظامات کر دیئے جائیں گے، میں نے خط پڑھا تو بڑی ناگواری ہوئی، ایک تو پاکستان جانے کے لئے طبیعت کبھی آمادہ نہیں ہوتی تھی، دوسرے یہاں کے حالات کے پیش نظر کچھ خود غرضی اور بے غیرتی سی محسوس ہوتی تھی، میں نے دو تین دن غور کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ایسا خط لکھوں کہ پھر یہ حضرات مجھے پاکستان آنے کی دعوت نہ دیں۔ میں نے جواباً لکھا کہ اگر خدانخواستہ کبھی یہ فیصلہ ہو جائے کہ ہندوستان کے سارے مسلمانوں کو پاکستان منتقل ہو جانا لازمی ہے تو مجیب اللہ آخری مسلمان ہوگا جو ہندوستان کی سرحد پار کرے گا۔ اس خط کے بعد پھر ان حضرات نے مجھے بلانے کی جرأت نہیں کی، میرے کچھ اعزہ مشرقی پاکستان میں تھے ان کے گھر کی عورتیں ایک بار آئیں۔ تو ہمارے گھر کی عورتوں سے کہتی تھیں کہ اس جہنم میں تم لوگ کیا پڑی ہو چلو پاکستان کی جنت میں چلو۔ ہم لوگ تو بہر حال اس جہنم میں باقی ہیں، مگر ان لوگوں کی جنت چند برس کے بعد ہی چھن گئی، اس کا ذکر صرف اس لئے کر دیا گیا ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مولویوں نے بھی محض مادی منفعت کی خاطر اس سرزمین کو نہیں چھوڑا۔

آزادی کے بعد سب سے پہلے اردو زبان کو دیس نکالا ملا، مسلم پرسنل لا کے لئے خطرہ پیدا کیا گیا، ابتدائی دینی تعلیم کے نظام کو درہم برہم کرنے کے لئے مختلف تدبیریں کی گئیں۔ فسادات کے ذریعہ مسلمانوں کو جانی و مالی نقصان پہنچائے اور ان کی خود اعتمادی کو مجروح کرنے کی کوشش کی گئی، ان ساری مشکلات سے کے حل کے لئے انصاف سے بتایا جائے کہ سب سے زیادہ کن لوگوں نے کوشش کی۔ اردو زبان ہی کو لیجئے۔ کیا اس وقت اردو زبان گورنمنٹ کے قائم کردہ اکاڈمیوں کے ذریعہ زندہ ہے یا یونیورسٹیوں اور کالجوں میں

شعبۂ اردو کھول دینے سے زندہ ہے؟ اردو زبان زندہ ہے علما کے قائم کردہ ہزاروں عربی مدرسوں اور
لاکھوں ابتدائی دینی تعلیم کے مکاتب سے جن میں اردو زبان کے ذریعہ تعلیم دی جاتی ہے۔ اردو زبان زندہ
ہے جمعیۃ العلماء، جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت کے لٹریچر سے اور علما کے وعظ و تقریر کے جلسوں سے
جن کی آواز خواص ہی تک نہیں بلکہ مسلمان عوام کے کانوں تک بھی پہنچتی ہے، پھر اردو زبان کی زندگی ان
کے ذریعہ صرف بات چیت تک محدود نہیں رہی اس لئے کہ اس میں تو اردو نہ جاننے والے بھی شریک
ہیں، ہماری مراد لکھنے، پڑھنے، خط و کتابت کرنے اور مادری زبان کی حیثیت سے اسے باقی رکھنے سے ہے،
اسی طرح ابتدائی دینی تعلیم کو ختم کرنے کے لئے جو کوششیں کی گئی ہیں وہ بھی پورے طور پر انہی مدارس اور ابتدائی
تعلیم کے مکاتب کی وجہ سے کامیاب نہیں ہونے پائیں۔

اسی طرح مسلم پرسنل لا کے مسئلہ کو لیجئے، اس سلسلہ میں اچھی بری کوشش مسلم پرسنل لا بورڈ کر رہا ہے
جس کا ڈھانچہ علما نے تیار کیا ہے، اسی طرح فسادات کا مداوا جو کچھ کر رہی ہیں وہ دینی جماعتیں کر رہی ہیں،
اور امارت شرعیہ بہار نے تو اس سلسلہ میں تاریخ ساز کام کیا ہے

ہندوستان کے علما کی یہ استقامت اور عزیمت کوئی نئی چیز نہیں تھی بلکہ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۹۴۷ء
تک ان کی تاریخ نہ جانے کتنے سرفروشانہ اور پر عزیمت واقعات سے پُر ہے۔ مسلم قوم نے اپنے کسی اجتماعی
فیصلہ کے وقت علما کو کبھی اہمیت نہیں دی بلکہ وہ ہمیشہ سیاسی بازیگروں کے ہاتھ کا کھلونا بنی رہی۔ یا
جذباتی نعروں کا شکار رہی۔ مگر اس کے باوجود علما نے جو کبھی مسلم قوم کے دکھ درد سے بے پروائی نہیں کی
اور نہ کسی سخت وقت میں ان کو بے یار و مددگار چھوڑا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اپنی بہت سی کوتاہیوں کے
باوجود انہوں نے اپنی جدوجہد للہ فی اللہ رکھا اور اسے مادی نقصان و فائدہ کی ترازو میں انہوں نے کبھی
نہیں تولا اور نہ محض سیاسی برتری کے لئے کسی کام کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ بلکہ وہ "بے خطر کود پڑا آتش
نمرود میں عشق" کے مصداق بنے رہے۔ یہ تفصیل اس لئے کی گئی ہے کہ علما یہ سوچیں کہ ان کی وہ کمی
کیا ہے جس کی وجہ سے مسلم قوم اپنے کسی اجتماعی فیصلہ کے وقت ان کی خدمات کو نظر انداز کر دیتی ہے، اور
سے مسلم قوم کے اندر بھی اپنے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز پیدا کرنے کا احساس پیدا ہو جائے، جو ایک
بڑی نیک فالی کی بات ہوگی۔

عورتوں کے فرائض اور مردوں کے حقوق

(مجیب اللہ ندوی)

اس سے پہلے مردوں کے فرائض اور عورتوں کے حقوق کی تفصیل کی گئی تھی اب عورتوں کے فرائض اور مردوں کے حقوق کی تفصیل کی جاتی ہے۔

اسلامی شریعت نے عورتوں کے فرائض یا ان کے اوپر مردوں کے حقوق مندرجہ ذیل مقرر کئے ہیں

۱۔ بیوی کا سب سے پہلا فرض یہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی عصمت وعفت کی حفاظت کرے، عصمت وعفت کی حفاظت میں صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ اپنی آبرو کی حفاظت کرے، بلکہ جو چیزیں .... ؛ اس کی آبرو کو کسی درجہ میں داغدار بناتی ہوں وہ ان کا ارتکاب بھی نہ کرے، مثلاً پردہ کرے، کسی نامحرم مرد سے بلا ضرورت بات چیت نہ کرے۔ شوہر کے علاوہ کسی محرم کے سامنے بھی چہرہ اور ہاتھ کے علاوہ سر، سینہ اور دوسرے اعضا کو کھلا نہ رکھے، بغیر اجازت گھر سے باہر نہ جائے، قرآن پاک میں عورتوں کے بارے میں کہا گیا ہے۔

حَافِظَاتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ

نیک عورتیں وہ ہیں جو شوہر کی غیر موجودگی میں اللہ کی توفیق سے اپنی عفت و آبرو اور شوہر کی ہر چیز کی حفاظت کرتی ہیں۔

۲۔ عورت کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کے مال کی حفاظت کرے، اوپر جو آیت نقل کی گئی ہے اس میں عزت و آبرو کی حفاظت کے ساتھ مال کی حفاظت بھی شامل ہے، حدیث نبوی میں بھی عصمت وعفت کی حفاظت اور مال کی حفاظت دونوں کے بارے میں سخت تاکید آئی ہے،

آپؐ نے ایک صالح عورت کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

ولا تخالفہ فی نفسہا ومالہ بما یکرہ۔ (نسائی وبیہقی) — جس چیز کو شوہر اس کے نفس اور اپنے مال کے بارے میں ناپسند کرتا ہے، اس کے خلاف وہ نہ کرے۔

آپ نے فرمایا کہ جو شخص چار چیزیں پا جائے وہ دنیا کی سب سے بڑی دولت پا گیا۔ ایک شکر گذار قلب، دوسرے اللہ کو یاد کرنے والی زبان، تیسرے ایسا جسم جو آزمائش کے وقت صابر ہو، چوتھے زوجۃ لا تبغیہ خونا فی نفسہا ولا فی مالہ (بیہقی فی شعب الایمان) ایسی عورت جو اپنے نفس (عزت و آبرو) اور شوہر کے مال میں خیانت نہ کرے۔

مال کی حفاظت یہ بھی ہے کہ گھر کی کوئی چیز شوہر کی اجازت کے بغیر کسی کو نہ دے، حتیٰ کہ اگر وہ کوئی چیز اس کی اجازت کے بغیر صدقہ کر دے، تو اس کا ثواب شوہر کو اور عذاب عورت کو ہوگا اور شوہر کو اس سے باز پرس کرنے اور اس چیز کو یا اس کی قیمت کو واپس لینے کا حق ہوگا۔

۳۔ عورت کا تیسرا فرض یہ ہے کہ عورت ہر نیک کام اور حق بات میں شوہر کی اطاعت کرے، قرآن میں ہے:

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ (نساء) — نیک عورتیں وہ ہیں جو فرماں بردار ہوتی ہیں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تقویٰ کے بعد آدمی کے لئے اللہ کی سب سے بڑی نعمت صالح عورت ہے۔ اور صالح عورت وہ ہے کہ شوہر جو اس سے کہے اسے وہ مانے، اور جب اس کی طرف دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے، اور اگر شوہر قسم کھا کر اس کے اعتماد پر کوئی بات کہہ دے تو اسے وہ پورا کر دے، اور جب وہ گھر میں نہ ہو تو اپنے نفس کی اور اس کے مال کی حفاظت کرے۔

آپؐ نے فرمایا کہ جو عورت نماز روزے کی پابندی کے ساتھ اپنی عزت و عصمت کی حفاظت کرے اور شوہر کی فرمانبرداری کرے تو (اس کا مرتبہ یہ ہے کہ) وہ قیامت کے دن جنت کے جس دروازے سے چاہے اس میں چلی جائے۔ (مشکوٰۃ)

عورت کی اطاعت کی تھوڑی سی تفصیل یہ ہے

(۱) شوہر کی اطاعت میں یہ بات بھی شامل ہے کہ شوہر کی اجازت کے بغیر نہ تو اس کی نفلی روزہ

پڑھنی چاہئیں اور نہ نفل روزے رکھنا چاہئیں اور نہ فرض نماز بہت لمبی اور دیر تک پڑھنی چاہیے
حدیث میں آتا ہے کہ صفوان بن معطل کی بیوی خدمت نبوی میں آئیں، اور بولیں کہ میرے شوہر مجھے
نماز پڑھنے پر مارتے ہیں، روزہ رکھتی ہوں تو تڑوا دیتے ہیں، اور خود فجر کی نماز سورج نکلنے کے بعد
پڑھتے ہیں، اتفاق سے صفوان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں موجود تھے، آپ نے ان سے
حقیقت حال دریافت کی، تو بولے کہ ان کا یہ کہنا کہ میں مارتا ہوں تو ان کا حال یہ ہے کہ جب یہ
نماز شروع کرتی ہیں تو دو دو بڑی سورتیں ایک ایک رکعت میں پڑھتی ہیں، میں نے بار بار ان سے
منع کیا مگر یہ نہیں مانتیں، اس لئے میں اس پر ان کو مارتا ہوں، آپ نے خاتون سے فرمایا کہ اگر ایک
چھوٹی سورہ یا آیت پڑھ لی جائے تب بھی نماز ہو جاتی ہے۔ پھر صفوان نے کہا کہ ان کا یہ کہنا کہ میں
روزے تڑوا دیتا ہوں تو یہ جب نفل روزے شروع کرتی ہیں تو رکھتی ہی چلی جاتی ہیں اور میں ایک
نوجوان آدمی ہوں اپنے اوپر قابو نہیں پاتا، اس لئے ایسا کرتا ہوں، آپ نے فرمایا کہ کوئی عورت
نفل روزہ بغیر شوہر کی اجازت کے نہ رکھے، اور اپنی نماز کی تاخیر کے بارے میں یہ عذر پیش کیا کہ
ہم لوگ رات کو دیر تک محنت مزدوری کرتے ہیں اس لئے اٹھنے میں دیر ہو جاتی ہے (ابوداؤد ابن ماجہ)

(۲) عورت کتنے ہی ضروری کام میں کیوں نہ لگی ہوئی ہو جب شوہر اسے بلائے تو اس کی طرف
متوجہ ہو جانا اور اس کے پاس پہنچ جانا چاہئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

اذا دعا الرجل زوجته	اگر شوہر بیوی کو اپنی ضرورت پوری کرنے
لحاجته فلتاته وان كانت	کے لئے بلائے تو وہ فوراً اس کے پاس
على التنور (ترمذی)	چلی جائے، خواہ وہ تنور پر ہی کیوں نہ بیٹھی ہو

ضرورت سے بلانے کا مطلب ہر طرح کی ضرورت ہے مگر یہاں خاص طور پر جنسی ضرورت مراد ہے
جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے کہ یہ اطاعت محض امر حق اور بھلے کام میں ہونی چاہئے، اگر کوئی
شوہر اس کو برائی کا حکم دے یا برے کام کے لئے مجبور کرے تو اس کی اطاعت ضروری نہیں ہے، مثلاً
بے پردہ رہنے کے لئے کہے، سینما دکھانے لے جائے، دوستوں سے ملاقات کے لئے مجبور کرے، فرض
نماز یا فرض روزے سے روکے، بے حیائی کے لئے مجبور کرے، تو ایسے تمام برے کام کرنے سے
اس کو صاف صاف انکار کر دینا چاہئے۔ خواہ شوہر خوش ہو یا ناخوش، اس کے تعلقات اس سے

اچھے رہیں یا برے، کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:
لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق — خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں کرنی چاہیئے

۴۔ ضروریاتِ زندگی کی طلب میں اعتدال عورت کا یہ بھی فرض ہے کہ شوہر کی حیثیت اور اس کی آمدنی کا خیال کرکے اپنی ضروریات پوری کرائے، اوپر ذکر آچکا ہے کہ ازواج مطہرات نے تعیش و آرام کے لئے نہیں، بلکہ اپنی ضروریات کے لئے کچھ زیادہ نفقہ طلب کیا، تو ان کو سخت تنبیہ کی گئی۔ اسی بنا پر عورتوں کو بے ضرورت تزئین و آرائش سے منع کیا گیا ہے تاکہ ان میں بے جا طلب نہ پیدا ہو، عہد نبوی میں عورتیں اپنے سر کے بالوں کو خوبصورت بنانے کے لئے کچھ خارجی بال لگا لیا کرتی تھیں، اس کے بارے میں آپؐ نے فرمایا فانہ زور (نسائی) یہ ایک طرح کا جھوٹ و فریب ہے حسن میں زیادتی کر رہی ہے۔ آپ نے اسی بنا پر گدنے گدوانے اور اپنے چہرے کے روئیں صاف کرنے اس کی حد سے زیادہ تراش خراش کرنے، دانتوں کو رگڑ رگڑ کر چمکانے سے منع فرمایا ہے (مسند احمد)

اوپر ذکر آچکا ہے، ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ سب سے مبارک رشتۂ نکاح وہ ہے جس میں آدمی کو کم سے کم اخراجات کی پریشانی اٹھانی پڑے (احمد) پھر حدیث میں ایسی عورت سے نکاح کی ترغیب دی گئی ہے جو دین و اخلاق کے ساتھ کم سے کم ضروریات زندگی پر راضی ہو جائے۔

۵۔ احسان شناسی عورتوں کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ وہ احسان شناس رہیں، عورتوں کی ایک بڑی اور عام کمزوری احسان ناشناسی بھی ہے، یعنی اگر ان کے ساتھ زندگی بھر سلوک کرتے رہیئے، اور ایک دو بار ذرہ برابر بدسلوکی ہو جائے تو پھر ساری زندگی کے سلوک کو بھلا کر صرف اس کی ایک بدسلوکی کو یاد رکھیں گی، اور وقت بے وقت اس کو دہراتی رہیں گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس ناشکری کی وجہ سے عورتیں زیادہ تر دوزخ میں جائیں گی۔

آپ نے فرمایا کہ عورتیں سب سے زیادہ ناشکری کرتی ہیں یکفرن العشیرۃ وہ عورتیں اپنے شوہروں کی اور خاندان والوں کی ناشکری کرتی رہتی ہیں:

اس سے معلوم ہوا کہ عورت کو شوہر کے ساتھ احسان شناسی اور شکر گذاری کا رویہ اختیار کرنا چاہئے، یعنی وہ محنت و مزدوری کر کے جو کچھ اسے دیتا ہے اس کو خدا کا شکر ادا کر کے خندہ پیشانی سے قبول کر لینا چاہئے۔ البتہ اگر وہ اپنی حیثیت سے کم دیتا ہے، یا اپنے کھانے پینے کے پیچھے اس کی پرواہ نہیں کرتا تو اس کو بولنے کا حق ہے، اور یہ بولنا احسان ناشناسی نہیں ہوگی۔

۲۔ رضاعت

دوسرے فرائض کے ساتھ عورت کا بحیثیت ماں ایک فرض اپنے بچوں کو دودھ پلانا بھی ہے، گو بعض صورتیں ایسی بھی ہیں کہ ماں کے ذمے سے یہ فرض ہٹ جاتا ہے مگر یہ ذمے داری ہے ماں ہی کی، قرآن میں اس فرض کے احکام کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّا اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ

(سورۂ بقرہ)

اور مائیں پورے دو سال تک اپنے بچوں کو دودھ پلایا کریں یہ بات اس کے لئے ہے جو پوری مدت دودھ پلوانا چاہے اور باپ کے اوپر قاعدے کے مطابق مرضعہ ماؤں کا کھانا کپڑا ہے، ہر شخص کو اس کی برداشت کے مطابق ہی حکم دیا جاتا ہے نہ تو کسی ماں کو اس کے بچے کی وجہ سے تکلیف پہنچائی جائے اور نہ باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے، اور اگر باپ نہ ہو تو اسی طرح وارث کو کرنا چاہئے، اگر دونوں آپس کی رضامندی اور مشورے سے وقت سے پہلے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان کے اوپر کوئی گناہ نہیں ہے اور اگر تم دوسری عورت سے اپنے بچوں کو دودھ پلوانا چاہتے ہو تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے، بشرطیکہ تم حسب دستور ان کو معقول

ان آیات کی روشنی میں فقہا نے حسب ذیل احکام مستنبط کئے ہیں:

دودھ پلانا کب واجب ہے اور کب مستحب بعض صورتوں میں ماں پر دودھ پلانا واجب ہے اور بعض صورتوں میں مستحب، دونوں صورتوں کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

(۱) اگر باپ کم حیثیت ہے، تو ماں کے اوپر دودھ پلانا واجب ہے، جیساکہ قرآن کے پہلے "کرتے میں" کہا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اگر اس کو طلاق مل جائے تو عدت بھر بغیر اجرت کے اس کو دودھ پلانا چاہیے۔

(۲) اسی طرح اگر بچہ ماں کے علاوہ کسی کا دودھ نہیں پیتا تو بھی عورت پر بچے کو دودھ پلانا واجب ہے۔

واجب کا حکم جن صورتوں میں ماں کو دودھ پلانا واجب ہے، ان میں نہ تو عورت اجرت مانگ سکتی ہے، اور نہ اس خدمت سے انکار کر سکتی ہے، اگر کرے گی تو گناہ گار ہوگی، اور اس کو دودھ پلانے پر قانوناً مجبور کیا جائے گا، کیونکہ ماں اگر دودھ نہ پلائے گی تو باپ کو خواہ مخواہ ایک زحمت اٹھانی پڑے گی اور قرآن میں یہ کہا گیا ہے کہ وَلَا مَوْلُودٌ لَّهُ بِوَلَدِهِ یعنی باپ اپنے لڑکے کی وجہ سے زحمت ومشقت میں نہیں ڈالا جا سکتا۔

جن صورتوں واجب نہیں ہے ان صورتوں میں دودھ پلانا واجب نہیں ہے۔

(۱) اگر مرد مالدار ہے اور وہ کسی عورت کو اجرت پر رکھ کر دودھ پلوا سکتا ہے تو اس صورت میں اگر ماں دودھ پلانے سے انکار کرتی ہے تو اس کو اس کا حق ہے۔

(۲) اگر ماں مریض ہے، یا بہت کمزور ہے تو باپ کا فرض ہے کہ وہ ماں سے دودھ نہ پلوائے، ورنہ عورت کو نقصان پہنچے گا اور قرآن میں اس سے منع کیا گیا ہے لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا، ماں اپنے بچے کی وجہ سے کسی مشقت میں نہیں ڈالی جا سکتی۔

جس صورت میں ماں دودھ پلانے سے معذور ہے، یا معذور تو نہیں ہے مگر باپ باحیثیت ہے، اور وہ دودھ نہیں پلاتی ہے تو اس صورت میں نہ تو وہ گنہگار ہوگی، اور نہ باپ اس کو دودھ پلانے پر مجبور کر سکتا ہے۔ نہ عورت پر قانونی دباؤ ڈالا جا سکتا ہے، لیکن ماں کو جب کوئی مرض یا مجبوری نہیں ہے تو صرف زحمت سے بچنے کے لئے یا شوہر کی خوشحالی سے فائدہ اٹھانے کیلئے بچے کو دودھ نہ پلانا بری بات ہے، کیونکہ یہ عورت کا فرض ہے۔ گو شوہر کی خوشحالی کی صورت میں اس پر قانوناً پابندی نہیں ہے۔ مگر یہ اچھی بات نہیں ہے کہ ماں اپنے بچے کے ساتھ اتنی محبت بھی نہ رکھے کہ اس کو اپنے دودھ تک سے بھی محروم کر دے۔ پھر اس لئے بھی ایسا نہ کرنا

چاہیئے کہ دودھ کا اثر صرف بچے کے جسم ہی پر نہیں، بلکہ اس کے اخلاق و کردار پر بھی پڑتا ہے، اس لئے وہ جس عورت کا دودھ پیئے گا ویسا ہی اس کا اخلاق و کردار ہوگا، اور اس معیار کی عورت ملنا آسان نہیں ہے۔

دیگر مسائل اگر ماں کا دودھ بچے کو نقصان کرتا ہے، یا ماں کی دینی و اخلاقی حالت اچھی نہیں ہے، تو باپ کا فرض ہے کہ وہ اس کے بجائے کسی ایسی عورت سے دودھ پلوائے، جس کا دودھ بچے کے جسم کے لئے بھی مفید ہو اور اس کے دین و اخلاق پر بھی کوئی برا اثر نہ پڑے،

(۲) بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ماں بچے کو دودھ پلانا چاہتی ہے اور اس کا دودھ بچے کی صحت کے لئے مضر بھی نہیں ہے، مگر باپ اپنی کسی جذباتی خواہش کی بنا پر ماں کو اس سے روکتا ہے تو باپ کو ایسا نہ کرنا چاہیئے۔ لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا میں اس کی ممانعت بھی ہے۔

رضاعت کی مدت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک رضاعت کی مدت ڈھائی سال ہے اور صاحبین (امام ابو یوسف اور امام محمد) کے نزدیک دو[1] برس ہے، مگر عام فقہائے احناف نے صاحبین کے مسلک پر فتویٰ دیا ہے، البتہ احتیاطاً[2] لکھا ہے کہ اگر کوئی بچہ دو برس کے بعد ڈھائی برس کے اندر بھی دودھ پیئے گا تو رضاعت ثابت ہو جائے گی۔ بشرطیکہ وہ مسلسل ڈھائی برس پیتا رہے۔

ماں باپ کا مشورہ اگر ماں باپ دونوں مشورے سے بچے کو ماں کے بجائے کسی اور سے دودھ پلوائیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْا میں اسی کی طرف اشارہ ہے، اسی طرح اگر وہ آپس کے مشورے سے دو سال پہلے ہی بچے کو دودھ چھڑا دیں تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا

رضاعت کی اجرت اگر کوئی اجنبی عورت کسی بچے کو دودھ پلاتی ہے اور اس کی اجرت مانگتی ہے تو بچے کے باپ یا ورثہ کا فرض ہے کہ وہ اس کو کھانا کپڑا یا نقد دے کر اس سے دودھ پلوائیں۔ وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّا اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ میں اسی طرف اشارہ ہے یعنی تم اگر کسی عورت سے دودھ پلوانا چاہتے ہو تو اس کو بھلے طریقے سے اس کی

---

[1] مدت رضاعت بھی دو ہی برس کے قائل ہیں۔ [2] امام صاحب نے احتیاطاً ہی ڈھائی برس مدت مقرر کی ہے۔
[3] اگر آپس کے مشورہ سے دودھ پلوانا چاہو۔

اجرت دے تو تب دودھ پلوائے۔

(۲) ماں جب تک اس شوہر کے نکاح میں ہے جس کا یہ لڑکا ہے تو اس کو نفقے کے علاوہ شوہر سے دودھ پلانے کی الگ سے اجرت مانگنے کا حق نہیں ہے۔

(۳) ایک ماں اپنے بچے کو دودھ پلا رہی تھی، مگر کسی وجہ سے شوہر نے طلاق دے دی، تو اب عدت تک عورت کو بلا کسی اجرت کے دودھ پلانا پڑے گا کیونکہ عدت بھر شوہر پر اس کا نان نفقہ واجب ہے، مگر عدت گزر جانے کے بعد وہ اجرت طلب کر سکتی ہے، اور باپ کو دینا پڑے گی۔

(۴) اگر باپ بچے کی مطلقہ ماں سے عدت کے بعد دودھ نہیں پلواتا بلکہ کسی دوسری عورت سے دودھ پلواتا ہے، تو اگر ماں اجرت طلب کرتی تھی اور دوسری عورت مفت دودھ پلا رہی ہے، تب تو باپ کو اسی عورت سے دودھ پلوانا چاہئے۔ لیکن اگر یہ عورت بھی اجرت لیتی ہے، تو اگر یہ اجرت مطلقہ ماں کی اجرت سے کم ہے، تو اس صورت میں بھی باپ دوسری عورت سے دودھ پلوا سکتا ہے، لیکن اگر دونوں کی اجرت برابر ہے، یا دوسری عورت کی اجرت زیادہ ہے تو پھر باپ کے لئے ضروری ہے کہ اس بچے کو اس کی مطلقہ ماں سے دودھ پلوائے اور اجرت دے۔

حضانت یعنی بچے کی پرورش بچے کی پرورش کرنے کو عربی میں حضانت کہتے ہیں، شوہر و بیوی کے فرائض کے سلسلہ میں دونوں کا ایک اہم فرض بچہ کی پرورش بھی ہے۔ گویہ دونوں کا مشترکہ حق ہے، یعنی بچے کی پرورش دونوں کو مل جل کر کرنا چاہیے۔ اور دودھ پلانے کے سلسلہ میں جو ماں باپ کے حقوق کی تفصیل کی گئی ہے، وہ بھی اسی حضانت ہی کی ایک شاخ ہے۔ بچے کی ابتدائی پرورش ہی پر اس کی ساری زندگی کی اچھائی اور برائی کا دارومدار ہوتا ہے، اس لئے اس فرض کے سلسلہ میں ماں باپ کو غفلت نہ کرنی چاہئے۔

بچے کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی اہمیت بچے کی پرورش کی ذمہ داری کا مطلب صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ ماں باپ اس کی جسمانی پرورش اور نشو ونما کا سامان فراہم کردیں، بلکہ اس کی جسمانی نشو ونما کے ساتھ اس کی ذہنی اور اخلاقی اصلاح اس کی تعلیم و تربیت بھی ان کے اوپر واجب ہے۔ دونوں طرح کی تربیتوں کی شریعت میں تاکید آئی ہے، خاص طور پر ان کی دینی اصلاح اور تعلیم و تربیت پر قرآن پاک میں بہت زور دیا گیا ہے

جسمانی پرورش کے احکام | قرآن پاک کے حکم کے مطابق ماں کا فرض ہے کہ بچے کو پیدا ہوتے ہی دودھ پلانا شروع کر دے، اور اگر وہ معذور ہو یا باپ کو استطاعت ہو، یا دونوں راضی ہوں، تو وہ دوسری عورت سے بھی دودھ پلوا سکتے ہیں، اگر کوئی ماں باپ ایسے ظالم ہوں کہ وہ اس فرض کو نہ انجام دیں، تو وہ سخت گنہ گار ہوں گے، اور ایسے بچے کی پرورش کی ذمہ داری اسلامی حکومت کے ذمہ ہوگی، پہلے وہ ماں باپ کو اس پر مجبور کرے گی، اگر کسی وجہ سے وہ معذور ہوں گے تو اس کا خرچ حکومت خود برداشت کرے گی۔

بچوں کی پرورش اور تربیت کے سلسلے میں لوگ عموماً لڑکیوں کے مقابلہ میں لڑکوں کا زیادہ خیال کرتے ہیں، اس لئے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر لڑکیوں کی پرورش کی تاکید کی ہے آپ نے فرمایا ہے:

من کانت لہ انثیٰ فلم یئدھا	جس کے کوئی لڑکی ہو اور اس نے اس کو
ولم یھنھا ولم یؤثر ولدہ	زندہ درگور نہیں کیا، اور لڑکوں کو اس پر
علیھا الذکور ادخلہ اللہ الجنۃ	ترجیح نہیں دی تو اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔

آپ نے فرمایا کہ جس نے اپنی تین لڑکیوں کی پرورش اور کفالت اس وقت تک کی جب تک کہ وہ اس سے بے نیاز نہیں ہو گئیں، یعنی ان کی شادی نہیں ہو گئی تو اس کے اوپر جنت واجب ہے، ایک شخص نے پوچھا کہ یا رسول اللہ یہ حکم دو لڑکیوں کا بھی ہے، آپؐ نے فرمایا کہ ہاں حضرت ابن عباس رض فرماتے ہیں، اگر کوئی ایک کے بارے میں سوال کرتا تو ایک کے بارے میں بھی آپؐ یہی فرماتے، (شرح السنۃ)

بچوں کی پرورش کی اہمیت کے پیش نظر حضرت عمر رض نے دودھ چھوڑنے کے بعد ہر بچے کا وظیفہ مقرر کر دیا تھا، بعد میں جب ان کو علم ہوا کہ مائیں وقت سے پہلے دودھ چھڑا دیتی ہیں کہ ان کو وظیفہ مل جائے تو پھر آپ نے پیدا ہوتے ہی ہر بچے کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

بچے کی پرورش کی مدت | لڑکے کی پرورش کی مدت سات برس اور لڑکی کی پرورش کی مدت نو برس ہے۔ اس مدت تک پرورش کی نگرانی ماں کے ذمے ہوگی،

اور ماں اور بچہ دونوں کا خرچ باپ کو برداشت کرنا ہوگا، اور یہ ماں کا ایسا حق ہے کہ اگر اس کو طلاق مل چکی ہو جب بھی بچے کو سات برس تک اور بچی کو نو برس تک اپنے پاس رکھ سکتی ہے اور باپ سے اس کے اخراجات لے سکتی ہے، باپ اس سے بچے کو نہیں لے سکتا۔ البتہ اگر طلاق کے بعد ماں خود خوشی سے بچے کو حوالہ کر دے تو یا وہ اجنبی جگہ نکاح کر لے تو پھر باپ کو اس کی پرورش کرنی ہوگی، اور اس کی مطلقہ ماں کو پرورش کے لئے مجبور نہیں کر سکتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک عورت آئی اور اس نے کہا " یا رسول اللہ یہ میرا بچہ ہے جو میرے پیٹ میں پلا ہے، میری چھاتی کا دودھ پیتا ہے، اور جس کے لئے میری گود آرام گاہ ہے۔ اس کے باپ نے مجھے طلاق دے دی ہے، اور میرے اس لخت جگر کو مجھ سے جدا کر لینا چاہتا ہے۔ آپ نے اس کی داستان غم سن کر فرمایا انتِ احق بہ مالم تنکحی تم اس وقت تک اس کی زیادہ مستحق ہو جب تک تم دوسرا نکاح نہ کر لو۔

(۱) اگر عورت خدانخواستہ مرتد ہو جائے، یعنی اپنا دین بدل دے، تو بچے کو اس کی پرورش اور نگرانی میں نہیں دیا جا سکتا، اسی طرح اگر وہ بداخلاق و کردار ہو یعنی اس میں ایسے اخلاقی عیوب ہوں مثلاً زنا، چوری، گانا بجانا وغیرہ، جن کی موجودگی میں بچے کے ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو تو ایسی عورت کی نگرانی اور گود میں بچے کو نہیں دیا جا سکتا، صاحب درمختار فاجرہ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یضیع الولد بہ کزنا و غناء وسرقۃ	ایسے عیوب مثلاً زنا، گانا بجانا، چوری جس سے بچہ برباد ہو جائے تو اس کی نگرانی میں بچہ نہیں دیا جا سکتا۔

پھر کہتے ہیں کہ عام طور پر " فاجرہ " کا لفظ فقہائے احناف مطلقاً لکھتے ہیں، اس سے وہ عورت بھی مراد لی جا سکتی ہے جو مستقلاً تارک نماز ہو اور یہی مسلک امام شافعیؒ کا بھی ہے۔

بعض علماء نے یضیع الولد کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے، اگر کوئی ایسی عورت ہے جو نماز روزے میں اتنی مشغول ہے کہ اپنے بچوں کی پرورش کا اس کو مطلقاً خیال نہیں ہے، تو ایسی عورت کی نگرانی میں بھی بچہ نہیں دیا جا سکتا، مگر اس سلسلہ میں فقہائے احناف نے اس رائے کو زیادہ پسند کیا ہے کہ اگر ماں کا اخلاق و کردار اچھا نہیں ہے، جب بھی اس وقت تک بچے کو اس کے پاس

رکھا جائے جب تک وہ بچہ سمجھ دار نہ ہو جائے۔ سمجھ دار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ماں کی حرکات و سکنات کا عملاً اثر نہ لینے لگے۔

ان تمام تفصیلات کا خلاصہ یہ ہوا کہ بچے کی جسمانی پرورش میں اس کی دینی اور اخلاقی تربیت کو بہر حال پیش نظر رکھا جائے گا۔

(۲) اگر ماں مطلقہ ہے اور اس نے کسی ایسے شخص سے نکاح کر لیا جس سے بچے کا کوئی ایسا نسبی تعلق نہیں ہے جس کی وجہ سے نکاح حرام ہو جاتا ہے تو اب اس کا حق پرورش جاتا رہا۔ البتہ اگر اس نے بچے کے کسی قریبی اعزہ ہی میں کسی سے نکاح کر لیا ہے۔ تو پھر اس کا حق اپنی جگہ پر باقی رہے گا۔ پہلی صورت میں اس لئے اجازت نہیں دی گئی ہے کہ اس کے موجودہ شوہر کو بچے سے کوئی خاص انسیت نہ ہوگی بلکہ وہ بار محسوس کرے گا اور اس کا اثر ماں کے اوپر یہ پڑے گا کہ وہ بچے کی نگرانی اچھی طرح نہ کر سکے گی۔ دوسری صورت میں اس لئے اجازت دی گئی ہے کہ چونکہ اس کا شوہر بھی بچے سے تعلق رکھتا ہے اور یہ تو ماں ہی ہے، اس لئے اس کی دیکھ بھال سے دونوں کو دلچسپی ہوگی۔

ماں کے بعد پرورش کا حق

(۳) ماں اگر پرورش کرنے کی اہل نہ ہو یعنی فاسقہ اور فاجرہ ہو یا اس نے انکار کر دیا ہو، یا اس نے کسی اجنبی سے نکاح کر لیا ہو تو اس کے بعد اس کی ماں یعنی بچے کی نانی کو پرورش کا حق ہے، اگر نانی نہ ہو تو پرنانی۔ اور یہ بھی نہ ہوں تو دادی کو، پھر حقیقی بہن کو پھر ماں جائی اور سوتیلی بہن کو پھر خالہ کو پھر پھوپھی کو پرورش کرنی ہوگی۔

ان میں سے جس کی پرورش میں دیا جائے گا۔ انہی شرائط کے ساتھ دیا جائے گا جن کا ذکر اوپر ہوا یعنی جس کا دین و اخلاق اچھا ہوگا اسی کو پرورش کے لئے دیا جائے گا۔ فرض کیجیے کہ بچے کی دو خالائیں ہوں یا دو پھوپھیاں ہوں، تو جو خالہ یا پھوپھی زیادہ پرہیز گار ہوگی، اسی کو پرورش کے لئے دیا جائے گا۔

باپ کے بعد خرچ کی ذمّہ داری

جب تک باپ موجود ہے، بچے کے اخراجات کی ذمے داری باپ کے اوپر ہے۔ لیکن اگر باپ مر جائے تو اگر بچے کے نام پر کوئی جائداد یا نقد روپیہ ہے تو اسی سے اس کی پرورش کا خرچ لیا جائے گا۔ اور اگر اس کے نام کوئی جائداد یا روپیہ نہیں ہے۔ تو پھر بچے کا خرچ قریبی رشتے داروں کے ذمے ہے جو اس کے وارث ہو سکتے ہیں

اور ایک پر میراث کے اعتبار سے خرچ کی ذمے داری ہوگی. مثلاً اس کا دادا ابھی زندہ ہے اور ماں بھی تو دو حصے کا خرچ دادا کو دینا پڑے گا، اور ایک حصہ ماں کو؛ اسی طرح دوسرے افراد پر اس کی ذمے داری ڈالی جائے گی۔

تعلیم و تربیت

بچے کی جسمانی پرورش اور صحت کی دیکھ بھال کے ساتھ اس کی ذہنی و اخلاقی تربیت بھی سب سے پہلے ماں اور اس کے بعد باپ کے ذمے ہے، اگر انہوں نے اس کے جسم کی پرورش کی اور اس کے باطن کی تربیت نہ کی، تو ایک طرف انہوں نے رشتۂ زوجیت کے ایک بڑے حق کی ادائگی میں کوتاہی کی، اور دوسری طرف معاشرہ میں صلاح پیدا کرنے کے بجائے فساد کا ایک مستقل بیج بو دیا. کیونکہ جس بچے کی ذہنی و اخلاقی تربیت نہیں کی جائے گی تو اس سے یہی امید کی جا سکتی ہے کہ بڑا ہو کر وہ اپنے بال بچوں کے لئے اپنے خاندان اور پھر پورے معاشرے کے لئے دینی و اخلاقی حیثیت سے مفید ہونے کے بجائے مضر ثابت ہوگا. گویا ایک لڑکے کی تعلیم و تربیت ایک فرد کی نہیں، بلکہ ایک خاندان اور ایک پورے معاشرے کو برباد کیا جا رہا ہے، اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کے جن کاموں کو صدقۂ جاریہ قرار دیا ان میں ایک ولد صالح بھی ہے کیونکہ اس کی نیکی سے اس کو اس کے بال بچوں کو، خاندان کو اور پھر پوری سوسائٹی کو فائدہ پہنچے گا، اور پھر یہ سلسلہ پھیلتا ہی چلا جائے گا، اور نہ جانے یہ فیض کب تک جاری رہے گا اپنے بال بچوں کی تعلیم و تربیت کی اس اہمیت کے پیش نظر قرآن نے عام مسلمانوں کو حکم دیا ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا قُوْا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَارًا (تحریم)	اے مسلمانو! تم اپنی ذات کو اور اپنے اہل و عیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ

اس چھوٹے سے فقرے میں تعلیم و تربیت کی ذمہ داری کو نہایت جامع طور پر بیان کر دیا گیا ہے. غور کیجئے. حکم یہاں آگ سے بچانے کے لئے دیا گیا ہے جس سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہوتی ہے، ایک مسلمان کو اپنے بال بچوں کو ایسی ہی تعلیم اور ایسی ہی تربیت دینی چاہئے، جو ان کو عذاب نار سے بچا سکے اور جو تعلیم و تربیت اس کو دوزخ کے عذاب سے نہ بچا سکے، وہ تعلیم نہ تعلیم ہے اور نہ وہ تربیت، تربیت. اگر کوئی مسلمان اپنے بچے کو ایسی تعلیم و تربیت دیتا ہے جو اس کو دوزخ میں لے جانے والی ہو تو پھر وہ نہ تو اپنے ایمان کے تقاضے کو پورا کر رہا ہے اور

نہ باپ اور سرپرست ہونے کی حیثیت سے اپنی اس ذمے داری کو پورا کر رہا ہے، جو اس پر عائد کی گئی ہے اور یہ معلوم ہے کہ ہر شخص سے اپنی ذمے داری کے بارے میں قیامت کے دن پوچھا جائے گا، کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیتہ۔

دینی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں قرآن و حدیث میں بے شمار ہدایتیں دی گئی ہیں، مگر یہ تفصیل کا موقع نہیں ہے، اس لئے چند حدیثیں اور نقل کر کے اس بحث کو ختم کر دیا جاتا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گزر چکا ہے کہ نیک اولاد صدقہ جاریہ ہے، آپ کا ایک دوسرا ارشاد ہے جس میں آپ نے بچے کی ایک تنبیہ کو ایک صاع صدقہ سے بہتر قرار دیا ہے۔

لان یؤدب الرجل ولدہ خیرٌ لہ من ان یتصدق بصاع

آدمی اپنے بچے کو کوئی ادب و تمیز کی بات سکھائے، تو یہ ایک صاع (ساڑھے تین سیر غلہ یا میوہ) صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

لوگ بچوں کے لئے روپیہ پیسہ جمع کرتے ہیں، ان کے لئے جائدادیں اکٹھا کرتے ہیں، ان کو مادی حیثیت سے خوش حال بنانے کے لئے وہ سب کچھ کرتے ہیں جو ان کے بس میں ہوتا ہے، مگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بچے کے لئے سب سے بہتر عطیہ اور سب سے بہتر ہدیہ و تحفہ ان کی تعلیم و تربیت ہے

ما نحل والدٌ ولدہٗ من نحلٍ افضل من ادبٍ حسنٍ" (ترمذی)

کسی باپ کا اپنے بچے کے لئے اس سے بہتر عطیہ کوئی نہیں ہے کہ وہ اس کو اچھی اور عمدہ تعلیم و تربیت دے۔

عملی تعلیم و تربیت

آپ نے صرف نظری طور پر ہی تعلیم و تربیت دینے کا حکم نہیں دیا ہے بلکہ یہ تاکید بھی کی ہے کہ عملاً بھی ان کو اسی کے مطابق بناؤ اور اگر ضرورت ہو تو ان کو اس کے لئے سخت تنبیہ بھی کرو۔ آپ نے فرمایا کہ

بچے جب سات برس کے ہو جائیں تو ان کو نماز کا حکم دو۔ اور جب دس برس کے ہو جائیں تو ان کو مار کر نماز پڑھاؤ اور ان کو بستر سے علیحدہ کر دو۔ (ابو داؤد) بستر سے علیحدہ کرنے کا حکم کن اخلاقی اور معاشرتی حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے اس کا اندازہ ہر سمجھنے والا کر سکتا ہے

تنبیہ اگر کوئی عورت یہ مذکورہ فرائض انجام نہیں دیتی ہے یا ان میں کوتاہی کرتی ہے تو وہ رشتۂ نکاح کو کمزور کر رہی ہے۔ ایسی صورت میں نہ تو گھر کا نظم و انتظام درست رہ سکتا ہے اور نہ ایک پاکیزہ اور اچھا خاندان بن سکتا ہے، چونکہ بحیثیت قوام، گھر کے نظم و انتظام اور اس کی دیکھ بھال اور درستگی کی اصل ذمہ داری مرد کے اوپر ہے اور ہر ذمہ دار آدمی کو نظم و انتظام درست رکھنے کے لئے کبھی نہ کبھی سختی بھی کرنی پڑتی ہے۔ اسی حکمت کے پیش نظر اسلامی شریعت نے شوہر کو ضرورت کے وقت بیوی کی تنبیہ و تادیب کرنے کی اجازت دی ہے۔ اور اگر تنبیہ و تادیب سے بھی وہ نہیں مانتی تو پھر اس کو مارنے، اس سے ایلا کرنے اور پھر بدرجۂ مجبوری طلاق دینے کی اجازت بھی دی ہے۔

جس طرح عورتوں کو شوہروں کی ناشکری سے بچنا چاہئے اسی طرح مردوں کو خواہ مخواہ عورتوں پر ہر وقت اپنی بڑائی کا حق جتانا نہ چاہئے۔ بلکہ ان کو تنبیہ و تادیب کا حربہ اس وقت استعمال کرنا چاہیے جب ان سے نشوز پایا جائے۔

وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَیْھِنَّ سَبِیْلًا (نساء)

جن عورتوں سے تم نشوز دیکھو تو پہلے ان کو سمجھاؤ بجھاؤ، پھر ان کی خوابگاہوں میں ان سے علیٰحدہ رہو، اور اس کے بعد ان کو مارو، اگر وہ تمہارا کہنا مانیں، تو پھر ان پر سختی کرنے کی راہ تلاش نہ کرو

نشوز کے معنیٰ اٹھ جانے کے ہیں، یعنی رشتۂ نکاح کا جو احترام اور لحاظ و پاس ہے وہ عورت کے دل سے اٹھ جائے۔ چنانچہ یہ آیت متصلاً اس آیت کے بعد ہے جس میں عورت کے فرائض کا ذکر کیا گیا ہے۔

فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ

صالح عورتیں وہ ہیں جو فرمانبردار اور غیب کی حفاظت کرنے والی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نشوز سے مراد ان فرائض کی عدم ادائگی ہے، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے حتیٰ کہ بعض مفسرین نے ان کی نظر کی بے احتیاطی کو بھی اس میں داخل کر دیا ہے۔ اب اگر کوئی عورت ... رہی، شوہر کے گھر بار اور مال و متاع کی حفاظت نہیں کرتی صرف ...

اس کی اطاعت نہیں کرتی تو وہ ناشزہ ہے، اس کو تنبیہ و تادیب کی جا سکتی ہے، اس آیت میں تنبیہ و تادیب کی تین صورتیں بتائی گئی ہیں، پہلے ان کو نرمی اور ملاطفت سے سمجھایا جائے اگر سمجھ سمجھانے سے مان جائیں تو خیر ورنہ دوسری صورت یہ ہے کہ ان سے ترک مباشرت کر لی جائے ترک مباشرت کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی دو چار دن روٹھ جائے اور ان کے ساتھ سونا بیٹھنا اور جنسی تعلق چھوڑ دے، دوسری صورت یہ ہے کہ وہ ایلا کرے، یہ حربے عورتوں کی فطرت کے عین مطابق ہیں اگر عورت کی فطرت میں کچھ بھی سلامت روی ہے تو مرد کی نظر التفات ہٹ جانے کے ساتھ ہی وہ اپنی روش میں تبدیلی پیدا کرے گی، لیکن کوئی عورت اس سے بھی نہ مانے تو آخری حربہ یہ ہے کہ تم اس کو مار پیٹ کی ہلکی سزا بھی دے سکتے ہو۔

مگر عورت کو ہر غلطی پر زدوکوب کرنا انتہائی گناہ ہے، بلکہ جیسا اوپر ذکر کیا گیا ہے، یہ بالکل آخری حربہ ہے، اگر کوئی شخص اس کے استعمال میں زیادتی کرے گا، تو پھر اس سے قانونی باز پرس بھی کی جا سکتی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی اس آخری اجازت کے استعمال کرنے کی جو تفسیر کی ہے اس کو اگر نظر انداز کر دیا گیا تو پھر ایک غلطی کی جگہ دوسری غلطی اور ایک ظلم کی جگہ دوسرا ظلم ہوگا آپ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں عورتوں کے بارے میں جو اعلان فرمایا تھا اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے۔

واتقوا اللہ فی النساء فانھن	عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرو وہ
عندکم عوان ولکم علیھن	تمہارے پاس قیدیوں کی طرح ہیں تمہارا
ان لا یوطئن فرشکم احدا	ان کے اوپر حق ہے کہ وہ تمہارے بستر پر
تکرھونہ فان فعلن	کو ان سے نہ روندائیں جن کو تم ناپسند کرتے
فاضربوھن غیر مبرح	ہو اگر وہ ایسا کرتی ہیں تو ان کو معمولی
	مار مار سکتے ہو۔

"بستر روندنے" سے مراد یہ ہے کہ ایسے لوگ گھر میں نہ آئیں، جن کو شوہر ناپسند کرتا ہے یا ان کی طرف سے شوہر کے دل میں کوئی شک و شبہ ہے۔

دوسری حدیث میں ہے کہ اگر وہ بھلائی میں تمہاری اطاعت نہ کریں تو ان کو معمولی مار مار سکتے ہیں

ایک [illegible] صورت یہ ہے کہ اگر وہ کھلی بے حیائی پر اتر آئیں تب یہ صورت اختیار کرنی چاہیے، یعنی مارپیٹ کی اجازت کے ساتھ دو شرطیں لگی ہوئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ کسی بھلے اور معروف کام میں اطاعت نہ کریں، دوسری یہ کہ مار معمولی ہو، اسی بنا پر بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ مسواک وغیرہ جیسی چھوٹی چیز سے مارنا چاہیے تاکہ اس کو سخت چوٹ نہ آئے (تفسیر طبری)

ظاہر ہے کہ مسواک سے مارنے کا مطلب یہ ہے کہ ذرا سخت قسم کی تنبیہ بھی ہو جائے اور اس کو شدید چوٹ بھی نہ آئے، ورنہ اسلامی شریعت نے جب جانوروں کو بھی سخت مارپیٹ کی اجازت نہیں دی ہے تو "صنف لطیف" کے بارے میں وہ ایسی اجازت کیسے دے سکتی ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کو بات بات پر لوگ مارتے تھے۔ آپؐ نے یہ کیفیت دیکھی تو اس سے بالکل ہی روک دیا۔ فرمایا کہ خدا کی بندیوں کو مارا نہ کرو، لیکن جب اس کے نتیجے میں عورتوں کی طرف سے زیادہ بے باکی اور دلیری شروع ہو گئی تو قرآن نے اور اس کی روشنی میں آپؐ نے معمولی مارپیٹ کی اجازت دی، اس اجازت کے بعد مردوں کی طرف سے پھر کچھ زیادتی شروع ہوئی، تو عورتیں بہت مسجد نبویؐ میں شکایتیں لے کر آنے لگیں، آپؐ نے یہ کیفیت دیکھی تو سخت تنبیہ فرمائی، آپؐ نے فرمایا کہ:

لقد طاف بآل محمد نساء	آل محمد کے گھر کے اردگرد بہت سی عورتیں
کثیر يشكون ازواجهن ليس	چکر کاٹتی رہتی ہیں جو اپنے شوہروں کی شکایتیں
اولئك بخياركم	لے کر آتی ہیں۔ اپنی بیویوں سے بدسلوکیاں کرنے
(ابوداؤد)	والے بھلے لوگ نہیں ہیں۔

ایک صحابیہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے نکاح کے بارے میں مشورہ کیا اور ایک شخص کے پیغام کا ذکر کیا، تو آپ نے فرمایا کہ اس سے نکاح نہ کرو، وہ اپنا ڈنڈا اپنے کندھے سے نیچے نہیں اتارتا (مسلم)، یعنی معمولی معمولی باتوں پر مارپیٹ کرتا ہے۔ قرآن نے مارنے کی جو اجازت دی ہے مذکورہ ارشادات نبوی سے اس اجازت کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے۔

سفرنامہ امام شافعیؒ پر ایک نظر

(مجیب اللہ ندوی)

تذکرہ وادب کی متعدد کتابوں میں امام شافعیؒ کا ایک خود نوشت سفرنامہ ملتا ہے۔ اس سفرنامہ کی صحت وعدم صحت کے بارے میں قدیم زمانہ سے اختلاف چلا آرہا ہے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے اس کو صحیح سمجھ کر من وعن اپنی کتابوں میں نقل کر دیا ہے۔ اور بعض نے یا تو سرے سے اس کو نقل ہی نہیں کیا ہے، یا اگر کیا ہے، تو اس کے متن وسند پر جرح وتنقید کی ہے۔

چند سال پہلے علامہ ابن عبد البر کی مشہور ومقبول کتاب "جامع بیان العلم وفضلہ" کا اردو ترجمہ ندوۃ المصنفین دہلی کی طرف سے شائع ہوا۔ کتاب کے مترجم مولانا عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی مرحوم ہیں، خوش مذاق مترجم نے کتاب کے آخر میں امام شافعی کے مذکورہ سفرنامہ کا اردو ترجمہ بھی شامل کر دیا ہے۔ صدق جدید میں اس کتاب پر تبصرہ لکھتے ہوئے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مرحوم نے اس سفرنامہ کی صحت کے بارے میں ایک ہلکے سے شبہ کا اظہار کر دیا تھا۔ جن کی تائید بعد میں مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مرحوم اور مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم نے بھی کی۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے تو اس سلسلہ میں امام ابن تیمیہ اور حافظ ابن حجر کی رائیں بھی نقل کر دی تھیں۔ جس سے اس کی صحت جڑی حد تک مشکوک ہو جاتی ہے۔ مگر اب بھی یہ بحث کچھ تشنۂ تحقیق معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں کچھ مزید باتیں پیش کر دی جائیں تاکہ اہل علم اس کی صحت وعدم صحت کے بارے میں کسی صحیح فیصلہ پر پہنچ سکیں۔

جن ارباب تذکرہ اور اہل علم نے اس سفرنامہ کو اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے، ان میں امام بیہقی امام رازی اور امام سیوطی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اتفاق سے یہ تینوں بزرگ شافعی مسلک اور شافعیت میں ان کو ایک حد تک غلو بھی ہے، اس لئے ان روایات کے سلسلہ میں جن کا تعلق امام شافعی کے مسلک یا ان کی ذات سے ہو، یہ حضرات بحث و تحمیص اور تدقیق و تحقیق سے کم کام لیتے ہیں، خصوصیت سے امام سیوطی کے بارے میں تو حاطب اللیل (یعنی ہر طرح کی رطب و یابس روایات کے جامع) کا لقب مشہور رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سفرنامہ کو انہوں نے اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے، اور اس کے متن اور سند پر کسی جرح و تنقید کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے، بخلاف اس کے محقق شافعی اہل علم یا اہل تذکرہ نے اس کے متن پر بھی تنقید کی ہے اور راویوں کی بھی پردہ دری کی ہے۔

اس سفرنامہ کے موضوع اور جعلی ہونے پر متعدد داخلی اور خارجی شہادتیں موجود ہیں جن کو مختصر طور سے پیش کیا جاتا ہے۔ خارجی شہادت سے مراد یہ ہے کہ یہ سفرنامہ جن رواۃ کے ذریعہ ہم تک پہنچا ہے، ان کے بارے میں محدثین نے اچھی رائے قائم نہیں کی ہے، اور داخلی شہادت سے مراد یہ ہے کہ واقعات کی ترتیب، تاریخ و سنین کی تعیین کے اعتبار سے اس سفرنامہ میں بعض ایسی خامیاں ہیں کہ اگر ان کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بہت سے مسلم واقعات غلط قرار پا جاتے ہیں۔

خارجی اسقام اس سفرنامہ کے مرتب دو شخص ہیں، ایک عبد اللہ بن محمد البلوی، دوسرے عبد الرزاق حمران البطین، ان میں عبد اللہ بن محمد البلوی کا ذکر تذکرہ و رجال کی کتابوں میں ملتا ہے، مگر اس کے غیر ثقہ اور وضاع حدیث ہونے پر تمام ارباب رجال متفق ہیں، امام ذہبی لکھتے ہیں:

قال الدار قطنی یضع الحدیث روی عنه ابو عوانه فی صحیحه فی الاستسقاء خبرا موضوعا (میزان الاعتدال ج ۲ ص)

دار قطنی کا قول ہے، کہ یہ حدیثیں وضع کرتا تھا، اس سے ابو عوانہ نے استسقاء کے سلسلہ میں ایک موضوع حدیث روایت کی ہے۔

حافظ ابن حجر نے بھی لسان المیزان میں دار قطنی کا مذکورہ قول نقل کیا ہے، پھر تو اس کے بعد اس سفرنامہ پر تفصیل سے ناقدانہ نظر ڈالی ہے، ان کی پوری عبارت ہم آگے نقل کریں گے

عبداللہ بن محمد البلوی نام کے ایک شخص کا ذکر ابن ندیم نے بھی کیا ہے، مگر اس پر کوئی تنقید نہیں کی ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ یہ منصب ابن ندیم کا نہیں ہے۔ ابن ندیم ہی کے حوالے سے اسی بلوی کا ذکر ایک شیعی مصنف یعنی صاحب منتہی المقال نے بھی کیا ہے، اور اس کے بارے میں لکھا ہے کہ "واضع حدیث تھا"۔ اگر یہ وہی بلوی ہے تو اس کے غیر ثقہ اور وضاع حدیث ہونے میں اب کس کو شبہ ہو سکتا ہے۔ ابن ندیم نے اس کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ یہ واعظ تھا، جو اس کے ضعیف بلکہ وضاع ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس لئے کہ واعظوں کا یہ خاص پیشہ تھا کہ وہ زیب داستاں کے لئے واقعات کو بڑھا چڑھا کر رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرتے تھے۔

مولانا مسعود عالم صاحب ندوی مرحوم نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ حافظ ابن قیم نے بھی "مفتاح دار السعادۃ" میں اس پر کچھ لکھا ہے۔ میں نے وہ عبارت تلاش کی، مگر افسوس ہے کہ نہ مل سکی، اگر کوئی صاحب اس کی نشاندہی کر دیتے، تو بہتر تھا۔

یہ تو پہلے راوی کا حال تھا، دوسرے راوی حمران البطین اور اس کے نیچے کے راوی احمد بن محمد الکواز دونوں مجہول ہیں، ان میں سے کسی ایک کا تذکرہ بھی رجال و طبقات یا تاریخ و تذکرہ کی متداول کتابوں میں نہیں ملتا۔ ان کے نیچے کے راوی احمد بن الفارسی کا حال بھی یہی ہے۔

اس سفرنامہ کے اصل راوی امام شافعی کے شاگرد ربیع بن سلیمان جیزی ہیں۔ ان سے ابن منذر نے روایت کی ہے۔ البطین اور کواز کے بارے میں تو ہم لاعلم تھے ہی، ابن منذر کے حالات بھی تلاش و جستجو سے متداول کتابوں میں نہ مل سکے۔ حتی کہ ربیع بن سلیمان کے تلامذہ میں بھی ان کا نام نہیں ملتا۔ علامہ زاہد الکوثری کے بیان سے البتہ معلوم ہوتا ہے، کہ اس نام کے کوئی راوی ضرور تھے۔ مگر ان کے بارے میں انہوں نے عقیلی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ابن منذر کو ربیع مرادی سے سماع حاصل نہیں ہے، ظاہر ہے کہ ربیع مرادی سے جن کا انتقال سنہ ۲۷۰ھ میں ہوا، ان کا سماع نہیں ہے، تو پھر ربیع جیزی سے

لے اس نام کے دو آدمی امام شافعی کے تلامذہ میں ہیں، صرف دونوں کی خاندانی نسبت میں فرق ہے۔ ایک ربیع جیزی اور دوسرے ربیع مرادی کی نسبت سے مشہور ہیں۔ آخر الذکر امام شافعی کے نامور شاگردوں میں ہیں۔ [illegible] [illegible] اول الذکر جو اس سفرنامہ کے راوی ہیں، ان کو [illegible] کے علاوہ [illegible] [illegible] حاصل [illegible] ہے۔

ان کی روایت کس طرح ثابت ہو سکتی ہے، جب کہ ان کا انتقال ۱۵۲ھ میں ہو چکا تھا۔

داخلی استقام یہ تو اس سفرنامہ کے سلسلۂ سند کا حال ہے، اس کے علاوہ اس میں متعدد تاریخی و درایتی خامیاں بھی ہیں، اس سلسلہ میں پہلے چند محقق تذکرہ نگاروں کے بیانات پیش کئے جاتے ہیں۔

حافظ ابن عبد البر، حافظ ابن کثیر، خطیب بغدادی، امام ذہبی، امام نووی وغیرہ نے امام شافعی کے حالات لکھے ہیں، مگر ان میں سے کسی نے اس سفرنامہ کا ذکر نہیں کیا ہے۔ امام نووی نے صرف اتنا لکھا ہے کہ ان کا سفر مدینہ بہت مشہور ہے، اور اس کو کسی نے مرتب بھی کر دیا ہے، امام ابن تیمیہ نے اصل سفرنامہ پر تو کچھ نہیں لکھا ہے، مگر اس کے ایک جزء پر تنقید کی ہے۔ یعنی یہ کہ امام ابو یوسف سے امام شافعی کی ملاقات ثابت نہیں ہے، اور اس سفرنامہ سے دونوں کی ملاقات اور مناظرہ کا پتہ چلتا ہے، حافظ ابن حجر پہلے شخص ہیں۔ جنہوں نے اس سفرنامہ پر کھل کر تنقید کی ہے، لسان المیزان میں بلوی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

هو صاحب رحلة الشافعی	اسی نے امام شافعی کا سفرنامہ بڑی طوالت
طولها ونمقها وغالب ما	اور رنگ آمیزی کے ساتھ مرتب کیا ہے
اورد فیها مختلق (ج ۳ ص ۳۳۸)	جس کا بیشتر حصہ من گھڑت ہے۔

پھر توالی التاسیس[۲] میں امام محمد اور امام شافعی کے تعلقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

واما الرحلة المنسوبة الی	وہ سفرنامہ جو امام شافعی کی طرف منسوب ہے
الشافعی المرویة من طریق	جس کا راوی عبد اللہ بن محمد البلوی ہے، اس
عبد الله بن محمد البلوی فقد	کو امام بیہقی، آبری وغیرہ نے کسی نے مختصرا
اخرجها الآبری والبیهقی	اور کسی نے مطول نقل کیا ہے۔ اور امام
وغیرهما مطولة ومختصرة	رازی نے اس کو مناقب الشافعی میں بغیر

۱؎ سماع حدیث کے لئے مدینہ کے سفر کے مشہور ہونے میں کوئی شک نہیں ہے مگر جس انداز سے اس سفرنامہ میں اس کا ذکر ہوا ہے وہ بالکل بے جا ہے۔ ۲؎ حافظ ابن حجر نے یہ کتاب امام شافعی کے حالات میں لکھی ہے ان کے حالات میں یہ بہترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔

وساقها الفخر الرازی فی
مناقب الشافعی بغیر اسناد
معتمدا علیہا ومن سکن وبہ
وغالب ما فیہا موضوع وبعضہا
ملحق من روایات ملفقة (ص[illegible])

کسی سند کے اس کی صحت پر اعتماد کرتے ہوئے
نقل کیا ہے، حالانکہ یہ سفرنامہ بالکل جھوٹ
ہے، اس کا بیشتر حصہ تو بالکل موضوع
ہے، اور اس کے بعض حصے بعض مشتبہ
روایات کی وجہ سے مشتبہ ہو گئے ہیں۔

ارباب تذکرہ کے ان بیانات سے اجمالی طور پر تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ یہ سفرنامہ بالکل جعلی ہے، مگر تفصیل کے لئے اس کے چند اور داخلی اسقام کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

اس سفرنامہ کی جو سب سے پہلی بات تاریخی حیثیت سے غلط ہے، وہ یہ ہے کہ امام شافعی جس زمانہ میں امام مالک کی خدمت میں موجود تھے، اسی زمانہ میں مصر کے تشنگان علم کا ایک قافلہ امام مالک کے پاس سماع مؤطا کے لئے آیا، جن میں عبداللہ بن حکم، اشہب، ابن قاسم اور لیث بن سعد جیسے ائمہ تھے، امام شافعی نے ان ائمہ کو مؤطا کا املا کرایا۔ سفرنامہ کی اصل عبارت یہ ہے۔

فاملیتہ علیہم حفظا منہم
عبد اللہ بن حکم واشہب و
ابن القاسم قال الربیع واظن
انہ ذکر اللیث بن سعد

میں نے ان کو اپنے حفظ سے املا کرایا، ان
میں عبداللہ بن حکم، اشہب، ابن قاسم تھے
اور ربیع نے کہا کہ غالب گمان یہ ہے کہ
انہوں نے لیث بن سعد کا بھی تذکرہ کیا تھا

اس عبارت کا ایک ایک لفظ غلط اور خلاف واقعہ ہے، سب سے پہلی خلاف قیاس بات اس میں یہ ہے کہ امام شافعی نے زبانی مؤطا کا املا کرایا، حالانکہ عام اہل مدینہ اور خصوصیت سے امام مالک کے طریقہ درس سے جو لوگ واقف ہیں، وہ اس کی کسی طرح تصدیق نہیں کر سکتے، امام مالک درس کے معاملہ میں صد درجہ محتاط تھے، وہ اپنی روایات کو بھی جن کے وہ حافظ تھے، کبھی زبانی املا نہیں کراتے تھے، بلکہ پہلے ان کو لکھ لیتے تھے، پھر مجلس درس میں پیش کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص خود اپنی روایات کے بارے میں زبانی املا کو پسند نہ کرتا ہو وہ امام شافعی جیسے کم سن شاگرد کو اس کی کیسے اجازت دے سکتا ہے۔

اس کے علاوہ اس عبارت میں مصر کے جن اشخاص کو املا کرانے کا ذکر ہے وہ تاریخی حیثیت سے

صحیح نہیں ہے، سب سے پہلے عبداللہ بن حکم کو لیجئے، ان کا سنہ ولادت ۱۵۵ھ ہے اور امام شافعی مدینہ منورہ ۱۶۲ھ یا ۱۶۴ھ میں گئے تھے، اب اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ عبداللہ بن حکم ۱۶۴ھ میں سماع موطا کیلئے مدینہ گئے، تو ان کی عمر زیادہ سے زیادہ نو برس کی تھی، ظاہر ہے کہ اس عمر میں ان کا مصر سے سیکڑوں میل دور مدینہ جاکر موطا کا سماع کرنا عقل و بداہت کے بالکل خلاف ہے، اسی طرح ابن قاسم اور اشہب امام شافعی کی آمد سے بہت پہلے سے امام مالک کی خدمت میں موجود تھے، اس حالت میں یہ کہنا کہ یہ لوگ ان کی موجودگی میں مدینہ آئے اور امام شافعی کے ذریعہ موطا کا سماع کیا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے؟

سب سے زیادہ غلط بات لیث بن سعد کی موجودگی ہے۔ تمام اہل تذکرہ اس بات پر متفق ہیں، کہ امام شافعی اور لیث بن سعد میں ملاقات نہیں ہوئی جس کا امام شافعی کو زندگی بھر افسوس رہا۔ الرحمۃ الغیثیہ[1] اور دوسرے تذکروں میں امام شافعی کا یہ قول منقول ہے، کہ

ما فاتنی احد اسفت علیہ	مجھے کسی شخص سے استفادہ نہ کرنے کا اس
ما اسفت علی اللیث بن سعد	قدر افسوس نہیں ہے جس قدر لیث بن سعد سے استفادہ نہ کرنے کا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امام شافعی کو لیث بن سعد سے نہ ملنے اور ان سے استفادہ نہ کرنے کا افسوس تھا، مگر سفرنامہ کی مذکورہ بالا عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ لیث بن سعد سے ان کی ملاقات ہوئی اور وہ بھی مفید و استاد کی حیثیت سے نہیں، بلکہ مستفید و شاگرد کی حیثیت سے، حالانکہ اس وقت یعنی ۱۶۴ھ میں لیث بن سعد کی عمر ستر برس سے زیادہ تھی، اور وہ مصر میں مسلم امام اور مرجع خلائق تھے

اس سفرنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ امام مالک کی خدمت میں آٹھ ماہ رہنے کے بعد امام شافعی مدینہ سے سیدھے عراق گئے۔ اس وقت ان کی عمر ۱۴ سال کی تھی، یعنی ۱۶۴ھ میں اور عراق میں ان کی امام محمد اور امام ابو یوسف سے ملاقات ہوئی، اور ان سے بعض مسائل میں مناظرہ ہوا، بلوی کے بیان میں اتنا اور اضافہ ہے، کہ امام محمد اور امام ابو یوسف نے جب دیکھا کہ امام شافعی کا علمی وقار بڑھتا

[1] حافظ ابن حجر نے یہ کتاب ان کے حالات میں لکھی ہے۔

جارہا ہے، تو انہوں نے ہارون رشید کو ان کے قتل پر اکسایا۔

تاریخ و روایت کے اعتبار سے اس بیان میں چند در چند غلطیاں ہیں،

سب سے پہلی بات تو یہی غلط ہے کہ امام شافعی مدینہ سے سیدھے عراق گئے، اور اس وقت ان کی عمر ۱۴ برس تھی، ان کے بیشتر سوانح نگار لکھتے ہیں کہ سماع مؤطا کے بعد وہ عراق نہیں گئے، بلکہ ملازمت کے سلسلہ میں یمن چلے گئے، اور وہاں سے یہ ایک سازش کے سلسلہ میں گرفتار کرکے ۱۸۴ھ میں عراق لائے گئے، اس سازش سے بری ہونے کے بعد وہ امام محمد کی خدمت میں آئے، اور ان سے استفادہ کیا، اس وقت ان کی عمر ۱۴ برس کی نہیں بلکہ تیس ۳۰ برس سے زیادہ تھی، اور عراق میں پہلی بار ان کا ورود عالم کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک متعلم کی حیثیت سے تھا۔ امام نووی لکھتے ہیں،

کان للشافعی حین اتی مالکاً ثلاث عشرۃ سنۃ ثم ولی بالیمن ..... ثم رحل الی العراق	جس وقت امام شافعی امام مالک کی خدمت میں آئے ان کی عمر ۱۳ برس تھی، اس کے بعد یہ یمن میں کسی عہدہ پر مقرر ہوئے۔ پھر انہوں نے عراق کا سفر کیا۔

اس سے اتنا تو واضح ہو جاتا ہے، کہ امام مالک کی خدمت میں سماع موطا کے بعد وہ عراق نہیں بلکہ یمن گئے، مگر اس سے سنہ کی تعیین نہیں ہوتی، اس کے لئے حافظ ابن کثیر اور حافظ ابن حجر کے بیانات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

انہ ولی الحکم بنجران من الارض الیمن ثم تعصبوا علیہ ..... فحمل علی بغل فی قید الیٰ بغداد فدخلہا فی سنۃ اربع و ثمانین ومائۃ وعمرہ ثلثون سنۃ [2]	یہ نجران (یمن) کے والی بنا دیئے گئے وہاں ان سے کچھ لوگوں نے دشمنی کی (اور ہارون سے شکایت کی)، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قید کرکے بغداد بھیج دیئے گئے، اس طرح وہ بغداد پہلی بار ۱۸۴ھ میں گئے، اس وقت ان کی عمر تیس برس ہو چکی تھی....

---

[1] تہذیب الاسماء ج ۱ ص ۴، [2] البدایہ ج ۱۰ ص ۲۵۲۔

حافظ ابن حجر نہایت وثوق کے ساتھ لکھتے ہیں۔

والذی تحرر لنا بالطرق الصحیحۃ ان قدوم الشافعی اول ما قدم کان سنۃ اربع وثمانین[1]

ہمارے نزدیک باوثوق ذرائع سے یہ بات ثابت ہے کہ امام شافعی پہلی بار بغداد ۱۸۴ھ میں آئے۔

ان بیانات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے، کہ امام شافعی پہلی بار عراق ۱۷۴ھ میں نہیں بلکہ ۱۸۴ھ میں گئے اور اس وقت ان کی عمر ۱۴، ۱۵ برس کی نہیں بلکہ ۳۰ برس سے زیادہ تھی۔

اب اس بیان کے دوسرے جزء پر نظر ڈالئے۔ وہ یہ کہ امام محمد اور امام ابو یوسف سے انہوں نے مناظرہ کیا، اور ان دونوں بزرگوں نے ان کے قتل کی سازش کی۔

اوپر امام شافعی کے ورود عراق کے سلسلہ میں جو ثبوت دیئے گئے ہیں، ان سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے، کہ امام شافعی ۱۸۴ھ سے پہلے کبھی عراق (بغداد) نہیں گئے، اور تمام تذکرہ نگار متفقہ طور سے لکھتے ہیں، کہ امام ابو یوسف کا انتقال ۱۸۲ھ میں ہوا۔ ظاہر ہے کہ جب ان کا انتقال ان کی آمد عراق سے دو برس پہلے ہو چکا تھا، تو ان سے مناظرہ ومباحثہ اور سازش قتل کا الزام ایک بہتان کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ حافظ ابن حجر سفرنامہ کے اس جزء پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں

واوضح ما فیہا من الکذب قولہ فیہا ان ابا یوسف ومحمد بن الحسن حرضا الرشید علی قتل الشافعی وھذا باطل من وجہین احدھما ان ابا یوسف لما دخل الشافعی بغداد کان مات ولم یجتمع بہ الشافعی والثانی انہما اتقی للہ من ان یسعیا فی قتل

سب سے زیادہ جھوٹی بات اس سفرنامہ میں یہ ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمد نے ہارون رشید کو امام شافعی کے قتل پر اکسایا۔ یہ دو وجہوں سے غلط ہے ایک تو یہ کہ جب امام شافعی بغداد گئے، تو امام ابو یوسف کا انتقال ہو چکا تھا اور امام شافعی کی ملاقات ان سے نہیں ہو سکی۔ دوسری یہ کہ یہ دونوں بزرگ اس سے بلند

[1] توالی التاسیس ص ۷۱۔

رجل مسلم لا سیما وقد اشتہر بالعلم ولیس له الیہما ذنب الا الحسد علی ما اتاہ اللہ من العلم ھذا ما لا یظن لہما وان منصبہما وجلالتہما وما اشتہر من دینہما لیصد عن ذالک
توالی ص ۱۷

بلند اور ندا سے ڈرنے والے تھے کہ وہ کسی مسلمان کے قتل کی کوشش کرتے، خصوصیت سے جب کہ امام شافعی کا علمی شہرہ ہو چکا تھا، اور ان کا اس کے علاوہ کوئی قصور نہیں تھا کہ ان بزرگوں کو ان کے علمی تفوق کی وجہ سے حسد تھا۔ ان بزرگوں کے بارے میں ایسا گمان بھی نہیں کیا جا سکتا ان کا منصب، ان کی جلالت شان اور ان کا دینی مقام خود اس کی تردید کرتا ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ امام محمد نے کبھی دربار خلافت سے تعلق نہیں رکھا بلکہ وہ تو امام ابو یوسف سے اسی لئے خفا ہو گئے تھے کہ انہوں نے کوشش کر کے ان کو رقہ کا قاضی مقرر کرا دیا تھا[1] ایسے شخص کے بارے میں یہ کہنا کہ خلیفہ کے یہاں اپنے اعزاز و اکرام کو ختم ہوتے دیکھ کر امام شافعی کے قتل کی سازش کی، اس سے زیادہ غلط بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

امام شافعی جب پہلی بار بغداد گئے، تو وہ امام شافعی کی حیثیت سے نہیں بلکہ محمد بن ادریس کی حیثیت سے گئے تھے۔ اور امام محمد اور ان میں جو علمی مذاکرے ہوئے وہ مذاکرے دو معاصروں کے نہیں، بلکہ مفید اور مستفید کے درمیان تھے، عام تذکرہ نگاروں کو جانے دیجئے، خود خطیب بغدادی نے بھی جن کو امام صاحب اور ان کے تلامذہ سے خاص کد معلوم ہوتی ہے، امام شافعی کے یہ اقوال نقل کئے ہیں، کہ

"میں نے ایک اونٹ کے بوجھ کے برابر محمد بن حسن سے علم حاصل کیا ہے، محمد بن حسن سے زیادہ میرے اوپر کسی کا احسان نہیں ہے۔ میں نے محمد بن حسن جیسا عالم نہیں دیکھا، وہ بولتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ قرآن پاک انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے"

یہ جملے خطیب بغدادی نے نقل کئے ہیں، دوسرے تذکرہ نگاروں مثلاً حافظ ابن عبد البر، حافظ

---

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے راقم الحروف کی کتاب تبع تابعین حصہ اول تذکرہ امام محمد بن حسن الشیبانی

ابن کثیر، حافظ ابن حجر اور امام ذہبی وغیرہ نے اس طرح کے بیسیوں جملے نقل کئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ امام شافعی اور امام محمد کے درمیان نہ تو کوئی معاصرانہ چشمک تھی، اور نہ مناظرہ و مباحثہ کی مجلس گرم ہوئی تھی، بلکہ امام محمد اور امام شافعی کے درمیان وہی تعلقات تھے، جو ایک ذہین شاگرد اور لائق استاد میں ہوتے ہیں، اور ان کے علمی مذاکروں کی بھی یہی حیثیت تھی، امام محمد نے متعدد بار ان کی مالی امداد کی، اور اپنی کتابیں ان کو نقل کرنے کے لئے دیں، اور وہ جب تک عراق میں رہے ان کے ساتھ سلوک کرتے رہے، اس سفرنامہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب میں امام محمد کے گھر پہنچا، تو دیکھا کہ ان کے مکان کے دروازوں اور دہلیزوں پر نقرئی اور طلائی کام بنا ہوا ہے، "اس وقت مجھ حجاز کی غربت کا خیال کر کے افسوس ہوا۔"

امام محمد کے گھر کا جو نقشہ اس سفرنامہ میں کھینچا گیا ہے، وہ اگر عباسی دور کے کسی حکمران کا ہوتا تو یقین کرنے میں کوئی تامل نہیں ہوتا، مگر محمد بن حسن جیسے صاحب زہد و تقویٰ اور سادہ روش امام کے بارے میں یہ بات کسی طرح ذہن میں نہیں آتی، رجال و طبقات کی کوئی ایسی کتاب نہیں ہے جس میں امام محمد کے حالات درج نہ ہوں، مگر یہ بات کسی تذکرے میں بھی نہیں ملتی، کہ ان کی زندگی مسرفانہ یا عیش پسندانہ تھی، تمام ارباب تذکرہ ان کے زہد و اتقا کے معترف ہیں، حتیٰ کہ خطیب بغدادی بھی اس میں پیچھے نہیں ہیں، خود امام شافعی کا یہ قول تذکروں میں ملتا ہے، کہ

"میں نے امام محمد جیسا متقی و پرہیزگار آدمی نہیں دیکھا"[1]

کیا یہ ممکن تھا، کہ امام شافعی امام محمد کے یہ خلاف زہد و تقویٰ اعمال دیکھتے ہوئے ان کے زہد و تقویٰ کی تعریف کرتے؟

یہ صحیح ہے کہ امام محمد کے والد اپنے بعد ایک اچھی خاصی رقم چھوڑ گئے تھے جس کے تنہا امام محمد مالک تھے، لیکن اگر ذرہ تفحص سے کام لیا جائے، تو سوانح نگاروں کے متعدد بیانوں سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ ساری رقم انہوں نے اپنے اوپر کم اور اپنے تلامذہ پر زیادہ صرف کی، جن میں امام شافعی بھی شامل ہیں۔ ان کے علمی انہماک اور سادگی کا حال تو یہ تھا کہ جب تک اہل خانہ ان کے کپڑے تبدیل نہیں کرا دیتے تھے، وہ خود کپڑے تک نہیں بدلتے تھے، امراء سے ملنا تک پسند نہیں کرتے تھے

---

[1] تہذیب الاسماء امام نووی، یہ قول دوسرے تذکرہ نگاروں نے بھی نقل کیا ہے۔

ایسے متقی آدمی کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ تعیش پسندی میں زہد و تقوی کی سرحد کو بھی پھاند گئے تھے
ایک بہتان کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔

اس سفرنامہ میں یہ بھی ذکر ہے کہ امام محمد سے رخصت ہونے کے بعد امام شافعی نے عراق کے
دوسرے شہروں اور ارض فارس اور بلاد عجم وغیرہ کا چکر لگا کر ہارون رشید کے ابتدائی عہد خلافت
یعنی ۱۷۱ھ میں دوبارہ بغداد پہنچے، اور اپنے ایک خاص تلمیذ حسن محمد زعفرانی کے نام سے ایک کتاب
زعفرانی تصنیف کی۔

اس بیان کا کوئی حصہ ایسا نہیں ہے جسے تاریخ و درایت کی روشنی میں صحیح کہا جا سکے، سب
سے پہلے امام شافعی کے ارض فارس اور بلاد عجم کے سفر کو لیجئے۔ آج فارس و عجم کے ہر مشہور مقام مثلاً
نیشاپور، رے، قزوین، جرجان، مرو، اصفہان وغیرہ کی تاریخیں موجود اور ان میں ان مقامات
کے معمولی سے معمولی واقعے درج ہیں، مگر کسی ایک میں بھی یہ ذکر نہیں ہے، کہ امام شافعی ان میں
سے کسی ایک مقام پر بھی گئے ہوں، راوی کے بیان کے مطابق تو امام شافعی اس وقت چاردانگ
عالم میں مشہور ہو چکے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کا کسی جگہ جانا کوئی معمولی واقعہ تو نہیں تھا، جس کے بارے
میں یہ کہا جا سکے کہ یہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا، اس لئے تاریخ میں ذکر نہ آسکا۔

اس بیان کا دوسرا جزء یعنی امام شافعی ۱۷۱ھ میں دوبارہ عراق گئے۔ اور کتاب الزعفرانی
تصنیف کی۔ تو اوپر یہ ثابت کیا جا چکا ہے، کہ امام شافعی ۱۹۴ھ سے پہلے عراق گئے ہی نہیں اس
لئے پہلی بار یا دوبارہ ان کے ۱۷۱ھ میں وہاں جانے کا کوئی سوال پیدا ہی نہیں ہوتا، اس کے علاوہ
ان کے تمام سوانح نگار متفقہ طور سے لکھتے ہیں کہ امام شافعی دوبارہ عراق ۱۷۱ھ میں نہیں بلکہ
۱۹۵ھ میں گئے، بلکہ بعض سوانح نگاروں نے تو اسی آمد کو عراق میں ان کی پہلی آمد تصور کیا ہے
اگر ان وجوہ کو تھوڑی دیر کے لیے نظرانداز کر دیا جائے، تو بھی یہ بیان صحیح نہیں معلوم ہوتا، اس
لئے کہ اس بیان کے مطابق زعفرانی کی ولادت کم از کم ۱۶۰ھ میں تسلیم کرنی پڑے گی، کیونکہ
جب وہ ۱۷۱ھ میں امام شافعی کے محبوب شاگرد بن سکتے ہیں، تو ان کی عمر کم از کم گیارہ بارہ
برس کی تو ضرور ہی تسلیم کرنی پڑے گی، اگرچہ یہ عمر بھی کم ہے، مگر اس سے کم عمر والے کے لئے تو

ان ائمہ کی شاگردی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، مگر ارباب تذکرہ کے بیان کے مطابق ان کی ولادت ۱۶۰ھ قرار دینا بالکل غلط ہے، اس لئے تمام سوانح نگاروں نے ان کی وفات کا ۲۶۰ھ لکھا ہے اس اعتبار سے ان کی عمر سو برس تسلیم کرنا پڑے گی، جو صحیح نہیں ہے، امام ذہبی نے یہ تصریح کی ہے کہ وفات کے وقت ان کی عمر ۸۰، ۹۰ کے درمیان تھی، اس اعتبار اگر ان کی عمر ۹۰ برس بھی تسلیم کرلی جائے تو ان کا سنہ ولادت ۱۷۰ھ سے آگے نہیں بڑھتا، ظاہر ہے کہ ۱۷۰ھ میں ان کی ولادت اور پھر ۱۷۱ھ میں امام شافعی کا ان کے نام سے کوئی کتاب تصنیف کرنا اس سے زیادہ بعید از عقل بات دوسری کون ہوسکتی ہے۔ زعفرانی نے امام شافعی سے استفادہ ضرور کیا ہے، اور امام شافعی نے ان کے نام کی ایک تصنیف بھی چھوڑی ہے، مگر یہ سب کچھ ۱۷۰ھ یا ۱۷۱ھ میں نہیں بلکہ ۱۹۵ھ اور اس کے بعد کی سنین[1] میں ہوا ہے

ایک بالکل ہی فرضی بات اس سفرنامہ میں یہ بھی ہے کہ جب امام شافعی حرّان سے چلے تو ایک امیر نے کافی دولت ان کے ساتھ کردی، جس کو وہ راستہ بھر اہل علم میں تقسیم کرتے رہے، اور جن اہل علم کو خاص طور سے انہوں نے اس دولت سے نوازا ان میں احمد بن حنبل، سفیان بن عیینہ، اور امام اوزاعی بھی تھے۔ امام احمد بن حنبل کی ولادت ۱۶۴ھ میں ہوئی، اور یہ واقعہ ۱۷۱ھ سے پہلے کا بیان کیا جاتا ہے، یعنی اس وقت ان کی عمر صرف سات سال کی تھی، کیا یہ عمر اس قابل تھی کہ وہ حصول علم کے لئے سفر کرتے، اور امام شافعی کے فیضان دولت سے مستفیض ہوتے؟ سفیان بن عیینہ ۱۵۰ھ سے پہلے مکہ چلے آئے تھے، اور پھر حجاز سے باہر قدم نہیں رکھا، اور اس سفر میں امام شافعی کا حجاز آنا بھی ثابت نہیں ہے، پھر یہ دولت ان تک نہ جانے کیسے پہنچی۔ اس میں سب سے زیادہ عجیب

---

[1] علامہ زاہد الکوثری نے لکھا ہے کہ امام شافعی سے استفادے کے وقت زعفرانی کی عمر ۱۵ سال کی تھی مگر امام ذہبی کے مذکورۂ بالا بیان سے اس کی تردید ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ کوثری کے بیان کو اگر صحیح تسلیم کرلیا جائے تو زعفرانی کی ولادت ۱۸۰ھ میں قرار پاتی ہے، یا پھر ان کے استفادہ کا ۱۹۵ھ نہیں بلکہ ۱۸۵ھ قرار دینا پڑیگا اور یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہے۔ اسلئے کہ تمام ارباب تذکرہ لکھتے ہیں کہ امام شافعی سے زعفرانی نے استفادہ ان کی پہلی آمد کے موقع پر نہیں بلکہ دوسری آمد کے موقع پر یعنی ۱۹۵ھ میں کیا، اور امام ذہبی نے جو ان کی عمر کے بارے میں تصریح کی ہو اس اعتبار سے بھی ان کی ولادت ۱۷۰ھ یا زیادہ سے زیادہ ۱۸۰ھ قرار دی جا سکتی ہے جب کہ استفادہ کے وقت ان کی عمر کم از کم

خبریات امام اوزاعی کا تذکرہ ہے۔ امام اوزاعی کی وفات ۱۵۷ھ میں ہوئی، جب کہ امام شافعی کی عمر صرف سات برس کی تھی، اور وہ ابھی مکہ کی گلیوں سے باہر بھی نہیں گئے تھے۔

اس سفرنامہ کے مرتب نے ایک افترا امام مالک پر یہ باندھا ہے کہ

"امام شافعی جس وقت ان کی خدمت میں گئے، اس وقت ان کے پاس تین سو لونڈیاں تھیں، جن کی باری صرف سال میں ایک بار آتی تھی، اس کے علاوہ امام کے پاس تین سو جوڑے مکلف کپڑوں کے اور ہزاروں کی تعداد میں دینار ان کے یہاں صندوقوں میں محفوظ رہتے تھے۔"

امام مالک کے سوانح حیات کا ایک ایک واقعہ سامنے ہے، کسی ایک تذکرہ نویس نے یہ نہیں لکھا ہے، کہ ان کی زندگی اس قدر مسرفانہ اور عیش پسندانہ تھی، اگر کسی تذکرہ نویس نے بھی لکھا ہوتا، تو امام مالک کی جلالت شان، ان کا علم و فضل، ان کا زہد و اتقا اور سادگی سے پر زندگی اسے تسلیم کرنے سے ابا کرتی، راوی نے یہ تصویر امام مالک کی نہیں، بلکہ عباسی خلیفہ کی کھینچی ہوتی تو مناسب تھا۔ امام مالک صاف ستھرے لباس پہنکر اور خوشبو وغیرہ لگا کر حدیث کے درس کے اندر ضرور بیٹھتے تھے مگر اس طرح کی عیش پرستانہ اور مسرفانہ زندگی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا،

آخر میں ہے کہ امام مالک کی خدمت میں جب آخری بار یعنی ۱۷۱ھ امام شافعی آئے، تو انہوں نے ان کو بڑی دولت دی، اور کئی ہزار سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا جو تقریباً گیارہ سال تک ان کو ملتا رہا۔

اگرچہ امام مالک کی دولت کی بہتات کا تذکرہ ہی سرے سے غلط ہے، امام شافعی کی زبان ہی سے اس سفرنامہ کے راوی نے یہ بھی بیان کیا ہے، کہ جب وہ عراق گئے اور امام محمد وغیرہ کی اونچی زندگی دیکھی، تو حجاز کی غربت پر بڑا افسوس ہوا، پھر آخر کار ایک ہی سال کے اندر اندر کہاں کی دولت امام مالک کے پاس آ گئی کہ وہ ہزاروں دینار ان کو وظیفہ دیتے تھے، پھر راوی نے بیان کیا ہے، کہ یہ وظیفہ ۱۷۰ھ کے بعد سے شروع ہوا اور گیارہ برس تک جاری رہا، اس اعتبار سے یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ امام مالک کم از کم ۱۸۱ھ تک زندہ رہے، مگر تاریخی حقیقت سے غلط ہے، امام مالک کی وفات ۱۷۹ھ ہی میں ہو گئی تھی، ان واقعات کو سامنے رکھتے ہوئے سفرنامہ کے راوی کے بارے میں یہ مقولہ صادق آتا ہے کہ

دروغ گو را حافظہ نہ باشد۔

مجیب اللہ ندوی

مدینہ منورہ کی حاضری، مسجد نبوی کی نماز اور دعا اور گنبد خضرا کا دیدار گو حج کے ارکان و فرائض میں داخل نہیں ہے لیکن اگر کوئی وہاں جاکر قصداً ان سعادتوں سے محروم چلا آیا تو اس کے بارے میں بلا مبالغہ کہنا صحیح ہے کہ وہ آب حیوان کے کنارے پہنچ کر ابدی زندگی سے محروم چلا آیا۔

غور کیجئے یہ اسلام کی دولت اگر ہم کو نہ ملی ہوتی تو کیا ہم دنیا کی سب سے بڑی سعادت اور سب سے بڑی نعمت سے محروم نہ رہتے؟ نہ تو خالق کو پہچانتے اور نہ اس کے حقوق کا علم ہم کو نصیب ہوتا، نہ مخلوق کی حیثیت سے ہم واقف ہوتے، نہ اس کے حقوق کو جانتے، پھر کیا ہم میں اور بے عقل جانوروں میں کوئی فرق ہوتا؟ پھر یہ دولت ہمیں کیسے ملی؟ یہ روشنی ہم نے کہاں سے پائی؟ اس نعمت سے ہمارا دامن کیسے مالا مال ہوا؟ ان سب باتوں کا جواب صرف ایک ہے، یہ ساری سعادتیں ہم کو خدا کے آخری نبی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن طفیل سے ملیں، ہمارے ماں باپ آپؐ پر فدا ہوں، گو آپ کا جسم اطہر پردۂ خاک میں چھپا ہوا ہے، اور ہماری ظاہری آنکھیں آپ کو قیامت سے پہلے نہ دیکھ سکیں گی، مگر آپ وہاں جائیں گے تو حضورؐ کے معنوی وجود کی شہادت وہاں کا ایک ایک ذرہ دے گا، آپ کو معلوم ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہاں بیٹھتے تھے، یہاں آرام فرماتے تھے، یہاں نماز پڑھتے تھے، یہاں وضو فرماتے تھے، یہاں آپؐ کھڑے ہو کر خطبہ دیتے تھے، یہاں بیٹھ کر وفود سے باتیں کرتے تھے، اس مقام پر وحی آتی تھی، اس مقام پر ہجرت کے بعد آپ کی اونٹنی بیٹھ گئی تھی، یہ خندق ہے جس کو کھود کر آپ نے دولت اسلام کی حفاظت کی تھی، جو لوگ اس نور مجسم پر خاک ڈالنے آئے تھے، ان کے منھ خود خاک آلود ہو گئے یہ مسجد قبا ہے جہاں آپ نے سب سے پہلی نماز پڑھی، یہ مسجد القبلتین ہے جہاں آپ نے قبلہ بدلا، یہ مسجد [illegible]

جو اپنی موجودہ شان و شوکت کے لحاظ سے دنیا میں اپنا نظیر نہیں رکھتی ، ابتدا میں اس کی دیواریں کچی اینٹ اور چٹانوں سے بنائی گئی تھیں ، چھت کھجور کی پتیوں سے بنائی گئی تھی ، جس کی تعمیر میں بذات خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حصہ لیا تھا ، فرش چھرّیوں کا تھا ، جب آپؐ اور صحابہ رضہ سجدہ کرتے تو ان مقدس پیشانیوں پر چھرّیاں لگ جاتی تھیں ، اور بارش میں نم آلود ہو جاتی تھیں ، اسی مسجد کے بارے میں قرآن نے کہا ہے کہ اس کی بنیاد خالص خدا کے تقویٰ پر رکھی گئی ہے ، یہ اس دنیا میں کسی نبی کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی آخری مسجد ہے ۔

ز خاکش بے صور رُوید معانی

غرض یہ ہے کہ مسجد نبوی کی زیارت کر کے ، مسجد نبوی میں نماز ادا کر کے ، اور روضۂ اقدس کا نظارہ کر کے ، آپ اس منبع سعادت کو دیکھیں گے ، جہاں سے آفتاب اسلام کی شعاعیں بلند ہوئیں ، اور پھر سارا عالم ان سے جگمگا اٹھا ، ہزاروں درود و سلام ہوں اس ذات گرامی پر جس کے ذریعہ یہ سب کچھ ہمیں ملا

مدینہ منورہ کا قدیم نام یثرب تھا ، جس کے لغوی معنی[1] فتنہ اور فساد وغیرہ کے ہیں ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب ہجرت کر کے وہاں تشریف لے گئے تو اس کا نام مدینۃ النبی (نبی کا شہر) پڑ گیا ، جو بول چال میں صرف مدینہ کہا جاتا ہے ، اب اس کو یثرب کے نام سے پکارنا مناسب نہیں ہے ، یہ جاہلیت کی یادگار ہے ۔ اس کے اور بہت سے نام ہیں ، طَیبَہ ، طابہ ، طَیِّبَہ وغیرہ ، اس سرزمین کی خاک میں بھی خدا کے کتنے بندے خوشبو اور لطافت محسوس کرتے ہیں ، اور یہ اس دعا کا اثر ہے جو آپؐ نے مکہ سے ہجرت کرتے وقت کی تھی ، اے اللہ ! جب تو مجھے اس جگہ سے نکالتا ہے جو میرے نزدیک سب سے محبوب جگہ ہے تو پھر ایسی جگہ لے جا ، جو دوسری آبادیوں میں تیرے لئے محبوب ہو ۔

زیارت نبوی کی فضیلت | نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں نماز پڑھنے کی اور اپنی قبر کی زیارت کی خود تاکید فرمائی ہے تاکہ مسلمانوں کا رشتۂ ایمانی محبت رسول سے ٹوٹنے نہ پائے ۔ آپؐ نے فرمایا ہے کہ جس نے حج کیا اور میری زیارت نہیں کی اس نے مجھ پر ظلم کیا "

غور کیجئے کہ کوئی مسلمان جس کے دل میں ایمان کی رمق بھی باقی ہے آپ پر ظلم کرنا پسند کرے گا ؟

---

[1] کانہ کرہ الیثرب لانہ فساد فی کلام العرب آپ نے مدینہ کو یثرب کے نام سے یاد کرنے کو ناپسند فرمایا ، اس لئے کہ کلام عرب میں یہ فتنہ و فساد کے معنی میں بولا جاتا تھا ۔

آپ کی زیارت کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے آثار اور آپ کی قبر شریف کی زیارت کی جائے۔ چنانچہ بعض موقع پر آپ نے خود فرمایا ہے کہ:

"جس نے میری قبر کی زیارت کی اس نے گویا زندگی میں میری زیارت کی"۔

آپ نے اس میں گویا کا لفظ فرمایا ہے، جس سے اس بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ کوئی یہ بھولے سے نہ سمجھ لے کہ زیارت قبر نبوی سے مرتبہ صحابیت پر پہنچ گیا۔ بلکہ اس کا مقصود یہ ہے کہ جس طرح صحابہؓ کو دوسرے مسلمانوں پر فضیلت تھی، اسی طرح زائرین قبر نبوی کو بھی دوسروں پر فضیلت ہوگی۔

زیارت مدینہ منورہ کا طریقہ مکہ معظمہ سے طواف وداع کے بعد ہی مدینہ منورہ کے لئے روانہ ہوجانا چاہئے، مدینہ کی منزلیں جتنی قریب آتی جائیں اپنے دل میں ادب واحترام اور جذبہ شوق وذوق بڑھانا چاہئے اور زبان پر راستہ بھر صلوٰۃ وسلام جاری رہنا چاہئے، مدینہ سے باہر شہر پناہ بنی ہوئی ہے۔ بہتر ہے کہ یہاں سے پیادہ پا سراپا ذوق وشوق ہوکر مدینہ میں داخل ہو۔ اور جب گنبد خضرا اور قبۂ نور کی دید سے چشم شوق شرف اندوز ہو تو زبان پر الصلوٰۃ والسلام علیک یارسول اللہ جاری ہوجائے۔ امام مالکؒ جب باہر سے آتے تھے تو مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے ادب واحترام کی وجہ سے سواری سے اتر جاتے تھے اور گریبان کے بٹن کھول دیتے تھے کہ شاید نقش پائے نبویؐ کا کوئی ذرہ ان کے سینہ کو چھو جائے۔ گویا وہ سراپا درد ہوکر زبان حال سے وارفتگان شوق کو پیغام دیتے تھے کہ ؎

قدم اے راہ رو آہستہ تر نہ ۔۔۔ چو ما ہر ذرۂ او دردمند ست

غالباً اسی عالم میں عزت بخاری نے کہا ہے ؎

ادب گاہیست زیر آسمان از عرش نازک تر ۔۔۔ نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید اینجا

بقیۃ السلف مولانا محمد احمد مدظلہٗ کا شعر ہے ؎

قربان کریں جاں یہاں سر کے بل آئیں ۔۔۔ دربار محمد ہے یہ دربار محمد

کوئے محبوب کا ہر ایک ذرہ ۔۔۔ قابل احترام ہوتا ہے

اس دیار حبیب سے خود حبیب کو جو تعلق اور شیفتگی تھی اس کا اندازہ اس حدیث سے کیجئے جسے بارگاہ نبوی کے خادم خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ:

"جب آپؐ کسی سفر سے واپس تشریف لاتے تو جب مدینہ کی دیواروں پر نگاہ سعادت نواز

پڑتی تو غایت شوق و محبت میں سواری کو تیز کر دیتے تھے۔ (بخاری)

اسی ذوق و شوق کے ساتھ مدینہ میں داخل ہونا چاہئے پھر اپنی قیام گاہ پر جا کر سامان رکھے، غسل و وضو اور مسواک سے فارغ ہو کر اگر ہو سکے تو کپڑے بھی بدل لے، خوشبو لگا لے۔ پھر مسجد نبوی کے دروازہ پر پہنچ کر سلام و صلوٰۃ پڑھے اور پھر مسجد میں جاتے وقت جو دعا پڑھی جاتی ہے، پڑھ کر مسجد میں قدم رکھے۔ اس وقت مسجد کے نقش و نگار اس کے فرش و فروش، اس کی زیبائش و آرائش پر نگاہ نہ ڈالے۔ بلکہ مسجد میں پہنچ کر سب سے پہلے حضور قلب کیساتھ دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھے اور سجدۂ شکر ادا کرے، اگر ہو سکے تو یہ دو رکعت نماز ریاض الجنۃ یا محراب نبوی کے پاس ادا کرے اگر وہاں جگہ نہ ملے تو پھر کشمکش نہ کرے، جہاں جگہ ملے پڑھ لے، نماز کے بعد پورے ادب و احترام کے ساتھ پورب جانب سے مواجہ شریف کی جالیوں کے پاس آئے اور صلوٰۃ و سلام پڑھے۔ مگر آواز میں تیزی نہ ہو بلکہ پست آواز سے پڑھے۔ قرآن میں آپ کی حیات مبارکہ میں لَا تَرْفَعُوا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ (نبی کی آواز پر اپنی آواز تیز نہ کرو) کا جو حکم تھا وہی حکم آپ کے پردہ فرمانے کے بعد کا بھی ہے۔ وہ سلام کافی ہے جو نماز میں تشہد میں پڑھا جاتا ہے یعنی السلام علیک ایہا النبی۔ پھر آپ کے دونوں محبوب صحابی حضرت ابوبکر رضی اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو سلام کرے اور پھر وہاں سے منبر نبوی کے پاس آئے اور اپنی دینی و دنیوی فلاح کے لئے دعا مانگے، اس کے بعد پھر دوسرے جو مشہور مقامات ہیں ان کی زیارت کرے، مثلاً جنۃ البقیع جہاں نہ جانے کتنے فدایان اسلام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سپرد خاک ہیں، مسجد قبا اور دوسری مسجدوں میں جائے، خاص طور پر جبل احد پر جائے جہاں اسلام و کفر کے درمیان دوسری جنگ ہوئی تھی، اور قلب و دماغ کو ولولۂ جہاد سے لبریز کرے اور ان شہدائے احد کی قبروں کی زیارت کرے جن میں سے کتنے بے کفن سپرد خاک کر دیئے گئے تھے۔ یہاں پہنچ کر قرآن کی یہ آیت تلاوت کرے

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ — تم پر سلامتی ہو کہ تم لوگ دین حق پر قائم رہے اس دنیا میں کیا ہی اچھا

جب تک مدینہ منورہ میں رہیں پورے ذوق و شوق سے پانچوں وقت مسجد نبوی میں با جماعت نماز پڑھیں اور ہو سکے تو تہجد و نوافل بھی، پھر جب وہاں سے رخصت ہونے کا ارادہ ہو تو حتی الامکان مسجد نبوی میں دو رکعت نماز پڑھ کر قبر نبوی کے پاس صلوٰۃ و سلام پڑھیں، اور پھر دل میں بے پایاں غم و فراق لئے ہوئے چشم نم کیساتھ وہاں سے رخصت ہوں اور دوبارہ آنے کی تمنا قلب و دماغ میں بسائے رکھیں۔

پھر گنبد خضرا کا ہو دیدار میسر
کعبہ مجھے پھر اپنے کلیجے سے لگا لے

اقتباسات از مواعظ حکیم الامت حضرت مولانا تھانویؒ

نسخہ کیمیا

ایک وعظ کے سلسلہ میں حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ گناہوں کے متعلق ایک بڑی مفید بات آپ کو بتاتا ہوں، یہ بات آپ مجھ ہی سے سنیں گے " اول تو جہاں تک ہو سکے ہر چھوٹے بڑے گناہ سے بچو، اور اگر گناہ کرتے ہی ہو تو اس کو گناہ اور حرام ہی سمجھنا، اور دوسری بات یہ کہ سوتے وقت دن بھر کے گناہوں کا حساب کر لیا کرو کہ صبح سے اس وقت تک کیا کیا گناہ کئے۔ خصوصاً جو معاش کے متعلق ہیں کیونکہ مال حرام سب سے بری چیز ہے، یہ تخم ہے تمام گناہوں کا۔ سو اس طرح گناہوں کو یاد کیا کرو اور تخلیہ میں زبان سے کہا کرو کہ اے اللہ میں بڑا نالائق ہوں اور اس قابل ہوں کہ غرق کر دیا جاؤں، کوئی عذر میرے پاس نہیں ہے، میں نے بہت ہمت کی مگر کامیابی نہیں ہوئی آپ مدد فرمائیے اور مجھے اس خباثت سے نجات عطا فرمائیے۔

میں یہ ایسی کام کی بات بتاتا ہوں کہ اول تو اس سے وہ گناہ ہی چھوٹ جائے گا، اور اگر بالفرض نہ چھوٹا اور ساری عمر اسی میں مبتلا رہے تب بھی اتنا فائدہ پہنچے گا کہ مرتے وقت صرف ایک گناہ ہی سر رہے گا، کیونکہ جب روز توبہ کی جاتی ہے تو اس سے ماضی کا کفارہ ہو جاتا ہے، تو بجائے کہ سو دن کے گناہ سر ہوتے ایک ہی دن کے رہ جائیں گے۔

جو تدبیر میں نے بتائی ہے، اس سے آپ کے ذمہ صرف ایک دفعہ رہ جاتی ہے اور بغیر اس کے بہت سی دفعات لگی ہوئی ہیں، یعنی بے فکری کا گناہ، غفلت کا گناہ، روزانہ کی بداعمالیوں کا گناہ۔ اگر یہ تدبیر کرو گے تو صرف ایک ہی عمل کا گناہ رہ جائے گا، اور ان گناہوں کے لئے ایک اور کام کی بات عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ گناہ دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ گناہ جن کو چھوڑنے میں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی اور وہ جن کے چھوڑنے میں کسی قدر تکلیف ہوتی ہے۔ اول کی مثال مردوں کے لئے ریشم پہننا، داڑھی منڈانا وغیرہ ان کے چھوڑنے میں کیا تکلیف ہوتی ہے، ان کو تو فوراً چھوڑ دینا چاہئے۔ اس کے لئے کوئی عذر بھی

بھی نہیں سوائے لاپرواہی کے۔ دوسری قسم گناہ کی یہ ہے، مثلاً ناجائز ملازمت۔ رشوت لینا، عورتوں
کا نامحرم کے سامنے آنا۔ باریک لباس پہننا، ننگے سر رہنا وغیرہ) تو ایسے گناہوں کے متعلق کہہ دیتا
ہوں کہ رفتہ رفتہ چھوڑ دو۔ نیت یہ ہونی ہے کہ کسی طرح تو چھوڑیں جن سے ایک دم چھوڑنے کی امید
نہیں، بلکہ اگر ان پر زور ڈالا جائے تو عمر بھر بھی نہ چھوڑیں۔ اس کے لئے وہی طرز عمل رکھو جو میں نے ابھی
بیان کیا ہے کہ رات کو وہ گناہ یاد کیا کرے اور اپنی خطا کا اعتراف کر کے زبان سے کہو کہ "اے
اللہ میں بڑا نالائق ہوں، گندہ ہوں، اپنی غلطی سے شرمندہ ہوں، اسی طرح اور سخت سخت الفاظ
اپنے متعلق استعمال کرو۔ اور اللہ تعالیٰ سے کہو کہ میں عاجز ہوں، آپ میری مدد فرما دیں، میرا قلب
ضعیف ہے گناہوں سے بچنے کی بات نہیں ہے، آپ ہی میری نجات کا سامان فرما دیجئے، یا اللہ
اب تک جو میں نے کئے ہیں اپنی رحمت سے معاف فرما دیجئے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں پھر گناہ نہ کروں گا
(اس لئے کہ مجھے اپنی نیت اور ہمت پر بھروسہ نہیں ہے اور بری عادت کا چھوٹنا آسان نہیں)
اگر گناہ ہوگا تو پھر آپ سے معاف کرا لوں گا (آپ اس طرح عمل شروع کردیں) اس کا نتیجہ وہی ہوگا
جو میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ اول تو گناہ چھوٹ جائے گا اور اگر ساری عمر بھی نہ چھوٹا تو صرف
ایک دفعہ کے آپ مجرم ہوں گے۔

لیجئے! میں نے ایسی آسان تدبیر بتلا دی ہے جس کی نسبت میرا دعویٰ ہے کہ اس سے زیادہ تخفیف
دس برس تک بھی کسی مصلح سے نہ سنئے گا، اور اس بیان پر شاید بعض طبیعتوں میں شبہ پیدا ہو کہ یہ تو گناہ
کی تعلیم کی جا رہی ہے، سو سمجھ لو کہ یہ گناہ کی تعلیم نہیں ہے۔ ترک گناہ کی تعلیم ہے ہاں اس کے لئے سہولت
کی شکل نکالی گئی ہے (وعظ جلاء القلوب)

کئے جاؤ اور لئے جاؤ

ایک سلسلہ وعظ میں فرمایا کہ انسان کو مایوس نہیں ہونا چاہئے، حق
تعالیٰ سے اچھی امید رکھنا چاہئے۔ وہ بندے کے ظن کے ساتھ ہیں جیسا
بندہ ان کے ساتھ گمان کرتا ہے ویسا ہی معاملہ اس کے ساتھ فرماتے ہیں۔ بڑی رحیم وکریم ذات ہے
مگر شرط یہ ہے کہ طلب ہو اور کام میں لگا رہے، جو بھی ہو سکے کرتا رہے پھر وہ اپنے بندہ کے ساتھ رحمت
اور فضل ہی کا معاملہ فرماتے ہیں۔ وہ کسی کی محنت اور طلب کو رائیگاں اور فراموش نہیں فرماتے ایک شخص
کا مقولہ مجھ کو پسند آیا کہ کئے جاؤ اور لئے جاؤ۔ واقعی ایسی ہی ذات ہے۔ اس قائل نے کہنے والے نے

بہت بڑے اور اہم مضمون کو دو لفظوں میں بیان کر دیا، ہاں لگا رہنا شرط ہے، اور ایک یہ ضروری بات ہو کہ ماضی اور مستقبل کی فکر میں نہ پڑے اس سے بھی انسان بڑی دولت سے محروم رہتا ہے، کیونکہ یہ بھی تو ماسوا اللہ ہی کی مشغولی ہے۔ خلاصہ میرے مضمون کا یہ ہے کہ قصداً ماضی و مستقبل کے مراقبے کی ضرورت نہیں ہے، اگر بغیر قصد کے خیال آ جائے تو ماضی کی کوتاہیوں پر توبہ و استغفار کر لیا کرے۔ بس کافی ہے۔ پچھلے معاصی کا کاوش کے ساتھ استحضار بھی کبھی حجاب بن کر خسران کا سبب بن جاتا ہے، اور اس طرح نہ آئندہ کے لئے تجویزات کی ضرورت ہے، یہ بھی ضرر رساں ہے نہ اس کی ضرورت کہ میں نے پہلے کیا کیا تھا اور اب کیا ہوگا اور میں کچھ ہوا یا نہیں، کن جھگڑوں میں وقت ضائع کرتے ہو۔ کام میں لگو، ان فضولیات کو چھوڑو کسی حالت میں بھی مایوس نہ ہوا وہ تو در بار ہی عجیب ہے، کوئی شخص کتنا ہی گنہگار کیوں نہ ہو ایک لمحہ ایک منٹ میں کایا پلٹ جاتی ہے بشرطیکہ خلوص کے ساتھ اس طرف متوجہ ہو کر رجوع کرے اور آئندہ کے لئے استقلال کا عزم کرے، پھر تو جس نے کبھی ساری عمر اللہ تعالیٰ کا نام نہ لیا ہو اور اپنی تمام عمر کا حصہ معاصی اور لہو لعب میں برباد کیا ہو اس کے لئے بھی رحمت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اسلئے فرماتے ہیں ؎

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ ❊ گر کافر و گبر و بت پرستی باز آ
ایں درگہہ ما درگہ نا امیدی نیست ❊ صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

جو بندے کے لئے مشکل ہے وہ خدا تعالیٰ کے لئے آسان ہے، اسی کو فرماتے ہیں ؎

تو مگو ما را بداں شہ بار نیست ❊ با کریماں کارہا دشوار نیست

رحمت حق ہر وقت اپنے بندوں کے لئے بخشش کا بہانہ ڈھونڈتی ہے، فی الحقیقت حق تعالےٰ ادنیٰ بہانے سے بندوں پر رحم فرما دیتے ہیں، نجات تو چھوٹی سی بات پر ہو جاتی ہے، مگر چھوٹی بات پر مواخذہ نہیں ہوتا، یہ بالکل غلط مشہور ہے کہ مواخذہ بھی چھوٹی بات پر ہو جاتا ہے، مواخذہ تو بڑی ہی بات پر فرماتے ہیں۔ اب رہا یہ کہ کوئی بڑی بات کو چھوٹی بات خیال کرلے، اس کا کسی کے پاس کیا علاج،

محاسبۂ نجات

ایک وعظ کے سلسلہ میں فرمایا کہ وہ دستور العمل جدول پر سے پردہ اٹھاتا ہے، جس کے چند اجزا ہیں۔ ایک تو دین کی کتابیں دیکھنا یا سننا، دوسرے مسائل دریافت کرتے رہنا، تیسرے اہل اللہ کے پاس آنا جانا، اور اگر ان کی خدمت میں آمد و رفت نہ ہو سکے تو بجائے ان کی صحبت کے ایسے بزرگوں کی حکایات و ملفوظات ہی کا مطالعہ کر لیا سن لیا کرو اور اگر ہو سکا

دیر ذکر اللہ بھی کر لیا کرو، تو یہ تو اصلاح قلب میں بہت ہی معین ہے اور اسی ذکر کے وقت میں سے کچھ وقت محاسبہ کے لئے نکال لو جس میں اپنے نفس سے کہو، اس طرح باتیں کرو کہ

"اے نفس ایک دن دنیا سے جانا ہے، موت بھی آنے والی ہے، اس وقت یہ سب مال و دولت یہیں رہ جاوے گا، بیوی بچے سب تجھے چھوڑ دیں گے اور خدا تعالیٰ سے واسطہ پڑے گا، اگر تیرے پاس نیک اعمال زیادہ ہوئے تو بخشا جائے گا اور گناہ زیادہ ہوئے تو جہنم کا عذاب بھگتنا پڑے گا جو برداشت کے قابل نہیں ہے اس لئے تو اپنے انجام کو سوچ اور آخرت کے لئے سامان کر، یہ عمر بڑی قیمتی دولت ہے اس کو فضول رائیگاں مت برباد کر، مرنے کے بعد تو اس کی تمنا کرے گا کہ کاش میں کچھ نیک عمل کر لوں جس سے مغفرت ہو جائے مگر اس وقت تجھے یہ حسرت مفید نہ ہوگی، بس زندگی کو غنیمت سمجھ کر اس وقت اپنی مغفرت کا سامان کر لے"

حدیث نبوی کا ادب

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ کہیں سے تشریف لا رہے تھے، راستہ میں ایک آدمی ان سے ملا اور اس نے درخواست کی کہ مجھ کو ایک حدیث سنا دیجئے، تو امام صاحبؒ نے تنبیہاً اس کو دس کوڑے لگائے۔ اور فرمایا کہ اے بے ادب: حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کہیں اس طرح سنی جاتی ہے، وہ بھی ایسا عاشق تھا اور حدیث سننے کے لئے اس قدر بے تاب تھا کہ اس نے کہا حضرت دس کوڑے اور مار لیجئے مگر مجھ کو حدیث سنا دیجئے اس کے جواب کو سن کر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ پر ایک کیفیت طاری ہو گئی اور وضو کر کے ادب کے ساتھ بیٹھ کر اس کو حدیث سنایا۔

چند زرین نصیحتیں

حضرت مولانا محمد احمد صاحب پرتاب گڈھی مدظلہ العالی اپنے تعلق رکھنے والوں کو عام طور پر یہ نصیحتیں فرماتے ہیں:

اللہ پاک کی توحید پر قائم رہیں، سنت کی پابندی کریں، خلاف شریعت اور خلاف سنت کوئی کام نہ کریں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حکموں پر پابندی سے عمل کریں، اللہ پاک کی نافرمانی سے بچیں، اگر کوئی گناہ سرزد ہو جائے فوراً سچے دل سے توبہ کریں۔ اللہ پاک اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضیات پر عمل کریں، تقویٰ اختیار کریں، حرام سے پرہیز کریں۔ حلال روزی حاصل کرکے کھائیں۔ اللہ کا ذکر کرتے رہیں۔ خوب عاجزی سے گڑگڑا کر اللہ پاک سے دعا مانگیں، اللہ سے ڈرتے رہیں۔

اللہ کی محبت پیدا کرنے کی کوشش کریں، اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو سوچا کریں، اس سے اللہ پاک کی محبت پیدا ہوتی ہے۔ اور اللہ کی محبت بزرگان دین کی صحبت میں حاصل ہوتی ہے۔ اسلئے اہل اللہ کی مجلس میں حاضری دیا کریں۔ کسی اللہ والے سے اصلاحی تعلق بھی پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ اللہ کے ولی وہ لوگ ہیں جو مومن کامل اور متقی ہیں، شریعت مقدسہ اور شریعت مطہرہ کے مطابق عمل کرتے ہیں، پس جو شخص خلاف شریعت عمل کرتا ہے وہ ہرگز بزرگ اور ولی نہیں ہے، دھوکہ نہ کھائیں۔

تمامی معاملات میں شریعت و سنت کے مطابق عمل کریں، شادی و غمی وغیرہ میں کوئی بات خلاف شریعت ہرگز نہ کریں۔ چاہے کوئی بھی ناراض ہو جائے، اس کی پرواہ نہ کریں بس اللہ تعالیٰ اور اس کے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے راضی کرنے کی فکر کریں، صفائی معاملات کا خاص خیال کریں، اور اخلاق کی درستگی کا بھی اہتمام کریں، اللہ کے ذکر میں جہاں تک ہو سکے مشغول رہیں۔

باجے گاجے سے بالکل پرہیز کریں، شرک و بدعت کے قریب نہ جائیں، شرک سے بڑا کوئی گناہ نہیں اور بدعت سراسر ضلالت اور سب سے بڑی مصیبت ہے لہذا ہرگز ہرگز اس کے قریب نہ جائیں [illegible]

کا عمل مقبول نہیں ہوتا، نماز نہ روزہ نہ حج، نہ زکوٰۃ نہ نفل نہ فرض کچھ بھی مقبول نہیں، دین میں جو نئی نئی باتیں ایجاد کی گئی ہیں ان کے قریب ہرگز نہ جائیں، بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر مضبوطی سے عمل کرتے رہیں، انشاء اللہ فلاح دارین حاصل کرلیں گے۔ اللہ راضی ہو جائے گا، اور جس سے اللہ راضی ہوگیا اس کو سب کچھ مل گیا، اور جس سے اللہ ناراض ہوگیا وہ سب کچھ کھو بیٹھا، اسے دین و دنیا میں خرابی اور خسارہ کے علاوہ کچھ نہ ملے گا، سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اللہ راضی ہو جائے بس تعلق مع اللہ سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں، اللہ تعالیٰ ہم سب کو نصیب فرمائے۔

مسائل کو علمائے ربانی سے پوچھتے رہیں، اور پوچھ پوچھ کر اس پر عمل کریں۔ اپنی مرضی اور تجویز سے کوئی کام نہ کریں، قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہیں، درود شریف اور استغفار کی کثرت کریں، موت کو کثرت سے یاد کریں اور موت کا مراقبہ کرتے رہیں۔

دنیا کو بالکل معتبر نہ سمجھیں، اکثر کو بچپن ہی میں اور بہتوں کو جوانی میں موت آجاتی ہے، اور بعضے بڑھاپے تک پہونچ جاتے ہیں، مگر تمام عمر دنیا کا دھندا ختم نہیں ہوتا۔

قیامت کے دن سوائے دین اور تقوے کے کوئی چیز کام نہ آوے گی، وہاں یہ نہیں پوچھا جائیگا کہ تم فلاں کے بیٹے اور فلاں کے پوتے تھے، بلکہ وہاں صرف تقویٰ کام آئے گا، واجبات کو ادا کرنا اور محرمات مکروہات اور مشتبہات کو ترک کرنا۔ اسی کا نام تقویٰ ہے، اس کا اہتمام رکھیں، اور جس جگہ دینی و دنیوی دونوں مصلحتیں جمع ہوں وہاں دینی مصلحت کو مقدم رکھیں، جو شخص دینی مصلحت کو مقدم رکھتا ہے، دنیا بھی تقدیر کے موافق اس کو مل جاتی ہے، اور جو شخص دنیا کی مصلحت کو مقدم رکھتا ہے تو دنیا بھی اسکو ہاتھ نہیں آتی۔

حقوق العباد کی ادائیگی کا خاص اہتمام کریں ان کو تلف نہ ہونے دیں، اس لئے کہ حق تعالیٰ تو خود رحیم و کریم ہیں، اور پھر ان کے دربار میں انبیائے کرام اور پیران عظام شفاعت بھی کریں گے، اس لئے ان کے حقوق میں تو عفو و درگذر کی امید ہے، لیکن حقوق العباد کا معاملہ بہت اہم ہے، ان کی مغفرت نہیں ہوگی، اسی لئے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ ؎

مباش درپئے آزار و ہرچہ خواہی کن
کہ در شریعت ما غیر ازیں گناہے نیست

بیوی بچوں، نوکر چاکر اور عیال و ماتحت میں سے ہر ایک کے ساتھ ایسا برتاؤ کریں کہ وہ

خوش ہوں اور محبت رکھیں، اور ان کے ساتھ اس قدر اخلاق و مروت اور غم خواری و حسن سلوک برتیں کہ وہ لوگ بجان و دل تمہارے گرویدہ ہو جائیں، ان سب کے باوجود اگر کوئی شخص محض اپنے حسد کی وجہ سے تم سے ناخوش ہو تو وہ معتبر نہیں۔

اپنے بڑوں کو ادب و فرمانبرداری اور خدمت گذاری سے راضی رکھیں، مگر جس چیز میں وہ لوگ معصیت کا حکم کریں اس میں ان کی اطاعت ہرگز نہ کریں، اس لئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: لَاطَاعَۃَ لِمَخْلُوقٍ فِی مَعْصِیَۃِ الْخَالِقِ. حق تعالےٰ کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔ اپنے چھوٹوں کے ساتھ شفقت و محبت کا برتاؤ کریں، اور اپنے عزیزوں، بھائیوں اور دوستوں ہم نشینوں اور پڑوسیوں کے ساتھ اخلاص و محبت اور غم خواری و تواضع کے ساتھ رہیں، ہر ایک کے ساتھ خندہ روئی سے پیش آئیں، ہر مسلمان سے سلام کرنے میں پیش قدمی کریں۔

دنیا چند روزہ ہے، دنیوی معاملات کی وجہ سے آپس میں قطع تعلق نہ کریں کیونکہ کوئی گھر اسی وقت برباد ہوتا ہے جب اس میں رہنے والے آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں۔

اور جن لوگوں سے دشمنی کا اندیشہ ہو ان کو نیکی اور سلوک سے شرمندہ اور سرنگوں کرنا چاہئے۔ اپنے برتاؤ سے ان کو بھی خوش رکھیں۔ جو اپنے لئے پسند کریں وہی دوسروں کے لئے پسند کریں، ہر مسلمان کو اپنے ہاتھ اور زبان کی ایذا سے محفوظ رکھیں۔

تقسیم ہند کے بعد بعض مصالح کے تحت دیوبند کے بعض علماء عرس وغیرہ کے مجمعوں میں شریک ہونے لگے، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اس کا علم ہوا تو ان کو اس سے تکلیف ہوئی، وہ اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اللہ کی شان انقلابات زمانہ اور اپنے اعمال بد کے ثمرات، دیوبندی حضرات جو عرس کے بند کرنے کی ہمیشہ ساعی رہے، اب وہ عرسوں کو فروغ دینے والے بن گئے، جس شخص کے مجمع نے نظام الدین کے عرس کے زمانے میں بستی بھی چھوڑ دیا کرتے تھے، اس کا ناخلف یہ سوچتا ہے کہ اس موقع پر جایا جائے تاکہ پاکستان سے آنے والے احباب سے جن کو عرس کے عنوان سے اجازت مل جاتی ہے ملاقات ہو جائے۔" (شیخ الحدیث)

چار باتیں

مجیب اللہ ندوی

اگر ساری دنیا کے مسلمانوں اور خاص طور پر ہندوستان کے مسلمانوں کے اندر یہ چار باتیں پیدا ہوجائیں تو یہ سرزمین جو ان کے لئے تنگ نظر آتی ہے وسیع سے وسیع تر ہو جائے گی، اور ان کو عزت کا وہ مقام جسے وہ حقوق طلبی اور سیاسی سطح سے حاصل کرنا چاہتے ہیں خود بخود حاصل ہو جائے گا۔

(۱) سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ وہ اپنے ایمان و یقین میں پختگی پیدا کریں، ایمان و یقین میں پختگی کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے علاوہ نہ تو کسی سے امید رکھیں اور نہ ڈریں اور نہ کسی کو حاجت روا اور رزاق سمجھیں، اور جو بھی کام کریں خدا سے اس کی کامیابی کا یقین دل میں رکھیں۔ حدیث قدسی ہے کہ اَنا عِندَ ظنِّ عَبدِی بِی، میرے ساتھ بندہ جیسا گمان کرتا ہے میں ایسا ہی معاملہ کرتا ہوں۔

(۲) دوسری چیز یہ کہ فرض عبادات کا زیادہ سے زیادہ اہتمام رکھیں، عبادات میں صرف نماز روزہ حج ہی کو نہیں بلکہ زکوٰۃ کو بھی عبادت سمجھیں، اور ایک ایک دانے اور ایک ایک پیسے کی زکوٰۃ نکالیں اور بغیر کسی نمود و نمائش کے اسے مستحقین تک پہنچا دیں۔ خدا کی نصرت سب سے زیادہ عبادت کے اہتمام سے آتی ہے۔

(۳) تیسری چیز یہ کہ ہم عام انسانوں کے حقوق میں کوتاہی نہ کریں، یعنی ان کے ساتھ ایک بھائی جیسا سلوک کریں، ان سے اخلاق سے پیش آئیں، اور معاملات میں سچائی اختیار کریں، کسی طرح کا دھوکہ فریب اور ظلم نہ کریں اور نہ جھوٹ بول کر کوئی فائدہ حاصل کریں، اور ان کی دینی و دنیاوی خدمت کو زندگی کا جزء بنائیں۔ اور اس کو ایک عبادت سمجھ کر کریں، اس کی تفصیل راقم الحروف نے اپنی کتاب "عبادت و خدمت" میں کر دی ہے۔ دینی خدمت کا بہترین ذریعہ دعوت و تبلیغ ہے۔ اور دنیاوی خدمت میں سب سے اہم وہ رفاہی کام ہیں جن سے عام انسانوں کو فائدہ پہنچے۔

(۴) چوتھی چیز یہ کہ زندگی کے ہر میدان میں آپ رعایت طلبی کے بجائے اپنے اندر خود اعتمادی اور

کی قوت پیدا کریں اور پوری نسل میں یہ جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کریں خواہ یہ میدان تعلیمی ہو یا اقتصادی ہو، اخلاقی ہو یا سیاسی ۔ دوسروں کے سہارے جینا اپنے اوپر حرام کرلیں ۔ اس سلسلہ میں امریکہ کے ایک یہودی کی بات ضرور یاد رکھئے ۔ جب اس سے ایک ہندوستانی سیاح نے پوچھا کہ تم لوگ امریکہ میں تین چار فیصد ہوتے ہوئے بھی اس کی سیاست و معیشت پر کیسے حاوی ہوگئے ؟ تو وہ بولا ہو کہ ہم نے سو برس پہلے یہ طے کیا تھا کہ اگر امریکی طالب علم کسی پرچہ میں ۵۰ فیصد نمبر لاکر امتیاز حاصل کرے گا تو اس میں ہمارا بچہ سو نمبر حاصل کرے گا تب وہ امتیاز حاصل کرے گا ۔ اسی جذبہ کے تحت ہم نے اپنی نسل کو تیار کیا جس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے ،، خود ہمارے ملک میں سکھ اقلیت کی مثال ہمارے لئے کافی ہے ۔ ان کی خود اعتمادی اور مقابلہ کی قوت ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی مذہبی پابندی اور داڑھی اور صافے کے ساتھ زندگی کے ہر میدان میں اور دنیا کے ہر ملک میں رواں دواں نظر آرہے ہیں ۔

کاش ہم بھی خدمت کی یہ مثال قائم کرتے

کوڑھیوں کی خدمت اور ان کی راحت رسانی کے سلسلہ میں مدر ٹریسا کو ۱۹۷۹ء میں نوبل انعام ملا اور پھر ۱۹۸۲ء میں دوبارہ ان کو یہ اعزاز ملا ۔

مدر ٹریسا ایک غیر ملکی خاتون ہیں جو آج سے پچاس برس پہلے عیسائی مشنری کی ایک رکن کی حیثیت سے ہندوستان آئیں ، اور انھوں نے کوڑھیوں کی خدمت کو اپنی زندگی کا مشن بنالیا ، اور ان کو اس کام سے اتنا لگاؤ پیدا ہوا کہ انہوں نے ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا ۔

عام طور پر کوڑھیوں کو دیکھکر خوف ، حقارت اور نفرت کی ایک عجیب و غریب کیفیت پیدا ہوتی ہے ، اور اس کے نتیجہ میں ہم ان کے قریب جانے ہی سے نہیں بلکہ ان کے سایہ سے بھی بچتے ہیں ۔ مگر مدر ٹریسا نہ تو ان کے مرض سے خوفزدہ ہوئیں اور نہ ان کے دل میں حقارت و نفرت کے جذبات پیدا ہوئے بلکہ انہوں نے ان کو اپنی آغوش محبت میں اٹھایا اور ان کی خدمت ایسی لگن اور خلوص سے کی کہ دنیا کی تاریخ میں نہ صرف اپنا نام زندہ جاوید کرلیا بلکہ عیسائی مشنریوں کی قدر و قیمت بھی دلوں میں اور بڑھادی ۔ عیسائی مشنریوں کے تین بنیادی اصول ہیں :

۱. تعمیری کام ۲. خاموش خدمت ۳. ٹھوس نتائج

انہوں نے ان اصولوں کی دنیا کے سامنے عملی مثال پیش کی ۔ مدر ٹریسا یہ خدمت ایک دو دن نہیں

بلکہ پورے پچاس پچپن برس سے انجام دے رہی ہیں، انہوں نے اس اثنا میں نہ تو شہرت دپروپیگنڈہ کا حربہ استعمال کیا نہ اپنے کاموں کا اخبارات میں اشتہار دیا، اور نہ اس "پیام انسانیت" کے لئے جلسے جلوس کا اہتمام کیا نہ ہی اور نہ اپنے کاموں کی تصویریں شائع کروائیں، اور نہ بساط سیاست کی ہنگامہ آرائیوں کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک کمزور نحیف اور بوڑھی تنہا عورت اپنی ذات سے خدمت خلق کے لئے ایک ادارہ بن گئی، اور نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کو اس کی خدمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اور اسی کے نتیجہ میں اسے نوبل پرائز ملا۔ اب تک ادبی اور سائنسی خدمات پر نوبل پرائز ملتا رہا ہے۔ مگر شاید خدمت کے نتیجہ میں یہ پہلا نوبل پرائز ہے جو مدر ٹریسا کو ملا ہے۔

کاش مسلمان قوم میں کچھ لوگ مدر ٹریسا کی مثال قائم کرتے۔ جس کی ان کی قوم کو مدر ٹریسا کی قوم سے زیادہ ضرورت ہے۔ آج کسی آفت ناگہانی یا مصیبت یا طوفان کے وقت یورپ و امریکہ کی امدادی ٹیمیں جس تیزی کے ساتھ پہنچ کر عام انسانوں کی خدمت کرتی ہیں، افسوس ہے کوئی مسلمان حکومت اس سلسلہ میں اتنی تیزی نہیں دکھاتی۔ حالانکہ یہ ان کے دین کا تقاضہ بھی ہے اور دعوت و تبلیغ کے لحاظ سے بھی یہ نہایت ضروری کام ہے، مگر ہم اس طرف سے انتہائی غفلت سے کام لے رہے ہیں۔

اگر آج مسلمانوں کے ہر طبقہ کے ذمہ دار حضرات اور خاص طور پر علما اسی انداز میں قوم کی ذہنی تربیت کریں تو بہت سی خرابیوں کے باوجود ہماری قوم میں اب بھی بہت سی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں، اور اس خاکستر میں بہت سی دبی ہوئی چنگاریاں موجود ہیں۔ ذرا ان کو ہوا دے جائے تو شعلہ بن کر بھڑک سکتی ہیں۔

نہیں ہے ناامید اقبالؔ اپنی کشت ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اہتمام، احترام، محنت اور حسنِ عمل

طلبہ کے سامنے کی گئی ایک تقریر کا کچھ حصہ

مرتبہ: اختر حسین نیپالی متعلم درجہ چہارم عربی

محنت اور حسن عمل عزیزو! ہم نے تم سے بار بار کہا ہے، اور آج پھر کہتا ہوں کہ تم اپنے اندر محنت اور حسن عمل کے ساتھ احترام و اہتمام پیدا کرلو تو تم ضرور کامیاب ہو جاؤ گے۔ محنت اور حسن عمل کا مطلب یہ ہے کہ یہ بالکل ممکن ہے کہ کوئی طالب علم نو ماہ غافل رہا ہو اور اپنی ذہانت وطباعی اور امتحان میں کامیابی کے خاص گر معلوم کرکے ایک ہی ماہ کی محنت اور مطالعہ سے یا نقل وغیرہ کرکے زیادہ سے زیادہ نمبر حاصل کرلے اور امتحان میں کامیاب ہو جائے۔ مگر صرف اچھے نمبر حاصل کرلینا تعلیم کا کوئی حاصل نہیں ہے اصل حاصل تو وہ ہے جسکا نتیجہ آئندہ زندگی میں برآمد ہو۔ ہمیشہ وہی طلبہ اپنی آئندہ زندگی میں کامیاب ہوتے ہیں جو محنت وشوق، لگن اور ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی میں مستقل طور سے لگے رہتے ہیں۔ ذہانت اور وقتی تیاری عارضی طور پر کتنی ہی نتیجہ خیز ہو، لیکن آپ کو یاد رکھنا چاہئے کہ وہ محنت اور شوق کا بدل ہرگز نہیں ہوسکتی۔ مولانا شبلی رح کے جانشین اور لائق شاگرد علامہ سید سلیمان ندوی رح سابق ناظم دار المصنفین کا نام نامی تم نے سیرت النبیؐ اور اردو کتابوں کے مطالعہ کے سلسلہ میں ضرور پڑھا اور سنا ہوگا وہ اپنی اسی محنت، لگن اور شوق ہی کی بدولت علم وفضل کے اعلیٰ مرتبہ کو پہونچے، اور دنیا میں اپنا نام کرگئے۔ اور ان کے بہت سے ذہین ساتھی محنت وشوق کی کمی کی وجہ سے ان سے پیچھے رہ گئے

احترام واہتمام احترام واہتمام کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے قلب کے اندر ان تمام چیزوں کا احترام ہونا چاہئے جس سے تمہارا فائدہ خواہ دنیاوی فائدہ یا اخروی فائدہ متعلق ہو۔ یعنی تمہارے

قلوب کے اندر اللہ کا اور اس کے رسول کا احترام ہونا چاہئے، اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کا احترام ہونا چاہئے۔ تم جن اساتذہ سے پڑھتے ہو اور جن کتابوں کو پڑھتے ہو ان سب کا احترام ہونا چاہئے، اسی طرح جو لوگ تمہاری تعلیم و تربیت اور نظم و انتظام میں لگے ہوئے ہیں ان کا بھی احترام تمہارے اوپر فرض ہے۔ ان چیزوں کا احترام تمہارے دل میں رہے گا تو تمہارے علم میں برکت اور آئندہ زندگی میں لوگوں کے دلوں میں تمہارا احترام بھی ہوگا، احترام صرف سامنے اور ظاہر کا احترام کافی نہیں ہے بلکہ یہ احترام قلب میں اور کمروں کی تنہائی میں بھی ہونا چاہئے۔

اہتمام کا مطلب یہ ہے کہ جو کام کرنا ہے وقت سے پہلے اس کی تیاری کی جائے۔ مثلاً نماز کے اہتمام کا مطلب یہ ہے کہ اذان سے پہلے اس کی تیاری شروع کردو، درجہ کی گھنٹی بجنے سے اپنے کو درجہ میں جانے کے لئے تیار کرلو۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ اہتمام سے جو کام کیا جاتا ہے اس سے شوق پیدا ہوتا ہے، اور شوق ہی سے آدمی کامیابی حاصل کرتا ہے۔ یہاں جن چیزوں کا اہتمام و احترام کرایا گیا ہے۔ گھر پر جاکر بھی اس کا احترام و اہتمام کرتے رہنا، مثلاً نماز کا اہتمام تلاوت قرآن پاک کا اہتمام اور بڑوں کا احترام وغیرہ وغیرہ۔ اور اہتمام ایک دو دن کا اچھا نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں برکت ہوتی ہے، اس لئے زندگی بھر ان کاموں کا احترام کرتے رہو۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھو کہ غیر ضروری چیزوں کا اہتمام بالکل نہ کرو، مثلاً کپڑوں کا اہتمام، بناؤ سنگار کا اہتمام، گھومنے پھرنے کا اہتمام، کھیلنے کودنے کا اہتمام، ان چیزوں کا اہتمام طلبہ کے لئے سم قاتل ہے۔ غیر ضروری چیزوں کے اہتمام سے بہت سے ضروری کام رہ جاتے ہیں۔ اس لئے اس سے پرہیز کرو۔

وفیات

آہ محمد یوسف صاحب مرحوم

پچھلے پرچہ میں جامعۃ الرشاد کے ایک مخلص ہمدرد اور اس کے بنیادی رکن جناب حاجی محمد یوسف صاحب کی علالت کا ذکر آچکا ہے۔ افسوس ہے کہ پچھلا پرچہ جس دن چھپکر آیا اس کے دو دن بعد ایک طویل علالت کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

ان کے انتقال سے ان کے بوڑھے والدین اور ان کے بھائیوں کے ساتھ جامعۃ الرشاد کے اساتذہ وطلبہ ہی نہیں بلکہ اس کا ایک ایک ذرہ سوگوار ہے، اور ان کی مغفرت کے لئے صمیم قلب سے سارے لوگ دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ انہیں اپنی جوار رحمت خاص میں جگہ عنایت کرے، اور ہمیں ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔ آمین؛ جن لوگوں کو اپنی زندگی میں کوئی نیا کام خاص طور پر کوئی اجتماعی یا دینی کام کرنے کا اتفاق ہوا ہے، ان کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگا کہ کسی کام میں کامیابی کے بعد بے شمار لوگ ساتھ ہو جاتے ہیں۔ مگر ابتدائی دور میں خاص طور ایسے کام کے ابتدائی دور میں جس میں مادی منفعت کا کوئی پہلو موجود نہ ہو بلکہ اس میں کھونا زیادہ پانا کم ہو تو بہت کم لوگ کامیابی و ناکامی سے بے نیاز ہو کر بغیر سوچے سمجھے اپنے سر خرخشہ مول لینے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ یوسف صاحب مرحوم انہیں لوگوں میں تھے جنہوں نے دینی و ملی کاموں اور خاص طور پر جامعۃ الرشاد کے سلسلہ میں اپنی شرکت کو کامیابی و ناکامی کی ترازو میں کبھی نہیں تولا۔ راقم الحروف نے ۱۹۶۲ء میں جب شہر اعظم گڈھ میں ایک عربی ادارہ کھولنے کا ارادہ ظاہر کیا تو عام لوگوں نے اسے ناممکن سمجھ کر بے اعتنائی برتی مگر جن لوگوں نے بے چون وچرا نہ صرف اسکی تائید کی بلکہ عملاً شریک ہو گئے، ان میں ایک محمد یوسف مرحوم بھی تھے، ابتدا میں مدرسہ میں کوئی منشی نہیں تھا وہ روزانہ مدرسہ کی آمدنی اور خرچ کا حساب اپنے ہاتھ سے لکھا کرتے تھے۔ سال میں تو وہ اس کی رسید لوٹتیا

کرتے اور چھپوانے کا انتظام کرتے تھے۔ مدرسہ کا آٹا ان کی مشین سے پیس کر آتا تھا جس کی پسائی بہت معمولی لی جاتی تھی۔

اس وقت مدرسہ ایک مسجد میں اور دارالاقامہ ایک کرایہ کی عمارت میں تھا یہ کرایہ کی عمارت جس شخص کی تھی وہ انتہائی سخت اور دین سے بے پروا آدمی تھا۔ اس عمارت میں ایک بڑا صحن تھا اس میں وہ آکر ترکاری وغیرہ بو دیتا تھا، کبھی کبھی طلبہ اس کی مولی، ٹماٹر وغیرہ توڑ لیتے تھے، اس پر وہ سخت برہم ہوتا اور طلبہ کو برا بھلا کہتا، ایک دن میں دارالاقامہ پہنچا تو حسب عادت وہ طلبہ پر بگڑ رہا تھا اور مجھے دیکھا تو مجھ پر برس پڑا، اور کہا کہ آپ اپنے طالب علموں کی یہی تربیت کرتے ہیں۔ میں ابھی اس کا کچھ معذرت خواہانہ جواب دینے کے لئے سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے میں یوسف صاحب آگئے۔ انہوں نے پوچھا کہ "مولانا کیا بات ہے" میں نے ان سے کہا کہ طلبہ نے ان کی مولی وغیرہ اکھاڑ لی ہے اسی پر یہ برس رہے ہیں۔ انہوں نے یہ مسئلہ اپنے سر لیتے ہوئے اس سے کہا کہ کرایہ میں یہ صحن وغیرہ شامل ہے۔ اس لئے آپ اس میں ترکاری وغیرہ بونا چھوڑ دیں، اور اگر بوئیں گے تو اس کو طلبہ ہی کھائیں گے۔ اور اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا کہ اگر آئندہ پھر تم مولانا سے یا طلبہ سے بولے تو تمہاری خیر نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر کبھی اس جھگڑے کی نوبت نہیں آئی۔

مدرسہ کی موجودہ عمارت سے تھوڑے فاصلہ پر کچھ غریب صاحب خیر مسلمانوں نے اپنی زمین وقف کردی جس پر کچھ بانس کی کھونٹیاں تھیں۔ شہر کے ایک مشہور غنڈہ نے سو پچاس آدمی کو لے کر اس پر زبردستی قبضہ کرنے کی کوشش کی اور سینکڑوں بانس کٹوا دیئے۔ اتفاق سے میں کسی ضرورت سے باہر گیا تھا ان کو جب علم ہوا تو تنہا وہاں پہنچ گئے اور پولیس کو اطلاع کرکے روک تھام کی۔

اس طرح نہ جانے کتنے مواقع تھے جس میں وہ میرے لیئے سایہ بن جاتے تھے، مدرسہ میں کوئی مسئلہ پیدا ہوتا تھا وہ اسے اپنے ہاتھ میں لے لیتے تھے، اور پھر اسے خوش اسلوبی سے طے کرڈالتے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو تعمیر کا اتنا عمدہ ذوق دیا تھا کہ بڑے بڑے انجینیر حیرت کرتے تھے۔ مدرسہ کی عمارت اور مسجد میں جو سادگی و پرکاری دکھائی دیتی ہے وہ سب انہی کے ذوق تعمیر کا نتیجہ ہے۔ اگر انکو میری رائے سے اختلاف ہوتا تھا تو وہ بروقت اس کا اظہار نہیں کرتے تھے۔ بلکہ دوسرے تیسرے دن ایسے انداز سے اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے کہ میں خود بخود ان کی رائے کے مطابق اپنی رائے اور فیصلہ بدل دیتا تھا۔ تعمیر میں حسن پیدا کرنے کے لئے بسا اوقات وہ اخراجات بڑھا دیتے تھے اس سے جب میں

بہت جز بز ہوتا تھا تو وہ ٹوک دیتے اور پھر یا تو میری غیر موجودگی میں اسے پورا کر دیتے یا پھر مجھے اس کی افادیت بتا کر راضی کر لیتے تھے۔ مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں ایسا کئی بار ہوا ہے۔

ایک بار انہوں نے مدرسہ کا زینہ بنوانا شروع کیا، میں نے کہا کہ اتنا چوڑا زینہ آپ بنوا رہے ہیں اس پر بہت خرچ ہو گا، انہوں نے کام روک دیا۔ دو چار دن بعد میں الہ آباد گیا۔ ان کو علم ہوا تو وہ بھی الہ آباد پہونچے اور باتوں باتوں میں مجھ سے کہا کہ چلئے آپ کو یونیورسٹی کا ہال دکھلائیں، میں ان کے ساتھ ہو لیا، جب ہال کی دوسری منزل پر چڑھنے لگا تو میں نے کہا "یوسف صاحب زینے بہت اچھے ہیں" بولے بس ایسا ہی زینہ مدرسہ پر بنوانا چاہتا ہوں، چنانچہ وہ ویسا ہی بن گیا۔

مدرسہ کی جب کوئی تعمیر شروع ہوتی تھی تو کبھی کبھی ہفتوں گھر نہیں جاتے تھے۔ گھر سے یہیں کھانا منگاتے اور ہم لوگوں کے ساتھ کھاتے۔ ابھی آخری بیماری میں جب تک وہ صاحب فراش نہیں ہو گئے تھے انہوں نے تھوڑی سی جگہ میں مدرسہ کا بیت الخلا، استنجا خانہ اور غسل خانہ وغیرہ اس سلیقہ سے بنوا دیا کہ لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں، اور پھر اتنا سب کرنے کے بعد بھی یہ محسوس نہیں ہونے دیتے تھے کہ انہوں نے کوئی اہم کام کیا ہے۔ مدرسہ میں جب کوئی دعوت یا اجتماعی تقریب ہوتی تھی وہ نمایاں جگہ پر نظر نہیں آتے تھے بلکہ ایسے کام میں لگ جاتے تھے جو نمایاں نہ ہو، مثلاً پلیٹ دھلوانے، فرش بچھوانے لگتے تھے،

جامعۃ الرشاد کے علاوہ انہوں نے شہر میں بیسیوں ملی کام کئے۔ بچوں کی لائبریری قائم کی، شاہ عبدالخالق مسافر خانہ کا کام جو دس برس سے ایک خاص جگہ پر پہونچ کر رکا ہوا تھا، اس کے کچھ نہ ہوتے ہوئے رضا کارانہ اس کا کام شروع کیا تو اس کی دنیا بدل دی۔ محلہ کے ایک امام باڑہ کو مسجد میں تبدیل کرا دیا۔ شہر کی شاید ہی کوئی نئی یا پرانی مسجد ہو گی جس کی تعمیر و مرمت میں خود بخود حصہ لینے کے لئے نہ پہونچ گئے ہوں۔ یوں انفرادی طور پر سیکڑوں آدمیوں کے مکانات کی تعمیر میں ان کے مشورے شامل رہے ہوں گے،

ان کی تعلیم انٹر سے زیادہ نہیں تھی، مگر صحبت انہوں نے ہمیشہ اہل علم اور اہل دین کی رکھی، اور دینی کتابیں خرید کر ہمیشہ مطالعہ کرتے تھے۔ اس لئے ان کی زندگی ہمیشہ محتاط رہی۔ نماز جماعت اور روزہ اور زکوٰۃ کے سختی سے پابند تھے، حج بھی کم عمری میں کر لیا تھا، مگر ان کی اصل خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے سے زیادہ دوسروں کے کام آتے تھے گویا وہ اسمٰعیل میرٹھی کے اس شعر کے مصداق تھے۔

مرد ہو تو کسی کے کام آؤ ؛ ورنہ کھاؤ پیو اور چلے جاؤ

ایک بڑے کاروباری ہوتے ہوئے بھی ان کی ذاتی زندگی بالکل فقیرانہ تھی، ایسا اوقات دو چار روپے بھی ان کی جیب میں نہیں رہتے تھے۔ کاروباری مصالح کے تحت انہوں نے اپنے کاروبار کی تین فرمیں بنائی تھیں مگر سب میں اپنے بھائیوں کا نام ڈالا، اپنا نام کسی میں نہیں ڈالا، وہ اپنے بھائیوں سے ہمیشہ کہا کرتے تھے کاروبار کی ترقی کو اپنی محنت کا نتیجہ نہ سمجھو بلکہ اللہ تعالے کا فضل سمجھو، بہت سے لوگ اس شہر میں کاروبار کرتے ہیں۔ مگر سب کامیاب نہیں ہوتے،

اپنی آخری بیماری کے زمانہ میں اپنے بھائیوں کو لے کر جمعہ کی نماز جامعۃ الرشاد میں پڑھنے آئے، خطبہ سے پہلے راقم الحروف نے اس حدیث کی تشریح کی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے سوال فرمایا کہ "تم میں سے کس کو وارث کے مقابلہ میں اپنا مال پسندیدہ ہے" صحابہ نے جواب میں فرمایا کہ ہم میں سے ہر شخص کو وارث کے مقابلہ میں اپنا مال زیادہ پسندیدہ ہے۔" آپ نے فرمایا کہ تمہارا مال تو اتنا ہی ہے جتنا کہ تم نے کھالیا اور پہن لیا اور کار خیر میں خرچ کر دیا۔ بقیہ مال تمہارے وارث کا ہے جسے تم چھوڑ جاتے ہو۔ گویا آدمی اپنے لئے کم اور وارث کے لئے زیادہ کماتا ہے۔

نماز کے بعد کہنے لگے کہ بڑی خوشی ہوئی کہ آج آپ نے وہی بات کہدی جو میں اپنے بھائیوں کو سنانا چاہتا تھا بحمد اللہ ان کے والد محمد روزن صاحب اور بھائی محمد یونس، انیس اور شفیق وغیرہ بھی ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خدا تعالےٰ ان لوگوں کو صحت وعافیت کے ساتھ رکھے اور انہیں اپنے بھائی کی خوبیوں سے نوازے۔

حق مغفرت کرے بڑا آزاد مرد تھا۔

عربی شاعر نے انہی جیسے کسی آدمی کے مرنے پر یہ شعر کہا تھا

لما حضرنا لاقتسام تراثہ ؞ اصبنا عظیمات اللھی و المآثر

جب ہم اس کی وراثت کی تقسیم کے لئے جمع ہوئے تو جودوکرم اور قابل فخر کارناموں کے علاوہ کوئی دوسری دولت تقسیم کے لئے نہیں ملی۔

اس کہنے میں شاید ذرہ بھر مبالغہ نہ ہو کہ ان کی خوبیوں کے آدمی بڑی مشکل سے پیدا ہوتے ہیں، ان کے انتقال کے بعد سے جس تنہائی کا احساس ہو رہا ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے اپنے کسی مخلص رفیق کے انتقال کا غم اٹھایا ہو۔ ۔۔

غزل الغزلات

بقیۃ السلف حضرت مولانا محمد احمد صاحب مدظلہ العالی

جب تک کہ نہ پامال ہو جذبات کا عالم
چھایا ہی ہوا رہتا ہے آفات کا عالم

ملے ہی نہیں جس نے کیا خطرات کا عالم
نادیدہ ہے اس کے لئے برکات کا عالم

دیکھا نہیں جس نے کبھی، سمجھے گا بھلا کیا
اُف کوچۂ محبوب کے دن رات کا عالم

قربان وہ کر دیتا ہے جنت کی بہاریں
پاتا ہے جو قسمت سے مناجات کا عالم

بس پوچھئے اُن سے جو محبت پہ فدا ہیں
حرکات کا سکنات کا لمحات کا عالم

جنت سے بھی بڑھ کر ہے محبت کی نظر میں
محبوب کے کوچہ کے غبارات کا عالم

بس اہل محبت کو نظر آتا ہے احمدؔ
خاکِ درِ محبوب کے ذرات کا عالم

میں اور کہاں دو سو لمحات کا عالم
مت پوچھئے محبوب کی سوغات کا عالم

ہر وقت ہی رہتا ہے مدارات کا عالم
کیا پوچھتے ہو ان کی عنایات کا عالم

غائب ہوا جاتا ہے حجابات کا عالم
مشہود لگا ہونے مغیبات کا عالم

ہے کیف سے لبریز سوالات کا عالم
جنت کی بھی جنت ہے جوابات کا عالم

محسوس لگا ہونے کہ دل عرش بریں ہے
اللہ رے یہ اُن کی ملاقات کا عالم

دل جھومنے لگتا ہے مسرت سے ہمارا
یاد آتا ہے جب اُنکے خطابات کا عالم

دیکھا نہیں جب سے تجھے اے نور مجسم
آنکھوں میں رہا کرتا ہے برسات کا عالم

فیضان محبت ہے جو آتا ہے نظر آج
اک بندۂ عاصی میں کرامات کا عالم

کہنے کی نہیں بات یہ، کہتا ہوں مگر خیر
پھرتا ہے نگاہوں میں محالات کا عالم